CPNE · MEMBER APNS

سسپنس ڈائجسٹ

مدیر اعلیٰ

انشائیہ — اس کائنات میں شعور کے بخشے ہوئے اختیار کا رابطہ پُرفکر انداز — جون ایلیا 11

آپ کے خط — سسپنس کی مجلسِ مشاورت قارئین کی تلخ و شیریں باتیں گلے شکوے اور پُرخلوص مشورے — مدیر اعلیٰ 12

غزنی تا ہالی — ماضی کا آئینہ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات — ڈاکٹر ساجد امجد 20

وصالِ صنم — سائے کے تعاقب میں تھکن پانے والی ایک حسینہ کی ہوشیاریاں — ایم اے راحت 47

کشکول — اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد و طویل سلسلہ — انوار صدیقی 62

اپنا بچہ — لب ساحل ایک پیاسے ہونے کی حماقتوں کا قصہ — منظر امام 93

شرارتی — اپنے مرکز سے ہٹنے والے چند شرارتی دوستوں کا ماجرا — مختار آزاد 97

سیدھی بات — رہبروں کے روپ میں رہزنوں کی سنگ دلی کا قصہ — ملک صفدر حیات 110

چور کا بھائی — نظروں سے اوجھل رہنے والی پراسرار شخصیت کی ایک خوفناک جھلک — بابر نعیم 135

جیسا تیسا — بند گلیوں میں بھٹکنے والے ایک انسان دوست مجرم کی روداد — کاشف زبیر 143

محفلِ شعر و سخن — آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ — قارئین 160

خواب — ضرورت اور لالچ میں فرق کرتا، معرکہ کا ایک سبق آموز رنگ — تنویر ریاض 163

کالج کی نوٹی — [illegible] — [illegible] 171

مسافر — گل و گلزار سے اپنے خار تک ایک مسافر بے نوا کی روداد حیات — ناصر ملک [illegible]

نہلے پہ دہلا — ایک اپنے سب سازشوں کا قصہ ... ارادات کی سنگینی کا احساس تھا — سلیم انور 229

حضرت سلیمانؑ — ایک عظیم بادشاہ اور عظیم پیغمبر حضرت سلیمانؑ کی روداد حیات — رضوانہ ساجد 233

جیت ہار — ... سنگدل اور ... کم فہم ... کی خوش فہمیاں — ثمر عباس 245

گھٹیا حرکت — ایک ذرا سی چوک سے چونکا دینے والے دلچسپ واقعات — عبدالقیوم شاد 249

وحشتِ امکاں — ... کے بکھرے موتی کبھی ہجر، کبھی وصل کے لمحات کا سحر انگیز بیان — عائشہ فاطمہ 254

کترنیں — دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیفے، چٹکلے، اقتباسات، سکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے — [illegible] 000

جلد 41 • شمارہ 06 • جون 2012 • زرِ سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 50 روپے •

پبلشر و پرنٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

انشائیہ

شعور

جون ایلیا

شام گہری ہوگئی ہے۔ دونوں وقت مل رہے ہیں اور مجھے نواب مرزا شوق لکھنوی کی زہرۂ اوراق اور شہرۂ آفاق مثنوی "زہرِ عشق" یاد آرہی ہے جو میں نے آٹھ نو برس کی عمر میں سنی تھی اور دس گیارہ برس کی عمر میں پڑھی تھی۔ اس حشر انگیز مثنوی کا میرے خواب خواب لڑکپن کی دنیا، دنیا نہیں بلکہ میرے لڑکپن کی کائنات پر ایک عمر طاری تھا۔ یہ مثنوی شاعری اور معشوقانہ شاعری کا ایک معجزہ ہے۔

میں عشق و حسن کے رشتے کے ایک خاص احساس کی حالت میں دیوان غالب تو کیا خدائے سخن میر کی کلیات تک کو "زہرِ عشق" پر وار سکتا ہوں۔ آپ میں سے اگر کوئی صاحب میری اس بات کو غلط قرار دیں تو میں ان سے کوئی حجت اور تکرار نہیں کروں گا۔ یہ تو احساس اور تاثر کا معاملہ ہے اور احساس و تاثر کا بھلا حجت اور تکرار سے کیا واسطہ! ہاں تو اس وقت مجھے "زہرِ عشق" کا ایک شعر ایک عجب حال خیزی کے ساتھ یاد آرہا ہے۔

رخ پہ گیسو ہوا سے ہلتے ہیں
چلیے اب دونوں وقت ملتے ہیں

"......دونوں وقت ملتے ہیں" سے میرے ذہن میں اچانک ایک لفظ ابھرا ہے اور وہ لفظ ہے انسان۔ یہ لفظ میرے ذہن میں اس لیے ابھرا ہے کہ انسان میں بھی دو کیفیتیں ملتی ہیں۔ ایک کیفیت خیر ہے اور دوسری شر۔ اب یہ ایک الگ بات ہے کہ بعض اوقات یا اکثر اوقات انسان سراپا شر نظر آتا ہے۔

اس لفظ یعنی انسان کا "مادہ" یا عربی قواعد کی اصطلاح میں "بنا" الف، نون، سین یعنی "انس" ہے۔ انس کا ایک تلفظ "اِنس" ہے اور دوسرا تلفظ "اُنس" اس کے معنی ہیں خوش خلق، ملنسار اور ایک دوسرے سے مانوس ہونا۔ (وغیرہ)

پس لفظ انسان کی اصل اور اس کے مادے یا مادوں کی بات ہوئی۔ اب میں انسان کے معنی کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اس لفظ کے معنی کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان وہ جاندار [illegible] اپنے کمال کے سبب دوسرے تمام جانداروں سے اعلیٰ اور اشرف حیثیت رکھتا [illegible]

[illegible] انسان وہ (راست قامت) جاندار ہے جو راست کار، راست کوش اور درست راستے پر گامزن ہو اور اپنی نوع کے دوسرے افراد سے انس رکھتا ہو۔

اس مرحلے پر آپ بھی وہی کچھ سوچ رہے ہوں گے جو میں سوچ رہا ہوں اور وہ یہ کہ لغت کے اعتبار سے انسان کے جو معنی ہیں کیا ان معنی سے ہماری یعنی انسانوں کی اکثریت کوئی دور کا بھی تعلق رکھتی ہے؟

"کیا انسان واقعی وہ جاندار ہے جو راست کار، راست کوش اور درست راستے پر گامزن ہو؟"
"ہرگز نہیں۔"
"کیا انسان واقعی وہ جاندار ہے جو اپنی نوع کے دوسرے افراد سے انس رکھتا ہو؟"
"ہرگز نہیں۔"

اس گفتگو کا جو پر مایہ نتیجہ نکلا وہ یہ ہے کہ ہم یکسر بے معنی اور مہمل ہیں۔ یکسر بے معنی اور مہمل۔ اور جون ایلیا! اس میں شبہ بھی کیا ہے کہ ہم سدا کے بے معنی اور مہمل وجود ہیں۔ الا ماشاء اللہ ہم وقت کا ایک فضول پن اور تاریخ کی ایک ہڑبونگ ہیں۔

انسانو! چاہے تم کہکشاؤں کو پٹکوں کی طرح اپنی کمروں پر باندھ لو تب بھی تمہارا وجود یکسر بے معنی اور مہمل ہی رہے گا۔ تم کیا اور تمہارا نظام شمسی کیا تمہاری کہکشائیں کیا اور تمہارے شہابیے کیا۔ جو کچھ بھی ہونے کے حال میں ہے، وہ عبث ہے، سرتاپا عبث ہے......اور میں بھی عبث ہوں اور اس کے ساتھ ہی اس بد طور اور بے ہودہ "عبث" کا انجوگر بھی ہوں۔ جو ذرا بھی بھلا مانس ہے اسے اس بد طور عبثیت کا انجوگر ہونا چاہیے۔

پھر انسان اگر کسی قدر ٹھیک ٹھاک ہونے کے طور سے کچھ ہیں تو فطرت کے اس عطیے کی وجہ سے ہیں جسے شعور کہا جاتا ہے اور اسی عطیے کی وجہ سے وہ اپنے بامعنی ہونے پر اصرار کرتے رہے ہیں اور اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کا یہ اصرار درست ہے۔ پر یہاں کہنے کی جو بات ہے، وہ یہ ہے کہ ان کی اکثریت نے فطرت کے اس عطیے سے عام طور پر بڑی بے تدبیری اور بے دانشی کے ساتھ کام لیا ہے۔

تم اپنی بد طور مہملیت اور بے ہودہ عبثیت کے باوجود اگر شعور کو جز وقتی طور پر نہیں بلکہ کل وقتی طور پر کام میں لاؤ تو تمہاری وجودی مہملیت اور عبثیت کی چیرہ دستی تمہارا کچھ بہت زیادہ نہیں بگاڑ سکے گی۔

شعور ہی انسانوں کو اختیار سے نوازتا ہے اور شعور ہی آزادی عطا کرتا ہے۔ چاہے وہ اختیار بہت زیادہ نہ ہو اور چاہے وہ آزادی پوری آزادی نہ قرار پائے۔

سنو یوں کہ اس کائنات میں، اپنے آپ میں مگن رہنے والی اور اپنا آپا چھپانے والی اس نخریلی کائنات میں شعور کے بخشے ہوئے اختیار، ادنیٰ اختیار اور معمولی اور ادنیٰ کی ہوئی آزادی، بہت کم آزادی کی حالت بھی فطرت کا کوئی معمولی عطیہ نہیں ہے۔

٭٭٭

عزیز قارئین!
تسلیمات

جون 2012ء کا شمارہ حاضرِ خدمت ہے۔ ماہِ جون پاکستانی حکمرانوں اور عوام کے لیے ایک مخصوص حوالہ "بجٹ" سے جانا جاتا ہے جس کے آنے سے پہلے عوام پر خوف کی ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور پیرا رکن ماحول میں مختلف چہ میگوئیاں جنم لیتی ہیں اور اس کے آجانے کے بعد عوام دشمن اور عوام دوست بجٹ میں دیر تک موضوعِ گفتگو رہتی ہیں مگر...... سب لاحاصل۔ پچھلے دنوں بدقسمتی سے پاکستانی عوام یکے بعد دیگرے دو بڑے حادثات سے دوچار ہوئی...... گیاری سیکٹر میں ایک برفانی تودہ پاک فوج کے سو سے زائد چراغ گل کر گیا...... تاریخ میں لازوال قربانی کا ایک اور باب رقم ہو گیا۔ دوسری جانب ائربلیو کے زخم ابھی بھرے نہیں تھے کہ بھوجا ائرلائن کا حادثہ سامنے آگیا جس میں سیکڑوں قیمتی جانیں تلف ہوگئیں۔ پچھلے حادثے کے متاثرین ہنوز داد رسی کے منتظر ہیں۔ اس حادثے کے بعد پاکستان میں نجی ائرلائنز کی کارکردگی اور مستقبل پر بھی سوالیہ نشان لگ گیا ہے۔ خیر یہ تو ایک الگ بحث ہے ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہلاک شدگان کو جوارِ رحمت میں جگہ اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور آئندہ اس قسم کے حادثات سے محفوظ رکھے، آمین۔ ان دنوں پاکستان میں پاک بھارت ٹریڈ کانفرنس منعقد ہوئی جس میں دونوں جانب سے تمام بڑے تاجروں اور کاروباری اداروں اور حضرات نے شرکت کی، اس کانفرنس کا مقصد دونوں ممالک کے درمیان دوطرفہ تجارت کے فروغ کے لیے تجاویز و منصوبے ترتیب دینا تھا۔ ہم بھی یہی سمجھتے ہیں کہ اس قسم کے معاہدات ہونے چاہئیں کیونکہ معیشت کے استحکام کے لیے تجارت نہایت ضروری ہے لیکن بات وہی ہے کہ دوطرفہ تجارت اور اس عمل کے مثبت نتائج میں عوام کا بھی حصہ ہو...... کیونکہ دیکھا یہی گیا ہے کہ جب بھی کوئی اہم فیصلہ کیا جاتا ہے تو وہ بظاہر عوام کی بھلائی کے لیے ہی کیا جاتا ہے اور کہا یہی جاتا ہے کہ جب اس پر عمل ہوگا تو اس کے ثمرات عوام تک بھی پہنچیں گے لیکن زمینی حقائق یہی بتاتے ہیں کہ یہ "جب" "کبھی" "اب" میں تبدیل نہیں ہوئی۔ ہماری دعا ہے کہ اس مرتبہ ایسا نہ ہو اور اس تجارت کے ثمرات عام آدمی تک بھی پہنچ سکیں بالکل ایسے ہی جیسے ہر خاص و عام آدمی کی دسترس ہماری جھلملاتی محفل تک ہے...... تو دیر کس بات کی، دیجیے دستک۔

☩ محمد جاوید بلوچ، تحصیل علی پور سے تبصرہ کر رہے ہیں "فہرست میں ہماری بے قرار نگاہوں نے ہمیشہ کی طرح اپنے فیورٹ لکھاری ملیہ زوماخ کے مالک محی الدین نواب جن کی وجہ سے ہم ڈائجسٹ کی دنیا سے آشنا ہوئے کو تلاش کیا مگر نہ پاکر آنکھوں کے سامنے مایوسی کی کہر چھا گئی اور نہ جانے اس کہر کو چھٹنے میں ابھی کتنا عرصہ باقی ہے؟ (بہت جلد انشاء اللہ) پسندیدہ الفاظ اور انداز بیاں پر مشتمل انشائیہ کو پڑھ کر یہ جانا کہ کرۂ ارض کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والے اہلِ علم ہیں خصوصاً عصری علوم پر دسترس رکھنے والے عالم۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ طالبِ دنیا کو علم سکھانا ایسا ہے جیسے کسی رہزن کے ہاتھ تلوار دینا۔ اداریہ نے حسبِ معمول پہلے دکھ بھرے کی خبر سنائی۔ ارفع کریم کے بعد پنجاب کے ہونہار طالب علم 13 سالہ موسیٰ فیروز اور حسنین نے انٹرنیشنل مقابلے میں بالترتیب پہلی، دوسری پوزیشن لے کر پاکستان کو عالمی سطح پر سرخرو کیا جو کام ہمارے ملک کے بڑوں کو کرنا چاہیے وہ ملک کے بچے کر رہے ہیں۔ محترمہ عائشہ فاطمہ کی تحقیق دادا پوتا بنا پلک جھپکائے بغیر پڑھنے والی تحریر تھی، وجاہت اللہ نے جان کی قربانی دے کر ثابت کر دیا کہ ماں باپ کی خواہشات جو اولاد کی بہتری کے لیے ہی ہوتی ہیں کا احترام اولاد پر از حد لازم ہے اولاد وہ بے قابو دریا ہے جس کی آبیاری والدین ہمیشہ اپنے خون سے کرتے ہیں۔ دادا پوتے کا انجام آنکھوں کو بھگو گیا۔ خون سے لتھڑی ہوئی تاریخ کے اوراق کا مطالعہ کیا۔ تف ہے ہمارے ان حکومت پرست حکمرانوں پر جو اسلام کی تبلیغ اور مسلمانوں کی ترقی کے بجائے عیش و نشاط کی دلدل میں دھنستے گئے۔ دنیاوی رشتے کتنے ہی گہرے کیوں نہ ہوں ان میں ایک نہ ایک دن پھوٹ پڑتی ہے۔ خالد اور شہریار کی دوستی میں دراڑ پڑے گی یہ تو سوچا تھا مگر اتنی جلدی اور وجہ عداوت خالد کی بہن کی بے راہ روی بنے گی یہ نہ سوچا تھا۔ انتظار کرانے کے فن میں طاق ناصر ملک کی اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ کشکول حسبِ معمول رہی۔ مجرم لاکھ چاہے جرم کی بہتر سے بہترین منصوبہ بندی کرکے مطمئن ہوجائے مگر جب دستِ خدا حرکت میں آتا ہے تو سب تدبیریں ہاتھوں سے پھسلتی ہوئی ریت کی مانند ہوجاتی ہیں نظارت نصری و دیانت بھیدی کا انجام گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے جیسا رہا۔ بھوک دو قسم کی ہوتی ہے ایک پیٹ کی اور دوسری جنس کی۔ ساحرہ اسی بھوک کی دوسری خطرناک قسم کا شکار تھی محبت کسی اور کے ساتھ، شادی کسی اور کے ساتھ۔ ایسے رشتے منافقت کے رشتے کہلاتے ہیں اور ساحرہ ایسے رشتے کی قائل تھی، والدین کی بے پروائی کے متعلق لکھے ہوئے آخری کلمات ہم سب کے لیے انتہائی توجہ کے متقاضی تھے۔ ایچ اقبال کی انتہائی نازک مسئلے پر لکھی ہوئی تحریر اچھوتی محبت ٹاپ کی تحریر تھی۔ سیاسی طوائفوں کے متعلق لکھی گئی بھٹی صاحب کی کاوش بمقابلہ پڑھنے کے بعد بی بی سی لندن کے چند سال پہلے پاکستانی قوم کے متعلق کہے گئے ریمارکس کہ پاکستانی قوم دنیا کی وہ بے وقوف قوم ہے کہ جس سیاسی جماعت کے اقتدار میں آنے پر خوشیاں مناتی ہے پھر اسی کے جانے پر لڈو بانٹتی ہے۔ نیلا انصاری آپ کا محاوروں والا خط پڑھ کر معلوم ہوا کہ آپ بہترین تخلیقی ذہن کی مالک ہیں۔ قدرت اللہ صاحب اب تک کی فرضی تحقیق و تفتیش کے مطابق سعدیہ بخاری کو تو صبح کی تاریخ بھی یاد نہیں رہتی۔ رمضان پاشا غالباً کسی بھی خوبصورت طرح دار لڑکی کے ساتھ جوان مرد کو دیکھ کر آپ کو اچھا نہیں لگتا ہوگا۔ ہمایوں سعید راج اپریل کے شمارے میں تصویر یاسمین کو آپ کا جواب قابلِ اعتراض اور غیر اخلاقی تھا۔ ہماری دعا ہے کہ آپ کو کئی ہاتھوں میں سے مخلص ہاتھ بھی مل جائے گا۔ بلیک لسٹ عرف کھڈے لائن کو حاضری رجسٹر کا نام دے کر ہمارے رستے زخموں پر پھاہا رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مقصود الحسن طاہر شکریہ آپ نے ہماری عدم موجودگی میں ہمارے طویل خط پر کیے گئے اعتراض کا تسلی بخش جواب دیا۔ دیدی رمشیٰ ونیل ہم بھی ہاتھ جوڑ کے عرفان شہزاد کی طرح منتیں کرتے ہیں کہ لوٹ آؤ، پلیز غصہ تھوک دو۔ عرفان شہزاد وادیٔ تنہائی کو کھانے کی طشت میں رکھ کر پڑھ رہے ہو جو مزہ آرہا ہے۔ عمران علی ہمارا خیال ہے کہ تفسیر عباس چارپائی پر بیٹھ کر تبصرہ لکھتے ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ گہرائی میں جاکر لکھتے ہیں۔ طاہرہ گلزار کے متعلق آپ کے خیالات بالکل غلط ہیں۔ راجا ثاقب نواز ثاقب غالباً گندم کی کٹائی میں مصروف تھے جو تبصرہ طویل تحریر نہ کرسکے۔ طاہرہ گلزار آپ کو اپنے مسلمان ہونے پر شرم نہیں فخر کرنا چاہیے۔ ماہا ایمان خط تو آپ کا واقعی ویلڈن ویلڈن تھا۔ طاہرہ یاسمین، تفسیر عباس، قدرت اللہ، ماہا ایمان کے شاندار تبصرے پڑھنے کے بعد سرد مہری دکھائی دیں۔ بابر عباس گزشتہ ماہ سے آپ کے تمام نمبر آف جا رہے ہیں۔"

☩ [illegible] اویس احمد خان، ناظم آباد سے تبصرہ کر رہے ہیں "ماہِ مئی کا سسپنس خوبصورت رنگوں اور کہانیوں سے سجا عنوان محبت سے مزین ٹائٹل [illegible] اس کے جذبوں کے ترجمان دو کبوتر باہم راز و نیاز تھے۔ انشائیہ سے بالکل اتفاق کرتے ہوئے دوستوں کی انجمن میں پہنچے جہاں سب [illegible] قدرت اللہ نیازی نظر آرہے تھے، مبارک باد قبول کریں۔ مسافر سے ابتدا کی، مسافر اچھی کہانی ہے اور اپنی دلچسپی کے لحاظ سے سرفہرست [illegible] شہریار کی جان کے درپے اس کا ہی دوست ہوگیا۔ آگے کی قسط کے بے چینی سے منتظر رہیں گے۔ کشکول بھی کامیابی سے جاری ہے، انوار [illegible] میں کوئی کمان نہیں۔ جس کا ثبوت کشکول ہے کہ ایک ہی نشست میں پوری قسط پڑھنے میں مزہ آتا ہے۔ دادا پوتا بھی اچھا تاثر لیے ہوئے تھی۔ [illegible] چالاک مجرم کی کہانی تھی مگر دنیا کا بڑے سے بڑا مجرم کتنا ہی چالاک ہو آخر اپنی خامی سے پکڑا جاتا ہے۔ فصل اجڑ گئی ساجد امجد کی تاریخی رزم شاہی [illegible]۔ شوق مردانگی میں جرم کی راہ پر چلنے والے طمع پرست ڈاکٹر کی کہانی تھی۔ جو دولت کے حصول میں جائز اور ناجائز کے واضح فرق کو بھول گیا۔ [illegible] پسند آئی۔ جہاں ایک عورت کی نفسیاتی کہانی تھی، صحیح کہا ہے کسی نے کہ عورت کی نفسیات کو کوئی نہیں سمجھ سکا۔ رقیب، کمپیوٹر کی انسان سے رقابت کی کہانی تھی۔ [illegible] میں منتخب اشعار معیاری اور اچھے تھے۔ نظارت نصری کی بھیدی بھی اچھا تاثر لیے تھی۔ اثر نعمانی کی معروف لاش بہتر تھی جہاں ایک جاسوس نے [illegible] دوست کو قتل کے الزام میں پھنسنے سے بچالیا۔ بمقابلہ عبدالرب بھٹی کی تحریر اچھی تھی۔ روحانی سلسلہ حضرت داؤد علیہ السلام بہت اچھا سلسلہ تھا جس میں داؤد علیہ السلام کے حالات و واقعات سے آگاہی ہوئی۔ شیریں زہر بھی اچھی تحریر تھی جہاں ایک بوڑھی خاتون نے اپنی زمین ہڑپ کرنے والی اپنی پڑوسن کو بڑے [illegible] طریقے سے ہلاک کردیا۔ سب سے منفرد اور خوبصورت کہانی اچھوتی محبت تھی جو آخری صفحات کا خاصا ہے اور ایچ اقبال کی تحریر کی پہچان، ایسی محبت کو شاید دنیاوی محبت کہنا زیادہ بہتر رہے گا۔"

☩ سعدیہ بخاری، ضلع اٹک سے محفل میں شریک ہوئی ہیں "شمارہ 18 تاریخ کو ملا۔ سرورق دیکھ کر ایک پرانا گانا یاد آگیا "سانولی سلونی سی محبوبہ" محفل میں آپ کے [illegible] قدرت اللہ نیازی صاحب براجمان ہیں۔ بہت بہت مبارک ہو بھئی، آپ کا تبصرہ شاندار تھا اور آپ نے جو مشورہ دیا ہے تو عرض یہ ہے کہ میرا [illegible] ہے۔ ماہا سسٹر ویلکم بیک ڈیئر آپ کی واپسی تو نازنین کی واپسی ہوگئی ہر کسی کو [illegible] ہے۔ طاہرہ گلزار پیاری سسٹر میں نے تو مذاق کیا تھا آپ تو [illegible] لیکن کمیل میں آپ کی طرح اسکول سے نہیں اور عمر کو رہنے [illegible] کہاں گئیں۔ طاہرہ یاسمین سو کیوٹ تمہارا معصوم سا تبصرہ اچھا لگا۔ تفسیر عباس آپ سے پوچھنا تھا [illegible] اس بار تبصروں میں ماہا ایمان، قدرت اللہ نیازی اور جعفر حسین کے تبصرے شاندار تھے باقی دوستوں کے تبصرے بھی [illegible] کہانی پڑھنے کا آغاز خلافِ معمول مسافر سے کیا پہلی دو اقساط کی طرح تیسری قسط بھی بھرپور تھی لیکن لاسٹ میں جو سنسنی خیز ایکشن ہے [illegible] خیال میں شہریار کا خواب ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ کیا سامنے آتا ہے۔ اچھوتی محبت کی آخری چند سطریں بہت متاثر کن تھیں پوری کہانی کا نچوڑ ان میں تھا لیکن کہانی کے واقعات و الفاظ کو بہت کھل کر بیان کیا گیا ہے۔ مرزا امجد بیگ اس بار بھی دلچسپ کیس لے کر حاضر تھے۔ ملازم اصغر بلوچ سے ان کی جرح نے کافی محظوظ کیا۔ تاریخی واقعات میں خلجی خاندان کا حکمران علاؤ الدین خلجی حکمران تو بلاشبہ بہت زبردست ثابت ہوا لیکن رشتوں کا لحاظ اس نے نہیں کیا، ہماری تاریخ کی یہی سب سے بڑی برائی ہے۔ سلسلہ وار کہانی کشکول میں آکٹوپس کی مکاریاں اور دہشت گردیاں جاری ہیں۔ مختصر کہانیوں میں نئی رائٹر عائشہ فاطمہ کی دادا پوتا، ٹاپ پر رہی کہانی حقیقت پر مبنی محسوس ہوئی۔ دادا پوتے کا کردار بہت پاورفل تھا۔ ویلڈن عائشہ فاطمہ۔ دوسرے نمبر پر رہی بمقابلہ، ہمارے دل کی آواز۔ یہاں نہ جمہوریت پوری طرح کامیاب ہے نہ آمریت۔ یہ ہوسکتا ہے کہ دونوں کی اچھی اچھی خصوصیات کو ملا کر ایک نئی طرز متعارف کرادی جائے۔ دوراہا میں آرزو کی آرزو پوری ہونے کی سب سے زیادہ خوشی مجھے ہوئی اور جو کچھ آصف کے ساتھ ہوا بالکل ٹھیک ہوا، ماہا کا فیصلہ درست تھا۔ شوق مردانگی پڑھ کر یقین نہیں آیا کہ مغرب میں بھی لوگ اتنے دھوکے سے اور اتنے عرصے تک غیر قانونی کام کرسکتے ہیں اور وہاں کے لوگ بھی اس طرح بے وقوف بن سکتے ہیں۔ شیریں زہر میں سب سے خوبصورت بات وہاں کے مقامات اور درختوں کا ذکر تھا، نیوزی لینڈ کا ذکر کسی کہانی میں غالباً پہلی مرتبہ پڑھا ہے۔ دیگر کہانیوں میں رقیب، بھیدی اور معروف لاش بس درمیانے درجے کی کہانیاں تھیں۔ کم تر نمبر زیادہ اور معیاری تھیں اشعار میں دوسرے نمبر والا ضیاالحسن گیلانی اور کمال انور کا انتخاب بہت اچھا تھا۔ اپنے تبصرے میں اس افسوس ناک حادثے کا ذکر ناگزیر ہے جو دو دن پہلے اسلام آباد میں ایئرلائن کے طیارے کو پیش آیا جس پر ہر آنکھ اشکبار ہے چند دن کے فرق سے یہ دوسرا بڑا سانحہ ہم پر گزرا۔ پہلا سیاچن کا جس کے جوانوں کی تلاش تاحال جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام جاں بحق افراد کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے۔" (آمین)

☩ رمضان پاشا، گلشن اقبال کراچی سے چلے آرہے ہیں "مئی 2012ء کا سسپنس مقررہ تاریخ کو بازار میں آگیا، حسبِ روایت سرورق اچھا تھا، فہرست بھی اچھی تھی۔ اس بار تبصرہ لکھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا سبب اس کا یہ ہے اسلام آباد میں ہونے والا خوفناک اور المناک طیارہ حادثہ جس میں بہت سی قیمتی جانیں ضائع ہوگئیں، جاں بحق ہونے والوں کے گھر میں کیا حالت ہوگی یہ سوچ کر ہی دل لرزاں اور ذہن ماؤف ہوگیا۔ ٹی وی دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ایک صاحب قمر عباس نام کے اپنے صاحبزادے کی علالت کی وجہ سے اس طیارے میں نہیں گئے، کیا یہ صاحب ہمارے اپنے قمر عباس ہیں سسپنس والے؟ (جی نہیں وہ اس طیارے میں سوار نہیں تھے۔ ان کی خیریت دریافت کرنے کا شکریہ۔ اللہ حادثے میں جاں بحق ہونے والوں کی مغفرت فرمائے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ آمین) آپ کے خط میں حسبِ عادت سب سے پہلے آپ کا اداریہ پڑھا، حالاتِ حاضرہ پر لکھا یہ اداریہ قابلِ فخر تھا، داد دیتا ہوں۔ اول نمبر آنے والے قدرت اللہ نیازی صاحب کا تبصرہ اچھا تھا مبارکباد۔ دیگر تبصروں میں ہمایوں سعید راج، جعفر حسین، طاہر الدین بیگ، ماہا ایمان کے تبصرے پسند آئے۔ اشعار کی محفل میں کورنگی والے محمد اقبال، حسنین عباس بلوچ، طاہرہ یاسمین، فرمان اللہ کاکڑ کے اشعار قابلِ داد تھے۔ تاریخی کہانی فصل اجڑ گئی۔ علاؤ الدین خلجی کے دور کے راجپوت راجاؤں کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوئیں جو پہلے نہیں معلوم تھیں، دوشیزہ دیولدی کے بارے میں تو میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ شوق

کی راہ پر گامزن کر رہے ہیں۔ تمام دوستوں سے اپیل ہے کہ بھوجا ایئر لائن کے حادثہ میں جاں بحق ہونے والوں کے لیے دعائے مغفرت کریں۔ اللہ سب پر اپنی رحمت خاص فرمائے۔ آمین۔ اب آتے ہیں یاروں کی من موہنی محفل میں۔ اتنے سارے خطوط یقین نہیں آرہا۔ تفسیر بھی آتے ہی کمال کر دیا ہے لگتا ہے آنٹی پر کوئی دم درود کر دیا ہے۔ قدرت اللہ نیازی دوسروں کا حق مارتے ہوئے اسٹیج پر جلوہ افروز تھے مبارکاں۔ سرورق پر ہر کوئی اپنی ہی بونگیاں مار رہا تھا۔ محاوروں والے قاری کا خطوط سے پتا چلا گیا (شکریہ) قدرت اللہ صاحب تفسیر عباس کے نادر مشورے کام آئے عمل بھی ہو گیا۔ رمضان پاشا بھی یاد کرنے کا بہت شکریہ۔ ہمایوں، بھئی آپ تو ناراض ہو گئے ہیں۔ بھئی، میں نے جب محفل میں پہلی بار شرکت فرمائی تو جناب آپ کی سدھرنے اور بگڑنے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ہماری طرف سے معذرت اگر آپ کے دل کو ٹھیس پہنچی ہو۔ ملک صاحب کی ڈائری آپ کے پاس تو نہیں ہے۔ توبہ کے کافی قاری ہیں جو حاضری لگوا کر بھاگ جاتے ہیں۔ طاہرہ گلزار تفسیر عباس کی کتاب کہاں ہے ہمیں بھی ورشن کروائیں۔ ماہ جبین لیڈی پنجاب پولیس آج کل بڑی اڑان میں ہے اپنا خیال رکھیے گا کہیں آپ کی دوڑیں نہ لگ جائیں۔ یہ بونگی والا معاملہ کیا ہے؟ طاہر صاحب ذرا اس پر روشنی ڈالیے گا۔ احمد خان تو حیدی صاحب کچھ نادر مشوروں کے ساتھ جلوہ افروز تھے۔ سب سے پہلے کشکول پڑھی اس بار تو بہت سنسنی خیز قسط ثابت ہوئی دیکھو سراج صاحب لیاقت حسین کو ساتھ رکھ کر کیا کرتے ہیں مسافر بھی سنسنی خیز مراحل میں داخل ہو گئی ہے۔ شاہ جی کو رشتہ کے لیے ہاں کر دینی چاہیے تھی۔ شہریار بھی بے خیالی میں کہاں پھنس گیا اس سسپنس کو ختم کرنے کے لیے اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ طاہر جاوید مغل صاحب کافی عرصہ بعد ادھوری داستان کے ساتھ حاضر ہوئے شکریہ طاہر صاحب۔ کچھ سسپنس کے لیے خاص ٹائم نکال لیں (پلیز) عائشہ فاطمہ کی کہانی واوا پوتا بڑی اچھی کہانی تھی۔ اولاد والدین کے لیے آزمائش ہے لیکن اولاد کو اپنی مرضی سے اجتناب کرنا چاہیے۔ مرزا امجد بیگ کی کہانی مجرمانہ ذہن۔ انسان کو ہمیشہ نیچا دکھاتا ہے جہالت ہمیشہ انسان کو لے ڈوبتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی کہانی مقابلہ تو شروع ہی سے سیاست کا مسئلہ چلا آرہا ہے جب عوام حکومت سے بے بس ہو جائیں تو انہیں سڑکوں پر ضرور آنا ہے۔ حضرت داؤد کے حالات پر رضوانہ ساجد کی لکھی تحریر اختتام پذیر ہوئی۔ اگلا سلسلہ حضرت سلیمان کی سوانح حیات ہونی چاہیے (یعنی جناب کی فرمائش پوری ہوگی) ایچ اقبال کی کہانی اچھوتی محبت واقعی اچھوتی ثابت ہوئی کہیں انسان کو محبت مار دیتی ہے اور کہیں دولت۔ قدرت اللہ نیازی، مقصود احسن اور ماہا ایمان کے تبصرے اچھے لگے۔ شاعری میں ابرار احمد، صوبیدار (ر) انوار بخش، رمضان پاشا اور ارسلا افضل کے شعر پسند آئے۔"

✠ حمیرا رضا، لاہور سے محفل میں شریک ہوئی ہیں "مئی کا تازہ ترین شمارہ بالآخر انتہائی تگ و دو کے بعد مجھ تک پہنچ ہی گیا۔ بہت دن محفل سے دور رہنے کے بعد اب دل کرتا ہے کہ ایک بار پھر اس کا حصہ بنا جائے ویسے کمال ہے، اتنے دن کی غیر موجودگی نے اس محفل پر کوئی اثر ہی نہیں ڈالا یقیناً یہی دستور زمانہ ہے مگر دل کے اندر کچھ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا (ایسی بات نہیں ہے، محفل کے اکثر ساتھیوں نے آپ کی کمی محسوس کی اور لکھا بھی مگر جگہ کی کمی کے باعث شائع ہونے سے رہ گیا) ارے یہ تو بتائیں حسنین عباس بلوچ بھائی، میں تو شادی شدہ زندگی کی ڈھیروں مصروفیات کے جنگل میں بھٹک ہی رہی ہوں، آپ اتنے ماہ سے کہاں غائب ہیں؟ میرے اچھے بھائی، آپ کی غیر موجودگی مجھے اور میرے میاں کو قطعاً پسند نہ آئی (حسنین بلوچ فوراً حاضر ہوں) ارے صاحب حیران مت ہوں میرے شوہر آپ تمام دوستوں کے خطوط انتہائی دلچسپی سے سنتے ہیں۔ میں پڑھ کر سناتی ہوں اور کون بھلا۔ اب تمام موجود اور میری طرح مختصر اور طویل عرصے سے غائب تمام ہی دوستوں کو بہت سلام اور مصنفین سے معذرت کہ ان کے قلم سے نکلے ہوئے انمول لفظوں کے خزانے جو کہ وہ کہانیوں کی صورت میں ڈھال چکے ہیں ان پر تبصرہ انشاء اللہ اگلے ماہ کروں گی۔ خدا اس ادارے کو مزید ترقی دے۔ آمین ثم آمین۔" (ہمیں آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا)

✠ طاہر الدین بیگ، میر پور خاص سے تبصرہ کر رہے ہیں "موسم کی تبدیلی نے لوڈشیڈنگ کی ستائی ہوئی مظلوم خلقت کو زندگی کی چند خوشگوار ساعتیں عطا کر دیں ورنہ تو لوڈشیڈنگ کے عذاب نے زندہ درگور کر دیا ہے (درست فرمایا آپ نے) علاوہ ازیں ہمارے لیڈران کے کان اور پیٹ میں درد کی وجہ سے ہڑتالوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ، اف ..... (سندھ میں رہنے والے قارئین اس سے خوب واقف ہیں) لیکن ان بڑے لیڈران کو اس بڑے سانحہ پر کسی بھی قسم کے احتجاج کا خیال بھی نہ آیا کہ جس سانحہ نے قیمتی جانیں لے لیں۔ ناکارہ جہاز فضا میں اڑنے کی اجازت..... ہم سسپنس کے توسط سے مرنے والوں کے لواحقین کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومین کی مغفرت کرے۔ آمین اور ہمارے حکمرانوں کو نیک ہدایت دے، آمین (ادارہ اور محفل کے تمام اراکین بھی آپ کی دعا میں شامل ہیں) آپ کے خط میں مجھے ماہا ایمان کے لیے حیرت نہیں خوشگوار مسرت محسوس ہوئی۔ اس مرتبہ بھی ساری خواتین بڑے ہی خوبصورت تبصروں کے ساتھ اپنی اپنی موجودگی کا بھرپور احساس دلاتی رہیں۔ بھئی طاہرہ گلزار صاحبہ انکل تو نہ کہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا آپ اس جملے کی وضاحت بھی کر دیتیں۔ انشاء اللہ آئندہ لکھتے وقت خیال رکھوں گا کہ کسی کی تحریر سے مماثلت نہ ہو۔ اب چلتے ہیں مسافر کی طرف، موجودہ قسط میں ڈبا پیر کا ڈبا گول کرنے والی جاسوسی ٹیم کا تعارف حاصل ہوا۔ ملک صاحب عشق اور محبت کے گرداب میں ہی رہے۔ زیبان کا محبت نامہ ڈاکٹر صاحب کے نام۔ بلو کا جنون شہریار کے لیے۔ اور شہریار کی جستجو عاشی کے لیے۔ بالکل کمال مرحوم کی فلموں کی طرح ایک تکی ہارے اگر عاشی کے دروازے پر جاتا اور تعارف حاصل کرتا۔ لیکن مسافر کے آخری منظر نے تو چونکا دیا ایک جگری دوست کے ہاتھوں دوسرے دوست کی..... اللہ خیر کرے۔ بڑی بے چینی سے اگلی قسط کا انتظار ہے۔ کشکول زبردست کشمکش اور خوبصورت اتار چڑھاؤ کے ساتھ اپنے پڑھنے والوں کو سحر میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔ سراج اور تغریب کے ساتھ لیاقت حسین کے ہمزاد کا کردار بہت ہی زبردست ہے۔ امید ہے آگے چل کر یہ کہانی مزید ہنگامے برپا کرے گی۔ کون کس کو مات دیتا ہے؟ کیا شبنم نکل پائے گی، شیخ حامد کے جال سے؟ افضل خان کا کیا بنے گا، کیا سراج اور تغریب لیاقت حسین کے ہمزاد کی مدد سے اپنے دیکھے ان دیکھے دشمنوں کو زیر کر پائیں گے؟ انتظار..... ایچ اقبال کی اچھوتی محبت خوب رہی جتنی دلچسپ کہانی انجام بھی بڑا ہی زبردست۔ ساحرہ اور احسن خوبصورت کہانی کے دلچسپ کردار۔ ایچ اقبال صاحب کی یہ کاوش عرصہ یاد رکھی جائے گی۔"

✠ ماریہ علی بھٹو، شکار پور سے محفل میں شامل ہوئی ہیں "سب سے پہلے اللہ رب کریم سے نگران اعلیٰ معراج رسول کی صحت و زندگی کے لیے دعا گو ہوں (جزاک اللہ) زندگی بھی عجیب کروٹیں بدلتی ہے کبھی خوشیوں کے جھولے میں ایسے جھلاتی ہے کہ اپنا ماضی، حال اور مستقبل ایک لگتا ہے، کبھی تپتی دھوپ میں ایسے کھڑا کر دیتی ہے کہ اپنے وجود کا بھی احساس نہیں ہوتا۔ مجھے یاد ہے جب میں میٹرک کلاس میں تھی تو پہلی بار سسپنس میں محمد بن قاسم کی تاریخ

[illegible] ای دن سے سسپنس سے دوستی ہو گئی آج بی اے فائنل میں ہوں اور دوستی نبھا رہی ہوں (خوش رہیے) اللہ کرے یہ ساتھ یونہی برقرار رہے (آمین) مئی کا شمارہ جیسے ہی میری نظروں سے ٹکرایا تو خوشی سے اس کی طرف لپکی، سب سے پہلے ملاقات جون صاحب سے ہوئی جن کی کچھ باتیں تو [illegible] میں آئیں، باقی اوپر سے گزر گئیں پھر قارئین کی محفل میں چلے گئے۔ بہت دنوں بعد دلی خوشی ہوئی پاکستان کے طلبا پر۔ مجھے پہلے بھی فخر تھا اپنے [illegible] وطن پر اب اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔ کہانیوں قصوں کو چھوڑ کر محفل شعر و سخن میں تشریف لے گئے، واہ واہ مزہ آگیا۔ سب سے اچھا شعر محفل کا یہ لگا۔

> ہم خون کی قسطیں تو بہت دے چکے ہیں لیکن
> اے خاک وطن، قرض ادا کیوں نہیں ہوتا

[illegible] سسپنس زیر مطالعہ ہے۔" (محفل میں شرکت کر کے غائب نہیں ہو جائیے گا۔ اللہ آپ کو ہر امتحان میں اور خاص طور پر بی اے میں بہت اچھے نمبروں سے [illegible] کرے۔ آمین۔ کہانیوں پر تبصرے کا انتظار رہے گا)

✠ لیبا انصاری، بہاولپور سے محفل میں چلی آرہی ہیں "سب سے پہلے تو آپ کا شکریہ کہ آپ نے میری الٹی سیدھی تحریر پڑھ کر بھی خط شائع کر [illegible] یقین کرے کہ آج مجھے اپریل 2012ء کا سسپنس ملا ہے۔ جی ہاں، گھر کی شفٹنگ کے باعث فرینڈز لائبریری کہیں دور رہ گئی ہے اور ہم یہاں [illegible] آج، وہاں چکر دوبارہ بھی لگا یا مگر مئی کا شمارہ نہیں ملا۔ وہاں تھے تو 5 روپے دے کر رسالہ پڑھ لیتے تھے۔ اکثر ساتھیوں کا مشورہ ہے، سالانہ خریدار [illegible] جاؤ، بھئی اتنی اگر نہ ہو اسٹوڈنٹ بچی کی تو کیا کرے بیچاری۔ اتنا کسی سے ہوتا نہیں کہ اس مشورے پر خود ہی عمل کر لے۔ چلو ایسا کر لیں کہ جب رسالہ آئے [illegible] وقت دے کر دو گھنٹے بعد لے لیں اور ساتھ ہی میرا خط بھی لے جائیں۔ جاتے جاتے وہ پوسٹ کر دیں (بھئی محفل کے ساتھیوں میں ہے کوئی ایسا جو [illegible] کر سکے) پورا رسالہ بہت مزے کا ہے، سب ساتھیوں کو سلام۔ ماہا جی اگر آپ کا بہاولپور آنا ہو تو مجھے ضرور مطلع فرمائیں۔ انکل جی، میں بھی کہانی لکھتا [illegible] ہوں، وقت نہیں نکال پا رہی۔ اب اگر بہاولپور کے کسی ساتھی کو معلوم ہو کہ یہ دفتر کہاں پائے جاتے ہیں تو پلیز مجھے بتائیں کیونکہ میری زندگی تو [illegible] لائبریری سے گھر اور گھر سے پھر اسکول اور اب تو تین سال ہوئے اسکول چھوڑا اور 1 سال پہلے گھر تبدیل کیا تو لائبریری [illegible] سال جلدی لوٹ کر تفصیلی خط لکھوں گی۔ میری ایک درخواست ہے کہ اگر بہاولپور کے کسی بچے/بچی کے پاس بی اے کی [illegible] دوں گی (ہماری محفل کے ساتھیوں سے درخواست ہے کہ اگر کسی کے پاس کتابیں ہوں تو وہ اور لیبا آپس میں مکمل پتے اور [illegible] اور وہ محبت باقی۔"

✠ [illegible] مین، ضلع سرگودھا سے محفل میں رونق افروز ہوئی ہیں "اس ماہ کا شمارہ توقع سے دو دن پہلے ہی مل گیا تھا۔ 16 اپریل کی سہ پہر کو شہزاد [illegible] اس ماہ کا سرورق بہت دلکش تھا محفل میں پہنچے تو اپنا خط دیکھ کر خوشی کے ساتھ حیرت بھی ہوئی۔ ہمارے پڑوس میں کچھ عرصہ بعد دیگرے دو تین قتل [illegible] کے بعد کچھ خاندانی وقاتیں ہو گئیں، شہزاد و بھائی ٹرک چھوڑ کر گھر بیٹھ گئے۔ میرا اپنا بیمار ہے پریشانی کیا بتاؤں عذرا آنٹی آپ میرے لیے [illegible] (اللہ آپ کی تمام پریشانیاں دور فرمائے۔ آمین) قدرت اللہ نیازی جی مبارک ہو کرسی صدارت کی آپ کا تبصرہ شاندار تھا۔ حسب معمول ہمایوں [illegible] انکل دوست کہا کہ خلوص ہاتھ تھامنے کو مل جائے تو قدم سنبھلتے دیر کہاں لگتی ہے۔ شیر علی خان، خانیوال آپ کا تبصرہ مختصر مگر اچھا تھا باقاعدگی سے لکھا [illegible] مسکین بھوانہ، آپ کا تبصرہ جاندار تھا بہت دن بعد لکھا آپ نے مگر آپ کی اس بات سے دکھی ہوں کہ آپ نے میری وجہ سے اتنا عرصہ محفل میں [illegible] دی۔ طاہر الدین بیگ، تصویر اسمین کو محفل میں پا کر حیرت کس بات کی بھئی کیا گدھے کے سر پر سینگ نکل آئے؟ عمران علی، جھنگ شکریہ اس بات کا کہ [illegible] آپ نے لکھا کہ فرحت، طاہرہ نے سچ بات کی۔ طاہرہ گلزار آپ نے ڈاکٹر وسیم کو لکھا کہ آپ میں ایسا ہے کیا کہ حسینہ آپ کو دیکھ رہی تھی تو سسٹر ایسا نہ [illegible] ہم مہتاں یہ بڑی وڈی شے ہے، کیا سمجھیں؟ اور سسٹر آپ نے لکھا کہ سازشی مرد ہوتا ہے تو ڈیئر یہ غلط بات ہے نہ سارے مرد ایک جیسے ہوتے [illegible] ماہا ایمان، جی سوری مائنڈ مت کرنا مگر مجھے آپ کی اس بات سے بالکل اتفاق نہیں کہ قدرت اللہ کی باتیں عمر رسیدہ تھیں، وہ تو بہت شاندار تبصرہ [illegible] آپ دیکھی ہی چکی ہو کہ ثمرہ احمد اور عمیرہ احمد کو سسپنس میں لکھنے کے لیے کافی ووٹ مل چکے یا کچھ اور ووٹ بھی چاہئیں؟ اور ایک بات آپ [illegible] اس بار آپ نے میرا پورا خط شائع نہ کیا تو میں نے خط لکھنے کی چھٹی کر دینی ہے پکی پکی کسی کے اصرار پر بھی خط نہیں لکھوں گی قسم سے [illegible] الطاہری بات ہے اور ناراض ہو جانا بھی اچھی بات نہیں ہوتی۔ دوسروں کی خوشی میں اپنی خوشی تلاش کریں تو اللہ بھی ہم سب سے خوش ہوتا [illegible] ناموں سے نہیں پکار سکتے تو برے ناموں سے بھی مت پکارو، قارئین کیا آپ میری اس اپیل سے اتفاق کرتے ہیں؟ (ہم آپ سے اتفاق [illegible] نام بگاڑنا اچھی بات نہیں) اب کچھ بات ہو جائے کہانیوں کی تو اس دفعہ ذرا معمول سے ہٹ کر پڑھی۔ اپنے پسندیدہ رائٹر ایچ اقبال کی اچھوتی [illegible] میں تھی مگر ایچ اقبال کا نام دیکھ کر رہا نہیں گیا۔ اب کیا تعریف کروں اس تحریر کی ایسے لفظ ہی نہیں مل رہے کہ لکھوں، بیان اپنی تعریف آپ [illegible] کردار بہت مضبوط اور اینڈ تک۔ کہانی کے آخر میں عشرت اعوان کے انکشاف نے چونکا دیا کہ آغا نصیر کی دونوں بیویوں کو اس نے مارا تھا۔ پھر پڑھی [illegible] اچھی تحریر تھی واقعی، عجیب تھی، آصف کو ماہا سے اپنی محبت کا اظہار کر دینا چاہیے تھا۔ پھر کشکول پڑھی، خاصی تیزی سے بڑھ رہی ہے ہر قسط شاندار [illegible] اور مسافر تو ہر سطر پر سنسنی خیز ثابت ہو رہی ہے۔ دل چاہتا ہے ساری قسطیں اکٹھی شائع ہوں اور پڑھ ڈالوں۔ رقیب تو بہت بور کہانی تھی پڑھ کر نام [illegible] بھلا ایسا بھی کبھی ہوا ہے کہ کمپیوٹر انسان سے باتیں کرے؟ اس کہانی کا نہ سر نہ پیر بس فضول (تیزی سے ترقی کرتی ٹیکنالوجی کو دیکھتے ہوئے کچھ بعید [illegible] میں کمپیوٹر یہ سب کرنے لگے۔ آج سے کچھ سال پہلے کون کہہ سکتا تھا کہ ہر شخص جیب میں فون لے کر گھوم رہا ہوگا) معروف لاش اچھی تحریر تھی۔ [illegible] قتل کے الزام سے۔ دادا پوتا بہت دلچسپ تھی مگر اس کے انجام نے چونکا دیا کہ ہوا کہ انا پرست وجاہت اللہ خان بھی اینڈ میں [illegible] کے ہاتھوں مارا گیا۔ حیدی اور فضل احمد کی یہ تحریریں بھی عمدہ تھیں۔ باقی شعروں کے انتخاب میں نمبر ون شعر تھا فرمان اللہ کا کرتو شکی سے، [illegible] شہباز اکرم لونی، ظفر اقبال ظفر اور نذیر احمد بزمی کے اشعار بھی بہت خوبصورت تھے۔"

تصویر الحسن، اوکاڑہ سٹی سے تبصرہ کر رہی ہیں "میرا دل بہت اداس ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی گہری کھائی میں چلا گیا ہے دل۔ پہلے بہن کی رخصتی اور اب جو یہ طیارے کا حادثہ پیش آیا ہے مجھے بہت دکھ ہوا۔ خدا اس حادثے میں شہید ہونے والوں کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ آج کل دل بالکل کسی چیز میں نہیں لگ رہا۔ اس دفعہ سسپنس کے ٹائٹل پر سوائے دو کبوتروں کے کچھ بھی اچھا نہیں لگا۔ آپ کے ذریعے جو پاکستانی طلبہ کی کامیابی کا علم ہوا پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ خدا پاکستان کا نام پوری دنیا میں اچھے معنوں میں اور بھی روشن ہو، آمین۔ صدارت کی کرسی پر محمد قدرت اللہ نیازی صاحب براجمان تھے، مبارک ہو آپ کو نیازی صاحب میں میل نہیں فی میل ہوں۔ یاد رکھیے گا اور خیر مبارک۔ رمضان پاشا آپ کا تبصرہ اچھا تھا، ہمایوں سعید راج آپ کو تو لگتا ہے آج کل شادی کا شوق چرایا ہوا ہے۔ اگر آپ کے والدین بھی سسپنس یا جاسوسی شوق سے پڑھتے ہیں تو ان سے التماس ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے ہاتھ جلدی ہی پیلے کر دیں۔ ویسے اس دفعہ آپ کے خط سے جلنے کی شدید بو آ رہی تھی۔ شیر علی خان آپ ہماری بھائی کا اپنا نام نہ خراب کرنے دیتا۔ جعفر حسین یہ کیا رپورٹ بتا دی آپ نے، لگتا ہے کہ سروے صحیح تھا میرا خود کا دل بہت اداس ہے۔ پاکستان نے تو اداسی کے معاملے میں چوتھے نمبر پر آنا ہی تھا۔ ذیشان فیروز میری خوشی میں خوش ہونے کا بہت شکریہ۔ یہ آپ دوستوں کا خلوص ہی ہے جو کہیں بھی جانے نہیں دیتا۔ کاش کوئی اس معیاری لڑکی سے بھی پوچھے کہ وہ قربانی انسان ہمایوں سعید راج کا ساتھ قبول کرے گی کہ نہیں۔ اتنا اچھا نام ہے طاہرہ یاسمین نے نام بدلا تو بدلا آپ خود اپنا نام بھی شہزادہ ٹیڈی شو کر رہے ہیں۔ ایم اے چودھری بزرگ ہی بنانا تھا تو آنٹی کی جگہ نانی یا دادی تو لکھ دیتے کچھ عزت ہی رہ جاتی۔ آپ سے گزارش ہے کہ آئندہ مجھے بزرگ ذرا ینگ والا بنایا کریں اور ہاں چودھری بیٹا تمہارے منہ سے فیڈر لگا یا نہیں۔ طاہر الدین مجھے دیکھ کر کیوں حیرانگی ہوئی آپ کو وجہ تو بیان کر دیتے۔ عمران علی مبارک باد اور دعاؤں کا بہت شکریہ۔ راجا اور نواز ثاقب آپ لوگ تو میرے بڑے ہیں۔ طاہرہ گلزار اگر آپ سنجیدگی سے بتا رہی ہیں کہ عون عباس، تفسیر عباس کے ڈھائی سال کے بیٹے کا نام ہے تو طاہرہ یاسمین بھی کہیں آپ کی رشتے دار نہ ہوں کیونکہ دونوں ہم نام ہیں نا۔ اور یہ بیٹا گجرات کہاں چلا گیا۔ ماہا ایمان مبارک باد کے لیے شکریہ۔ یار بہت زبردست تبصرہ تھا تمہارا، سب کی خوب ٹانگ کھینچی تم نے۔ طاہرہ یاسمین آپ نے ماہا ایمان کی زیادہ تعریف نہیں کر دی؟ مقصود الحسن طاہر آپ کی خوشی کا بہت شکریہ آپ کے ڈھول کی آواز مجھے یہاں تک آ رہی ہے۔ ویسے یہ ایک بات بتائیں کہ آپ تمام دوستوں کو مجھ میں اور ماہا ایمان میں کیا بات مشترک لگتی ہے۔ ویسے ماہا سن لیں۔ ہم دونوں ایک ہی ہیں۔ اب یہ بات ہم نے سب پر ثابت بھی کرنی ہے کیا خیال ہے آپ کا اس بارے میں؟ کشکول واقعی بہت اچھی ہے۔ لیاقت حسین اب یقیناً جاکی کی جان بچائے گا۔ آئندہ قسط کا انتظار رہے گا۔ مسافر میں خالدہ نے شہریار کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ شہریار بچ تو جائے گا مگر دونوں دوستوں کی دوستی میں فرق آئے گا یا نہیں یہ آئندہ قسط میں ہی پتا چلے گا۔ بھیدی میں ایڈم اور جینڈ دونوں کے جرم کو ان کے بیٹے ایڈگر نے کھول دیا۔ محفل شعر و سخن میں کنول زریں، طاہرہ یاسمین، محمد عزیز، امتیاز احمد اور ساگر ٹکوکری کی چوائس اچھی لگی۔" (کہانیوں پر اتنا سا تبصرہ.....؟)

احمد خان توحیدی، پاکستان اسٹیل مل کراچی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں "انتسابیہ: آخری المیہ موجودہ وطن عزیز کے حالات، حالیہ عدالت عظمٰی کا فیصلہ اور ڈیکٹران کی بغاوت۔ اقبال کے خواب والے پاکستان پر معراج رسول جیسے باضمیر قلمی تڑپ والے گم سم بکتے کے عالم میں نہ ہوں تو کیا کریں؟ قدرت اللہ نیازی کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ تبصرہ گڈ، ہمیں بادام کھانے کا مشورہ دیا آج 27 اپریل تک مارچ کی تنخواہ بھی نہیں ملی۔ روٹی ملے تو بھی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر۔ بادام بہت مہنگے۔ رمضان پاشا، ہمایوں سعید راج، شیر علی خان نے اچھے تبصرے لکھے۔ شبیر احمد بھٹی بہاولپور کیا واقعی الیاس سیتا پوری کی رحلت کا علم نہ تھا؟ جعفر حسین بھوانہ شریں سعید جیسے ذہین لوگوں کو جاگیردار ٹولہ کب برداشت کرتا ہے؟ ذیشان ٹوبہ ٹیک سنگھ سرگزشت و سسپنس جیسی تحریر کہاں ملتی ہے۔ کاش یہ ماہانہ کے بجائے ویکلی ہو جائیں۔ ایم اے چودھری احمد پور شرقیہ میرا تبصرہ اچھا لگا۔ شکریہ تبصرہ آپ کا بھی بہت گہرا ہوتا ہے۔ طاہر، عمران، ماہا ایمان و دیگر ساتھیوں کے تبصرے اچھے مگر طویل تھے دوسروں کو بھی جگہ دیا کریں۔ فصل اجڑ گئی، ڈاکٹر صاحب نے مغلیہ دور کی معلوماتی تاریخی تحریر پیش کی۔ مغلیہ دور سے ہمارا فاصلہ اب زیادہ ہو گیا۔ برصغیر کے عظیم مسلمان رہنماؤں اور شاعر حضرات کی سوانح عمری بار بار لکھ کر نئی نسل کو آگاہ کریں۔ شوق مردانگی اچھی کہانی ہے۔ دوراہا، آصف نے بروقت ماہا سے اظہار محبت نہ کیا آرزو کا مذاق بری بات۔ ماہا کا فیصلہ بہت اچھا۔ کشکول کے صفحات کم ہیں۔ شیخ حامد کا انجام بلیک ٹائیگر جیسا ہوگا۔ ہماری پولیس اور جیل سے واسطہ پڑنے کے بعد شریف آدمی جگا نہ بنے تو کیا بنے؟ دادا پوتا، عائشہ فاطمہ کی اچھی کہانی تھی۔ چودھری ملک دین جیسے سور کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔ البتہ خان صاحب کو وکیل کے گھر رشتہ لینے جانے سے قبل بیٹے سے پوچھنا چاہیے تھا۔ بالغ اولاد کی رضامندی شرعاً لازم ہوتی ہے۔ شوق مردانگی مختار آزاد، رقیب سلیم انور، بھیدی ظفارت نصر انگلش کہانیاں متاثر نہ کر سکیں۔ مجرمانہ ذہن، بیگ صاحب اور ملک صفدر حیات، سدا اصل قاتل تک پہنچ جاتے ہیں۔ ملی جلی کہانی پہلے بھی شائع ہوئی۔ راجا ضیا الحسن، سعید عباسی، حسنین بلوچ، صوبیدار بخش، ماہا ایمان کے اچھے اشعار ہیں۔ مسافر، ویری گڈ ناصر ملک۔ دلجیت سائیں جیسے بہروپیے ہر جگہ موجود ہیں۔ بخت خان، ڈاکٹر شاہ صاحب کی پیر کے بارے میں رائے بہت اچھی لگی، خالدہ عرف بلو کی حرکت بہت بری محسوس ہوئی۔ آگے شہریار اور کمالے کے تعلقات کا کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ بمقابلہ ڈاکٹر بھٹی کی ہر کہانی منظر امام کی طرح ایک سے بڑھ کر ایک۔ لڑاؤ اور حکومت کرو۔ منظر امام غائب ہیں۔ محسن اختر کی پہلی بڑی کہانی کی قوی امید تھی، مایوسی ہوئی۔ شیریں زہر، صوفیا نے بے ضمیر لوگوں والی غلط حرکت کی۔ میڈیم آرتھر کو ٹونو پودے کی حقیقت علم ہونے کے باوجود پودا اگانا اور شہر بدلنا اچھی بات نہ تھی۔ اچھوتی محبت، احسن کے والدین کا سانحہ بہت افسوسناک ہے۔ ساحرہ کی روش بالکل غلط تھی۔ عشرت اعوان سے آغا نصیر کی زیادتی۔ عشرت کا آغا نصیر کی پہلی بیویوں کو قتل کرنا سو فیصد غلط اقدام ہے۔ انتقام لینا تھا تو آغا نصیر سے لیتی۔ شیبا عظیم ہے۔ صبر اور نیک نیتی کا صلہ خاموش محبت حسن کی مل گئی۔"

اب آخر میں ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے اس ماہ شامل اشاعت نہ ہو سکے۔

آغا فرید احمد خان، سکھر۔ اختر شاہ عارف، ڈھوک جمعہ، جہلم۔ ملک بشریٰ ٹکوکر اینڈ تانی ٹکوکر، کراچی۔ محمد شمیم ہارون، کراچی۔ ڈاکٹر مرزا انتظار نذیر مغل، جلال پور بھٹیاں۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ آر ساحر، نامعلوم مقام۔ مقصود الحسن طاہر، چونی ضلع قصور۔ محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن ضلع خانیوال۔ جعفر حسین، بھوآنہ، چنیوٹ۔ قرحان الفت، بہاولپور۔ ہمایوں سعید راج، بنوں۔ شیر علی خان، خانیوال۔ محسن علی موم، بالاکوٹ۔ محمد زبیر ساگر، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ سید محی الدین اشفاق، فتح پور، لیہ۔ ڈاکٹر وسیم خالق کھیاں، گجرات۔ محمد کامران خالد، چھب، ضلع اٹک۔

غزنی تا دہلی

ڈاکٹر ساجد امجد

سلطان شہاب الدین غوری، ایک نرم دل شہنشاہ... قطب الدین ایبک ایک قابل غلام... جب قدرت یہ چاہتی ہے کہ کوئی بچہ ایک بڑے انسان کے روپ میں زندگی گزارے تو اس کے لیے حالات اس کی پیدائش کے وقت سے ہی سازگار کرنا شروع کردیتی ہے... اور پھر وقت کا یہی اتار چڑھاؤ اس کی تربیت کرتے ہوئے اس کی بصیرت، شعور و آگہی میں گہرائی پیدا کرتا رہتا ہے۔ قطب الدین ایبک کا شمار بھی قدرت نے ایسے ہی لوگوں میں رکھ چھوڑا تھا۔ شہاب الدین غوری نے اپنے غلاموں کو ہمیشہ بیٹوں کا درجہ دیا اور تاریخ شاہد ہے کہ ان ہی غلاموں نے کتنے طمطراق سے ہندوستان کی سرزمین پر اپنی بادشاہت قائم کی... تاریخ کے اوراق سنہرے ہوں یا سیاہ تاریک... حالات و واقعات کی تمام ترتیب کو اپنے اندر سمو لیتے ہیں۔ جو کبھی آئینہ بن کر درس دیتے ہیں تو کبھی عبرت بن کر اذیت کا نشان بن جاتے ہیں۔ بادشاہوں کا جاہ و جلال بادشاہت کی روایت سہی لیکن وقت کی بساط پر لڑکھڑاتی چالوں کا شکار ہونا بھی تو تاریخ کی روایت ہے۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

راجا دلپت رائے اور اس کی رانی چمپانیر کے درمیان پچھلے دو دنوں سے سخت بحث چھڑی ہوئی تھی اور اب اس بحث نے تلخی کا روپ دھار لیا تھا۔ ماں کو گرجتے برستے دیکھ کر راجکماری بھی ماں کے ساتھ شامل ہوگئی تھی اور ماں کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔

اس تلخی کا باعث تھا غزنی سے ہندوستان کی سرزمین میں داخل ہونے والا سلطان شہاب الدین غوری جو ملتان کے قرامطیوں کو شکست دینے کے بعد اب اچ کی طرف بڑھنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اچ کے راجا دلپت رائے اور اس کا سپہ سالار بالک رام شہاب الدین غوری سے مقابلے کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے جبکہ رانی اس مقابلے کے خلاف تھی۔

"یہ کہاں کی عقل مندی ہے کہ ہم اس مسلمان بادشاہ سے مقابلہ کرنے کی ٹھان لیں جو قرامطیوں کو شکست دے چکا ہے۔ کیا تمہارے پاس قرامطیوں سے بڑا لشکر ہے، کیوں اپنی موت کو دعوت دے رہے ہو۔"

"راج نیتی چوہوں کے بلوں میں گھس کر نہیں کی جاتی۔ وہ ڈاکو ہمارے علاقے میں گھس آیا ہے اور میں اس کا مقابلہ بھی نہ کروں۔ اپنی سلطنت تھالی میں سجا کر اس کے سامنے پیش کردوں؟" دلپت رائے نے کہا۔

"راج نیتی چوہوں کے بلوں میں گھس کر نہیں کی جاتی لیکن عقل کے بغیر بھی نہیں کی جاتی۔ جب دریا میں باڑ آتی ہے تو کشتیاں پانی میں نہیں اتاری جاتیں۔ اس گھاٹ کی تلاش کی جاتی ہے جہاں پانی کم ہوتا ہے۔ اپنے لشکر کو دیکھو اور شہاب الدین کی طاقت کو دیکھو۔ ہاتھی کی مستک سے سر ٹکراؤ گے تو مارے جاؤ گے۔"

"چمپانیر!" دلپت رائے دہاڑا۔ "تو ہرگز اس قابل نہیں کہ تجھے میں اپنی رانی کہوں۔ رانیاں تو وہ ہوتی ہیں جو وقت پڑنے پر ہتھیار سجا کر میدان میں اترتی ہیں اور ایک تو ہے جو مجھے بزدلی کا سبق پڑھا رہی ہے۔"

"تو بھی کیسا راجا ہے کہ تیری گدی میں عقل ہی نہیں۔ تو وہ کام کر رہا ہے کہ خود بھی مارا جائے گا۔ تیرے ساتھ ہم بھی اور تیری پرجا بھی بے موت ماری جائے گی۔ شہاب الدین جب فاتح بن کر شہر میں داخل ہوگا تو کیا تجھے نہیں معلوم کہ وہ شہر کا کیا حال کرے گا۔"

"یہ تو اس وقت ہوگا بے عقل رانی جب اسے فتح ملے گی۔ میں سب انتظام کر چکا ہوں۔ اسے اپنے لوگوں کی

لاشیں اٹھانے کا موقع بھی نہیں ملے گا اور وہ بھاگنے پر مجبور ہو جائے گا۔"

"راجکماری جوان ہے، خوب صورت ہے۔ کیا تجھے ڈر نہیں لگتا کہ شہاب الدین اسے اٹھا کر لے جائے گا؟"

"میں نے کہہ دیا ناں کہ یہ سب اس وقت ہوگا جب میں اسے یہاں تک پہنچنے دوں گا۔؟"

"دیکھو دلپت، شہاب الدین یہاں پردیسی ہے، وہ اپنے دیس سے دور ہے۔ اس کی عورتیں اس کے ساتھ نہیں ہیں۔ اس کے شہر ہماری پہنچ سے دور ہیں۔ اسے اگر شکست ہوئی تو وہ اپنی جان بچا کر بھاگ کھڑا ہوگا لیکن ہم ہارے تو ہمارا سب کچھ خاک میں مل جائے گا۔"

"تو مجھے اپنا گھاگھرا دے دے جسے پہن کر بیٹھ جاؤں۔ میں راجا ہوں تو راجا کی طرح لڑوں گا۔ تجھے اگر شہاب الدین پسند آ گیا ہے تو میں تجھے نہیں روکتا۔ جا اس کے پاس چلی جا۔ اس کی رانی بن کر رہ یا رکھیل، مجھے پروا نہیں۔"

"لعنت ہو تیرے راجا ہونے پر کہ اپنی بچی کو ایک مسلمان کی رکھیل بننے کو کہتا ہے۔ اس کی حفاظت کا نہیں سوچتا۔ اس کی حفاظت اس میں ہے کہ تو ایک وفد شہاب الدین کی خدمت میں بھیج اور اس سے صلح کر لے۔ تیری سلطنت بھی بچ جائے گی اور تیری رانی اور راجکماری بھی۔"

"تم لوگ میری طرف سے بھاڑ میں جاؤ۔ میں بالک رام کو حکم دے چکا ہوں، وہ لشکر ترتیب دے رہا ہے۔ ہم باہر نکل کر شہاب الدین کا مقابلہ کریں گے اور اب تم میں سے کوئی میرے بیچ میں نہیں بولے گا۔"

یہ عجیب بات تھی کہ راجکمار دیوداس ان سب سے الگ تھلگ بیٹھا تھا جیسے ان باتوں سے اسے کوئی سروکار ہی نہ ہو، حالانکہ اب وہ جوان ہو چکا تھا۔ اسے حمایت یا مخالفت میں بولنا چاہیے تھا۔

رانی نے بھی چپ سادھ لی تھی۔

☆☆☆

گھڑ سوار گجرات کے راجا بھیم دیو کی سرحد میں داخل ہوا۔ اس نے گھوڑے کی رفتار کو مزید بڑھا دیا تھا کہ جلد سے جلد راجا کے محل تک پہنچ سکے۔

راستے میں اسے راجا کا لشکر ادھر اُدھر بکھرا ہوا نظر آیا تو اسے تعجب ہوا کہ کیا یہاں بھی جنگ چھڑ گئی ہے جو لشکر تیاری کر رہا ہے۔ اس نے گھوڑے کی رفتار دھیمی کر لی تھی کہ حالات کا جائزہ لے سکے۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک محافظ دستے نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

"کون ہے تو اور یہاں ریگستان میں کیا لینے آیا ہے؟"

"میں اچ کے راجا دلپت رائے کا قاصد ہوں۔ تمہارے راجا کے نام اس کا ایک پیغام لے کر آیا ہوں۔"

"جھوٹ بولتا ہے۔ ہندوستان میں مسلمان داخل ہو چکے ہیں۔ تو ہمیں ان کا بھیجا ہوا مخبر معلوم ہوتا ہے۔"

"تم لوگ میری بات کا یقین کرو۔ مجھے رائے بھیم دیو کے پاس لے چلو۔ وہ دلپت رائے کی تحریر کو ضرور پہچان لے گا۔"

"تیری قسمت اچھی معلوم نہیں ہوتی۔ بھیم دیو بھی اسی مقام پر موجود ہے۔ ابھی فیصلہ ہوا جاتا ہے کہ تو کون ہے۔"

یہ خبر تیزی سے پھیل گئی تھی کہ ایک مخبر پکڑا گیا ہے۔ بھیم دیو کو بھی یہ خبر اسی طرح پہنچا دی گئی تھی اور اس نے حکم دیا تھا کہ اس شخص کو اس کے سامنے پیش کیا جائے جو خود کو دلپت رائے کا قاصد بتاتا ہے۔

دلپت رائے کے قاصد کو گھوڑے سے اتار کر پیدل لے جایا جا رہا تھا۔ محافظ دستہ اس کے ساتھ تھا۔ راجا بھیم دیو اپنے لشکر کے معائنے کے لیے اس میدان میں آیا ہوا تھا۔ اس کی فوج کے اعلیٰ سالار بھی اس وقت اس کے ساتھ تھے۔ وہ اس وقت ایک بڑے سے شامیانے کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔

دلپت رائے کے قاصد نے جھک کر اسے تعظیم پیش کی۔

"میں دلپت رائے کا قاصد ہوں۔ اس کا ثبوت یہ تحریر ہے جو میرے مالک نے آپ کے نام بھیجی ہے۔" قاصد نے ایک کاغذ راجا کی طرف بڑھا دیا جس پر کچھ تحریر تھا۔

راجا نے اس خط کو پڑھا اور پھر قاصد سے مخاطب ہوا۔

"تو نے ٹھیک کہا تھا۔ تو مخبر نہیں دلپت کا قاصد ہے۔ میں نے اس پیغام کو بھی پڑھ لیا جو تو اپنے ساتھ لایا ہے، میں اس کا جواب مشورے کے بعد دوں گا۔ تجھے میرے جواب کا انتظار کل تک کرنا ہوگا۔"

راجا نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ قاصد کو شہر لے جا کر مہمان خانے میں ٹھہراؤ اور کل ہمارے سامنے پیش کرو۔

دوسرے دن راجا اپنے راج محل میں تھا کہ قاصد کو اس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

"دلپت رائے سے کہنا کہ ہم اسے اس مشکل کی گھڑی میں تنہا نہیں چھوڑیں گے۔ ہم یہ کبھی نہیں چاہیں گے کہ شہاب الدین غوری اچ پر حملہ آور ہو اور پھر وہ ہماری طرف رخ کرے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اسے اچ میں شکست دی جائے تاکہ وہ اپنے علاقے کی طرف لوٹ جائے اور پھر اس طرف کا رخ نہ کرے۔

اپنے مالک کو ہمارا یہ پیغام بھی پہنچا دو کہ وہ محاصرے کی نوبت نہ آنے دے۔ شہر سے باہر نکل کر مقابلہ کرے۔ میں عنقریب ایک لشکر روانہ کرنے والا ہوں جو مسلمانوں کی پشت سے حملہ آور ہوگا۔ چکی کے دو پاٹوں کے بیچ شہاب الدین پس کر رہ جائے گا۔ ممکن ہے مارا بھی جائے۔ دلپت کی فتح یقینی ہوگی۔"

قاصد نے ہاتھ جوڑ کر راجا کا شکریہ ادا کیا۔

یہ قاصد، بھیم دیو کا پیغام لے کر پہنچا تو دلپت تمام تیاریاں مکمل کر چکا تھا۔ اتنے میں یہ خبریں بھی پہنچ چکی تھیں کہ سلطان شہاب الدین اچ کے نزدیک پہنچ چکا ہے اور ایک میدان میں پڑاؤ کر کے جنگ کی تیاریاں کر رہا ہے۔

بھیم دیو کی طرف سے پیغام آنے کے بعد دلپت کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ رانی نے ایک مرتبہ پھر اسے روکنے کی کوشش کی لیکن اب وہ کہاں رکنے والا تھا۔ گجرات کا راجا بھی اس کے ساتھ تھا تو مقابلہ کیوں نہ کیا جاتا۔ وہ شہر سے نکلا اور شہاب الدین کے لشکر کے سامنے پڑاؤ ڈال لیا۔

"بالک رام، ذرا شہاب الدین کے لشکر کا جائزہ لے کر یہ اندازہ تو کرو کہ اس کا لشکر بڑا ہے یا ہمارا؟"

"مالک، میں پہلے ہی اندازہ کر چکا۔ دونوں کے لشکر تقریباً برابر ہیں لیکن جب بھیم دیو کا لشکر ہم سے آن ملے گا تو شہاب الدین کا لشکر اونٹ کے منہ میں زیرے کی طرح ہوگا۔"

"تم کیا کہتے ہو۔ ہم بھیم کا انتظار کریں یا جنگ کا آغاز کر دیں؟"

"میرے خیال میں تو ہمیں صبح ہوتے ہی جنگ کا آغاز کر دینا چاہیے تاکہ دشمن پر ہمارا رعب طاری ہو جائے اس وقت تک بھیم دیو بھی پہنچ ہی جائے گا۔"

"پھر تم تیاری کرو۔ صبح ہوتے ہی ہم لشکر کو آگے بڑھا دیں گے۔"

سلطان شہاب الدین عشا کی نماز پڑھ کر فارغ ہوا تھا کہ اس کا چہیتا غلام قطب الدین ایک خیمے میں داخل ہوا۔ غلام تھا۔ ظاہری حسن سے بھی عاری تھا لیکن عقل و دانش اور بہادری ایسی رکھتا تھا کہ روز بہ روز ترقی کرتا گیا۔ شہاب الدین نے اسے داروغۂ اصطبل بنایا اور پھر غزنویوں کے خلاف ہونے والے معرکوں میں اسے اپنے ساتھ لے جانے لگا۔ اس معرکے میں بھی وہ اس کے ساتھ تھا۔

وہ ابھی بچہ تھا کہ بردہ فروش اسے ترکستان سے اٹھا کر

نیشاپور لے آئے اور قاضی فخر الدین بن عبدالعزیز کوفی کے پاس بیچ دیا جو حضرت امام ابو حنیفہؒ کی اولاد میں سے تھے۔ خداوند تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ قطب الدین ایبک ایک دن بڑا آدمی ہوگا۔ اس لیے بچپن ہی سے اس کے چہرے سے عظمت اور برتری کے آثار نمایاں تھے۔ قاضی فخر الدین اسے بہت عزیز رکھتے تھے۔ انہوں نے اس کی پرورش بیٹوں کی طرح کی۔ اسے دینی تعلیم کے علاوہ شہسواری اور تیراندازی کی بھی تعلیم دی۔

قاضی صاحب کے انتقال کے بعد ان کے کسی بیٹے نے قطب الدین کو ایک سوداگر کے ہاتھ فروخت کردیا۔ اس سوداگر نے اسے تحفے کے طور پر سلطان شہاب الدین غوری کی خدمت میں پیش کردیا۔

قطب الدین کے ایک ہاتھ کی چھوٹی انگلی ٹوٹی ہوئی تھی اس لیے بادشاہ اور درباریوں نے اسے ایبک کہنا شروع کردیا۔ رفتہ رفتہ یہ لفظ اس کے نام کا جزو بن کر رہ گیا۔ قطب الدین نے بڑے سلیقے اور محبت کے ساتھ سلطان کی خدمت کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مختصر سی مدت میں اس نے بادشاہ کو اپنا گرویدہ بنالیا۔

قطب الدین کی قسمت کا ستارہ روز بہ روز بلند ہوتا گیا اور کچھ ہی دنوں میں اسے ”امیر اخوری“ کا مرتبہ حاصل ہوگیا۔ جس زمانے میں غور، غزنی اور بامیان کے حکمرانوں نے باہمی اتحاد سے خوارزم پر لشکر کشی کی تھی اسی زمانے میں قطب الدین بھی اس معرکہ کارزار میں شریک تھا۔

قطب الدین خیمے میں داخل ہوکر کچھ دیر سر جھکائے کھڑا رہا۔ اس کی عادت تھی کہ جب تک سلطان اسے اذن کلام نہیں دیتا تھا وہ خاموشی اختیار کیے رہتا تھا۔

”ایبک، کہو کیا بات ہے؟“

”حضور ابھی ابھی ہمارا ایک مخبر ایک خبر لے کر آیا ہے۔ دلپت رائے نے اپنا قاصد رائے بھیم دیو کے پاس روانہ کیا تھا۔ یہ تو معلوم نہ ہوسکا کہ وہ کیا پیغام لایا ہے لیکن قیاس کہتا ہے، بھیم دیو نے دلپت رائے کی مدد کا عندیہ دیا ہے۔ میرا اندازہ کہتا ہے کہ بھیم دیو نے لشکر روانہ کردیے ہوں گے۔ اسی لیے دلپت رائے کی اتنی ہمت ہوئی ہے کہ وہ اپنے لشکر کو شہر سے باہر لے آیا ہے۔“

”تمہارے خیال میں اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

”دلپت رائے یقیناً بھیم دیو کا انتظار کرے گا اور جنگ شروع کرنے میں دیر کرے گا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم صبح ہوتے ہی جنگ کا آغاز کردیں۔“

”ہم تمہاری تجویز کو منظور کرتے ہیں۔“

”غلام ایک اور اجازت کا طلب گار ہے۔“

”کہو، ہم سن رہے ہیں۔“

”بھیم دیو یقیناً ہمارے لشکر کی پشت پر حملہ آور ہوگا۔ آپ سے گزارش یہ ہے کہ لشکر کا ایک حصہ میرے حوالے کردیں۔ میں دور نظر آنے والے ریت کے ٹیلوں کے عقب میں گھات لگا کر بیٹھوں گا اور بھیم دیو کے لشکر کو یہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی تہس نہس کرکے رکھ دوں گا۔“

”ایبک! دنیا کو بتادو کہ میں اپنے غلاموں کو یونہی اپنا فرزند نہیں کہتا ہوں۔ بے شک! تم جتنے سپاہی اپنے ساتھ لے جانا چاہو لے جاسکتے ہو۔“

سلطان شہاب الدین کو اللہ تعالیٰ نے صرف ایک بیٹی دی تھی۔ اس کے گھر میں کوئی بیٹا پیدا نہ ہوا تھا۔ اس لیے اس کو ترکی غلام خریدنے اور انہیں بیٹوں کی طرح پالنے کا بڑا شوق تھا۔

کسی نے اس سے ایک روز کہا۔ ”کیا ہی اچھا ہوتا کہ خداوند تعالیٰ بادشاہ کو کوئی بیٹا بھی عطا کرتا تاکہ کسی ناگزیر واقعے کے پیش آنے کی صورت میں اس کو تخت کا وارث بنایا جاتا۔“

سلطان نے جواب دیا۔ ”عام طور پر بادشاہوں کے چند بیٹے ہوتے ہیں جو اپنے باپ کی وفات کے بعد حکومت کے وارث قرار پاتے ہیں لیکن میرے کئی ہزار ایسے سعادت مند بیٹے ہیں جو میرے بعد عنان حکومت سنبھالیں گے اور میرا نام زندہ رکھیں گے۔“

اس کا اشارہ انہی غلاموں کی طرف تھا جو اس کے دربار میں موجود تھے۔

تاریخ شاہد ہے کہ اس کے غلاموں نے نہایت رعب داب کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کی۔

قطب الدین ایبک نے ایک چھوٹا سا دستہ اپنے ساتھ لیا اور رات میں ہی ریت کے ٹیلوں کی طرف چل دیا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی سلطان نے اپنے سالاروں کو طلب کیا۔ انہیں حکم دیا کہ صبح کی پہلی کرن کے نمودار ہوتے ہی جنگ کا آغاز کرنے میں پہل کردیں۔

ان سالاروں میں سے چند نے کچھ کہنا چاہا لیکن سلطان کے اشارے نے انہیں خاموش رہنے کے لیے کہہ دیا۔ وہ غالباً واقف نہیں تھے کہ جنگ میں جلدی کیوں کی جارہی ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ قطب الدین کو کہاں بھیج دیا گیا ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ خود دلپت رائے

بھی حملہ کرچکا ہے۔

صبح ہوتے ہی دلپت رائے نے سلطان کے لشکر کی طرف سے تکبیر کے نعرے بلند ہوتے ہوئے سنے۔ پھر دیکھا کہ سلطان کا لشکر آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا ہے۔ دلپت رائے نے بھی چونکہ رات ہی کو صفیں درست کرلی تھیں اس لیے اس کے لشکر کو گھبراہٹ کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔

دلپت رائے نے اس امید کے ساتھ کہ بھیم دیو کا لشکر بس آنے ہی والا ہوگا اپنے لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دے دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ سلطان کا لشکر جنگ میں الجھ کر اپنی پشت سے غافل ہوجائے۔

دونوں طرف سے ہولناک شور بلند ہوا اور پھر دونوں لشکر آپس میں گتھم گتھا ہوگئے۔ چیخوں اور تلواروں کی جھنکار کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

دلپت رائے کا لشکر تعداد میں زیادہ تھا لیکن ابتدا ہی میں ظاہر ہونے لگا کہ مسلمان حاوی ہورہے ہیں۔ بالک رام اپنے گھوڑے پر سوار صفوں کے درمیان دوڑ رہا تھا اور اپنے سپاہیوں کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔

”جم کر لڑتے رہو۔ حاکم گجرات کا لشکر پہنچنے والا ہے۔ بس کچھ دیر جاتی ہے۔ فتح کے شادیانے بجانے کے لیے تیار رہو۔“

میدان جنگ میں وقت چلتا نہیں رینگتا ہے۔ خون بہتا رہا۔ گردنیں کٹتی رہیں۔ دلپت رائے بار بار اپنے گھوڑے پر پورے قد سے کھڑے ہوکر دیکھ لیتا تھا کہ میدان جنگ سے دور کہیں دھول اڑتی نظر آئے لیکن میدان صاف پڑا تھا۔ بھیم دیو کے لشکر کے آثار دور دور تک نہیں تھے۔ واہمے سر اٹھا رہے تھے۔ کہیں بھیم دیو اپنے وعدے سے پھر تو نہیں گیا۔

وہ انہی اندیشوں کو اپنے ساتھ ساتھ لیے ادھر سے ادھر دوڑتا پھر رہا تھا کہ اس نے ایک سوار کو آتے ہوئے دیکھا۔ یہ کون ہوسکتا ہے جو تلواروں کے بیچ دوڑا چلا آرہا ہے۔ وہ شخص قریب آیا تو دلپت نے اسے پہچان لیا۔ یہ اس کا ایک مخبر رام داس تھا۔ دلپت کو دیکھتے ہی وہ گھوڑے سے کود گیا۔

”کہو رام داس، کیا خبر لائے؟“

”مالک میں ایک بری خبر لے کر آیا ہوں۔ راجا بھیم دیو نے ہماری مدد سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ اب اس کے کسی لشکر کا انتظار فضول ہے۔“

”اس نے تو وعدہ کیا تھا کہ وہ لشکر بھیجے گا۔ کیا اب راجا بھی اپنے قول سے پھرنے لگے ہیں؟“

”جی مالک۔ اس کا خیال ہے کہ اگر آپ کو شکست ہوگئی تو سلطان شہاب الدین آپ کی مدد کرنے کے جرم میں اس کے علاقے کو پامال کردے گا۔ وہ سلطان سے مصالحت کے راستے بند کرنا نہیں چاہتا۔“

”اب تم جاؤ اور خبردار کسی سے اس کا ذکر مت کرنا۔ میرے لشکر کو یہی سمجھنے دو کہ بھیم دیو پہنچنے والا ہے۔“ دلپت رائے نے کہا اور بالک رام کو تلاش کرنے لگا جو ہر اس جگہ پہنچنے کی کوشش کررہا تھا جہاں اس کا کوئی سپاہی مصیبت میں تھا۔ دلپت رائے نے گھوڑا دوڑایا اور بالک رام کے پاس پہنچ گیا۔

”بالک رام، بھیم دیو نے غداری کی ہے۔ اس نے ارادہ بدل دیا ہے۔ اب اس کا لشکر ہماری مدد کو نہیں پہنچے گا۔ میں اس کے سہارے پر شہر سے باہر نکلا تھا ورنہ شہر کے دروازے بند کرکے بیٹھ جاتا اور مناسب موقعے پر نکلتا اور اسی نے ساتھ چھوڑ دیا۔“

”مالک یہ تو بہت برا ہوا۔ ہم یوں بھی کمزور پڑتے جارہے ہیں۔ اگر اس وقت......“

”لشکر میں کسی کو یہ بات معلوم نہ ہو۔ تم چیخ چیخ کر کہتے رہو کہ بھیم دیو کا لشکر آنے والا ہے۔ اگر یہ بات پھیل گئی کہ بھیم دیو انکاری ہوگیا ہے تو ہمارے سپاہیوں کے حوصلے ٹوٹ جائیں گے۔“

ہندو سورما اس امید پر لڑتے رہے کہ بس بھیم دیو کا تازہ دم لشکر پہنچنے ہی والا ہے۔ اتنی دیر میں مسلمانوں کے لشکر کے عقب سے دھول اڑتی نظر آئی۔ دلپت کے سپاہی یہ سمجھے کہ بھیم دیو کا لشکر آگیا۔ وہ جان کی پروا کیے بغیر سلطان کی اگلی صفوں میں گھس گئے۔ پھر یہ دیکھ کر ان کے ہاتھوں سے تلواریں گرنے لگیں کہ یہ مسلمان سپاہیوں کا ہی تازہ دم دستہ ہے جو کسی جگہ چھپا ہوا تھا اور اب میدان میں کودا ہے۔

یہ دراصل قطب الدین ایبک تھا جو اپنے دستے کے ساتھ بھیم دیو کا راستہ روکنے گیا تھا اور اب اس کی طرف سے مایوس ہوکر واپس آگیا تھا۔ اسے دیکھ کر دلپت رائے کا بھی حوصلہ پست ہوگیا۔

دلپت رائے نے گھبرا کر اپنی صفوں کی طرف دیکھا۔ اگلی صفیں پامال ہوچکی تھیں۔ پچھلی صفوں کے لشکری آگے جانے سے کترا رہے تھے۔ مسلمانوں کی تلواریں بڑی تیزی سے قتل عام کررہی تھیں۔

مسلمان پوری طرح حاوی ہوچکے تھے۔ اب پسپائی کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ واپسی کے راستے بھی بند ہوجائیں۔ وہ شکست اٹھا کر راج شہر میں داخل ہوا اور

شہر پناہ کے دروازے بند کر لیے۔
سلطان کے لشکریوں نے تعاقب کرتے ہوئے ہزاروں ہندوؤں کو قتل کر دیا اور اچ شہر کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ اتنے فاصلے پر تھا کہ فصیل سے چلایا جانے والا تیر، پڑاؤ تک نہ پہنچ سکے۔ مقصد یہ تھا کہ محاصرے سے تنگ آ کر راجا شہر پناہ کے دروازے کھولنے پر مجبور ہو جائے۔
محاصرہ طول پکڑتا جا رہا تھا۔ دلپت کے آدمی فصیلوں سے تیر برساتے رہتے تھے جس سے سلطان کے سپاہی زخمی بھی ہوتے رہتے تھے۔ شہاب الدین کے پاس کوئی ایسا انتظام نہیں تھا کہ وہ فصیل توڑ کر شہر میں داخل ہو جائے۔ سلطان کے کئی مخبر اچ شہر میں موجود تھے لیکن ان میں سے کوئی واپس نہیں آیا تھا اور نہ ہی کوئی خبر آئی تھی کہ شہر میں غذا وغیرہ کا حال کیا ہے۔
ایک دن ایک مخبر کسی نہ کسی طرح شہر سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوا اور سلطان کی خدمت میں پہنچ گیا۔
"سلطان، میں آپ کے لیے ایک اچھی خبر لایا ہوں۔"
"کیا دلپت رائے صلح کے لیے تیار ہے؟"
"مجھے محل کے با اثر لوگوں کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ رانی اور راجا کے درمیان اختلافات بڑھ گئے ہیں۔ رانی کہتی ہے کہ سلطان کی اطاعت قبول کر لی جائے جبکہ راجا اس پر تیار نہیں۔ یہ اختلاف اتنا بڑھ گیا ہے کہ دونوں نے اپنی تھالیاں الگ کر لی ہیں۔ یہ اختلافات زیادہ بڑھ گئے تو آپس میں پھوٹ پڑنے کا امکان ہے۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے سالار بھی رانی کے ساتھ ہیں۔ ممکن ہے کوئی بغاوت اٹھ کھڑی ہو۔"
"یہ واقعی اچھی خبر ہے۔ یہ اختلافات ہمیں فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ جب گھر میں پھوٹ پڑ جائے تو باہر والوں کو فائدہ ہی ہوتا ہے۔"
مخبر کے چلے جانے کے بعد سلطان کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ اپنی سوچ میں کسی دوسرے کو شریک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ قطب الدین ایبک کو بھی نہیں جس کو وہ ہر مشورے میں ساتھ رکھتا تھا۔
کئی ساعتیں بیت چکی تھیں۔ اب رات بھی آدھی ادھر آدھی ادھر ہو گئی تھی۔ اس نے محافظوں سے کہہ دیا تھا کہ اس کے پاس کسی کو نہ آنے دیں اس لیے مکمل تخلیہ تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ رانی اور راجا کے اختلافات سے کس طرح فائدہ اٹھایا جائے، کئی خیال آئے اور چلے گئے اور پھر شاید وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا۔ اب اس کے چہرے پر خوشگوار تبسم کھیل رہا تھا۔ وہ مطمئن ہو گیا تھا۔ اس نے نماز تہجد ادا کی اور اپنے بستر پر چلا گیا۔
صبح ہوتے ہی اس نے ایک قاصد کو اپنے پاس بلایا۔
"تم قاصد کی حیثیت سے دلپت رائے سے ملاقات کرو گے اور اس سے درخواست کرو گے کہ وہ شہر پناہ کے دروازے ہمارے لیے کھول دے۔ وہ یقیناً اسے ہماری کمزوری سمجھ کر انکار کرے گا لیکن ہمیں اس کے انکار سے غرض نہیں۔ تم ہمارا پیغام لے کر دراصل رانی کے پاس جا رہے ہو۔ وہ جب سنے گی کہ ہمارا قاصد آیا ہوا ہے تو وہ یقیناً تم سے ملاقات کرے گی۔ اس سے ملاقات کر کے ہمارا پیغام پہنچانا کہ اگر وہ کسی ترکیب سے اچ شہر فتح کرا دے تو ہم اس سے شادی کر لیں گے۔"
قاصد نے چونک کر سلطان کی طرف دیکھا۔ "آپ اس ہندو رانی سے شادی کریں گے؟"
"اسے ہمارے لیے مسلمان بھی ہونا پڑے گا۔"
"کیا وہ اس پر تیار ہو جائے گی؟"
"یہ سوچنا ہمارا کام نہیں۔ یہ تجویز ہے اس تک پہنچا دو۔ ہمیں کچھ شک سا ہے کہ وہ اپنے شوہر سے خوش نہیں۔ وہ ہماری اس پیشکش کو ضرور قبول کر لے گی۔"
"میں آپ کا یہ پیغام رانی تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔"
"اور سنو! اگر وہ ملاقات کے لیے تمہیں نہ بلائے تو خود کوشش کرنا کہ اس سے ملاقات کی کوئی سبیل نکل آئے۔"
"میں سلطان کا پیغام رانی تک پہنچانے کی پوری کوشش کروں گا۔"
"بس اب تم جاؤ۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔"
قاصد نے سفید پرچم ہاتھ میں لیا اور لشکر سے نکل کر اچ شہر کی طرف چلا۔ شہر پناہ کے دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ دروازے کے نگہبانوں نے اسے غیر مسلح دیکھ کر دروازہ کھول دیا۔ ضروری سوال جواب کیے اور اسے شہر میں داخل ہونے کی اجازت مل گئی۔ اسے راج محل تک پہنچا دیا گیا۔
اس خبر کو پھیلتے دیر نہیں لگی کہ شہاب الدین کا قاصد صلح کی بات چیت کے لیے محل میں آیا ہے۔ یہ خبر رانی تک بھی پہنچی۔ وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ دلپت رائے صلح کے لیے تیار ہو جائے لیکن اس نے بہت جلد سن لیا کہ دلپت رائے نے قاصد کے پیغام کو ٹھکرا دیا ہے۔ وہ ایک مرتبہ پھر دلپت رائے کے پاس پہنچی اور اس سے الجھ پڑی۔
"تم کیوں بھگوان کی کرپا کو ٹھکرا رہے ہو۔ سلطان نے

[illegible] لیے ہاتھ بڑھایا ہے۔ اس سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے۔ اپنی شرائط پر صلح کر سکتے ہو۔ اس موقعے کو ضائع مت کرو۔"
"میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ راج نیتی کے معاملے میں دخل مت دیا کرو۔ سلطان کے قاصد کے آنے کا مطلب جانتی ہو؟ سلطان اب محاصرے سے تنگ آ گیا ہے۔ وہ محاصرہ اٹھا کر جانا چاہتا ہے۔ پھر میں کیوں اسے خراج دینے کا عہد باندھوں۔ وہ اب کمزور پڑ گیا ہے میں اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔"
"وہ کمزور پڑ گیا ہے۔ یہ ضروری تو نہیں۔ ممکن ہے وہ تمہیں ایک موقع دینا چاہتا ہو۔ اگر وہ کسی طرح شہر میں داخل ہو گیا تو جانتے ہو کیا ہوگا۔ غصے میں بھرے ہوئے اس کے لشکری شہریوں کا کیا حال کریں گے۔ تمہاری اور میری جان کی سلامتی کی کوئی ضمانت ہے؟"
"شہر کی فصیلیں اتنی مضبوط ہیں کہ وہ کبھی اندر داخل نہیں ہو سکتا۔ میرے پاس اجناس کے ذخیرے اتنے ہیں کہ میں سال بھر تک شہریوں کو مرنے نہیں دوں گا۔ وہ ٹھنڈے ملک کے لوگ ہیں یہاں کی گرمی برداشت نہیں کر سکیں گے۔ اگر پھر بھی تم ڈرتی ہو، تو اپنے بھائی کے پاس ہانسی چلی جاؤ۔ مجھے تمہاری پروا نہیں۔"
"ٹھیک ہے۔ میں تم جیسے آدمی کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ میں کل ہی اپنے بھائی کے پاس چلی جاؤں گی۔"
"جاؤ، چلی جاؤ۔ میں تمہیں روکنے والا نہیں۔"
رانی پاؤں پٹختی ہوئی دلپت رائے کے کمرے سے نکل گئی۔ وہ اپنے محل کی طرف جا رہی تھی کہ اس نے سلطان کے قاصد کو دیکھا جو دلپت رائے سے رخصت کی اجازت لینے کے لیے اس کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کچھ لوگ اس کے ساتھ تھے۔ اس نے ان لوگوں کو آگے جانے دیا اور خود اپنی رفتار کم کر دی۔
"راج ماتا، کیا آپ سے میری ملاقات ہو سکتی ہے؟"
"مجھ سے ملنے کا کیا فائدہ۔ جو کچھ دلپت رائے نے کہا وہ اپنے مالک تک پہنچا دو۔"
"راج ماتا!" قاصد نے سرگوشی میں کہا۔ "مجھے سلطان نے دلپت رائے کے پاس نہیں، آپ کے پاس بھیجا ہے۔ اس کا ایک پیغام ہے جو میں آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں۔"
"کیا تم شام تک ٹھہر سکتے ہو۔ شام ہوتے ہی دلپت رائے فصیلوں کے معائنے کے لیے جائے گا۔ میں تم سے ملاقات کر لوں گی۔"
قاصد آگے بڑھ گیا لیکن اب اسے رخصت کی اجازت نہیں لینی تھی۔ اس نے دلپت رائے سے کہا کہ وہ ایک رات اور ٹھہرے جاتا ہے تاکہ آپ سلطان کی پیشکش پر مزید غور کر لیں۔
"تم ٹھہر جاؤ لیکن میرا جواب کل بھی وہی ہوگا جو میں دے چکا۔"
قاصد کو اس کے جواب سے غرض نہیں تھی۔ اسے تو شام ہونے کا انتظار تھا۔ وہ مہمان خانے کے اس کمرے میں آ گیا جہاں اسے ٹھہرایا گیا تھا۔ جب سورج غروب ہونے کو تھا تو ایک آدمی اسے بلانے کے لیے آیا۔
"رانی چمپا آپ کو یاد کر رہی ہیں۔"
"وہ کہاں ہیں؟"
"میرے ساتھ چلے آؤ۔"
قاصد اس کے ساتھ رانی کے سجے سجائے کمرے میں پہنچ گیا۔
"جلدی کہو کیا پیغام لائے ہو۔ دلپت رائے کے وفادار تشویش میں ہوں گے کہ تم مجھ سے ملاقات کر رہے ہو۔"
"رانی صاحبہ، سلطان شہاب الدین نے آپ کے نام پیغام بھیجا ہے کہ اگر آپ شہر فتح کرانے میں اس کی مدد کریں تو وہ آپ سے شادی کر کے اپنی ملکہ بنانے کا اعزاز بخشے گا۔"
رانی کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا تھا لیکن پھر جیسے اس نے اپنی خوشی پر قابو پا لیا ہو۔ خوشی کی جگہ چہرے پر سنجیدگی آ گئی۔ غیر ارادی طور پر کمرے میں لگے قد آدم آئینے کی طرف دیکھا۔
"اب میرا بھی ایک پیغام ہے جو تم اپنے بادشاہ تک پہنچاؤ گے۔ اس سے کہنا کہ اب میری عمر تو شادی کی رہی نہیں۔ اگر وہ میری بیٹی سے شادی کرنے پر رضامند ہو تو میں شہر کے دروازے اس کے لیے کھول دوں گی۔"
"جو بادشاہ آپ سے شادی کے لیے تیار ہے وہ آپ کی بیٹی سے شادی کیوں نہیں کرے گا۔ یہ تو آپ راج کماری سے پوچھیں کہ وہ مسلمان ہونے اور سلطان سے شادی کے لیے تیار ہے۔"
"میں راج کماری کی طرف سے تمہیں جواب دیتی ہوں کہ ہاں۔"
"میں بھی آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سلطان کو راجکماری سے شادی کے لیے رضامند کر لوں گا۔"
"لیکن میری ایک شرط ہے۔"
"فرمائیے۔"

"بادشاہ یقیناً یہاں نہیں رہے گا۔ وہ راجکماری کو جہاں لے کر جائے گا میں بھی اپنی بیٹی کے ساتھ جاؤں گی کیونکہ یہاں رہنا میرے لیے خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ دلپت کے وفادار مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"میں آپ کو ضمانت دیتا ہوں کہ جہاں راجکماری جائیں گی آپ ان کے ساتھ ہوں گی۔"

"اپنے بادشاہ سے یہ بھی کہنا کہ جب وہ شہر میں داخل ہو تو اس کے لشکری لوٹ مار نہ مچائیں۔ میرے خاندان کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔"

"اور دلپت رائے؟"

"اس کے ساتھ بادشاہ جو چاہے سلوک کرے۔ جو بادشاہ کے خلاف تلوار اٹھائے اس کے لیے بھی بادشاہ آزاد ہوگا۔ جس طرح چاہے نمٹے۔"

قاصد نے اس کی تمام شرطیں مان لیں۔

"اب تم جاؤ۔ دو دن بعد شہر کے دروازے کھل جائیں گے۔"

قاصد کے جانے کے بعد رانی نے اپنے دونوں بچوں راجکماری سون کرن اور راجکمار دیوداس کو اپنے پاس بلایا اور انہیں قاصد سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا۔

"میرے بچو! میں نے تمہارے باپ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہیں مانا۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ سلطان کسی نہ کسی دن اس شہر کو فتح کرلے گا۔ اس کے بعد ہماری جانیں اس کے رحم وکرم پر ہوں گی۔ اس کے سپاہی اس شہر کو جی بھر کر لوٹیں گے۔ اب جو اس نے پیغام بھیجا ہے کہ وہ راجکماری کو اپنی ملکہ بنائے گا اور شہر کو نہیں لوٹے گا تو اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ میں اس کے لیے شہر کے دروازے کھول دوں۔ راجکماری بہت بڑے بادشاہ کی ملکہ ہوگی۔ کیا تمہیں میرے فیصلے سے اختلاف ہے؟"

"ہم دونوں نے آج تک آپ کی کوئی بات نہیں ٹالی۔" دیوداس نے کہا۔

"دیوداس! تمہارے لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تم کل ہی اپنے ماموں کے پاس ہانسی چلے جاؤ گے۔ دریائے سرسوتی کے کنارے کھڑی حویلیوں میں سے کوئی بھی تمہیں مل جائے گی۔"

"میں وہاں کیوں جاؤں۔ آپ کے ساتھ ہی رہتا ہوں۔" دیوداس نے پہلی مرتبہ اس سے اختلاف کیا۔

"میں نے کچھ سوچ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔ تم اج شہر کے وارث ہو۔ تمہارا ہندوستان میں رہنا ضروری ہے۔ اگر کسی وقت بادشاہ نے یہ شہر کسی کے حوالے کرنا چاہا تو تم یہاں موجود ہوگے۔"

"نہ جانے آپ لوگوں سے کب تک ملاقات نہ ہو۔"

"راجکماری جیسے ہی سلطان کے دل میں گھر کرلے گی ہم جہاں بھی ہوں گے تمہیں بلانے کی کوشش کریں گے۔ یہ بھی کوشش کرتے رہیں گے کہ تمہیں اج شہر کا راجا بنادیں۔ اگر سلطان شہاب الدین کا ٹکراؤ ہندو راجاؤں سے ہو تو تم اس جنگ میں شامل ہوجانا اور اپنا حق طلب کرنا۔ ابھی تو تم بالک ہو مگر یہ سب کچھ آج نہیں ہونا ہے۔ راجا بھیم دیو کو اپنا دشمن سمجھنا کہ اسی کی غداری نے سلطان کو ہم پر مسلط کیا ہے۔"

یہ رات گزری اور صبح ہوئی تو راج کماری نے اپنے بھائی کو آخری مرتبہ جی بھر کے دیکھا۔ دونوں بھائی بہن دیر تک گلے لگ کر روتے رہے۔ دیوداس نے ماں کے قدم چھوئے اور چلا گیا۔

دلپت اپنی پریشانیوں میں گم تھا۔ اسے خبر تک نہ ہوئی کہ راج کمار محل میں نہیں۔

اب صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا۔

شام کے وقت دلپت رائے روزانہ کی طرح محل سے نکلا اور فصیل پر جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ رانی بھی اس کے ساتھ تھی۔

"تم کیوں چلی آرہی ہو؟" دلپت نے کہا۔ "تم تو سلطان کے ساتھ ہو؟ میرے خلاف ہو۔"

"میں آپ کو سمجھاتی رہی ہوں لیکن میرا دھرم تو آپ کے ساتھ ہے۔ جو آپ کا فیصلہ وہی میرا فیصلہ۔"

دونوں بہت بلندی تک پہنچ گئے تھے۔ اچانک دلپت رائے کا پاؤں پھسلا اور وہ اتنی بلندی سے نیچے آگیا۔ جو لوگ رانی اور راجا کے ساتھ چل رہے تھے کچھ سمجھ ہی نہ پائے اور نیچے کی طرف بھاگے۔ رانی بھی لوگوں کو دکھانے کے لیے چیختی ہوئی نیچے آگئی، وہ یہ دیکھنے آئی تھی کہ دلپت مرگیا یا بچ گیا۔

سب کی طرح وہ بھی حیران تھی۔ دھکا تو اس نے دیا تھا لیکن تیر اس نے نہیں چلایا تھا جبکہ اوندھے پڑے ہوئے دلپت کی پیٹھ میں ایک تیر بھی پیوست تھا۔ اس کا مطلب یہی ہوسکتا تھا کہ فصیل پر بیٹھا ہوا کوئی سپاہی بھی دلپت سے بیزار تھا۔

دلپت مرگیا۔ یہ فیصلہ نہ ہوسکا کہ اس کی موت سیڑھیوں سے گرنے سے ہوئی یا تیر جان لیوا ثابت ہوا۔

اب رانی کو روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس نے شہر کے دروازے کھلوا دیے۔ شہاب الدین غوری اپنے لشکر کے

میں داخل ہوا۔ شہر کے لوگ خوف زدہ تھے لیکن انہیں ... کہ سپاہیوں نے ہتھیار پھینک دیے ہیں اور ... اب ... دیکھ رہے ہیں۔

شہاب الدین غوری راج محل کے دروازے پر پہنچا تو رانی استقبال کے لیے تیار کھڑی تھی۔ دلپت کا سپہ سالار بالک رام ... ماند خاموش تھا۔ محل میں موجود جتنے سپاہی تھے ... کے انداز میں زمین پر پڑے ہوئے تھے۔

"میں تم سب کو امان دیتا ہوں۔ تم میری طرف سے آزاد ہو۔ جہاں چاہو چلے جاؤ۔ اگر میری ملازمت میں رہنا چاہتے ہو تو شہر کے نظم ونسق میں میرے لشکریوں کا ہاتھ بٹاؤ۔"

چند ضروری احکام جاری کرنے کے بعد قطب الدین ایبک اور علی کرماج کو شہر کے نظم ونسق پر متعین کیا اور خود رانی کے ساتھ اس کے محل میں پہنچ گیا؟

"میں امید کروں کہ سلطان کو اپنا وعدہ یاد ہے؟"

"میں مسلمان ہوں، مسلمان اپنا وعدہ کبھی نہیں بھولتا۔"

"راج کماری آپ کے انتظار میں ہے۔"

"ہم آج تھکن اتاریں گے۔ کل راجکماری کو اسلام قبول کرنا ہوگا۔"

"مجھے بھی اپنا وعدہ یاد ہے۔ ہم ہندو عورتوں کا دھرم وہی ہوتا ہے جو اس کے پتی کا ہوتا ہے۔ وہ اس کے لیے جی سے تیار ہے۔"

"اور تم رانی چمپا؟"

"میں بھی اپنا دھرم چھوڑنے کو تیار ہوں۔"

"ہمیں اب آرام کرنا ہے۔"

وہ آرام کرنے کے لیے اس بستر پر لیٹا جو کبھی دلپت رائے کے استعمال میں رہتا ہوگا تو دنیا کے نشیب وفراز کے کئی رنگ اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہوکر گزر گئے۔

اس کے سامنے اس کے ماضی کا ایک ایک ورق کھلا ہوا تھا۔ ایک زمانہ وہ تھا جب اس کے باپ بہاء الدین کے انتقال کے بعد اس کے چچا علاؤالدین جہاں سوز نے غزنی پر حملہ کیا اور ظلم وبربریت کا ایسا بازار گرم کیا کہ علاؤالدین جہاں سوز کے لقب سے مشہور ہوا۔ اس نے آل سبکتگین کی قبریں تک کھدوائیں اور ان کی ہڈیوں کو نذر آتش کیا۔ اور ... واپس آکر اپنے بھتیجوں شہاب الدین اور غیاث الدین کو ... کی حکومت عطا کی۔

... تبدیل ہوا، شہاب الدین اور غیاث الدین ... کے قلعے میں قید تھے۔

میرے چچا علاؤالدین کے کسی نے ایسے کان بھرے کہ اس نے ہم دونوں بھائیوں کو قید کردیا۔ وقت اسی طرح تبدیل ہوتا ہے۔ جب چچا کا انتقال ہوگیا تو اس کا بیٹا سیف الدین غورستان کا حکمران بنا۔ اسے مجھ پر اور میرے بھائی پر رحم آیا اور اس نے ہمیں رہا کردیا۔

ہم دونوں بھائیوں کی قسمت عروج پر تھی۔ ابھی ایک سال اور کچھ مہینے ہی گزرے تھے کہ سیف الدین، غزنویوں سے معرکہ آرائی میں مارا گیا۔ غور کی بادشاہت میرے بڑے بھائی غیاث الدین کے ہاتھ میں آئی۔ غیاث الدین نے مجھے یعنی شہاب الدین کو تکینا باد (بعض نے تگنا باد لکھا ہے) میں چھوڑا اور دوسرے علاقوں کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوا۔

یہاں تک سوچنے کے بعد وہ دل ہی دل میں مسکرانے لگا۔ میں تکینا باد میں تھا لیکن چھوٹے چھوٹے لشکر لے کر غزنی پر حملے کرتا رہتا تھا۔ ان حملوں کو سپاہیانہ شرارت ہی کہا جاسکتا ہے۔ ان حملوں کا مقصد یہ تھا کہ غزنی جو سبکتگین کی اولاد کے قبضے میں چلا گیا تھا اسے دوبارہ غور کی سلطنت میں شامل کیا

جائے۔ میری بار بار کی کوششوں کے باوجود غزنی پر قبضہ نہ ہوسکا۔ پھر غیاث الدین نے خود لشکر کشی کی اور غزنی کو غورستان کا حصہ بنا دیا۔ یہاں کی حکومت میرے سپرد کردی۔ میں غوری تھا اور غزنی پر حکومت کر رہا تھا۔ وہ غزنی جس پر سلطان محمود غزنوی جیسا طاقتور بادشاہ حکومت کر چکا تھا۔ اس کو کہتے ہیں دنیا کے نشیب و فراز۔

میں نے اپنے بھائی غیاث الدین کے حکم سے ملتان پر حملہ کیا اور اب اچ فتح کرلیا۔ وہ بستر جس پر کبھی دلپت رائے سوتا تھا میرے نیچے بچھا ہوا ہے۔ اسے کہتے ہیں دنیا کے نشیب و فراز۔

وہ رات بھر اپنی خیالات میں غلطاں رہا۔ صبح سو کر اٹھا تو تھکن اتر چکی تھی لیکن آنکھیں نیند کے بوجھ سے بھاری ہو رہی تھیں۔

اس نے ماں بیٹیوں کو مسلمان کیا اور راجکماری اس کے حرم میں آگئی۔

سلطان شہاب الدین نے اس کے ساتھ شب زفاف گزاری ضرور لیکن یہ خیال بار بار آتا تھا کہ یہ اپنے باپ کے قتل میں اپنی ماں کی شریک رہی ہے۔ یہ اپنی ماں کو روک سکتی تھی لیکن ملکہ بننے کے لالچ میں خاموش رہی ہوگی۔ رانی ملاقات کے لیے آئی تو بھی یہی خیال دامن گیر رہا۔ جس عورت نے اپنے شوہر سے بے وفائی کی اس پر کیسے اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ یہ دونوں اگر یہاں رہیں تو ضرور کوئی نہ کوئی گل کھلائیں گی۔

راجکماری کے ساتھ چند دن گزارنے کے بعد ہی جب سلطان نے یہ حکم جاری کیا کہ رانی اور راجکماری کو غزنی بھیج دیا جائے تو رانی سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔

”رانی کی شادی کو ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں اور آپ اسے غزنی جیسے دور دراز ملک میں بھیج رہے ہیں اور وہ بھی اکیلی۔“

”اکیلی کہاں، تم بھی اس کے ساتھ ہوگی۔ کیا تم نے نہیں کہا تھا کہ جہاں تمہاری بیٹی رہے گی وہاں تم بھی رہو گی۔“

”ملکہ تو بادشاہ کے ساتھ ہی اچھی لگتی ہے۔ جب آپ یہاں ہیں تو اسے بھی یہیں رہنا چاہیے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ غزنی جائیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ چلے جائیں۔“

”مجھے ابھی یہاں بہت سے معرکے سر کرنے ہیں۔ ہم مسلمان ہیں جنگوں میں اپنی عورتوں کو اپنے ساتھ نہیں رکھتے۔“

”میں اور راج کماری اچ میں ہی رہیں گے۔ آپ کے ساتھ میدان جنگ میں نہیں جائیں گے۔“

”پھر بھی تم لوگوں کو غزنی جانا ہوگا۔“

بادشاہ کے حکم سے سرتابی نہیں کی جاسکتی تھی۔ رانی اور اجکماری کو غزنی جانا پڑا۔

رانی کو سلطان کے تیور دیکھ کر ایسا دھچکا لگا کہ غزنی پہنچتے ہی بیمار پڑ گئی۔ اس کی بیماری کی خبر سلطان تک پہنچائی گئی لیکن وہ یہاں کے نظم و نسق میں مصروف رہا۔

شہاب الدین نے رانی کے توسط سے اپنا کام نکال تو لیا تھا لیکن دل ہی دل میں اس سے ناراض تھا کیونکہ اس نے اپنے شوہر سے بے وفائی کی تھی۔ اس نے اس کی بیماری کی ذرا بھی پروا نہیں کی۔ پھر اسے اطلاع ملی کہ رانی کا انتقال ہوگیا۔

غزنی میں راج کماری اکیلی رہ گئی تھی۔ سلگتے دن جلتی راتیں تنہائی میں گزرنے لگیں۔ کچھ ماں کی موت کا صدمہ، کچھ سلطان کی بے رخی کا احساس۔ وہ پتھر کی طرح خاموش ہوگئی۔ بیٹھی دیواروں کو تکتی رہتی۔ اس کے خدمت گاروں کو تو یہ شک ہونے لگا تھا کہ راجکماری بولنا بھول گئی ہے، قوت گویائی سے محروم ہوگئی ہے۔

سلطان کو خیال بھی نہیں آیا کہ اسے غزنی سے بلوا لیتا۔ شاید اسے یاد بھی نہیں رہا تھا کہ راجکماری سے اس کی شادی ہوئی ہے۔

راجکماری اس تنہائی کا مقابلہ نہ کرسکی اور اس کا بھی انتقال ہوگیا۔

سلطان شہاب الدین اردگرد کے علاقوں کا نظم و نسق درست کرچکا تھا۔ اب وہ حاکم گجرات رائے بھیم دیو کی طرف متوجہ ہونے کا خواہش مند تھا۔ وہ ابھی بھولا نہیں تھا کہ اس نے دلپت رائے کو مقابلے پر اکسایا تھا اور اس کی مدد کا وعدہ کیا تھا۔ یہ الگ بات کہ بعد میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا تھا اور اب سلطان کے علم میں یہ خبریں بھی آرہی تھیں کہ بھیم دیو، ہندوستان کے راجاؤں کو سلطان کے خلاف بھڑکا رہا ہے اور مل کر مقابلہ کرنے کے لیے ساز باز کر رہا ہے۔ اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ اس سے پہلے کہ یہ راجا بھیم دیو کی مدد کو پہنچیں وہ اس پر حملہ کردے گا۔

وہ تیاری مکمل کرچکا تھا کہ غزنی سے بغاوت کی خبریں آنے لگیں۔ اس نے اپنے ایک سردار علی کرماج کو ملتان، اچ اور اردگرد کے علاقوں کا حاکم بنایا اور خود غزنی واپس چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے لیے ہندو راجاؤں نے سکھ کا سانس لیا۔

☆☆☆

نہروالا کا حاکم گجرات رائے بھیم دیو، رانی راج کنول اعلان رام دیو محل کے ایک کمرے میں خاموش بیٹھے تھے۔ سب کے چہروں سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ بھیم دیو ابھی ابھی ایک ایسی خبر سنا چکا تھا کہ سب کا پریشان ہونا لازمی تھا۔ وہ اپنے اہل خانہ کو بتا چکا تھا کہ غزنی کا بادشاہ سلطان شہاب الدین ہم پر حملہ آور ہونے کے لیے اپنے علاقوں سے نکل کر ہندوستان میں داخل ہوچکا ہے۔

اس خاموشی کو ایک مرتبہ پھر خود بھیم نے توڑا۔

”اس مرتبہ شہاب الدین اپنے لشکر کو زندہ واپس نہیں لے جاسکے گا۔ میں نے اجمیر کے راجا رائے پتھورا، قنوج کے راجا جے چند اور دہلی کے راجا کھانڈے رائے کو خط لکھ دیے تھے۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اپنے اپنے لشکر ہماری مدد کو بھیجیں گے۔ سوچو وہ منظر کیسا ہوگا جب تینوں راجاؤں کے لشکر ہماری مدد کو پہنچیں گے اور شہاب الدین کو عظیم الشان شکست ہوگی۔“

رام دیو کے جوان خون نے شور مچایا۔ ”کیا ہم اکیلے شہاب الدین کا مقابلہ نہیں کرسکتے جو آپ نے ان راجاؤں کا احسان قبول کرلیا۔“

”شہاب الدین کوئی معمولی طاقت نہیں۔ وہ ملتان اور اچ میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کرچکا ہے۔“

”پتا جی، اس نے اچ میں بہادری سے نہیں چالبازی سے کام لیا تھا۔ اگر وہاں کی رانی غداری نہ کرتی تو اچ پر قبضہ نہیں ہوسکتا تھا۔“

”یہ تم غلط کہہ رہے ہو۔ وہ دلپت رائے کو میدان میں شکست دے چکا تھا۔ رانی نے ٹھیک کیا کہ دروازے کھلوا دیے ورنہ وہ دیر سے سہی، شہر میں داخل ہو ہی جاتا۔“

”آپ دلپت رائے نہیں ہیں پتا جی۔ ہم اکیلے بھی مقابلہ کرسکتے ہیں۔ آپ نے مدد طلب کرکے ریت ڈال دی ہے۔ کل کو ان پر مشکل آئے گی تو ہمیں بھی پہنچنا پڑے گا۔“

”تم ابھی بالک ہو۔ ان باتوں کو نہیں سمجھو گے۔ میں نے بڑی ہوشیاری سے ان تینوں کو شہاب الدین کا دشمن بنا دیا ہے۔ شہاب الدین اس شکست کے بعد اگر ہندوستان آیا تو وہ سوچ کر آئے گا کہ اس سرزمین پر چار طاقتیں اس کی منتظر ہیں۔ اچ ہم سے قریب ہے۔ شہاب الدین کی شکست کے بعد میں اچ پر بھی قبضہ کرلوں گا۔ تینوں راجا ہمارے دوست ہوں گے۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

بھیم دیو نے کئی نصیحتوں کے بعد انہیں مطمئن کردیا۔ اب بھیم دیو کو ضروری معائنے کے لیے لشکر گاہ کی طرف جانا تھا۔ وہ ان سب کو اسی کمرے میں چھوڑ کر چلا گیا۔

☆☆☆

سلطان شہاب الدین غوری اپنے لشکر کے ساتھ غزنی سے چلا۔ گھاٹیوں اور دریاؤں کو عبور کرتا ہوا ملتان اور اچ کی طرف آیا اور یہاں سے براہ ریگستان گجرات کی طرف روانہ ہوا۔ یہ 574ھ کا واقعہ ہے۔ وہ نہروالا کے نواح میں پہنچا تو بھیم دیو اس سے پہلے ہی پڑاؤ ڈال چکا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جنگ یہیں ہونی ہے۔ شہاب الدین بھی کچھ فاصلے پر خیمہ زن ہوگیا۔

شہاب الدین آنے والے حالات سے قطعی بے خبر تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تین بڑے لشکر اپنے اپنے علاقوں سے اس جنگ میں شامل ہونے کے لیے چل پڑے ہیں۔ اس کے مخبر ادھر ادھر پھیل گئے تھے لیکن یہ لشکر غیر معروف راستوں پر تھے لہٰذا مخبروں کو کچھ معلوم نہ ہوسکا۔

ان لشکروں کو بھی کوئی جلدی نہیں تھی کیونکہ طے یہ ہوا تھا کہ یہ لشکر جنگ شروع ہونے کے بعد میدان میں اتریں گے تاکہ شہاب الدین کو سنبھلنے کا موقع نہ مل سکے۔

شہاب الدین نے بھیم دیو کے لشکر پر ایک فاتحانہ نظر ڈالی اور اپنے لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ دوسری طرف سے بھیم دیو کی فوجیں آگے بڑھیں۔ بھیم دیو کی فوجوں نے خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن جلد ہی قدم اکھڑنے لگے۔ سورج آگ برسا رہا تھا کہ خون ہزمین، کی پیاس بجھانے لگا۔ تلواروں کے زور نے بھیم دیو کی اگلی صفوں کو صاف کردیا۔ پسپائی کے آثار صاف دکھائی دینے لگے تھے کہ عین اس وقت راجا اجمیر کا لشکر نمودار ہوا۔ شہاب الدین نے اس نئے حملہ آور کو تشویش سے دیکھا۔ سالاروں کو حکم دیا کہ بھیم کے تھکے ہوئے سپاہیوں کو چھوڑ کر نئے حملہ آوروں کو تلواروں پر رکھ لیں۔ تلواروں نے اپنا رخ تبدیل کیا ہی تھا کہ کھانڈے رائے آن موجود ہوا اور پھر قنوج کا راجا آگیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ پورا ہندوستان اس میدان میں سما جانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ ہر راجا کا لشکر، شہاب الدین کے لشکر سے بڑا تھا۔

شہاب الدین کا لشکر پہاڑوں میں گھرے اونٹ کی طرح کم حیثیت نظر آرہا تھا۔

جنگ کا نقشہ بدل گیا تھا۔ مسلمان سپاہی کٹ کٹ کر گر رہے تھے۔ اب مزید جنگ کرنا اپنے سپاہیوں کو خودکشی پر مجبور کرنا تھا۔ اس نے پسپائی اختیار کی۔ فرار ہی میں عافیت سمجھی۔ اس نے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ اتنے بڑے لشکر کے سامنے سے بچ نکلنا ہی کسی کارنامے سے کم نہیں تھا۔

شہاب الدین نے بڑی مشکلوں سے جان بچائی اور بچے کھچے لشکر سمیت بھاگتے ہوئے غزنی کی راہ لی۔

وہ اتنی بڑی ہزیمت اٹھا کر غزنی آیا تھا کہ حوصلوں نے سپر ڈال دی تھی لیکن شہاب الدین کو تاریخ میں اپنا نام درج کرانا تھا۔ اس نے ہمت نہیں ہاری۔ غزنی میں جگہ جگہ بھٹیاں لگا دی گئیں۔ بڑے پیمانے پر اسلحہ تیار ہونے لگا۔ بڑے پیمانے پر بھرتیاں کیں اور ایک نیا لشکر تیار کرلیا۔

اسے پچھلے سال تجربہ ہو چکا تھا کہ ہندوستان کے راجا متحد بھی ہو سکتے ہیں۔ اس مرتبہ اس نے یہ حکمت عملی تیار کی کہ راجاؤں پر حملہ آور ہونے سے پہلے راستے میں پڑنے والے تمام بڑے شہروں پر قبضہ کرلیا جائے تاکہ ان راجاؤں پر اس کا رعب بھی قائم ہو اور ان قوتوں کا بھی خاتمہ ہو جو ان راجاؤں کی مدد کرسکتی ہیں۔

وہ غزنی سے نکلا۔ گویا شیر کچھار سے باہر گیا۔ اس نے اپنے گھوڑوں کا رخ پشاور کے نواح کی طرف موڑ دیا۔ ان علاقوں تک پہنچا جو ابھی تک اس کی عملداری میں نہیں تھے۔ یہ علاقے اس وقت بگرام، پرشور اور فرسور کہلاتے تھے۔ جو طاقت سامنے آئی اسے مسل کر رکھ دیا۔ ان علاقوں پر اس کا قبضہ ہو گیا۔

پشاور اور اس کے گرد و نواح میں اپنی عملداری مضبوط کرنے کے بعد وہ لاہور کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ لاہور کی حکومت اس وقت غزنوی خاندان کے آخری تاجدار خسرو ملک کے ہاتھوں میں تھی۔

خسرو ملک کی حکومت کی بنیادیں راجا دہلی اور دوسرے راجاؤں کے بار بار حملوں اور افغانوں کی یورشوں کے سبب کمزور ہو چکی تھیں۔ اب خسرو ملک میں اتنی طاقت نہیں رہ گئی تھی کہ وہ شہاب الدین کا مقابلہ کرتا۔ وہ کھلے میدان میں گرجنے کے بجائے قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی بہت گفت و شنید کے بعد شہاب الدین نے بھی جنگ کا ارادہ ترک کر دیا۔

خسرو ملک نے اپنا ایک نوعمر لڑکا، ایک ہاتھی چند تحائف کے ساتھ سلطان کے پاس بھیجے اور صلح کا خواہاں ہوا۔

"میں صلح کا خواہاں ہوں۔ آپ ہندو راجاؤں سے جنگ کے لیے نکلے ہیں۔ مجھ مسلمان پر ہاتھ نہ ڈالیں۔ میری حکومت میرے پاس رہنے دیں۔ میں کسی بھی وقت آپ کی راہ میں مزاحم ہونے کی جرأت نہیں کروں گا۔ آپ میرے لڑکے کو بہ طور ضمانت اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔"

نیک نیت بادشاہ نے خسرو ملک کے بیٹے کو واپس کر دیا اور لاہور کی حکومت خسرو ملک کے حوالے کر کے غزنی چلا گیا۔

576ھ میں شہاب الدین ایک مرتبہ پھر غزنی سے نکلا اور سندھ کے مشہور شہر دیبل یا دیبول پر حملہ آور ہوا۔ یہ سندھ کی قدیم بندرگاہ اور مشہور شہر تھا۔ یہ وہی دیبل تھا جہاں کبھی محمد بن قاسم آیا تھا اور راجا داہر کو شکست دی تھی۔

شہاب الدین نے صرف تین ماہ میں نہ صرف دیبل بلکہ دریائے سندھ کے تمام مقامات کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ اپنے ایک امیر سیف الملوک کو سندھ کا حاکم بنایا اور خود بے پناہ مال غنیمت لے کر اپنے وطن لوٹ گیا۔

سندھ کی فتح کے بعد چار سال تک غزنی سے ہندوستان تک کے راستوں نے کسی لشکر کا منہ نہیں دیکھا لیکن 580ھ میں گھوڑوں کی ٹاپوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ شہاب الدین نے ایک مرتبہ پھر ایک مہم شروع کی۔ دریائے راوی اور چناب کے اردگرد کے علاقوں کو خوب جی بھر کر لوٹا اور سیالکوٹ پہنچ کر اسے فتح کرلیا۔ یہاں اس نے ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرایا۔ سیالکوٹ اور گرد و نواح کے جتنے علاقے اس نے فتح کیے تھے، ان کی حکومت اپنے ایک سالار حسین خرمیل کے سپرد کی اور خود غزنی واپس چلا گیا۔

اس کے عزائم کچھ اور تھے لیکن وہ یہ سیڑھیاں زینہ بہ زینہ چڑھ رہا تھا۔

شہاب الدین کے چلے جانے کے بعد لاہور کے حاکم خسرو ملک کو قلعہ سیالکوٹ کو فتح کرنے کی سوجھی۔ اس نے آس پاس کے ہندوؤں اور کھکر قوم کو اپنے ساتھ ملایا اور قلعہ سیالکوٹ کو فتح کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

کھکر ایک لامذہب قوم تھی۔ یہ لوگ دریائے سندھ سے لے کر کوہ سوالک کے دامن تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ قوم نہایت فتنہ پرور تھی۔ آس پاس کے قبیلوں کا جینا حرام کر دیا تھا۔ ان لوگوں نے خدا پرست مسلمانوں کے لیے پنجاب کا سفر کرنا بھی مشکل کر دیا تھا۔

یہ لوگ کسی مذہب اور اخلاقی اصولوں کے قائل نہیں تھے۔ لڑکیوں کے ساتھ ان کا برتاؤ نہایت برا تھا۔ ان کے ہاں رواج تھا کہ جب ان کی لڑکی جوان ہو جاتی تھی تو لڑکی کا باپ یا بھائی اسے دروازے پر لے کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ ایسا لباس پہنایا جاتا تھا کہ اس کے جسم کے حصے صاف نظر آئیں۔ راستہ چلنے والوں کو اشارے سے بلایا جاتا تھا۔ لڑکی کی قیمت بتائی جاتی تھی۔ خریدار بھی لڑکی کے جسم کو ٹٹول کر دیکھتا تھا اور اپنی تسلی کر لیتا تھا۔ گاہک آتے رہتے تھے اور یہ عمل جاری رہتا تھا۔ اگر کوئی خریدار لگ جاتا تو وہ لڑکی اس کے حوالے کر

دی جاتی تھی ورنہ اس بے زبان کو وہیں موت کے گھاٹ اتار کر اس کے بوجھ سے نجات حاصل کرلی جاتی تھی۔

ان لوگوں میں یہ دستور بھی تھا کہ ایک بیوی کے کئی کئی شوہر ہوتے تھے۔ جب کسی شوہر کو اپنی خواہش پوری کرنی ہوتی تھی اور وہ بیوی کے گھر میں داخل ہوتا تھا تو دروازے پر اپنا نشان لگا جاتا تھا تاکہ دوسرے شوہروں کو اس کی موجودگی کا علم رہے۔ ایسے عالم میں اگر کوئی دوسرا شوہر عورت کے مکان پر آتا تو وہ نشان دیکھ کر اندازہ کرلیتا کہ اس وقت اس کی بیوی تنہا نہیں ہے۔ وہ واپس چلا جاتا تھا۔

یہ وہ عورتیں ہوتی تھیں جنہیں کئی خریدار مل کر بھاری رقم میں خریدتے تھے لہٰذا ان سب کا اس پر برابر کا حق ہوتا تھا۔

خسرو ملک نے اسی بے دین قوم کو اپنے ساتھ ملا کر قلعہ سیالکوٹ کو فتح کرنا چاہا لیکن ناکام رہا اور واپس ہونے پر مجبور ہوگیا۔

اس کی اس ناکامی کا ایک سبب جموں کا راجا چکر دیو تھا جو خسرو ملک سے عداوت رکھتا تھا۔ اس نے ایک طرف تو اپنا قاصد غزنی کی طرف دوڑایا کہ وہ شہاب الدین کو باخبر کر دے، دوسری طرف وہ اپنا لشکر لے کر سیالکوٹ کے قریب پہنچ گیا۔ اب خسرو ملک دوطرفہ گھر گیا تھا۔ آگے بڑھتا تو حسین خرمیل قلعے سے نکل کر حملہ آور ہوتا پیچھے چکر دیو کا لشکر کھڑا تھا۔ اس نے واپسی میں عافیت سمجھی۔

شہاب الدین کو خبر پہنچی تو وہ خسرو ملک کی اس حرکت پر سخت برافروختہ ہوا اور ایک زبردست لشکر تیار کر کے لاہور آگیا۔

خسرو ملک اس بار بھی مقابلے کی تاب نہ لاتے ہوئے قلعہ بند ہوگیا۔ بیٹھا سوچتا رہا کہ وہ کب تک قلعہ بند رہ سکے گا۔ شہاب الدین کا غصہ کم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ قلعے کے دروازے کھول دیے جائیں۔ شاید اس مرتبہ بھی اسے معافی مل جائے۔

اس نے قلعے کے دروازے کھول دیے اور نہایت عاجزی کے ساتھ سلطان کی خدمت میں پہنچ گیا اور نہایت عزت واحترام کے ساتھ اسے شہر میں لے کر آیا۔ اس طرح لاہور بھی فتح ہوگیا۔ اس نے لاہور کو بھی ملتان کے حاکم علی کرماج کے حوالے کردیا۔

خسرو ملک نے پہلے کی طرح اب بھی چاہا کہ اسے امان دے دی جائے لیکن شہاب الدین اب اس کی باتوں میں آنے والا نہیں تھا۔ اس نے خسرو ملک اور اس کے بیٹے کو غیاث الدین کے پاس فیروز کوہ کی طرف روانہ کردیا۔ غیاث الدین نے دونوں باپ بیٹوں کو جرجستان کے ایک قلعے میں قید کردیا۔ یہ وہی قلعہ تھا جس میں کبھی علاؤالدین جہاں سوز نے غیاث الدین اور شہاب الدین کو قید کیا تھا۔ اسی کو کہتے ہیں دنیا کے نشیب وفراز۔

اس قلعے میں اور بھی غزنوی قیدی تھے۔ غیاث الدین نے ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان میں خسرو ملک بھی شامل تھا جو قتل ہوا اور یوں سلطان محمود کے خاندان کا آخری چراغ بھی گل ہوگیا۔

587ھ میں شہاب الدین غوری ایک مرتبہ پھر ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ لاہور اب غوریوں کے قبضے میں تھا۔ شہاب الدین کا امیر علی کرماج اس کا حاکم تھا۔ اردگرد کے علاقوں میں شورشیں ہوتی رہتی تھیں۔ دہلی اور اجمیر کے راجا بھی چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے جنہیں علی کرماج بڑی خوبصورتی سے پسپا کرتا چلا آرہا تھا۔

لاہور شہر دہلی تک پہنچنے کا ایک شاندار دروازہ تھا۔ اسی لیے شہاب الدین چاہتا تھا کہ لاہور کو مستحکم کیا جائے اس کے لیے ضروری تھا کہ لاہور کے اردگرد جو عام شہر ہیں انہیں اپنی عملداری میں کرلیا جائے۔ اس سے پہلے وہ اسی خیال سے سیالکوٹ کی طرف گیا تھا۔ اس مرتبہ جو وہ ہندوستان آیا تو اس نے بٹھنڈا کے قلعے کا رخ کیا۔ بٹھنڈا نہایت اہم شہر تھا اور اجمیر کے راجا کی سلطنت میں شامل تھا۔ بٹھنڈا میں رائے پتھورا کا ایک خاصا بڑا لشکر موجود تھا۔ شہاب الدین نے کامیاب حملہ کیا اور معمولی سی جھڑپ کے بعد قلعہ فتح کرلیا۔

اس نے یہ قلعہ ملک بہاء الدین کے سپرد کیا اور تیرہ سو سواروں کی جماعت کے ساتھ یہاں چھوڑ کر خود واپسی کی تیاریوں میں مصروف ہوگیا۔ وہ واپسی کی تیاریاں مکمل کرچکا تھا کہ مخبروں کی اطلاع پر اس کے کان کھڑے ہوگئے۔ اسے اطلاع ملی کہ رائے پتھورا اور اس کا بھائی کھانڈے راؤ، راجا دہلی دو لاکھ سواروں اور تین ہزار ہاتھیوں کا ایک زبردست لشکر لے کر بٹھنڈا کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ان دونوں بھائیوں نے ہندوستان کے دیگر راجاؤں کو بھی خط لکھے ہیں۔ دیگر راجا بھی جلد ہی اس جنگ میں شامل ہوجائیں گے۔ رائے بھیم دیو بھی اپنے لشکر کے ساتھ چل نکلا ہے۔

اس خبر کو سنتے ہی شہاب الدین نے سامان سفر کھول دیا۔ لشکر سمجھا کہ یہ ہنگامۂ کارزار اس کی غیر موجودگی میں برپا نہیں ہوا۔

شہاب الدین اس سال اپنی فتوحات کو بٹھنڈا تک محدود رکھنا چاہتا تھا اس لیے زیادہ بڑا لشکر اس کے پاس نہیں

[illegible] ہی خلاف مردانگی سمجھا کہ لشکر کی کمی کا بہانہ [illegible] لوٹ جائے۔ وہ اسی لشکر کے ساتھ رائے [illegible] مقابلے کے لیے روانہ ہوا۔ دہلی سے چالیس کوس [illegible] دریائے سرسوتی کے کنارے پر واقع قصبہ ترائن [illegible] دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔

رائے پتھورا کے لشکر کی عجیب کیفیت تھی۔ انسانوں کا [illegible] شہاب الدین کے سامنے کھڑا تھا۔ بڑے بڑے [illegible] جارہے تھے۔ قرنوں کی آوازوں سے دل دہل [illegible] تھے۔ ہاتھیوں کی چنگھاڑ نے میدان سر پر اٹھایا ہوا [illegible] معلوم ہوتا تھا ہاتھیوں کی سونڈیں نہیں ہیں، اندھیری [illegible] میں درخت کھڑے جھوم رہے ہوں۔ تین ہزار مست ہاتھی لشکر کے آگے دیوار بنے کھڑے تھے۔

شہاب الدین کا لشکر بھی نعرہ ہائے تکبیر بلند کر کے اپنے [illegible] کا یقین دلا رہا تھا۔

معرکۂ کارزار گرم ہوا تو دونوں طرف کے سورماؤں نے جانبازی کے جوہر دکھانے شروع کیے۔ ہندوؤں کا لشکر تعداد میں اتنا زیادہ تھا کہ مسلمان سپاہیوں کے قدم اکھڑنے لگے۔ شہاب الدین کے لشکر کا میمنہ اور میسرہ بالکل خالی ہوگیا۔ قلب لشکر میں البتہ کچھ لشکری باقی رہ گئے تھے جو ڈٹ کر مقابلہ کررہے تھے لیکن صاف ظاہر ہورہا تھا کہ تھوڑی دیر میں قلب کا زور بھی ٹوٹ جائے گا۔ اس افراتفری میں ایک امیر گھوڑا دوڑاتا ہوا شہاب الدین کے قریب آیا۔

"سلطان، ہماری فوج کے میمنہ اور میسرہ کے دونوں امیر خوفزدہ ہوکر میدان جنگ سے فرار ہوچکے ہیں۔ افغانی اور خلجی سردار بھی جو ہمیشہ بڑھ چڑھ کر باتیں کیا کرتے تھے، غائب ہوچکے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ بھی اس وقت جنگ سے ہاتھ اٹھائیں اور لاہور کی طرف روانہ ہوجائیں۔"

"کیا بکتا ہے۔" سلطان نے ڈانٹ کر کہا۔ "مجھے بزدلی کا سبق سکھاتا ہے۔ میں بھی اگر فرار ہوگیا تو مجھ میں اور بھاگنے والے سرداروں میں کیا فرق رہ جائے گا۔ مجھے قسمت نے آخری جنگ لڑنے پر مجبور کردیا ہے، میں آخری جنگ لڑ رہا ہوں۔ اگر تجھے بھاگنا ہے تو بھاگ جا۔"

سلطان نے اللہ کا نام لیا اور قلب لشکر کے باقی ماندہ سپاہیوں کو ساتھ لے کر دشمن پر حملہ کردیا۔ وہ اس بہادری سے لڑا کہ دشمن کے سپاہی بھی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکے [illegible] اچانک دہلی کے راجا کھانڈے رائے کی نظر اس پر [illegible] اس نے اپنا ہاتھی شہاب الدین کی طرف بڑھایا۔ اسی [illegible] شہاب الدین نے بھی کھانڈے رائے کو دیکھ لیا۔ اپنا نیزہ سیدھا کیا۔ اس کی طرف بڑھا اور ہاتھی کے پاس پہنچ کر اس نے پورے زور سے ہاتھی کے منہ پر نیزے کا وار کیا۔ نیزہ ہاتھی کے منہ میں چلا گیا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ ہاتھی کے دانت ٹوٹ گئے۔ کھانڈے رائے بہادر راجپوت تھا۔ اس افتاد سے ذرا بھی نہیں گھبرایا۔ پورے ہوش وحواس میں رہتے ہوئے ہاتھی پر بیٹھے بیٹھے شہاب الدین کے بازو پر تلوار کا ایسا وار کیا کہ شہاب الدین بری طرح زخمی ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ شہاب الدین بے ہوش ہوکر گھوڑے سے گر جائے، ایک خلجی سپاہی نہایت پھرتی سے شہاب الدین کے گھوڑے پر چڑھ گیا اور گھوڑا دوڑاتا ہوا میدان جنگ سے بھاگ نکلا۔ یہ سپاہی اسے لے کر ان امیروں کے پاس پہنچا جو میدان جنگ سے بھاگ آئے تھے اور بیس کوس کے فاصلے پر خیمہ زن تھے۔

ایک مورخ نے اس واقعے کو اس طرح قلم بند کیا ہے۔

"جب کھانڈے رائے کے ہاتھوں زخمی ہوکر شہاب الدین زمین پر گر پڑا تو شام تک یہ شیر غورستان اسی عالم میں زمین پر پڑا رہا۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ جب سورج غروب ہوگیا تو اس کے غلاموں کا ایک گروہ اسے تلاش کرتا ہوا اس کے پاس سے گزرا۔ اس وقت تک وہ کچھ کچھ ہوش میں آچکا تھا۔ وفادار غلام اپنے بادشاہ کو صحیح وسلامت دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اسے اٹھا کر وہاں لے گئے جہاں جنگ سے فرار ہونے والے امیر جمع تھے۔"

دونوں واقعات میں یہ مماثلت یکساں ہے کہ شہاب الدین کی جان بچ گئی اور اسے اس کے امیروں تک پہنچا دیا گیا۔ یہاں سے وہ غورستان چلا گیا۔

شہاب الدین کو شکست دیتے ہی رائے پتھورا نے بٹھنڈا کا محاصرہ کرلیا۔ یہ محاصرہ تیرہ مہینے تک قائم رہا بالآخر حاکم قلعہ ملک بہاء الدین نے رائے پتھورا سے صلح کرلی۔ قلعے پر ہندوؤں کا قبضہ ہوگیا۔

محمد قاسم فرشتہ نے تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ غورستان واپس پہنچ کر شہاب الدین نے میدان جنگ سے بھاگنے والے امیروں سے تو کچھ نہیں کہا لیکن خلجی اور غوری امیروں کو سخت سزا دی۔ اس نے توبڑوں میں کچے جو بھروا کر ان امیروں کی گردنوں میں لٹکا دیے اور اسی حالت میں ان کو سارے شہر میں پھرایا۔ یہ حکم بھی جاری کیا کہ جو امیر کچے جو نہ کھائے اسے قتل کردیا جائے۔ امیروں نے اپنی جانوں کی سلامتی کو غنیمت سمجھا اور کچے جو کھالیے اور اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کیا۔

ان امیروں کی جان بخشی تو ہو گئی لیکن شہاب الدین کا دل صاف نہیں ہوا۔ ان میں سے کسی کو شرف باریابی نہیں بخشا۔ رائے پتھورا سے مقابلے میں فرار ہونے کی سزا یہ ملی کہ وہ بادشاہ کی نظروں سے گر کر دور ہو گئے۔

سلطان شہاب الدین نے ان امیروں سے نمٹنے کے بعد ہندوستان جانے اور ہندو راجاؤں سے جنگ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ دن کا چین اور رات کا آرام بھی اس نے خود پر حرام کر لیا تھا۔ اپنے لشکر کو نئے سرے سے استوار کیا اور ان کی تربیت کرنی شروع کی۔ ایک سال تک اس کے ہونٹوں پر کسی نے مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ اس کے ہمدرد اسے مشورہ دیتے تھے کہ اس طرح وہ اپنی صحت خراب کر لے گا لیکن اسے اپنی شکست کا داغ دھونا تھا۔ اس محنت کا نتیجہ تھا کہ ایک سال میں اس نے ایک لاکھ سات سو کا لشکر تیار کر لیا۔ اس لشکر میں زیادہ تر خلجی، افغانی اور ترک سپاہی شامل تھے۔ شاندار ہتھیار ان کے پاس تھے۔ بہت سے فوجی سردار تو اپنی مرصع ٹوپیوں اور جنگی سامان کی وجہ سے بادشاہ معلوم ہوتے تھے۔

وہ اس ایک لاکھ سے زیادہ کے لشکر کو لے کر ہندوستان کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے امیروں میں سے کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کدھر کا رخ کرے گا اور کس پر حملہ آور ہوگا۔ اس کا دل چونکہ اپنے امیروں سے صاف نہیں تھا اس لیے اس نے کسی کو بھی مشورے میں شامل نہیں کیا تھا۔ وہ غالباً ان بھگوڑے امیروں کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ ان کے مشورے کے بغیر بھی بڑی سے بڑی جنگ لڑ سکتا ہے۔

یہ عظیم الشان لشکر منزلیں طے کرتا ہوا چلا جا رہا تھا لیکن کسی امیر کی یہ جرأت نہیں تھی کہ سلطان سے اس کی منزل کا پوچھ سکے۔ یہاں تک کہ لشکر پشاور کے قریب پہنچ گیا تب ایک بوڑھے امیر نے ہمت کی اور سلطان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اب تک آپ کے جاں نثاروں کو یہ علم نہ ہو سکا کہ جہاں پناہ کا ارادہ کیا ہے اور کس دشمن کی تباہی کے لیے اتنے عظیم الشان لشکر کے ساتھ سفر کی زحمت فرمائی ہے۔"

شہاب الدین نے جواب دیا۔ "کیا تجھے معلوم نہیں کہ جس دن سے میں نے ہندوؤں سے شکست کھائی ہے اس دن سے میں نے اپنی بیوی کا منہ نہیں دیکھا ہے۔ یہ سارا سال میں نے انتہائی رنج و الم میں بسر کیا ہے۔ جن خلجی اور غوری امیروں نے میرے حقوق خدمت کو نظر انداز کر کے مجھے میدان جنگ میں تنہا چھوڑ دیا تھا، میں نے ان سے سلام دعا تک کو ترک کر دیا۔ ان نمک حرام امیروں سے مجھے کوئی امید نہیں۔ میں خداوند تعالیٰ کے بھروسے پر ہی اس لشکر کو لے کر ہندوستان پر حملہ کرنے جا رہا ہوں۔"

بوڑھے امیر کا حوصلہ کچھ اور بڑھا۔ اس نے عاجزانہ عرض کیا۔ "خداوند تعالیٰ آپ کو کامیاب و کامران اور آپ کے دشمنوں کو نامراد کرے۔ اس بوڑھے کی صرف ایک درخواست ہے کہ آپ اپنے امیروں کے قصور معاف فرما دیں اور انہیں شرف باریابی عطا فرمائیں۔ خدا معاف کر دینے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

"میں ایسے بزدل امیروں پر کیا بھروسا کروں جنہوں نے اپنی جانیں بچانے کے لیے میری جان کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔"

"بے شک ان امیروں نے بڑی غلطی کی تھی لیکن آپ انہیں معاف کر دیں گے تو آپ کا یہ سلوک انہیں راہ راست پر لے آئے گا۔ مجھے امید ہے کہ وہ دل و جان سے کوشش کریں گے کہ اپنی گزشتہ بدنامی کو نیک نامی میں بدل دیں اور اپنے آقا کا حق ادا کریں۔"

شہاب الدین بوڑھے امیر کی باتوں سے متاثر ہوا۔ اسی وقت دربار عام منعقد کیا۔ معتوب امیروں کو گراں قیمت خلعت اور مرصع خنجر عنایت کیے اور ان کی گزشتہ غفلت کو معاف کر کے آئندہ احتیاط سے کام لینے کی تلقین کی۔

اس معافی سے تمام امیروں میں ایک نیا جوش پیدا ہوا۔ انہیں تاسف ہو رہا تھا کہ انہوں نے ایسے مہربان بادشاہ کو ترائن کے معرکے میں تنہا چھوڑ دیا تھا اور آپس میں عہد باندھا کہ وہ آئندہ سلطان کے لیے خون کا آخری قطرہ تک بہانے کے لیے تیار رہیں گے۔

دربار عام کے دوسرے روز شہاب الدین نے پشاور سے کوچ کیا اور ملتان پہنچا۔ یہاں وہ وفادار امرا موجود تھے جنہوں نے اس کی غیر موجودگی میں خیر خواہی اور نمک حلالی کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ ان کے دامن انعام و اکرام سے بھر دیے۔

ملتان میں چند دن کے قیام کے بعد وہ لاہور پہنچا اور اپنے لشکر کے ساتھ شہر کے نواح میں پڑاؤ کیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے اپنے ایک معتمد امیر قوام الملک رکن الدین حمزہ کو اجمیر روانہ کیا کہ وہ راجا کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دے۔ وہ اسلام قبول کر لیتا ہے تو ٹھیک ورنہ اسے جنگ کی دعوت دو۔

رکن الدین حمزہ مقامی زبانوں اور ہندوؤں کی تاریخ سے واقفیت رکھتے تھے۔ اسی لیے ان کا انتخاب کیا تھا کہ وہ یہ کام بہ خوبی سرانجام دے سکتے ہیں۔

الدین حمزہ اجمیر روانہ ہو گئے اور رائے پتھورا سے مل کر اسے اسلام کی دعوت دی۔

"تم مسلمانوں کے سفیر۔ تمہاری کمزوری تم پر ظاہر ہو۔ صلح کا پیغام لے کر میرے پاس آئے ہو؟"

"راجا تم نے غلط اندازہ لگایا۔"

"صحیح کیا ہے یہ تم بتا دو۔"

"صحیح یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کا ہمیشہ سے قاعدہ رہا ہے جب ہم کسی غیر مسلم سے جنگ کرتے ہیں تو پہلے اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے بادشاہ شہاب الدین غوری نے تمہاری طرف پیغام بھیجا ہے کہ تم اسلام قبول کر لو۔ ہم جس طرح آئے تھے اسی طرح چلے جائیں گے۔ تمہارا ملک تمہارے پاس رہے گا۔"

"اگر میں ایسا نہ کروں تو؟"

"تو پھر مسلمانوں کی اطاعت قبول کرو، جزیہ دینا قبول کرو۔"

"میں جزیہ دینا بھی قبول نہ کروں تو کیا کرو گے؟"

"پھر ہم وہی کریں گے جو تم آریاؤں نے ہزاروں برس پہلے دراوڑوں کے ساتھ کیا تھا۔ انہیں نکال کر خود بیٹھ گئے تھے اور اب تک بیٹھے ہوئے ہو اور یہ ظاہر کرتے ہو جیسے تم ہی یہاں کے اصل باشندے ہو۔"

"رکن الدین حمزہ، اگر ہماری روایت کے خلاف نہ ہوتا تو ایسی سخت بات کہنے پر ہم تمہاری گردن اڑا دیتے۔"

"راجا، سچی بات پر کیوں ناراض ہوتے ہو۔ میں نے جو پیغام تمہیں پہنچانا تھا پہنچا دیا۔ اب تمہارے جواب کا انتظار ہے تاکہ تمہارا پیغام اپنے بادشاہ تک پہنچا سکوں۔"

"اس سے کہنا مجھے تمہاری کوئی شرط منظور نہیں۔ اس سے یہ بھی کہنا کہ نہ ہم دراوڑ ہیں اور نہ تم آریہ جو ہمیں نکال باہر کرو گے۔ اسے یہ بھی یاد دلانا کہ وہ ترائن کے میدان سے زخمی ہو کر بھاگا تھا۔ اگر ایک مرتبہ پھر بھاگنے کا شوق ہے تو ترائن کا میدان حاضر ہے۔ میں اس سے لڑنے کے لیے تیار ہوں۔"

راجا نے اپنی بات ختم کر دی تھی۔ رکن الدین حمزہ اٹھنے والے تھے کہ راجا کو کچھ اور یاد آ گیا۔ اس نے طنزیہ انداز میں رکن الدین حمزہ سے کہا۔

"ویسے ایک بات ہے، مسلمان بھاگتے بہت تیز ہیں واپس پہنچنے سے پہلے مڑ کر بھی نہیں دیکھتے۔"

"راجا، اس مرتبہ بھاگنے کی باری تمہاری ہے۔"

"تم میں سے کوئی زندہ بچے گا تو بھاگے گا۔ نہیں بھاگنا چاہو تو ہم تمہیں ترائن کے میدان ہی میں سلا دیں گے اور ہاں اب میں اس کے سوا تم سے کچھ کہنا نہیں چاہتا کہ اپنے بادشاہ کو میرا پیغام دینا کہ جن قدموں سے وہ لاہور تک پہنچا ہے انہی قدموں سے واپس لوٹ جائے۔"

رائے پتھورا نے مسلمانوں کے لیے ایسے تضحیک آمیز الفاظ استعمال کیے تھے کہ اب اس سے مزید گفت و شنید کی ضرورت نہیں تھی۔ شہاب الدین کا ایک لاکھ کا لشکر چلنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ اس نے ترائن کے میدان کی طرف چلنے کا حکم دے دیا۔

جنگ کا پیغام ملتے ہی رائے پتھورا نے ہندوستان کے تمام راجاؤں کو اپنی مدد کے لیے خطوط لکھے۔ بات دھرم کی تھی اور وطن کی تھی لہٰذا خط ملتے ہی اپنے لشکر لے کر اس کی مدد کو چل پڑے اور کچھ ہی دنوں میں ڈیڑھ سو چھوٹے بڑے راجا اپنے اپنے لشکروں کے ساتھ اجمیر کے گرد و نواح میں جمع ہو گئے۔ ان لشکروں کی تعداد تین لاکھ سے بھی تجاوز کر گئی تھی۔

ان راجپوت راجاؤں نے بہادری کا تلک اپنے ماتھوں پر لگایا اور قسم اٹھائی کہ جب تک ایک ایک مسلمان سپاہی کو ختم نہ کر لیں گے اپنی تلواریں نیام نہیں کریں گے۔

یہ راجا چونکہ ترائن کی پہلی لڑائی میں شہاب الدین کو شکست دے چکے تھے اس لیے ان کے حوصلے بہت بڑھے ہوئے تھے۔ لشکر کی تعداد بھی اتنی زیادہ تھی کہ انہیں اپنی فتح کا پورا یقین تھا۔

دونوں کے لشکر ترائن کے میدان میں آ کر خیمہ زن ہو گئے۔

☆☆☆

ابھی جنگ شروع نہیں ہوئی تھی۔ میدان جنگ میں موت کا سناٹا طاری تھا۔ ہندو راجا ایک جگہ پر جمع تھے اور آپس میں صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ انہوں نے آپس میں طے کیا کہ جنگ کے آغاز سے پہلے شہاب الدین کے پاس خط کی صورت میں ایک ہدایت نامہ بھیجا جائے۔ شاید اس خط کو پڑھ کر وہ جنگ سے باز آ جائے۔ ہر اہم راجا نے خط کے مندرجات طے کرائے اور انہیں ایک کاغذ پر تحریر کر لیا گیا۔ ایک مرتبہ پھر اس خط کو پڑھا۔ خط میں تحریر تھا۔

"ہم ہندو راجاؤں کے لشکر کی کیفیت تو تمہیں معلوم ہو ہی گئی ہوگی۔ ہمارے ساتھ جس قدر لشکر ہے وہ تمہیں اور تمہاری فوج کو تباہ و برباد کرنے کے لیے کافی ہے لیکن ابھی مختلف افواج کی آمد جاری ہے کہ جن کے قدموں سے زمین کا سینہ کانپ رہا ہے۔ اگر تمہیں اپنی جان عزیز ہے تو اپنے

سپاہیوں کی غربت پر رحم کھاؤ۔ ہم نے اپنے معبودوں کے سامنے قسم کھائی ہے کہ اگر تم اپنے ارادے سے باز آکر واپسی کا ارادہ کرلو گے تو ہم تم سے کسی قسم کا تعرض نہیں کریں گے اور تمہارا راستہ نہ روکیں گے۔

ہم تم پر رحم کھا کر تمہیں واپسی کا نیک مشورہ دیتے ہیں ورنہ یاد رکھو کہ کل صبح ہم اپنے تین ہزار ہاتھیوں کے ساتھ بے شمار توپچی سپاہیوں کی فوج سے میدان جنگ کو میدان حشر بنا دیں گے اور اس کے نتیجے میں تمہیں شکست کھا کر ذلت و رسوائی کے ساتھ یہاں سے بھاگنا پڑے گا۔"

سلطان شہاب الدین اپنے خیمے میں تشریف فرما تھا۔ مشعلیں روشن تھیں۔ مشعلوں کی روشنی میں صاف دیکھا جاسکتا تھا کہ اس کے دائیں جانب قطب الدین ایبک، غیاث الدین خلجی، حسین خرمیل اور کچھ دوسرے سالار بیٹھے ہوئے ہیں۔

دوسری جانب اس کے وزیر اور دوسرے عمائدین ہیں۔

یہ سب آنے والی جنگ کے لیے حکمت عملی طے کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ اس وقت سب خاموش تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ سلطان کب سلسلۂ کلام آغاز کرتا ہے۔

سلطان نے سالاروں اور عمائدین کو مخاطب کیا۔

"عزیزان من!"

ابھی وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ رکن الدین حمزہ خیمۂ شاہی میں داخل ہوئے۔

"حضور، رائے پتھورا کا ایک قاصد لشکر گاہ میں آیا ہے۔ اس کے پاس کوئی پیغام ہے جو وہ آپ تک پہنچانا چاہتا ہے۔" اس اطلاع پر سب نے ایک دوسرے کی طرف چونک کر دیکھا۔

قطب الدین ایبک نے کسی قدر خفگی سے کہا۔ "اس قاصد کو ابھی وہیں روکو۔ ہمارا اجلاس ختم ہوجائے اس کے بعد اسے باریابی ملنی چاہیے۔"

دوسرے کئی لوگوں نے بھی اس کی تائید کی لیکن بادشاہ نے ان سب کو ٹوک دیا۔

"صاحبو! پہلے اس قاصد سے ملاقات کرلینی چاہیے۔ معلوم تو ہو وہ کیا پیغام لایا ہے۔ اس وقت آپ لوگ موجود ہیں۔ اس کے پیغام کا جواب دینے میں آپ لوگوں کے مشورے کی ضرورت ہوگی۔"

قاصد کو پیش کردیا گیا۔ وہ اپنے ساتھ خط لایا تھا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ وہ اس خط کو بہ آواز بلند پڑھے۔ قاصد نے حکم کی تعمیل کی۔

شہاب الدین نے صبر و سکون سے خط سنا۔ وہ خط سے زیادہ اس خط میں چھپی ہوئی رائے پتھورا کی نیت کو سن رہا تھا۔ جب قاصد خط ختم کرچکا تو شہاب الدین نے جواب لکھوانا شروع کیا۔

"مجھے اس امر کا پورا پورا اندازہ ہے کہ آپ کا خط محبت اور ہمدردی کے جذبات سے بھرپور ہے۔ میں آپ کی ہدایت پر ضرور عمل کرتا لیکن کیا کروں، مجبور ہوں۔ میں اپنے بھائی کا محکوم ہوں اور اسی کے حکم کے مطابق یہ ارادہ کیا ہے کہ اگر مجھے اتنی فرصت ملے کہ میں کسی قابل اعتبار قاصد کو اپنے بھائی کے پاس بھیج کر آپ کے لشکر کی کثرت و قوت کا حال بیان کرسکوں اور اپنی کمزوری کی روداد بتا سکوں تو مجھے یقین ہے کہ اس شرط پر صلح ہوسکتی ہے کہ سرحد، پنجاب اور ملتان پر تو غوریوں کا قبضہ رہے اور باقی تمام ہندوستانی علاقے آپ کی حکومت میں چھوڑ دیے جائیں۔"

جب قاصد خط لے کر روانہ ہوا تو امرا کی حیرت بلکہ پریشانی ان کے چہروں سے ظاہر ہونے لگی۔ امرا نے آنکھوں آنکھوں میں قطب الدین ایبک کو اشارہ کیا کہ وہ استفسار کرے کہ ایسا معذرت خواہانہ خط بادشاہ نے کیوں لکھوایا۔

"ہم غلاموں کو یہ پوچھنے کا حق تو نہیں کہ حضور کی کیا مصلحت تھی پھر بھی ہم یہ جاننے کی کوشش ضرور کریں گے کہ دشمن پر اپنی کمزوری ثابت کرنے میں کیا مصلحت تھی۔"

"اگر آپ لوگ نہ بھی پوچھتے تو میں بتاتا۔ یہ خط نہیں تھا میری ایک چال تھی جو میں نے رائے پتھورا تک پہنچا دی ہے۔"

"کیا ہم یہ سمجھیں کہ یہ جنگ کچھ دنوں کے لیے ٹل گئی ہے؟"

"ہرگز نہیں بلکہ اب جنگ میں پہلے سے زیادہ جلدی کرنی ہے۔"

"پھر یہ خط؟"

"میں نے اپنی کمزوری اور ان کی قوت کا ذکر جان بوجھ کر کیا ہے تاکہ وہ زیادہ شد و مد سے تیاری نہ کریں بلکہ مطمئن رہیں۔ اس دھوکے میں رہیں کہ ہم پر ہر حال میں غلبہ پالیں گے۔ ہماری قوت کا صحیح اندازہ نہ کرسکیں۔ میں نے ان سے جان بوجھ کر اپنے بھائی سے مشورہ طلب کرنے تک مہلت مانگی ہے تاکہ وہ ہماری طرف سے غافل ہوجائیں اور یہ سمجھیں کہ ہم ان سے پہلے جنگ نہیں چھیڑیں گے جبکہ ہمیں ان کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر فوراً جنگ چھیڑنی ہے۔ شاید کل صبح۔"

شہاب الدین کو ہندوؤں کی فوج اور ان کی بہادری کا

پورا پورا علم تھا، اس کا سامنا کسی معمولی دشمن سے نہیں تھا۔ راجپوتوں کی بہادری کا تجربہ اسے پہلے بھی ہو چکا تھا اور اس وقت تو پورا ہندوستان امڈ آیا تھا۔ یہ آخری جنگ ہو سکتی تھی اور وہ اسے آخری جنگ کی طرح ہی لڑنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی فوج کو چار حصوں میں منقسم کیا اور ہر حصے کو یہ ہدایت کی کہ وہ باری باری ہندوؤں سے لڑائی کرے۔ اپنی فوج کو یہ ہدایت بھی کی کہ جب ہندوستانی ہاتھیوں کی قطاریں مسلمانوں پر حملہ آور ہوں تو یہ لوگ اپنے آپ کو جھوٹ موٹ کے فراری ثابت کریں اور جنگ کے میدان سے منہ موڑ کر ہندوؤں سے مقابلہ کرنے سے بھاگیں۔ جب ہندوستانی لشکر کے سپاہی ان کا پیچھا کرتے ہوئے اپنی حدود سے تھوڑا بہت باہر نکل آئیں تو پلٹ کر ان پر حملہ کر دیں اور اپنے نیزوں اور تلواروں کی جاں گزار ضربوں سے دشمن کو موت کے گھاٹ اتار دیں۔

"فوج کا ایک حصہ میرے پاس دوسرا قطب الدین ایبک، تیسرا غیاث الدین خلجی اور چوتھا حسین خرمیل کے پاس ہوگا۔ میرے ساتھ میرے نائب کی حیثیت سے محمد علی غازی اور امیر شکار ناصر الدین ہوں گے۔ فوج کے چاروں حصے ایسے تیر انداز مقرر کریں گے جو صرف یہ کام کریں گے کہ اپنے تیروں سے ہاتھیوں کو نشانہ بنائیں گے۔ دوسرے لشکری ہاتھیوں کے اندر جو دشمن کے لشکر کی صفیں ہوں گی انہیں ہدف بنائیں گے۔ اس کے بعد کچھ اس طرح پسپائی اختیار کی جائے گی کہ دشمن کو یہ گمان ہو کہ ہم فرار ہو رہے ہیں۔ بس یہی موقع ہوگا جب دشمن کا لشکر ہاتھیوں کی دیوار کو پیچھے چھوڑ کر ہمارے تعاقب کے لیے باہر نکل آئے گا۔ تم بھاگتے رہنا۔ پھر نعرۂ تکبیر بلند کروں گا، اس وقت پلٹ آنا اور تعاقب کرنے والوں پر ٹوٹ پڑنا۔ کچھ دائیں پہلو کو دبانا کچھ بائیں پہلو۔ میں سامنے کی طرف سے حملہ آور ہوں گا۔ مجھے امید ہے اس اچانک افتاد سے دشمن سنبھل نہیں پائے گا۔"

ان ہدایات کے بعد اس کے سالار اپنے اپنے لشکری صفوں کی درستی کے لیے باہر نکل گئے کیونکہ صبح ہوتے ہی جنگ کا آغاز کر دینا تھا۔ شہاب الدین سجدے میں گر کر اللہ تعالیٰ سے اس کی مدد کے لیے دعا گزار ہو گیا۔

رائے پتھورا کا قاصد شہاب الدین کا جواب لے کر اپنے لشکر میں پہنچا اور راجاؤں کے سامنے پیش ہو کر خط ان کے سامنے رکھ دیا۔ خط کو بہ آواز بلند پڑھا گیا۔ اس خط کا ایک ایک لفظ ان راجاؤں کے لیے طمانیت کا باعث تھا۔

رائے پتھورا نے راجاؤں کو مخاطب کیا۔ "آخر شہاب الدین کی سمجھ میں ہماری بات آ گئی۔ ہمیں بھی اس مہلت کا انتظار کرنا چاہیے جو اس نے مانگی ہے۔ ممکن ہے اس مہلت سے پہلے ہی وہ یہاں سے چلا جائے۔"

"رائے پتھورا، ایسا تو نہیں اس نے کوئی چال چلی ہو۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ کیا وہ ہمارے لشکر کی تعداد کو نہیں دیکھ رہا ہے۔ اسی لیے اب وہ معافی تلافی پر اتر آیا ہے۔"

"شہاب الدین کی عادت ہے کہ وہ شاطرانہ چالوں سے اپنا مطلب نکال لیتا ہے۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ دلپت رائے کے ساتھ اس نے کیا تھا۔ اس کی بیوی اور بیٹی کو لے کر بھاگ گیا تھا۔" ایک راجا نے کہا۔

"ہمارے لشکر میں کوئی رائی اچ نہیں ہے۔ وہ اگر جنگ میں پہل کرتا ہے تو نقصان اسی کا ہوگا۔ ہم تو خود یہ چاہتے ہیں کہ وہ ہم سے جنگ کرے۔ اب اگر وہ مہلت مانگ رہا ہے تو ہمیں بھی جلدی نہیں۔"

"پھر بھی ہمیں غافل نہیں رہنا چاہیے۔"

"ہمارے لشکر میدان میں موجود ہیں، چلے نہیں گئے ہیں۔ تم مطمئن رہو راجا بارس۔"

رائے پتھورا نے شہاب الدین کے جواب سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مسلمانوں کا لشکر واقعی بہت کمزور ہے اور پریشانی کی حالت میں ہے لہٰذا وہ اپنی قوت و کثرت کے نشے میں سرشار ہو کر مسلمانوں کی طرف سے بالکل غافل ہو گیا۔

اس کے لشکر میں رات بھر جنگ کی تیاری کے بجائے شراب کے دور چلتے رہے۔ نشے میں ڈولتے یہ راجا اپنے اپنے بستروں پر چلے گئے۔ لشکر بھی مطمئن تھا کہ جنگ کچھ دنوں کے لیے ٹل گئی ہے۔

ابھی پوری طرح دن نکلنے بھی نہیں پایا تھا کہ شہاب الدین کی فوج کے چاروں حصے بلائے ناگہانی کی طرح ٹوٹ پڑے۔ ہندوؤں کے لشکر کے سردار اگرچہ اس بلائے ناگہانی سے سخت پریشان ہوئے۔ ان کے ہتھیار تک ان کے جسموں سے الگ تھے لیکن انہوں نے جس طرح بھی ہو سکا جلد از جلد تیاری کی اور مسلح ہو کر مقابلے پر آ ڈٹے۔

پھر وہی ہوا جس کی ہدایت شہاب الدین نے کی تھی۔ شہاب الدین کے لشکر کے تیر اندازوں نے ہاتھیوں کو چھلنی کر دیا۔ ہاتھی گھبرا کر پیچھے ہٹنے لگے۔ اگلی صفیں ہاتھیوں سے آگے نکل آئیں، دوبدو لڑائی شروع ہو گئی۔ یہ ایسی افتاد تھی کہ اگر رائے پتھورا کے لشکر کی تعداد کم ہوتی تو یہ صفیں کب کی اکھڑ جاتیں۔ ہندو کٹ کٹ کر گر رہے تھے لیکن جتنے

ان سے زیادہ سامنے آ جاتے تھے۔ انسانوں کا سا انسانی لہریں ایک کے بعد ایک آ رہی تھیں۔ کٹ کٹ کر گر رہے تھے لیکن ہندوؤں کے قدم جمے ہوئے تھے۔ بس پھر وقت تھا جب شہاب الدین نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ اشارہ پایا تھا۔ مسلمان لشکر نے پسپائی کے انتظار میں پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ ہندو سرداروں نے اپنے لشکر کو للکارا۔ لشکری بھی دیکھ رہے تھے کہ مسلمان پسپا ہو رہے ہیں۔ وہ ان کا پیچھا کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ وہ فتح کے نشے میں اتنے سرشار تھے کہ ان کی صفیں بے ترتیب ہو گئیں۔ ایک ہجوم تھا جو مسلمانوں کے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ تکبیر کی آواز پھر بلند ہوئی۔ بھاگتے ہوئے سپاہی پلٹ آئے۔ شہاب الدین کے بارہ ہزار سپاہی الگ تھلگ کھڑے تھے وہ بھی ہندوؤں پر ٹوٹ پڑے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہندوؤں کا وہ لشکر پوری طرح کٹ گیا جو مسلمانوں کا پیچھا کر رہا تھا۔

اس گڑبڑ میں زخمی ہاتھی اپنے ہی لشکر کو روندنے لگے تھے لہٰذا ان ہاتھیوں کو میدان سے نکال لیا گیا۔ ان کے نکل جانے کے بعد مسلمانوں کے سروں سے ہاتھیوں کا خطرہ ٹل گیا۔

اتنی دیر میں مسلمانوں کو موقع مل گیا۔ فوج پھر چار حصوں میں تقسیم ہو گئی اور اس فوج نے چاروں طرف سے ایک ساتھ حملہ کر دیا۔

ہندو سردار بار بار اپنے سپاہیوں کو للکار رہے تھے لیکن سپاہیوں پر خوف طاری ہو چکا تھا۔ پھر ترائن پر چھائے ہوئے آسمان نے یہ عجیب و غریب منظر دیکھا کہ اتنی بڑی تعداد ہونے کے باوجود ہندو سپاہی میدان جنگ سے منہ موڑنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کھانڈے رائے اور دوسرے بہت سے ہندوستانی راجا ہلاک ہو گئے۔ رائے پتھورا تھوڑی بہت بچی ہوئی فوج کو اپنے ساتھ لے کر بھاگ نکلا۔

شہاب الدین نے اس عظیم الشان فتح کے نشے میں سرشار ہونے کے باوجود صورت حال پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ رائے پتھورا فرار ہو رہا ہے۔ اس نے چند دستوں کو اس کے تعاقب میں لگایا اور حکم دیا کہ راجا کو زندہ گرفتار کر کے اس کے پاس لایا جائے۔

رائے پتھورا نے بہت کوشش کی کہ وہ کسی طرح اجمیر کی طرف نکل جائے لیکن شہاب الدین کے بھیجے ہوئے دستوں نے اسے جا لیا اور حکم کے مطابق زندہ گرفتار کر کے شہاب الدین کے سامنے پیش کر دیا۔

"آؤ رائے پتھورا۔ تم بھاگتے ہوئے اچھے نہیں لگ رہے تھے اس لیے ہم نے تمہیں اپنے پاس بلا لیا۔ کہو کیسا لگا تمہیں ہمارے پاس آنا؟"

"وقت وقت کی بات ہے مہاراج۔" رائے پتھورا نے کہا۔ "ایک دن وہ تھا جب تم اسی میدان سے بھاگے تھے۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ اس وقت میں نے تمہیں جانے دیا۔"

"غلطی تو تم سے یہ بھی ہوئی کہ تم نے میری طاقت کا غلط اندازہ لگایا اور میرے امن و سلامتی کے پیغام کے باوجود مجھ سے لڑنے چلے آئے۔"

"سلطان، تم نے میرے گھر میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ پھر میں جنگ نہ کرتا تو اور کیا کرتا؟"

"تم میری اطاعت کر کے اپنی سلطنت قائم رکھ سکتے تھے۔ میں واپس جانے کو تیار تھا لیکن تم نے میرے قاصد کے پیغام کو ٹھکرا دیا، میرے دین کا مذاق اڑایا۔"

"میں نے تو میدان جنگ میں بھی تم سے ہمدردی کی تھی اور تمہیں اس جنگ سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔"

"تو نے اپنے لشکروں کی قوت و کثرت کا ذکر کر کے مجھے دھمکانا چاہا تھا۔ میرے لیے ضروری تھا کہ میں تیرے غرور کو پاش پاش کر دوں، اب تو اس حال میں میرے سامنے آیا ہے۔ کہاں گئے تیرے لشکر؟"

"یہ کوئی نئی بات نہیں۔ کبھی تجھے شکست ہوئی تھی آج مجھے شکست کا منہ دیکھنا پڑا ہے لیکن یاد رکھ شہاب الدین، یہ ہندوستان ہے۔ چند راجا مرے ہیں، سب نہیں مر گئے۔ تیرے خلاف پھر آندھی چلے گی۔ تو تنکوں کی طرح بکھر جائے گا۔ تو ایک فتح پر مغرور نہ ہو اور مجھے جانے دے۔"

"کیا تو اب بھی میری اطاعت قبول کرنے اور جزیہ دینے پر تیار ہے؟"

"یہ میری سرشت میں نہیں۔"

"کیا تو اب بھی مجھ سے جنگ کرنے کی ہمت رکھتا ہے؟"

"موقع ملا تو ضرور لڑوں گا۔"

"کیا میں تجھے زندہ رہنے دوں گا؟"

"تو ہرگز ایسا نہیں کرے گا۔"

"کیوں؟"

"تو مجھ سے ڈرتا ہے۔"

"میری جگہ تو ہوتا تو کیا کرتا؟"

"میں تجھے قتل کرا دیتا۔"

"اگر میں بھی تیرے ساتھ یہی سلوک کروں؟"

"تو فاتح نہیں غاصب ہے۔ تجھے یہ حق نہیں پہنچتا۔"

"میں دشمن کو معاف کر سکتا ہوں، گستاخ کو نہیں۔ اب تو

اپنے مردہ بھائی ہندوؤں کے پاس جانے کے لیے تیار ہو جا۔"
شہاب الدین نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا اور اپنے آدمیوں کو ایک مخصوص اشارہ کیا۔ اسی وقت کئی ہاتھ حرکت میں آئے اور رائے پتھورا کو لشکر گاہ کی طرف لے گئے۔

اس کا سر اس کے تن سے جدا کر دیا گیا۔

رائے پتھورا، بکھری ہوئی لاشوں میں سے ایک لاش بن گیا۔

ترائن کے میدانوں سے نکل کر شہاب الدین نے تیزی سے اجمیر کا رخ کیا۔ رائے پتھورا کا بیٹا راجا کولا اس وقت رائے پتھورا کی نیابت کر رہا تھا۔ اسے یہ خبریں مل چکی تھیں کہ نہ صرف رائے پتھورا اور کھانڈے راؤ مارے گئے ہیں بلکہ سلطان شہاب الدین وہ عظیم طاقت ہے جس نے راجاؤں کی متحدہ قوت کو شکست دی ہے۔ وہ اکیلا کیا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس نے عقل مندی کی اور اپنی سلطنت کے سرکردہ لوگوں کے ساتھ شہاب الدین کے استقبال کے لیے اجمیر سے باہر نکل آیا۔

اس نے شہاب الدین کی خدمت میں قیمتی تحائف پیش کیے اور التجا کی کہ اسے اجمیر کی حکومت بخش دی جائے۔

"میں بزور شمشیر اجمیر پر قبضہ کر سکتا ہوں لیکن میں تمہاری عاجزی قبول کرتے ہوئے تمہاری حاکمیت برقرار رکھتا ہوں مگر یہ تنبیہ بھی کرتا ہوں کہ کبھی سرکشی مت کرنا ورنہ تمہارا انجام تمہارے باپ سے مختلف نہیں ہوگا۔"

"سلطان محترم! میں آپ کا اطاعت گزار رہوں گا اور جو خراج میرے لیے مقرر کیا جائے گا اسے پابندی سے ادا کرتا رہوں گا۔"

شہاب الدین نے اس پر خراج مقرر کیا اور کچھ دن اجمیر میں قیام کے بعد وہ دہلی کی طرف چل دیا۔ دہلی کا راجا ترائن کی جنگ میں مارا گیا تھا اور اب اس کے خاندان کے کچھ افراد دہلی کا نظم و نسق چلا رہے تھے۔ دیکھنا یہ تھا کہ ان کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔ مقابلہ کرتے ہیں یا استقبال۔

ترائن کی اتنی بڑی فتح کے بعد کس کی ہمت تھی جو شہاب الدین کے مقابلے پر آتا۔ راجپوت اس وقت سہمے ہوئے چوہوں کی طرح تھے۔

کھانڈے رائے کے عزیز و اقارب کا بھی اس وقت یہی حال تھا۔ انہوں نے بھی راجا کولا کی طرح دہلی سے نکل کر شہاب الدین کا استقبال کیا۔ شہاب الدین تاریخ اسلام کا پہلا بادشاہ تھا جو اس وقت دہلی کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔

دہلی سے کوچ کرنے کے بعد شہاب الدین نے اپنے لشکر کے ساتھ کہرام شہر میں جا کر قیام کیا۔ یہ شہر دہلی سے تقریباً سوا سو میل دوری پر ایک مشہور شہر تھا۔ اس نے قطب الدین کو کہرام کا حاکم بنایا اور خود شمالی ہندوستان کے کوہستانی علاقوں کی غارت گری میں مشغول ہو گیا۔

ان علاقوں کو تباہ و برباد کر کے غزنی واپس چلا گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد قطب الدین ایبک نے اسی سال دہلی اور میرٹھ کے قلعوں پر حملہ کر کے ان دونوں علاقوں کو اسلامی مقبوضات میں شامل کر لیا۔ قلعہ کول کو تسخیر کیا اور اسی سال (589ھ) دہلی کو اپنا دارالسلطنت بنا کر آس پاس کے علاقوں اور شہروں پر قبضہ کر لیا۔

کچھ عرصہ بعد شہاب الدین غزنی سے پھر ہندوستان آیا۔ اس بار اس نے قنوج کا راستہ لیا۔ قنوج کے راجا نے مقابلہ ضرور کیا لیکن ٹھہر نہ سکا اور اپنے کوہ پیکر ہاتھیوں کی قطاریں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ شہاب الدین نے یہاں کے تمام مال و متاع پر قبضہ کر کے بنارس کی طرف کوچ کیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے ایک ہزار مندروں کو اس غرض سے مسمار کیا کہ مسلمانوں کے رہنے کے لیے مکان بنائے جائیں۔

اب ترائن کے میدان سے بنارس تک کوئی طاقت نہیں تھی جو مسلمانوں کے خلاف سر اٹھا سکے۔ کچھ علاقے آزاد رہ گئے تھے، باقی شہاب الدین کے اطاعت گزار تھے۔ انہوں نے خراج ادا کر کے اپنی سلطنت قائم رکھنے کی اجازت لے لی تھی۔ بظاہر سناٹا تھا لیکن اندر لاوا پک بھی رہا تھا۔ رائے پتھورا کا ایک رشتہ دار بھیم راج تھا۔ وہ شہاب الدین سے انتقام لینے کے لیے اپنی قوت میں اضافہ کر رہا تھا۔ ترائن کے میدان میں جو لشکر مرنے سے بچ گئے تھے وہ بھاگ بھاگ کر اس کے پاس جمع ہو رہے تھے۔ قنوج کا راجا بھی شہاب الدین سے شکست کھا کر بھیم راج کے پاس پہنچ گیا تھا۔ بھیم راج کو صرف یہ انتظار تھا کہ شہاب الدین غزنی واپس چلا جائے تو وہ اپنے ارادوں کی تکمیل کرے۔

شہاب الدین نے بنارس کے انتظامات مکمل کرنے کے بعد ہندوستانی علاقوں کی حکومت قطب الدین ایبک کے سپرد کی اور غزنی واپس چلا گیا۔

شہاب الدین کے جاتے ہی بھیم راج اور راجا قنوج نے مل کر رائے پتھورا کے بیٹے راجا کولا پر حملہ کر دیا اور راجا اجمیر کو اس کے قبضے سے نکال لیا۔

اجمیر شہاب الدین کا باج گزار تھا لہٰذا اس کی حفاظت مسلمانوں کی ذمے داری تھی۔ قطب الدین نے آگے بڑھ کر بھیم راج کا راستہ روکا۔ دونوں میں زبردست جنگ ہوئی۔

بھیم راج اس جنگ میں مارا گیا اور اجمیر پر مسلمانوں کا براہ راست قبضہ ہو گیا۔

اس ہنگامے سے فرصت پانے کے بعد قطب الدین نے نہروالا پر حملہ کیا اور بھیم دیو دانی گجرات کو شکست دی۔

اس عظیم فتح کے بعد قطب الدین بہت سا مال غنیمت لے کر غزنی گیا اور شاہی عنایتوں سے سرفراز ہو کر واپس دہلی آیا۔

☐☐☐

راجپوت اپنی پوری طاقت اور قوت کے ساتھ "بھنکر" شہر کے گرد و نواح میں جمع ہو رہے تھے۔ آج کل اس مقام کو بیانہ کہا جاتا ہے۔

مخبروں نے اس کی اطلاع غزنی بھی پہنچا دی اور قطب الدین ایبک کو بھی۔ یہ خبر ملتے ہی شہاب الدین غزنی سے نکل کھڑا ہوا۔ قطب الدین ایبک بھی بیانہ کی طرف چلا۔ بیانہ سے کچھ دور سلطان کا لشکر قطب الدین سے آن ملا۔ یہ اطلاع ملتے ہی راجپوت بھی بیانہ سے نکل آئے تھے۔ سلطان نے بھی پڑاؤ کیا۔

یہ ایک اور چھوٹا اتحاد تھا جو ہندوؤں نے قائم کیا تھا۔ گوالیار، اجمیر، کالنجر اور بدایوں کے ان گنت راجپوت اس لشکر میں شامل تھے۔

اس کثرت نے راجپوتوں کو ایسے گھمنڈ میں مبتلا کر دیا کہ فوراً صفیں درست کیں اور جنگ کی ابتدا کر دی۔ جوش سے بھرے ہوئے راجپوت مسلمانوں سے انتقام لینے کے لیے اس شدت سے ٹکرائے کہ زمین کانپنے لگی لیکن ان کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی۔ شہاب الدین کا لشکر بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا اور راجپوتوں کی تعداد کم کرتا جا رہا تھا۔ ایک وقت وہ آیا کہ راجپوتوں کے قدم اکھڑ گئے۔ راجپوتوں کو بدترین شکست ہوئی۔ بچے کھچے راجپوت گوالیار کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

شہاب الدین ابھی بیانہ ہی میں تھا کہ غزنی سے خبر آئی طوس اور سرخس کے شہروں میں بغاوت ہو گئی ہے۔ اس کا جانا ضروری تھا۔ وہ ابھی اس خبر سے سنبھل نہیں پایا تھا کہ اس کے بھائی غیاث الدین کی بیماری کی خبر آ گئی۔ اس نے نہایت جلدی میں اپنے ایک سالار بہاء الدین طغرل کو قلعۂ گوالیار سر کرنے کے لیے روانہ کیا اور خود اپنے لشکر کا آدھا حصہ قطب الدین ایبک کے پاس چھوڑ کر غزنی روانہ ہو گیا۔

وہ ابھی طوس اور سرخس کے مسائل کو سلجھا رہا تھا کہ اسے غیاث الدین کے انتقال کی خبر ملی۔ شہاب الدین بادغیس پہنچا اور اپنے بھائی کا پوری طرح سوگ منایا۔

جب وہ بھائی کے سوگ سے فارغ ہو چکا تو اس نے اپنے عزیزوں کو نوازنے کے لیے خراسان کی حکومت اپنے عزیزوں میں تقسیم کر دی۔ اس نے اپنے چچا زاد بھائی ملک ضیاء الدین کو فیروزکوہ اور غورستان کا حاکم بنایا۔ غیاث الدین کے بیٹے سلطان محمود کے حوالے لیست، فرح اور اسفرائن کی حکومت کی۔ اپنے بھانجے ناصر الدین کو ہرات اور اس کے مضافات کا حاکم بنایا اور خود غزنی پہنچ کر شاہی تخت پر قدم رکھا۔

مرو کے حاکم محمد خیر بیگ کو خوارزم کے حکمران محمد خوارزم شاہ نے قتل کرا دیا تھا۔ محمد خیر بیگ شہاب الدین کا حامی اور دوست تھا۔ جب غزنی پہنچ کر شہاب الدین کو اس حادثے کی اطلاع ہوئی تو وہ حاکم مرو کا انتقام لینے کے لیے خوارزم پر حملے کی غرض سے نکلا۔

خوارزم نہایت محفوظ شہر خیال کیا جاتا تھا۔ اس کے اردگرد کوہستانی اور بڑے بڑے پتھروں سے بنی ہوئی انتہائی مضبوط اور مستحکم فصیل تھی۔ دریائے جیحوں سے ایک نہر نکال کر خوارزم کے مشرق سے گزاری گئی تھی چنانچہ اگر کسی

کو خوارزم پر حملہ آور ہونا ہوتا تو اسے یہ نہر بھی عبور کرنا ہوتی تھی۔ اگر کشتیوں کے پل توڑ دیے جائیں تو حملہ آور کو سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

خوارزم شاہ کو شہاب الدین کی آمد کی خبر ہوئی تو وہ اپنے لشکر کے ساتھ خوارزم سے نکلا۔ خوارزم کے مشرق میں جو نہر تھی اسے عبور کر کے وہ کھلے میدانوں میں خیمہ زن ہو گیا۔

دریائے جیحوں کے جنوب میں دونوں لشکروں کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔ خوارزم شاہ کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور وہ اپنے مرکزی شہر خوارزم میں محصور ہو گیا۔

سلطان شہاب الدین نہر عبور کرنے سے گریز کر رہا تھا کیونکہ فصیل سے چلائے جانے والے تیر نہر کے قریب تک پہنچ رہے تھے اور نہر عبور کیے بغیر خوارزم تک پہنچا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے باوجود اس کے سپاہی بار بار نہر عبور کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

شہاب الدین ابھی نہر پار کر کے فصیل تک پہنچنے کی کوشش ہی کر رہا تھا اور اس کوشش میں وہ اپنے کئی دن ضائع کر چکا تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ خوارزم شاہ نے سمرقند کے حکمراں سلطان عثمان خاں اور ملک خطا کے سپہ سالار قرا بیگ خاں کو اپنی مدد کے لیے خط لکھ دیے ہیں۔

صورتِ حال دیکھتے ہی دیکھتے اس کے خلاف ہو گئی۔ تین بڑے دشمنوں کے مقابلے میں وہ اکیلا تھا۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ تین مختلف سمتوں سے اس پر حملے شروع ہو گئے۔ شہاب الدین نے نہایت بہادری سے ترکوں پر حملہ کیا اور انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔

اس موقع پر حسین خرمیل شہاب الدین کے پاس آیا اور اسے تجویز پیش کی ''ہم تین دشمنوں کا ایک ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتے، یہ موقع اچھا ملا ہے۔ آپ ترکوں کا تعاقب کرتے ہوئے آگے نکل جائیں اور غزنی پہنچ جائیں۔ اس جنگ سے ہاتھ اٹھا لیں۔'' شہاب الدین نے اس کی تجویز کو رد کر دیا۔ حسین خرمیل ایسا ناراض ہوا کہ اپنے چھ ہزار ہمراہیوں کو لے کر میدان سے چلا گیا۔

ایسا قابل جرنیل چلا گیا۔ چھ ہزار ساتھی بھی کم ہو گئے لیکن شہاب الدین نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ دشمنوں سے لڑتا رہا لیکن جب اس نے مقابلے کی تاب نہ دیکھی تو ضرورت سے زیادہ سامان کو آگ لگائی اور خراسان کی طرف بھاگ نکلا۔

خوارزم شاہ اس فرار کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے شہاب الدین کا پیچھا کیا اور اس بری طرح پیچھے پڑا کہ شہاب الدین کو مجبوراً پلٹ کر اس سے معرکہ آرائی کرنے پڑی۔ اس معرکہ آرائی میں شہاب الدین کو شکست ہوئی۔ اب جائے مفر کوئی نہیں تھی۔ اس نے اپنے ہاتھی گھوڑے اور خزانہ وغیرہ چھوڑ کر جنگل کی طرف بھاگنے میں عافیت ڈھونڈی۔ بدقسمتی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ابھی وہ راستے میں تھا کہ اسے قرا بیگ اور سلطان عثمان خاں نے گھیر لیا۔

اس مردِ مجاہد نے جم کر مقابلہ کیا لیکن دو لشکروں سے بہ یک وقت جنگ نے اسے مشکل میں ڈال دیا۔ اگرچہ اس کا لشکر تعداد میں کم تھا لیکن وہ برابر لڑتا رہا لیکن جب ایک وقت وہ آیا کہ اس کے ساتھ صرف 100 سپاہی رہ گئے تو وہ پریشان ہو گیا۔ وہ خراسان کی سرحد کے قریب تھا کہ اسے اندخود قلعے کا خیال آیا جو خالی پڑا تھا اور خراسان میں شامل تھا۔ وہ اپنے سو سپاہیوں کے ساتھ بھاگ کر اس قلعے میں داخل ہو گیا اور دروازے بند کر لیے۔ اس کے سو سپاہی مختلف برجوں میں بیٹھ گئے تاکہ اگر دشمن فصیلوں پر چڑھنے کی کوشش کرے تو وہ اسے مار بھگائیں۔

اب کیفیت یہ تھی کہ عثمان خاں، قرا بیگ اور خوارزم شاہ کے لشکر قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ دو دن گزرنے کے بعد خوارزم شاہ قلعے پر حملہ کرنے کے لیے بے چین ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اندر صرف سو سپاہی ہیں، وہ کتنی دیر مقابلہ کریں گے۔ عثمان خاں اس مقابلے کے خلاف تھا، اس نے مخالفت کی۔

''جب شہاب الدین نے خود کو قلعہ بند کر لیا ہے تو ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ اس کے سو سپاہیوں پر حملہ کریں۔''

''ہم سو سپاہیوں پر حملہ نہیں کر رہے ہیں۔ شہاب الدین کو گرفتار کر رہے ہیں۔'' خوارزم شاہ نے کہا۔

''وہ گرفتار ہونے والا نہیں۔ لڑتے لڑتے جان دے دے گا اور اس کا نتیجہ تمہیں معلوم ہے؟ جب قطب الدین ایبک جو ہندوستان میں اس کا نائب ہے اور غزنی میں اس کے نائبوں کو خبر ہوگی تو غزنی، غور اور ہندوستان سے لشکر آئیں گے اور ہمیں تہس نہس کر کے رکھ دیں گے۔''

''پھر تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں چاہتا ہوں ہم واپس ہو جائیں۔''

''کیا تم یہ نہیں سمجھتے کہ اگر اس وقت ہم نے شہاب الدین کو چھوڑ دیا تو وہ ہم پر حملہ ضرور کرے گا۔''

''اس کے لیے میں حاضر ہوں۔ میں قلعے کے اندر جاتا ہوں اور شہاب الدین سے صلح کی بات چیت کرتا ہوں۔''

خوارزم شاہ انتقام کی بات سن کر گھبرا گیا۔ سوچنے لگا

اگر کسی وقت شہاب الدین نے یا اس کے نائبین نے اس پر حملہ کر دیا تو عثمان خاں اس کی مدد کو نہیں آئے گا اور وہ اکیلا مقابلہ کرنے سے قاصر ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ اس وقت صلح کر کے معاملہ رفع دفع کر لیا جائے۔

عثمان خاں اپنے چند محافظوں کے ساتھ قلعے کے اندر گیا اور شہاب الدین سے غلطی کی معافی چاہی۔ شہاب الدین بھی اس وقت اتنا بے بس تھا کہ زیادہ بحث نہ کر سکا اور صلح پر تیار ہو گیا اور یوں یہ معاملہ نمٹ گیا۔

سلطان نے چند دن اس قلعے میں قیام کیا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کے ساتھ کوئی چال نہیں چلی گئی ہے۔ لشکر واقعی محاصرہ اٹھا کر چلے گئے ہیں تو وہ قلعے سے نکلا اور غزنی چلا گیا۔

ابھی وہ غزنی سے کچھ فاصلے پر تھا کہ اسے یہ وحشت ناک خبر ملی کہ اس کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اس کے ایک غلام ایلدگز نے غزنی پر قبضہ کر لیا ہے۔

شہاب الدین اپنے غلاموں کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتا تھا۔ ایک غلام کی یہ حرکت دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے ہرچند چاہا کہ قلعے میں داخل ہو لیکن ایلدگز نے اجازت نہ دی اور اپنے آقا سے جنگ کرنے پر کمر باندھ لی۔ اس وقت شہاب الدین کے پاس مناسب لشکر نہیں تھا لہٰذا اس نے جنگ کرنا مناسب نہ سمجھا اور ملتان کی طرف چلا گیا۔ یہاں اس نے ایک زبردست فوج تیار کر کے غزنی کا رخ کیا۔

اس عرصے میں ایلدگز کو اپنی نمک حرامی کا احساس ہو گیا تھا یا پھر وہ شہاب الدین کے ساتھ لشکر کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا۔ بات کچھ بھی ہو۔ اس مرتبہ وہ شہاب الدین کے خلاف صف آرا نہیں ہوا بلکہ غلاموں کی طرح نہایت عاجزی سے شہاب الدین کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی غلطی کی معافی چاہی۔ شہاب الدین کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ اس نے اسے معاف کر دیا۔

غزنی میں داخل ہوا اور سلطنت کے کاموں میں مشغول ہو گیا۔

ابھی کچھ ہی دن ہوئے تھے کھکر قوم کی شکایتیں اس کے دربار میں پہنچنے لگیں۔ اس لادین قوم نے مسلمانوں کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ لوٹ مار کا ایسا بازار گرم کیا تھا کہ کسی کی جان و مال محفوظ نہیں تھی۔ وہ ان شکایتوں کو درگزر کرتا رہا لیکن جب شکایتوں کے انبار لگ گئے تو اس نے کھکروں کو سبق سکھانے کا ارادہ کر لیا۔ ان شکایتوں میں وہ مظلوموں کی آہوں اور سسکیوں کو سن سکتا تھا۔ اس نے لشکر تیار کیا اور غزنی سے نکل کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے قطب الدین ایبک کو بھی خط لکھ دیا کہ وہ بھی مغرب کی طرف سفر کرے۔ دونوں لشکر جب آپس میں مل جائیں گے تو اس سرکش قوم کی بیخ کنی کر دی جائے گی۔

دہلی سے قطب الدین بھی آ گیا۔ شہاب الدین کھکروں پر حملہ آور ہوا اور قتل و غارت گری کا وہ بازار گرم کیا کہ اس قوم کو اس کے کیے کی خوب سزا مل گئی لیکن ظاہر ہے پوری قوم کا صفایا نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کھکر جو دور دراز کے علاقوں میں آباد تھے محفوظ رہ گئے۔

کھکروں کے ایک قبیلے کے امیر نے ایک متقی پرہیزگار مسلمان سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ اگر وہ مسلمان ہو جائے تو شہاب الدین اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔

اس مسلمان نے جواب دیا۔ ''میں اس امر کا یقین دلاتا ہوں کہ بادشاہ تجھے اس عالم میں دیکھ کر بہت خوش ہوگا اور اس کوہستان کی حکومت تیرے ہی سپرد کر دے گا اور تجھے یہاں کا خودمختار حاکم مان لے گا۔''

''تو پھر میں مسلمان ہونے کو تیار ہوں۔''

اس مسلمان بزرگ نے اس امیر کی خواہشات ایک خط میں تحریر کر کے یہ خط سلطان کے پاس بھیج دیا۔ سلطان اس وقت لاہور میں تھا۔

سلطان شہاب الدین نے ایک مرصع کمربند اور گراں بہا خلعت امیر کے لیے بھجوائی اور اسے اپنے دربار میں طلب کیا۔

کھکروں کا یہ امیر شہاب الدین کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوا۔ شہاب الدین نے بزرگ مسلمان کی سفارش پر اس کے نام کوہستانی علاقوں کی فرماں روائی کا فرمان جاری کر دیا۔ اس امیر نے وطن واپس آ کر اپنی قوم کے بڑے حصے کو مسلمان کر لیا لیکن بعض وہ بھی تھے جو اس نعمت سے دور رہے۔

ایک علاقہ تراہیہ تھا جو غزنی اور پنجاب کے درمیان کوہستانی علاقے میں واقع تھا۔ اس نے اس علاقے پر حملہ کیا۔ یہاں تقریباً چار لاکھ غیر مسلموں نے مذہب اسلام قبول کیا۔

شہاب الدین نے چند روز لاہور میں قیام کرنے کے بعد غزنی کا رخ کیا۔ وہ اس وقت بہت مطمئن اور شاداں نظر آ رہا تھا۔ اس نے تمام ضروری کام نمٹا لیے تھے۔ غزنی سے لے کر دہلی تک اس کی حکومت تھی۔ اس کا نائب قطب الدین ایبک نہایت وفاداری اور خوش اسلوبی سے تمام کام سرانجام دے رہا تھا۔ ہر طرف امن تھا۔ اس نے تمام دشمنوں کی

سرکوبی کر دی تھی۔ جو چھوٹے چھوٹے واقعات ہوتے رہتے تھے انہیں سنبھالنے کے لیے اس کے امیر بہت تھے جنہیں وہ چھوڑے جا رہا تھا۔

اس نے لاہور سے نکل کر دریائے سندھ کے کنارے پر پڑاؤ کیا۔ اس مقام کو برمہیک کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ہر طرف خیمے سج گئے۔ جنگل میں منگل ہو گیا۔

کھروں کی قوم میں سے چند افراد اس وقت شہاب الدین کے لشکر کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ یہ وہ تھے جن کے عزیزوں کو سلطان نے قتل کیا تھا اور وہ خود گھر سے بے گھر ہو گئے تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ سلطان کے لشکر نے دریائے سندھ کے کنارے پڑاؤ کیا ہے تو وہ بھی رک گئے اور قریب کے جنگل میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ ان کا منصوبہ پورا ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ بس ضروری تفصیلات طے کرنے کی ضرورت تھی۔ وہ سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے اور آئندہ کا لائحہ عمل طے کر لیا۔ کام از حد خطرناک تھا لیکن وہ جان پر کھیلنے کا عزم کر چکے تھے۔

''اگر ہم مارے بھی گئے تو اب کون سے زندہ ہیں۔ اس بدبخت بادشاہ نے ہمارے عزیزوں کو تہ تیغ کیا ہے! ہم گھر سے بے گھر ہو گئے ہیں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔''

یہ لوگ منصوبے کے مطابق اگلے دو دنوں تک جنگل میں چھپے رہے۔ تیسرے دن انہوں نے جب دیکھا کہ لشکر کوچ کی تیاری کر رہا ہے۔ خیمے اکھاڑے جا رہے ہیں۔ سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ غزنی پہنچنے کی خوشی میں کسی کو کسی کا ہوش نہیں ہے تو وہ جنگل سے باہر نکلے۔ فراش سراپردہ اتار رہے تھے کہ ایک کھر آگے بڑھا اور خنجر مار کر دربان کو زخمی کر دیا۔ اس کے زخمی ہوتے ہی ایک شور مچ گیا۔ کھر وہاں سے ہٹ گیا۔ سلطان شہاب الدین کے جس قدر محافظ تھے وہ دوڑتے ہوئے آئے اور زخمی دربان کو سنبھالنے میں لگ گئے۔ سب ادھر مشغول ہوئے تو ان کھروں کو موقع مل گیا۔ وہ آزادانہ شاہی خیمے میں گھستے چلے گئے۔

سلطان کے تمام محافظ زخمی دربان کی چیخیں سن کر باہر کی جانب دوڑ پڑے تھے۔ سلطان کے پاس اس وقت صرف دو ترک غلام تھے جو سلطان کے پاس کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ کھروں کی تعداد بیس تھی۔ ان سب کے ہاتھوں میں خنجر تھے۔ ترک غلاموں اور شاید خود بادشاہ کی سمجھ میں بھی نہ آ سکا کہ یہ لوگ کون ہیں اور کیوں آئے ہیں۔ جتنی دیر میں ان کی حیرت ختم ہوتی اور وہ حرکت میں آتے یہ کھر ترک غلاموں اور بادشاہ پر ٹوٹ پڑے۔ سلطان کو یہ موقع ہی نہ مل سکا کہ قریب رکھی تلوار اٹھاتا۔ ان کھروں نے ترک غلاموں کے علاوہ سلطان شہاب الدین کا بھی خاتمہ کر دیا۔

کہتے ہیں سلطان کے جسم پر چھروں کے بائیس گہرے زخم آئے تھے۔

یہ سانحہ ایسا تھا کہ لشکر کی عجیب حالت تھی۔ ان کے سامنے ان کا بادشاہ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور وہ کچھ نہ کر سکے۔

اس وقت سلطان کا ایک وزیر معید الملک جتائی لشکر میں موجود تھا۔ اس نے لشکر کو سنبھالا اور سلطان کی لاش لے کر غزنی کی طرف روانہ ہوا۔

سلطان کی لاش غزنی پہنچی تو غزنی اور غورستان سوگ میں ڈوب گیا۔ سلطان کے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ اس کی یادگار میں صرف ایک بیٹی تھی۔ اس بیٹی کو دفن کرنے کے لیے اس کی زندگی ہی میں سلطان نے ایک مقبرہ بنوا دیا تھا۔ سلطان کو اسی مقبرے میں دفن کر دیا گیا۔

مورخین کا بیان ہے کہ غزنی کا خزانہ بے شمار اشرفیوں سے معمور تھا۔ بہت سے دوسرے جواہرات کے علاوہ خزانے میں پانچ سو من الماس بھی تھے۔

وہ جب تک رہا شریعت کا پابند رہا۔ وہ اگرچہ خود مختار حکمران تھا لیکن عالموں اور اولیا کی صحبت میں بیٹھنے کو وہ اپنے لیے باعث فخر سمجھتا تھا۔

اس نے غزنی کی حکومت کی ابتدا سے لے کر شہادت تک 35 سال سے کچھ زیادہ کے عرصے تک فرماں روائی کی۔ اس کو خدا نے اولاد نرینہ نہیں دی تھی۔ وہ اپنے غلاموں کو اپنے بیٹے کہتا تھا۔ ان بیٹوں نے اس کی لاج رکھ لی۔ بادشاہوں کے بیٹے ہوتے ہیں جو اس کی فتوحات کو قائم رکھتے ہیں، اس کے غلاموں نے بادشاہی کی اور اس کی محبت کو رائگاں نہیں جانے دیا۔ ان میں سے ایک قطب الدین ایبک بھی تھا۔ اس کی کرم گستری اور سخاوت کی ایسی شہرت تھی کہ اسے لکھ بخش کہا جانے لگا تھا۔

سلطان کے غلاموں میں سے قطب الدین کے علاوہ چار دیگر غلاموں نے بھی ہندوستان پر حکومت کی اور سلطان شہاب الدین کے نام کو زندہ رکھا۔

سلطان شہاب الدین 602ھ میں شہید ہوا۔

ماخذات: تاریخ فرشتہ۔ تاریخ طبری۔ تاریخ فیروز شاہی

وہ جو خوابوں اور خواہشوں کو زنجیر کرنا چاہتی تھی ایک ایسے سفر پر چل نکلی جس میں پڑائو تو بے شمار تھے مگر منزل کوئی نہ تھی۔ اس کا حسن بھی ایسا ہی کرشمہ ساز تھا کہ ہر اک موڑ پر اس کی پُرفریب معصومیت ایک ماتم بپا کردیتی مگر دھیرے دھیرے بھنور کو جیسے قرار سا آجاتا... پھر اگلے موڑ پر ایک اور آندھی... ایک اور گردباد اور پھر اس کے حسن کی وہی کرشمہ سازیاں... وہی ایک لمبی مسافت۔

آپ جانتے ہیں، روئے زمین پر سب سے خوفناک جاندار کون ہے؟

لو کہاں... نرم و نازک، بے ضرر، محبوب محبوب سی نظر آنے والی، دل موہ لینے والی مخلوق، جانداروں میں سب سے خطرناک شے ہے۔ حشرات الارض میں سانپ کو سب سے زہریلا سمجھا جاتا ہے، حماقت ہے۔ سانپ کاٹ لیتا ہے، انسان تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے لیکن عورت کاٹتی ہے...... الامان، الحفیظ! انسان ہنستا رہتا ہے، خواب دیکھتا ہے، خود کو سنوارتا ہے۔ اپنی حیثیت سے آگے بڑھ جاتا ہے اپنی شخصیت سے بھٹک جاتا ہے۔ بھیک مانگتا ہے، چوری کرتا ہے

اور اسے خوش رکھتا ہے۔ سانپ کے منہ میں دو مڑے ہوئے دانت ہوتے ہیں، جن کا تعلق ان کے حلق میں موجود زہر کی تھیلی سے ہوتا ہے۔

ان دانتوں کے درمیان میں باریک سوراخ ہوتے ہیں۔ جس وقت سانپ کاٹتا ہے تو آہستہ سے گھوم جاتا ہے۔ زہر کی تھیلی دبتی ہے اور اس سے زہر کے چند قطرے دانتوں کے خول سے گزر کر انسان کے زخم میں اتر جاتے ہیں۔

نتیجہ یہ کہ جسم میں زہر پھیل جاتا ہے۔ بچھو کا ڈنک ہوتا ہے۔ جس سے وہ جسم کے کسی حصے میں سوراخ کر کے حسب توفیق زہر بخش دیتا ہے۔ لیکن عورت، سر کے بالوں سے لے کر پیروں کے ناخنوں تک مختلف ہتھیاروں سے آراستہ ہوتی ہے۔ شاعروں نے عورت کے بالوں کو گھٹاؤں، بادلوں سے تشبیہ دی ہے۔ کچھ نے انہیں زنجیر و سلاسل کہا ہے۔ بے شمار ان بالوں کے پیچ وخم میں پھنس کر آج تک آزاد ہونے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ درحقیقت یہ عورت کا ابتدائی ہتھیار ہے۔ بدلتے زمانے کے ساتھ ساتھ اس خوفناک جاندار نے ہتھیاروں کا استعمال بھی بدل لیا ہے۔

اس کے بعد پیشانی کو شاعر حضرات نے چاند سے تشبیہ دی۔ پھر ابرو پر بات آئی اور انہیں بلاتردد خنجر تسلیم کر لیا گیا۔ اس کے بعد سب سے خوفناک ہتھیار آتا ہے آنکھیں، تیر، کٹار، خنجر جیسے ہتھیار پرانے ہیں۔ اب تو انہیں راکٹ، میزائل بلکہ سام میزائل سے تشبیہ دینی چاہیے۔ اس ہتھیار کا توڑ آج تک دریافت نہیں ہو سکا۔ پھر ناک، ہونٹ، ٹھوڑی، گردن، ہر ہتھیار اپنی جگہ مکمل ہے، کس کس سے بچیں گے۔

سائنس دانوں نے آسمان کی وسعتیں ناپی ہیں۔ زمین کی گہرائیاں تلاش کی ہیں لیکن اس ننھی سی مخلوق کے سینے میں دھڑکتے ہوئے گوشت کے لوتھڑے کی تفصیل آج تک کوئی نہ بتا سکا۔ عورت کے دل کی گہرائی ناپنے والے آلات آج تک تیار نہ ہو سکے۔ میری اطلاع میں عورت کے سر کے بال حساس راڈار ہوتے ہیں۔ وہ شکار کی آمد کی اطلاع دیتے ہیں۔ ابرو، شکار پر ہلکی شیلنگ کرتے ہیں، آنکھیں اس کی ساخت کا جائزہ لے کر اس پر ناکارہ کرنے والے میزائل پھینکتی ہیں۔ ہونٹ اسے مسکراہٹ کی نظر نہ آنے والی شعاعوں میں جکڑتے ہیں اور شکار بہ آسانی اس کے دل کی گہرائیوں میں گر کر تباہ ہو جاتا ہے۔

آپ شاید میری بات کو تسلیم نہ کریں لیکن میرا تجربہ یہی ہے۔ عورت مٹی کی ہانڈی میں لکڑی کی ڈوئی سے دال چلا رہی ہو یا آسمان کی وسعتوں میں ہوائی جہاز، ہر جگہ یکساں ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں شمانہ خان کی مثال دوں گا۔

جی ہاں..... میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میرے تجربات وسیع ہیں، میں نے ایک ایسا پیشہ اپنا رکھا ہے جس میں بھانت بھانت کے خطرناک لوگوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔

ہاں تو میرا تجربہ ہے کہ عورت جرائم پیشہ بھی ہو تو سہ آتشہ بلکہ چار آتشہ ہوتی ہے جس کا ثبوت شمانہ خان موجود ہے اور ہم سب کے سینے پر مونگ دل رہی ہے۔

کہانی کچھ یوں ہے کہ.....

سینٹرل انٹیلی جنس بیورو کے انسپکٹر زوار پاشا سے بھی میری شناسائی ایسی ہی تھی جیسے دوسرے پولیس افسروں سے۔ وہ بھی مجھے پسند نہیں کرتا تھا لیکن میرا دوست بھی تھا۔ اکثر اس نے مجھے بڑے بڑے ہوٹلوں میں کھانا کھلایا ہے۔ اپنی کار میں لیے لیے گھوما ہے۔ اپنے ہاں کی تقاریب میں بھی بلاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی میری تاک میں بھی رہتا ہے۔

میں اس کے خلوص پر اعتماد کرتا ہوں، اس کی محبت کا قائل ہوں۔ اس کے اخلاق کی تعریف و توصیف بھی کرتا ہوں لیکن اس سے چوکنا بھی رہتا ہوں اور اپنا کوئی کمزور پہلو اس کے سامنے نہیں آنے دیتا۔ چنانچہ اس روز صبح دس بجے کے قریب اس کی خوبصورت کار اس بلڈنگ کے سامنے رکتے دیکھ کر میں چونکا جس میں میرا خوبصورت دفتر ہے۔ زوار پاشا سرکاری ملازم ہے۔ مصروف آدمی ہے اور اپنا وقت بلاوجہ ضائع نہیں کرتا۔ چنانچہ اس کی آمد بے مقصد نہیں ہو سکتی۔

میں سنبھل گیا۔ اس کے راستہ طے کرنے سے قبل میں نے پچھلے چند روز کا بھرپور جائزہ لیا۔ میں ایسی کوئی حماقت تو نہیں کر بیٹھا جو قابل گرفت ہو، کسی معاملے میں اسے میرے بارے میں کوئی کلیو تو نہیں مل گیا لیکن تقریباً پچھلے ایک ماہ کے دوران تو ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی جو قابل گرفت ہو۔ میں بے مقصد وسوسوں کا قائل نہیں ہوں چنانچہ ماضی کا جائزہ لے کر میں مطمئن ہو گیا۔ "آجاؤ..... زوار! کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔" میں نے دل ہی دل میں کہا۔

اور اسی وقت میری میز پر رکھے ہوئے انٹرکام پر اشارہ موصول ہوا۔

"بھیج دو۔" میں نے کی آن کر کے کہا اور اسے آف کر دیا۔

یقیناً میری سیکریٹری میرے اس اعتماد پر حیران رہ گئی ہو گی۔ بہرحال زوار پاشا اندر آ گیا۔ حسب معمول ایک زوردار سلام مارا۔ اپنے چوڑے سخت ہاتھ میں میرے ملائم ہاتھ کو مسلا اور بے تکلفی سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ پولیس کیپ

اور ابرو پر بل اور مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"ہلو....."

"ہائی....." میں نے انٹرکام کی آن کر کے کہا اور پھر اسے آف کر دیا۔

"کیسی چل رہی ہے؟" اس نے بھاری آواز میں پوچھا۔

"بیٹری ڈاؤن ہو گئی ہے۔ چارجنگ کے لیے بھیجی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میں گاڑی کی نہیں زندگی کی بات کر رہا ہوں۔" زوار پاشا نے کہا۔

"اوہ..... زندگی بغیر پہیوں کے چلتی ہے۔ جیسی بھی چلے غنیمت ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میرے سامنے فلسفی مت بنا کرو، سمجھے۔" زوار پاشا نے میز پر گھونسا مارتے ہوئے کہا۔

"بہتر ہے۔" میں نے سہم کر کہا اور میز پر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ آٹھواں شیشہ کافی مضبوط تھا۔ ورنہ اس سے قبل زوار سات عدد شیشے توڑ چکا تھا۔ شیشہ بچ جانے پر میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ میرے دفتر میں پولیس والوں کی ہر جارحیت جائز تھی جسے میں بخوبی سمجھتا تھا۔

زوار پاشا اپنی مردانگی پر مسکرانے لگا اور پھر میرے زنانے پن پر ہی اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک تصویر نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ میں نے بڑے احترام سے تصویر اٹھائی اور اپنے سامنے رکھ کر اسے دیکھنے لگا۔ ایک "مسلح" لڑکی تھی۔ قدرت نے اسے تمام ہتھیار فیاضی سے بخشے تھے۔

"مبارک ہو زوار پاشا! تمہارا انتخاب لاجواب ہے، خدا آپ کی جوڑی سلامت رکھے۔" میں نے خلوص دل سے کہا۔

"بدعا مت دے یار، اس سے شادی کر کے موت کے منہ میں جانا ہے کیا۔" زوار پاشا نے اداسی سے کہا۔

اور میں زور زور سے کھانسنے لگا۔ غلطی ہو گئی تھی لیکن خطا میری نہیں تھی۔ زوار پاشا اس سے قبل بھی تین چار لڑکیوں کی تصویر دکھا کر مجھ سے رائے لے چکا تھا۔ ہر لڑکی کے بارے میں وہ یہی کہتا تھا کہ بس وہ اس سے شادی کا فیصلہ کر چکا ہے۔ وہ بھی اس پر مرمٹی ہے اور یہ بھی ہلاک ہو گئے ہیں۔ پھر جب وہ دوسری تصویر لے کر آتا۔

پہلی لڑکی کے بارے میں بتاتا کہ وہ تو جنگلی تھی، وہ میرے معیار کی نہ تھی۔ اور جب اسے معلوم ہوا کہ میں پولیس افسر ہوں تو اس نے ایک مل منیجر سے شادی کر لی، وغیرہ وغیرہ۔

چنانچہ میں اس نئی تصویر کے بارے میں بھی یہی سمجھا تھا اور ڈر رہا تھا کہ آج بھی زوار پاشا میز پر دوسرا گھونسا رسید نہ کر دے، شیشہ موٹا ضرور تھا لیکن تین گھونسوں سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

پھر جب میں نے زوار پاشا کو اداس دیکھا تو دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور بولا۔ "بدعا کیوں، زوار پاشا؟"

"اگر میں نے اس سے شادی کر لی تو آٹھویں خودکشی مجھے کرنا پڑے گی۔"

"اوہ....." میں نے بہ ظاہر حیرت سے کہا لیکن میرا دل، گڑگڑا کر خدا سے دعا کر رہا تھا کہ زوار پاشا اس سے شادی ضرور کر لے تاکہ یہ شیشہ تو سلامت رہ جائے۔

"کیا سمجھے؟" زوار پاشا نے مجھے گھورا۔

"نہیں سمجھ سکا زوار پاشا۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"اس کے سات شوہر خودکشی کر چکے ہیں؟"

"اوہ۔" میں سنبھل گیا۔ میں نے غور سے تصویر دیکھی، حسین خدوخال، زیادہ عمر بھی نہ تھی۔ سیاہ بکھرے بکھرے بال، موٹی آنکھیں، ماڈرن، ایک گارڈن چیئر پر بیٹھی کسی سے موبائل فون پر بات کر رہی تھی۔ شاید زوار پاشا مبالغے سے کام لے رہا تھا، اس کے چہرے سے تو سات شوہروں کا تجربہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔

"کیا تم درست کہہ رہے ہو زوار.....؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"سو فیصدی درست۔" زوار پاشا غراتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اس کے سات شوہر مر چکے ہیں اور اب اس نے آٹھویں شادی کی ہے۔"

"ساتوں شوہروں نے خودکشی کی ہے؟"

"اس سے شادی خودکشی کے مترادف ہے۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ اس کے بعد مرنا لازمی ہے۔"

"ہوں....." میں نے گہری سانس لی۔ زوار پاشا میرے لیے کتنا ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو لیکن اس کی کہانی دلچسپ ہے۔

"اس وقت میں تمہارے پاس اسی سلسلے میں آیا ہوں۔" زوار پاشا نے کہا۔

"بسر و چشم، حکم دیں۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کا نام شمانہ خان ہے۔"

"خان اس کے آخری شوہر کا نام ہے..... میرا مطلب ہے کوئی خانی۔" میں نے درمیان میں دخل دیا۔

"شاید باپ کا نام ہو یا شاید پہلے شوہر کا ہو یا پھر اس کا پورا نام یہی ہو۔ اس بارے میں، میں کچھ معلوم نہیں کرسکا۔"

"ٹھیک ہے، آگے......"

"ہوں...... اچھا یہ بتاؤ۔ تم نے گولڈ سٹی کا نام سنا ہے؟"

"شاید......" میں نے کہا۔

"وہ بلا شرکت غیرے مالک ہے اس کی۔ اس لحاظ سے تم اسے ارب پتی کہہ سکتے ہو۔"

"یقیناً۔" میں نے کچھ کچھ سمجھتے ہوئے کہا۔ "غالباً یہ دولت اس کے شوہر چھوڑ کر مرے ہوں گے۔"

"ہرگز نہیں۔" زوار پاشا پھر غرایا۔ "اس نے آج تک کسی مالدار آدمی سے شادی نہیں کی۔ معمولی قسم کے لوگوں سے شادی کر کے انہیں امیر ترین شخص بنا دیتی ہے۔ سب کچھ ان کے سپرد کر دیتی ہے اور پھر وہ اسے منافع دے کر مر جاتے ہیں۔"

"منافع دے کر......؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں منافع دے کر...... اور پولیس آج تک اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ اس کے کئی شوہروں کی موت کے الزام میں دوسرے کئی لوگوں کو سزائیں ہو چکی ہیں، ایک بھی شوہر قدرتی موت نہیں مرا۔ لیکن وہ بے قصور ثابت ہوتی ہے اور اس کے شوہر کے بیمے کی رقم اسے مل جاتی ہے، کئی بیمہ کمپنیاں پولیس سے مل کر اور اپنے ذرائع سے اس کے خلاف تحقیقات کرا چکی ہیں لیکن ناکام رہی ہیں اور اس کی دولت میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ تین ماہ قبل اس نے کرکٹ کے ایک کھلاڑی سے شادی کی ہے۔ آج کل وہ اس کے ساتھ عیش کر رہا ہے، موت سے بے خبر ہو کر اور اس کی زندگی کا بیمہ پانچ کروڑ روپے کا ہے۔ یہ بیمہ شادی سے چار ماہ قبل کرایا گیا تھا اور اس کا بھاری پریمیم باقاعدگی سے ادا ہو رہا ہے جبکہ اس کرکٹر کی سالانہ آمدنی بھی اتنی نہیں ہے کہ وہ ایک ماہ کا پریمیم بھی ادا کر سکے۔"

"خوب...... ظاہر ہے کہ ادائیگی شمانہ خان ہی کر رہی ہوگی۔"

"یقیناً وہ رقم لگا رہی ہے، رقم کمانے کے لیے۔ کسی کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"وہ کاٹھ کا الو اپنے بارے میں کچھ نہیں سوچ رہا۔"

"اس کے شوہر کی بات کر رہے ہو؟"

"ہاں......"

"بے وقوفی کی بات ہے۔ تصویر کو غور سے دیکھو! کافی خوب صورت ہے۔" تصویر سے زیادہ حسین۔ حسین بیوی" بے پناہ دولت جسے مل رہی ہو وہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ کرکٹر اس پر جان دیتا ہے۔ ایک شخص نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ ہاتھا پائی پر آمادہ ہو گیا اور پھر جب پولیس بھی اس عورت کو بے گناہ قرار دیتی ہے تو پھر کوئی دوسرا اس پر شک کر کے اپنی مصیبت کو دعوت کیوں دے گا۔ وہ اس الزام میں دو گروہوں پر مقدمے کر چکی ہے۔"

"خدا کی پناہ۔" میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیں۔ چند سیکنڈ اس عجیب و غریب کہانی پر غور کرتا رہا، پھر میں نے چونک کر زوار پاشا کو دیکھا۔ "لیکن آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں، زوار پاشا؟"

"ہاں...... اب مطلب کی بات پر آجاؤ۔ وہ دولت مند ہے، اس کے تعلقات وسیع ہیں۔ بغیر کسی ثبوت کے اس کے خلاف سرکاری طور پر تحقیقات بھی نہیں کی جاسکتی۔ یہ بات سب جانتے ہیں لیکن جب سے اس کرکٹر نے شمانہ خان سے شادی کی ہے، بیمہ کمپنی کو تشویش لاحق ہو گئی ہے۔ بیمہ کمپنی کے ارکان نے براہ راست پولیس سے رابطہ قائم نہیں کیا۔ ظاہر ہے، وہ کیا رپورٹ کر سکتے ہیں اور رپورٹ کر کے بھی بے وقوف گردانے جاتے۔ چنانچہ کمپنی کے ایک نمائندے نے ذاتی طور پر مجھ سے ملاقات کر کے اس سلسلے میں کام کرنے کی پیشکش کی۔

انہوں نے مجھے 10 لاکھ روپے کی آفر کی ہے، جو بری نہیں ہے۔ ایک لاکھ روپے ایڈوانس دیے گئے اور میں اس ایک لاکھ میں سے پچاس ہزار اور پوری رقم میں سے پانچ لاکھ، تمہارے حوالے کرنے آیا ہوں۔"

"اوہ......" میں نے گہری سانس لی اور گردن جھکا کر زوار پاشا کے خلوص پر غور کرنے لگا۔ بظاہر اس پیشکش میں کوئی فریب نہیں تھا۔ یوں بھی آج مجھے پیسوں کی ضرورت تھی۔ پانچ لاکھ روپے کم نہیں ہوتے اور پھر پچاس ہزار ایڈوانس لیکن معاملہ بھی اتنا ہی ٹیڑھا تھا، وہ عورت جو آسانی سے سات شوہروں کو ہضم کر چکی ہے معمولی عورت نہ ہوگی اور پھر اس انداز میں کہ اس کے بارے میں ذرا بھی شک نہ کیا جاسکا ہو۔

"آپ نے اس سلسلے میں کیا سوچا ہے؟ شمانہ خان......"

"دراصل یہ ذاتی معاملہ ہے، سرکاری طور پر میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتا۔ یوں بھی میں صرف ایک آدمی ہوں لیکن اس کے باوجود میں نے ابتدائی کام مکمل کر لیا ہے، جسے میں اس وقت تمہارے سامنے پیش کروں گا جب تم اس

کام پر آمادگی کا اظہار کرو گے۔" زوار پاشا کافی پینے لگا اور ہم اس معاملے پر غور کرتے رہے۔

پھر میں نے گردن اٹھا کر کہا۔ "زوار پاشا...... کیا آپ مجھے انسان سمجھتے ہیں؟"

"کیوں؟" زوار پاشا چونک کر بولا۔

"میری بات کا جواب دیں۔"

"صورت سے تو آدمی ہی لگتے ہو۔" زوار پاشا نے مذاق کر کے خود ہی قہقہہ لگایا۔

"درست ہے، چنانچہ سات شوہروں کو بلا ڈکار ہضم کر جانے والی کے خلاف ثبوت حاصل کرنے میں اگر میں بھی ناکام رہوں، تو تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں کامیاب ہونے کی پوری کوشش کرنے کے بعد بھی ناکام رہوں تو میری کیا سزا ہوگی؟"

"کچھ نہیں۔" زوار پاشا سنجیدگی سے بولا۔ "اس کے باوجود پانچ لاکھ تمہارے ہوں گے۔ کیونکہ بیمہ کمپنی کے نمائندے سے بھی میری یہی بات ہوئی ہے۔ ہاں ہم کوشش پوری پوری کریں گے اور کامیابی کے بعد ہمیں مزید ایک لاکھ انعام ملے گا جس میں سے آدھے حسب معاہدہ تمہارے ہوں گے۔ چنانچہ دونوں صورتوں میں فائدہ ہے۔ سودا برا نہیں ہے لیکن کام ایمانداری سے کرنا ہوگا۔"

"تو آپ کے خیال میں اس پیشکش کو قبول کرنے میں مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"کوئی نہیں ہونا چاہیے۔"

"چنانچہ منظور۔" میں نے کہا اور زوار نے ایک ایماندار تاجر کی طرح سے پچاس ہزار کے نوٹوں کی گڈی میرے سامنے ڈال دی۔ میں نے شکریے کے ساتھ گڈی اٹھا کر جیب میں ٹھونس لی۔

"میرے ساتھ چلو۔ اب تک میں نے جو تحقیقات کی ہے، وہ تمہارے حوالے کر دوں۔ آج سے یہ کیس تم ڈیل کرو گے اور میں تمہاری ہر قسم کی مدد کروں گا۔"

میں نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی اور تھوڑی دیر کے بعد میں زوار پاشا کے ساتھ گاڑی میں اس کے دفتر کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں، میں نے کہا۔

"اگر ہم اس کے بارے میں کوئی ثبوت مہیا نہ کرسکے زوار پاشا تب بھی اتنا تو کرسکتے ہیں کہ پانچ کروڑ کے اس چیک کو کیش نہ ہونے دیں۔"

"کیا مطلب؟" زوار پاشا کچھ نہ سمجھ کر بولا۔

"مطلب یہ کہ اس کرکٹر کو اس وقت تک کسی حادثے سے بچائیں، جب تک وہ شمانہ خان کی شوہریت میں ہے۔"

"ہاں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے لیکن اس طرح تو ہمیں پوری زندگی ہی مصروف رہنا پڑے گا۔ ظاہر ہے وہ اسے اس وقت تک کیوں چھوڑے گی جب تک اس کا چیک کیش نہ ہو جائے۔"

"ممکن ہے، اس دوران کسی طرح اس کھلاڑی کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی زندگی کو خطرہ ہے اور پھر یہ بھی نہ سہی، کم از کم اس کے ساتھ پیش آنے والے کسی حادثے کا صحیح تجزیہ تو کیا جاسکتا ہے۔ اس حادثے کی بنیاد میں ممکن ہے شمانہ خان کے سائے نظر آجائیں۔"

"بالکل درست۔" زوار پاشا اچھل پڑا اور کار سڑک پر لہرانے لگی۔ "یقیناً۔" اس نے کار کے اسٹیئرنگ کو کسی مجرم کی گردن کی طرح مروڑتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم اس کے خلاف کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور حاصل کر لو گے۔ تم سائے کی طرح ان دونوں کے پیچھے رہو۔"

میں گردن ہلانے لگا، پھر تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا۔

"مجھے اس کے ساتوں شوہروں کی موت کی تفصیل درکار ہے۔"

"گڈ...... ویری گڈ...... بالکل میرے انداز میں سوچ رہے ہو، میں نے بھی انہی لائنوں پر کام کیا ہے۔ میں نے یہ تفصیل حاصل بھی کر لی ہے۔" اور میں نے دل ہی دل میں زوار پاشا کی ذہانت کو پرزور الفاظ میں داد دی۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم زوار پاشا کے خوبصورت آفس میں پہنچ گئے تھے جہاں اس نے مجھے جوابی کافی پلائی اور پھر ایک لمبی چوڑی فائل نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ اس فائل میں شمانہ خان کے شوہروں کی تصویریں، ان کا شجرہ نسب ان کی دردناک موت کا حال تفصیل سے موجود تھا۔

میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور اس میں سے ایک سگریٹ سلگا لیا اور پھر تفصیل سے فائل پڑھنے لگا۔ زوار پاشا کا کہنا بالکل درست تھا۔ ان شوہروں کی تفصیل پولیس رپورٹ کے ساتھ موجود تھی۔

شمانہ خان کا پہلا شوہر اب سے پانچ سال قبل چند مجرموں کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا تھا۔ وہ ایک فرم میں اکاؤنٹنٹ تھا۔ ایک دوپہر بینک سے ملازموں کی تنخواہوں کا کیش لے کر آرہا تھا کہ لٹیروں کے ایک ٹولے نے اس کا راستہ روک لیا۔ اس سے کیش چھین لیا گیا اور اسے گولی مار دی گئی۔ اس وقت شمانہ کی شادی کو صرف چار ماہ ہوئے تھے اور اکاؤنٹنٹ نے صرف دو ماہ قبل زندگی کا بیمہ کرایا تھا۔ مگر اس

بیمے کی رقم پچاس لاکھ روپے تھی۔

ایک اکاؤنٹنٹ کو پچاس لاکھ کا بیمہ کرانے کی کیا ضرورت تھی، جبکہ اس کی پوری تنخواہ سے بھی پریمیم کی رقم پوری نہ ہوتی تھی۔ یہ سوال اس کی کروڑ پتی بیوی سے کیا گیا تو اس نے جواب دیا۔

بیمہ اس کے شوہر کا تھا اور خود اس کی حیثیت معمولی نہیں ہے۔ اس کا شوہر باظرف تھا اور اسے اپنی کمائی کھلانا چاہتا تھا اس لیے اس نے اپنی ملازمت جاری رکھی ورنہ اسے اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

بات سچ نکلی۔ شانہ خان پر شبہ نہ کیا جاسکا اور پھر وہ مجرم بھی پکڑے گئے جنہوں نے واردات کی تھی۔ شانہ سے ان کا کوئی تعلق نہ نکلا۔ انہیں سخت سزائیں ملیں اور شانہ کو پچاس لاکھ روپے نقد...... شوہر کی موت کے بعد شانہ نے اپنے چھوٹے سے ہوٹل کو از سرِ نو تعمیر کرایا اور...... گولڈ سٹی... وجود میں آگیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کنسٹرکشن کمپنی کے منیجر سے شانہ کا معاشقہ بھی چل نکلا جو گولڈ سٹی بنوا رہی تھی اور اس نے گولڈ سٹی کا افتتاح شانہ نے اپنے شوہر کے ہاتھوں کرایا جو کنسٹرکشن کمپنی کا منیجر ہی تھا اور جس کا بیمہ ایک کروڑ کا تھا۔

ابھی شانہ کے ہاتھ دوبارہ پیلے ہوئے صرف چھ ماہ گزرے تھے کہ انجینئرنگ کمپنی کے منیجر صاحب کار کے حادثے کا شکار ہوگئے۔ ان کا ڈرائیور اور وہ دونوں اس ٹرک کے نیچے دب گئے تھے جس سے کار کا حادثہ ہوا تھا۔ ٹرک ڈرائیور نشے میں تھا۔ پولیس نے بیمہ کمپنی کے ایما پر لاکھ سر مارا لیکن ڈرائیور شانہ کو پہچانتا بھی نہ تھا۔ ماہرین نے کار چیک کی جو بالکل صحیح حالت میں تھی۔

چنانچہ شانہ کو ایک کروڑ مل گئے اور صرف ایک سال بعد اس نے تیسری شادی رچالی۔ میں نے پوری فائل پڑھ لی۔ ساتوں شوہروں کی موت سے شانہ کو تقریباً 10 کروڑ مل چکے تھے اور اگر اسے بیمے کی رقم نہ ملی ہوتی تو کسی طور اس پر شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا بلکہ ایک طرح سے وہ ہمدردی کی مستحق تھی۔ اس کے شوہروں کے دوستوں کے بیانات موجود تھے۔ جن میں اس کے شوہروں نے دوستوں سے اپنی وفاپرست بیوی کی شان میں زمین آسمان کی قلابے ملائے تھے۔ کوئی آدمی یہ بات نہ کہہ سکا کہ شانہ کے کسی شوہر کی موت میں اس کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔

اس جیسی وفاپرست بیویاں تو شوہروں پر زندگی نچھاور کردیتی ہیں نہ کہ انہیں قتل کردیں۔ تمام کے تمام لوگوں کی موت انوکھے حادثوں سے ہوئی تھی جنہیں ناگہانی کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ صرف ایک بات مشکوک تھی، شانہ کے شوہر اس سے شادی سے قبل بھاری رقوم کے بیمے کیوں کرا لیتے تھے جبکہ ان کی حیثیت وہ نہیں ہوتی تھی یا شانہ سے شادی کرتے وقت انہیں اپنی موت کا خیال کیوں نہیں آتا تھا؟

لیکن اس شک کو یقین کا درجہ کوئی نہیں دے سکتا تھا۔

میں نے پوری فائل پڑھ لی۔ میں زوار پاشا کا ہم خیال تھا۔ میں نے غور سے شانہ کی تصویر دیکھی۔ ”یہ آخر کون سا جادو کرتی تھی، اپنے شوہروں پر۔“

زوار پاشا میری شکل دیکھ رہا تھا۔ جب میں نے فائل بند کی تو وہ سنبھل گیا۔ ”کیا خیال ہے؟“ اس نے فوراً سوال داغ دیا۔

”بالکل درست زوار پاشا...... یہ عورت درحقیقت بے حد چالاک اور مکار ہے۔“

اور زوار پاشا مسکرانے لگا۔ ”اور اس مکار عورت سے تمہیں ہی نمٹنا ہے۔“

”پوری کوشش کروں گا لیکن اس کے لیے مجھے تمہاری خاص مدد درکار ہوگی۔“

”ہاں...... ہاں...... بے تکلفی سے کہو......“

”تعلقات والی عورت ہے۔ ممکن ہے میری کسی مداخلت سے برافروختہ ہوکر میرے خلاف کوئی اقدام کرے۔ اس وقت آپ کو میری حفاظت کرنا ہوگی۔“

”کسی قانونی چکر کی طرف سے تم بے فکر ہوجاؤ۔“

”ٹھیک ہے، باقی چکروں سے میں خود نمٹ لوں گا۔“ میں نے کہا اور میری اور ہماری بات پکی ہوگئی۔

میں نے زوار پاشا سے شانہ خان کے مکان کا پتا لیا۔ باقی چیزوں کی مجھے چنداں ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ میں زوار سے اجازت لے کر واپس چل پڑا اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے دفتر پہنچ گیا۔

اب میں مصروف تھا، کافی معقول رقم کا کیس تھا اور مجھے اس پر محنت کرنا تھی۔ معاملہ ایک آدمی کی زندگی بچانے کا تھا اور اگر اس کی زندگی نہ بھی بچ سکے تو کم از کم اس کی موت میں شانہ خان کا ہاتھ تلاش کرنا تھا۔ چنانچہ میں اپنی شہرۂ آفاق میز پر بیٹھ کر اس کیس کے تانے بانے بننے لگا، اس میں اپنی مداخلت کی ترکیبیں سوچنے لگا اور میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں سائے کی طرح شانہ خان اور اس کے شوہر کے پیچھے لگ جاؤں گا۔

میں اسے جانِ بہار، رونقِ محفل، آسمان سے اتری ہوئی حور تو نہیں کہہ سکتا تھا لیکن بہرحال حسین تھی اور کسی بھی نوجوان کو آہیں بھرنے کے لیے مجبور کرسکتی تھی۔ اس وقت گہرے عنابی رنگ کی ساڑی میں ملبوس تھی۔ بالوں میں سفید پھول لگے ہوئے تھے۔ اس سادہ سے حسن میں وہ قیامت نظر آرہی تھی۔

آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ میں بھی انسان ہوں، جنسِ مخالف میں میرے لیے بھی وہی کشش ہے جو دوسروں کے لیے...... ہاں احتیاط لازم ہے اور جس نے احتیاط نہ کی مارا گیا۔ چنانچہ میں نے بھی شانہ خان کو پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا اور ایک بات کم از کم سمجھ گیا۔ اس عورت کے بارے میں سب کچھ جاننے کے باوجود اسے اس قدر ظالم اور سنگدل نہیں سمجھا جاسکتا۔ شاید اس کے تمام شوہر اس کے الھڑپن پر مرمٹتے تھے اور سب کچھ بھول کر افواہیں اڑانے والوں کو احمق سمجھنے لگتے تھے۔ اس کی ادائیں معصوم تھیں، اس کے چہرے سے بھولپن برستا تھا۔ اس کے کسی بھی انداز سے فریب کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ اور جب ہوٹل کی بالائی منزل سے چھریرے بدن کا ایک خوبصورت نوجوان نیچے اترا تو میں نے اس کی آنکھوں میں گہری محبت دیکھی۔ وہ پیار بھری نگاہوں سے آنے والے کو دیکھ رہی تھی۔ یہی اس کا شوہر تھا، نیا شوہر۔ یہی اس کا کروڑوں کا چیک تھا۔ وہ اسے محبت بھری نگاہوں سے نہ دیکھتی تو پھر کیسے دیکھتی۔ کرکٹر اس کے قریب پہنچ گیا، اس نے محبت سے بیوی کا ہاتھ تھاما۔ ہوٹل میں اس وقت رقص ہورہا تھا۔ چنانچہ دونوں میاں بیوی چوبی فرش پر رقص کرنے والوں میں شامل ہوگئے۔

میری ڈیوٹی شروع ہوگئی تھی۔ چنانچہ میں ان سے زیادہ سے زیادہ قریب ہوکر ان پر نگاہ رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا، پھر ایک میز پر ایک اداس لڑکی نظر آگئی۔ نجانے اس بے چاری کو کسی نے رقص کے لیے کیوں نہیں کہا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کا قد بہت چھوٹا تھا، رنگ بھی کالا تھا جسے اس نے چھپانے کی کوشش تو بہت کی تھی لیکن یہ میک اپ کا سامان بنانے والی کمپنیاں بھی بس مفت کے پیسے بٹورتی ہیں۔ یہ خوب صورت لڑکیوں کو مزید خوب صورت تو بنا سکتی ہیں لیکن کسی سیاہ رنگ کو چھپانے کے لیے انہوں نے کوئی موثر چیز ایجاد نہیں کی۔ بہرحال مجھے اس کے کالے رنگ اور چھوٹے قد سے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔ مجھے تو بس رقص کرنا تھا۔ چنانچہ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

”کیا آپ کی ٹانگ میں تکلیف ہے؟“ میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

”جی......“ وہ چونک پڑی اور پھر اس نے حیرانی سے اپنے پاؤں دیکھے۔ ”جی نہیں تو؟“ اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

”تب پھر آیئے، رقص کریں۔“ میں نے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔

وہ ایک لمحے کے لیے بھونچکا رہ گئی تھی۔ پھر مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور ہم دونوں بھی چوبی فرش پر پہنچ گئے۔ میں اپنی ہم رقص کے ساتھ ان کے قریب پہنچ گیا۔ رقص کے دوران میں صرف شانہ خان کو گھورتا رہا۔ کیا گڑبڑ ہے، کیا واقعی آج تک صرف اتفاقات ہوتے رہے۔ کیا ان شوہروں کی موت میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے، اتنے لوگ مرگئے۔ ایک بھی ایسا نہیں جس کے بیمے کی رقم معمولی ہو، پھر یہ لڑکی بغیر شوہر کے بھی تو رہ سکتی ہے۔ اسے اتنی شادیاں کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

یا پھر ممکن ہے، اس کی پشت پر کوئی اور ہو جو اسے اس کام پر مجبور کرتا ہو۔ اوہ...... یہ خیال خاصا وزنی معلوم ہوا۔ مجھے اس طرف بھی نگاہ رکھنی ہوگی۔ یقیناً زوار پاشا اور دوسرے لوگوں نے اس انداز میں نہیں سوچا ہوگا۔ ہوسکتا ہے، اس گروہ کے ہی لوگ ان شوہروں کے قاتل ہوتے ہوں۔ لیکن ایک اور بات تھی جس نے میرے اس خیال کی تردید کردی۔ اگر گروہ ہے بھی تو اس کے افراد خود ان لوگوں کو قتل نہ کرتے ہوں گے کیونکہ ایک بھی کیس ایسا نہ تھا، جس میں قاتل پکڑے نہ گئے ہوں یا پھر اس کے شوہر قدرتی موت...... میرا مطلب ہے حادثے کی موت مرے تھے اور یہ حادثے صرف ان کی اپنی حماقت سے ہوئے تھے۔

بہرحال گروہ کے امکان پر نگاہ رکھنی ہوگی۔ ایک بات صاف تھی۔ وہ یہ کہ شانہ خان اپنے کسی بھی شوہر کو کسی پوشیدہ مقام پر قتل نہیں کرے گی بلکہ جب بھی مارے گی، کھلے عام مارے گی، تاکہ دوسرے لوگ اس موت کے گواہ ہوں اور اب تو وہ پولیس اور بیمہ کمپنیوں کی نگاہ میں مشکوک بھی تھی۔ اب تو وہ ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائے گی جو اس کے لیے پریشانی کا باعث ہو۔

چنانچہ ان کی تنہائیوں میں میری ضرورت نہیں تھی۔ ہاں پبلک مقامات پر میں ان دونوں کے ساتھ ضرور رہوں گا اور خاص طور سے اس کے شوہر کے ساتھ اور میں نے یہی کیا۔ پورے چھ دن سے میں ان کے پیچھے لگا ہوا تھا اور اب ایک بات مجھے پریشان کرنے لگی تھی۔ شانہ خان کی اس نئی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ کیا ضروری ہے کہ وہ اپنے اس نئے شوہر کو جلد ہی قتل کرنے یا کرانے کا فیصلہ کر

سکے۔اس کی زندگی طویل بھی ہو سکتی ہے، پھر میں کب تک اس کے پیچھے لگا رہوں گا؟ لیکن اپنی میز پر زوار پاشا کے خوفناک گھونسے بھی مجھے گوارہ نہ تھے۔ مزید کچھ دن گزر گئے۔ زوار پاشا سے دن میں تین چار بار موبائل فون پر بات ہو جاتی تھی۔

یہاں تک کہ پورا ماہ گزر گیا۔ میرے پاس چند چھوٹے چھوٹے کیس آئے۔ جنہیں میں نے کچھ وقت نکال کر ڈیل کیا لیکن میرا ذہن آج کل، شانہ خان میں ہی الجھا رہا۔ اور یہ نئے مہینے کی تیسری تاریخ تھی۔ گہما گہمی کے دن جب لوگوں کی جیبوں میں پیسے ہوتے ہیں۔ چھٹی کا دن تھا۔ مختلف تفریح گاہوں میں بھیڑ تھی۔ شانہ خان اپنی لمبی چوڑی مرسیڈیز میں سلور مون آئی ہوئی تھی۔

میں تو حیثیت ہی چوکیدار کی رکھتا تھا۔ سلور مون میں عام انسانوں کا داخلہ ممنوع تھا، لیکن ایسی ہی ایک جگہ جانے میں مجھے دقت پیش آئی تھی اور میں نے اس کی شکایت زوار پاشا سے کی تھی، چنانچہ زوار پاشا نے اپنی ذاتی کوشش سے میرے لیے ایک کارڈ بنوا دیا تھا جو وزارت داخلہ کی طرف سے جاری ہوا تھا۔ اس کارڈ کے ذریعے میں کسی بھی جگہ بے دھڑک داخل ہو سکتا تھا۔ میری حیثیت ایک سوشل محافظ کی سی تھی۔

چنانچہ سلور مون کے منیجر نے کارڈ دیکھ کر مجھے خوش اخلاقی سے اندر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ بس سلور مون کے منتظمین اس لیے عام لوگوں کو یہاں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ بڑے آدمیوں کی تفریح میں خلل نہ پڑے۔

آپ نے یورپی ساحل بھی دیکھے ہوں گے۔ جہاں مختصر لباس میں چھپکلیاں جگہ جگہ پڑی نظر آتی ہیں۔ ان چھپکلیوں میں نہ دلکشی ہوتی ہے، نہ جاذبیت لیکن سلور مون میں عریاں ہونے والے جسم اور کہیں عریاں نہیں ہوتے۔ اس لیے ان کی دلکشی باقی رہتی ہے۔ بہرحال عریانیت ہی ان کی نگاہوں میں بڑائی ہے، بڑے ہونے کی دلیل۔

جب دعوت نگاہ ہو تو اہل نگاہ کو کیا اعتراض۔ میں بھی سلور مون کے حسین سوئمنگ پول کے کنارے کنارے چہل قدمی کرنے لگا جہاں بڑے لوگ سن باتھ لے رہے تھے۔ شاید ان کے مکانوں میں دھوپ نہیں آتی تھی۔ یہ جھیل بھی قدرتی نہیں تھی بلکہ سلور مون کی خوبصورتی بڑھانے کے لیے بنائی گئی تھی، خاصی گہری تھی اور دل والے ہی اس میں نہاتے تھے۔

میں نے شانہ خان اور اس کے کرکٹر شوہر کو بھی اسی طرف آتے دیکھا اور میں حسب معمول ان کے پیچھے چل پڑا۔ ان دونوں کو آج تک میرے تعاقب کا علم نہیں ہو سکا تھا اور بہرحال یہ میرا کمال تھا۔ ورنہ زوار پاشا جیسے لوگ پانچ لاکھ روپے دینے پر کیوں تیار ہو جاتے۔ اس وقت تو میں ان کے بہت ہی قریب تھا، چنانچہ ان دونوں کی گفتگو کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ شانہ کہہ رہی تھی۔

”تیرنے والے مردوں کے جسم بڑے سڈول ہوتے ہیں کیا تم تیرنا جانتے ہو؟“

”کیوں نہیں!“ کرکٹر صاحب کی آواز سنائی دی۔

”مجھے یقین تھا کچھ بھی ہو، تیرنا ضرور آنا چاہیے۔ دراصل مرد میں کچھ صفات نہ ہوں تو وہ مرد کہلانے کا مستحق نہیں ہے اور تیراکی بھی انہی صفات میں سے ایک ہے۔“

”بے شک ڈارلنگ!“ کرکٹر صاحب نے جواب دیا۔

”اوہ...... دیکھو...... اس نے کتنی خوب صورت ڈائیو لگائی ہے۔“ اس نے جلدی سے ایک مرد کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں۔“

”کیا تم اتنی بلندی سے ڈائیو کر سکتے ہو؟“

”کیوں نہیں!“ کرکٹر نے سینہ پھلا کر کہا۔

”تب چلو...... اس کونے میں چلیں، یہاں رش بہت ہے۔ تم مجھے ڈائیو کر کے دکھاؤ۔“

”آؤ......!“ کرکٹر صاحب نے کہا اور وہ دونوں جھیل کے ایک پرسکون گوشے کی طرف چل پڑے۔ اس طرف بہت کم لوگ تھے۔ اب میرا ان کے پیچھے جانا مناسب نہ تھا اس لیے میں نے ان سے کٹ کر ایک لمبا چکر لیا اور کافی دور سے ان کی طرف پہنچا۔ لیکن اب بھی میرا ان سے کافی فاصلہ تھا۔

میں نے کرکٹر کو لباس اتارتے دیکھا۔ نیچے باتھنگ انڈرویئر موجود تھا۔ پھر وہ ڈائیونگ اسٹینڈ پر پہنچ گئے۔

شانہ محبت بھری نگاہوں سے اس کے سڈول جسم کو دیکھ رہی تھی۔ کرکٹر صاحب قدرے بدحواس نظر آ رہے تھے، میں نے ان کے جسم کو ہولے ہولے کانپتے ہوئے بھی محسوس کیا لیکن شانہ خان مسکرا مسکرا کر ان کی ہمت بڑھا رہی تھی، چنانچہ انہوں نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔

لیکن جس انداز میں چھلانگ لگائی گئی تھی، اسے دیکھ کر میں چونک پڑا، یقیناً یہ کسی تیراک کی چھلانگ نہیں تھی۔ وہ بالکل اناڑی معلوم ہوتا تھا۔ جھیل گہری تھی اور اناڑی تیراک اس میں نہیں تیر سکتا تھا...... اور پھر میرے ذہن میں تیزی سے ایک خیال آیا۔ اسے ڈائیو لگانے کی ترغیب شانہ نے ہی دی تھی۔ قتل کرنے کا ایک حسین طریقہ......!

کسی خیال کے تحت میں نے جلدی سے لباس اتار لیا ہے۔ جسم پر باتھنگ انڈرویئر نہیں تھا، لیکن انڈرویئر ضرور تھا۔ میں نے دور سے جھیل میں چھلانگ لگا دی۔

کرکٹر اوندھے سیدھے پاؤں مار رہا تھا اور شانہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی۔

”ونڈر فل ڈارلنگ...... تم تو بہت اچھے تیراک ہو، دور تک جاؤ۔“

”مم...... میں...... مم......!“ کرکٹر صاحب کی ڈوبتی آواز سنائی دی، کچھ دوسرے لوگ بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

”کیا بات ہے، ڈارلنگ...... کیا تم مذاق کر رہے ہو؟“ شانہ نے ہانک لگائی، لیکن میرے جسم میں بجلیاں بھر گئی تھیں۔ کرکٹر صاحب زندگی کی آخری جدوجہد کر رہے تھے کیونکہ میں نے پانی میں چھلانگ لگا دی لہٰذا میں بہ مشکل انہیں ساحل تک لا سکا تھا۔ ان کی حالت سخت ابتر تھی اور شانہ بھی بدحواس نظر آ رہی تھی۔

”آپ کو تیرنا نہیں آتا تھا تو جھیل میں چھلانگ کیوں لگائی تھی صاحب!“ ایک شخص نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

”نہیں...... بس پانی میں اترنے کے بعد...... طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی۔“ کرکٹر صاحب نے اس عالم میں بھی سچ بولنے سے گریز ہی کیا۔ میری طرف کسی نے بھی توجہ نہ دی۔ نہ شانہ اور اس کے شوہر نے میرا شکریہ ادا کیا۔ چنانچہ میں خاموشی سے پیچھے ہٹ گیا۔ میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ شانہ نے اسے موت کی ترغیب دی تھی، یقیناً وہ تیراک نہیں تھا لیکن شانہ خان نے اسے آمادہ کرنے کے لیے پہلے تیراکوں کی تعریف کی تھی پھر اس کے بدن کو سراہا تھا اور نہ تیرنے والوں کو احمق گردانا تھا۔

اب ایک مالدار بیوی کا غریب شوہر اگر اس کے معیار پر پورا نہ اترتا تو اسے شوہر بننے کا کیا حق تھا۔ چنانچہ غریب کرکٹر سولی پر چڑھ گیا تھا، کون شانہ کو مورد الزام ٹھہرا سکتا تھا۔ اس کے ہوش و حواس درست تھے۔ اس نے کئی آدمیوں کے سامنے ڈائیو اسٹینڈ پر چڑھ کر جھیل میں چھلانگ لگائی تھی۔ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ دوسرے لوگ بھی نہا رہے تھے۔ اگر وہ اب کر مر جاتا تو شانہ خان رونے پیٹنے کے علاوہ اور کیا کر سکتی تھی، کون اسے مورد الزام ٹھہرا سکتا تھا۔

قتل کرنے کا حیرت انگیز طریقہ...... اوہ میرے خدا...... یہ شیطانی مخلوق...... یہ شیطان صفت عورت کس قدر چالاک ہے۔ یقیناً اگر آج میں نہ ہوتا تو یہ پھر بیوہ ہو گئی ہوتی اور بیمہ کمپنی دیوالیا......! زوار پاشا کے لیے میرے پاس بہترین رپورٹ تھی۔ چنانچہ میں نے جلدی سے لباس پہنا۔ دوسری طرف کرکٹر صاحب بھی لباس پہن رہے تھے اور شانہ خان ایسی بدحواس نظر آ رہی تھی جیسے اس کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ اس کا پیارا شوہر ہاتھ سے جاتے جاتے رہ گیا تھا۔

پھر وہ دونوں سلور مون سے باہر نکل گئے۔ میں نے بھی اپنی کار سنبھالی اور زوار کے گھر روانہ ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ فی الحال کرکٹر صاحب کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ تاوقتیکہ وہ دوبارہ مردانگی دکھانے کے قابل نہ ہو جائیں۔

زوار پاشا گھر پر موجود تھا۔ بن سنور کر کہیں جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ مجھ سے بڑے تپاک سے ملا۔

”سناؤ بھئی کیسی چل رہی ہے؟“ انہوں نے مخصوص انداز میں پوچھا۔

”گرما گرم خبر ہے۔ زوار صاحب!“ میں نے دبے ہوئے جوش سے کہا اور زوار پاشا اچھل پڑے۔

”کیا......“ انہوں نے ہونقوں کے سے انداز میں پوچھا۔ ”کیا وہ بھی مر گیا......؟“

”نہیں...... بچ گیا!“ میں نے جواب دیا۔

”ارے مگر کیسے...... بیٹھو تو سہی...... جلدی بتاؤ......“ زوار پاشا نے بے تابی سے کہا اور میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ پھر میں نے زوار پاشا کو ”الف“ سے لے کر ”ے“ تک پوری تفصیل سنائی۔ زوار پاشا کا بھاڑ سا منہ کھلا ہوا تھا۔ پوری کہانی سننے کے بعد اس کا منہ اس طرح بند ہو گیا جیسے پوری کہانی حلق سے اتارنے کے بعد نگلنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”اب بتاؤ...... اب بتاؤ......“ وہ بولا۔ ”اس طرح تو ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ الو کا چرخہ خود مرنا چاہ رہا ہے۔ کون روک سکتا ہے، کیسے روک سکتا ہے، کچھ سوچو میرے یار!...... آج تم نے اسے بچا لیا کل کیا کرو گے؟ اس طرح تو وہ کسی طور جان دے سکتا ہے۔“

”ہاں...... زوار پاشا یہ قتل کرنے کا بالکل نیا انداز ہے۔ ایسے کسی حادثے کو ہم کیسے روک سکتے ہیں؟“

”سوچو...... کچھ سوچو...... تم بہت کچھ کر سکتے ہو...... اور ہاں پانچ ہزار کی رقم اور مل گئی ہے۔ چنانچہ ڈھائی ہزار تمہارے۔“

”آپ کہیں تو میں اس کرکٹر سے ملاقات کر کے اسے ایسی کسی حرکت سے باز رکھوں؟“

”کچھ نہ ہوگا۔ اس طرح تو کچھ نہ ہوگا صاحب! وہ بچ

بھی گیا تو...... بات بن جائے گی لیکن وہ کمبخت آزاد رہے گی۔ مجھے تو اس کے بارے میں ثبوت درکار ہے۔"

"ہوں......" میں سوچنے لگا۔ پھر میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں زوار پاشا! اس بار میں اس کی گفتگو ٹیپ کرنے کی کوشش کروں گا۔" میری آنکھوں میں زوار پاشا کی جیب سے نکلنے والی نوٹوں کی گڈیاں گھوم رہی تھیں۔ بہرحال میں اپنا کام ایماندارانہ طور سے کر رہا تھا اور اگر میں نہ ہوتا تو...... تو یقیناً بھائی کرکنز...... کیش ہو گئے ہوتے۔

"ہاں، یہ عمدہ ترکیب ہے۔ لیکن کیا تم اس سے اس قدر قریب رہ سکو گے کہ اس کی گفتگو ٹیپ کر سکو؟"

"کوشش کروں گا۔ ویسے آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں نے اپنا کام بہ خوبی سرانجام دیا ہے ورنہ......"

"میں جانتا ہوں، مگر ہم اس بدبخت کو کیا کریں جو مرنا ہی چاہتا ہے۔ وہ خوب صورت بلا پھر اسے مرنے کے لیے تیار کر لے گی۔" زوار نے پرخیال انداز میں کہا اور میں بھی سوچ میں پڑ گیا۔ درحقیقت کرکنز کی موت تو لازمی تھی اور یہ کام اتنا آسان بھی نہیں تھا جتنا ہم سوچ رہے تھے۔ نہ زوار پاشا کچھ کر سکتا تھا اور نہ میں...... اور نہ بیمہ کمپنی کے ارکان۔ اگر شانہ خان پر الزام لگاتے تو وہ ہتک عزت کا دعویٰ کر دیتی جبکہ پولیس بھی اس کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں کر سکی تھی۔ سب ہی مجبور تھے۔ میں کرکنز کے باڈی گارڈ کے فرائض کب تک سرانجام دے سکتا تھا۔ اس کی تو پوری زندگی کو خطرہ تھا کیونکہ وہ شانہ خان کا سب سے قیمتی شکار تھا۔

بس ضرورت اس بات کی تھی کہ شانہ خان کوئی حماقت کر بیٹھے، اسی طرح کام بن سکتا تھا۔

"بہرحال اس سلسلے کو تمہیں ہی دیکھنا ہے۔" زوار پاشا نے یاد دلایا۔

"ٹیپ ریکارڈر کے بارے میں تمہارا کیا اندازہ ہے؟"

"میں نے سوچا تھا لیکن آپ کا یہ خیال درست ہے۔ اس کے اس قدر نزدیک کیسے رہا جا سکتا ہے۔"

"وہی تو میں کہہ رہا تھا۔ بہرحال تم کوشش جاری رکھو اور جیسا مناسب سمجھو کرو۔"

"بہتر ہے، مجھے اجازت دیں زوار پاشا!" میں نے کہا اور اجازت مل جانے پر باہر نکل آیا۔

پچاس ہزار وصول ہو گئے تھے، وہ بھی ایک پولیس آفیسر سے جو کم نہ تھے، اس پورے سال میں اتنا قیمتی کیس کوئی اور نہیں ملا تھا۔ دراصل ہمارا ملک غریب ہے، مالدار لوگ اپنے معاملات خود ہی آپس میں طے کر لیتے ہیں۔ کچھ کم یا زیادہ۔ درمیانے طبقے کے مسائل ایسے نہیں ہوتے جن میں وہ کسی پرائیویٹ جاسوس کی مدد لیں اور لیں بھی تو ادائیگی کہاں سے کریں۔ اس لیے یہ رقم خاصی دلکش تھی۔

دوسرے دن اپنے دفتر آنے کے بعد میں نے ڈاک وغیرہ دیکھی۔ سیکریٹری سے کسی نئے کیس کے بارے میں پوچھا۔ کوئی نہیں آیا تھا۔ ملازموں کی پیشگی تنخواہیں دیں۔ اس کے بعد میں اپنی ڈیوٹی پر نکل گیا۔

شانہ خان اپنی کوٹھی پر تھی۔ اس کا اندازہ اس کی کار سے ہوتا تھا۔ میں بھی اس کی کوٹھی سے ذرا دور ٹھہر گیا۔ دن وہیں گزارا، شام کو وہ کلب گئی تو کاٹھ کا الو ساتھ تھا اور رات گئے واپس آئی۔

ایک ہفتہ مزید گزر گیا۔ کوئی کام نہیں بن سکا تھا۔ دوسرے ہفتے کا پہلا دن سنسنی خیز تھا۔ اس دوپہر کو شانہ خان خاصی بنی ٹھنی گھر سے باہر نکلی۔ شوہر بھی ساتھ تھا۔ اس بے چارے کو اور کوئی کام تو تھا نہیں، بس دن بھر گھر میں رہنا ہوٹل چلے جانا یا پھر بیوی کے ساتھ گھومنا اس کا معمول بن گیا تھا۔

ہاں تو اس دوپہر کو شانہ خان آسمانی رنگ کی حسین ساڑی میں ملبوس، قیامتیں سمیٹے اپنے شوہر نامدار کے ساتھ نکلی۔ چنانچہ ان کی کار کے پیچھے میرا چھکڑا بھی دوڑنے لگا۔ آج ان کا رخ شہر سے باہر کی طرف تھا۔

میری چھٹی حس گنگنانے لگی۔

کوئی گڑبڑ...... کوئی گڑبڑ...... اور میں چاق و چوبند ہو گیا۔ کہاں جا رہے ہیں یہ لوگ نجانے کہاں کا ارادہ ہے؟ پھر کافی طویل فاصلہ طے کر کے جب ان کی کار "سنہری جام" کلب کی ذیلی سڑک پر مڑی تو میں نے ایک گہری سانس لی۔ یہاں ڈرائیونگ کے شوقین لوگ آتے تھے۔ کلب کے ایک بہت بڑے علاقے میں کار ریس کا انتظام کیا تھا۔ ڈرائیونگ کے شوقین کلب سے کاریں حاصل کر کے شرطیں لگا کر ریس لگاتے تھے اور یہ ریس کافی خطرناک ہوتی تھی۔ اکثر لوگ یہاں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ کیا کرکنز صاحب بھی ریس میں حصہ لیں گے......؟ ہو سکتا ہے شانہ خان نے انہیں تیار کر لیا ہو۔

"ویری گڈ...... اچھا آئیڈیا ہے مگر اب میں کیا کروں، سوائے اس کے کہ خود بھی اس میں حصہ لوں اور اس گدھے کی حفاظت کی کوشش کروں؟"

کار کلب کے کمپاؤنڈ میں کھڑی ہو گئی۔ شوقینوں کا ہجوم تھا، ترقی پذیر ملک تھا۔ ترقی پسند لوگ ہر نئی تفریح کے لیے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ چنانچہ ریسنگ کلب خوب چل رہا تھا۔

نوجوان لڑکیاں اور لڑکے چست لباس پہنے ریسنگ ہیلمٹ پہنے ادھر ادھر جا رہے تھے۔

شانہ خان اپنے شوہر کے ساتھ ہی ویو میں جا بیٹھی۔ میں نے ان سے کافی دور ایک گوشے کا انتخاب کر لیا تھا۔ ان لوگوں نے ایک مشروب طلب کیا اور میں نے بھی بیرے سے کافی کے لیے کہہ دیا۔ یہاں سے ریس میں حصہ لینے والے صاف نظر آتے تھے۔ بڑے پہیوں والی نیچی کاریں دوڑ رہی تھیں۔ دیکھنے والوں کی تالیاں گونج رہی تھیں۔ ذرا سی لغزش چیتھڑے اڑا سکتی تھی لیکن لوگ تفریح کے لیے زندگی کی بازی لگائے ہوئے تھے اور جب لڑکیاں تک کاریں دوڑا رہی تھیں تو پھر کرکنز صاحب کیسے بیٹھے رہتے۔

تقریباً آدھے گھنٹے تک وہ لوگ یہاں بیٹھے رہے پھر ریس آپریٹر ریس میں حصہ لینے والوں کے آرڈر بک کرنے آیا اور میں نے شانہ کو اسے اشارہ کرتے دیکھا۔ شانہ نے اسے آرڈر نوٹ کرایا اور میں نے ایک گہری سانس لی۔ کرکنز صاحب سولی پر چڑھ گئے تھے اور پھر آپریٹر میرے پاس آیا تو میں نے بھی اسے ریس میں حصہ لینے کا آرڈر نوٹ کرا دیا۔

چند منٹ کے بعد اناؤنسمنٹ ہوئی اور بہت سے لوگ اٹھ گئے ان میں شانہ اور اس کا شوہر بھی تھا۔ میرے رکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہم نے ریسنگ لباس پہنا اور ہیلمٹ لگایا اور چند منٹ کے بعد قطاروں میں کھڑی کاروں کے قریب پہنچ گئے۔ شانہ دیکھنے والوں کے ساتھ جا کھڑی ہوئی اور کرکنز صاحب ریس کا لباس پہنے اس نمبر کی کار کی طرف بڑھ گئے جس نمبر کا لباس پہنے ہوئے تھے، ان کی کار کا رنگ سبز تھا اور میں پیلے رنگ کی کار میں تھا۔ ان کی کار کا نمبر گیارہ تھا اور میں اکیانوے نمبر کی کار کا مالک تھا۔ تیاریاں مکمل ہو گئیں اور میں جل تو جلال تو پڑھ کر اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ میں نے کار چیک کی، ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا۔ ایسا نہ ہو کہ اسے بچانے کی کوشش میں، میں ہی اللہ کو پیارا ہو جاؤں۔ ہاں...... زندگی کا کیا بھروسا، قدرت ایسے ہی دلچسپ تماشے کرتی ہے۔

اس خیال سے میرا دل لرز گیا۔ عام حالات میں زندگی کی بازی لگانے کا شوقین نہیں تھا۔ شاید پوری زندگی اس خوفناک راستے پر کار دوڑانے کا تصور بھی نہ کرتا، لیکن اس وقت معاملہ دوسرا تھا۔

"اونہہ...... اگر یونہی لکھی ہے تو کون ٹال سکتا ہے۔ آرام، آرام سے کھیلوں گا۔ مجھے کون سا ریس جیتنے کا شوق ہے۔ صرف اس گدھے پر نگاہ رکھنی ہے جو ایک بار جان بچنے کے باوجود نہیں سنبھلا۔"

بالآخر ریس شروع ہو گئی۔ کرکنز صاحب کی کار گولی کی طرح قطار سے آگے نکلی۔ درحقیقت اس نے شاندار پک اپ لیا تھا۔ اگر وہ مشاق ڈرائیور ہے تو پھر میرا تردد بیکار ہے کیونکہ بہرحال دوسرے لوگ ریس میں حصہ لے رہے ہیں۔ میں کرکنز صاحب سے کافی پیچھے رہ گیا تھا۔ بہرحال میں بھی چل رہا تھا۔ کرکنز صاحب پہلے راؤنڈ میں بیوی کے سامنے سے گزرے اور شانہ خان نے پرجوش تالیاں بجائیں، اس کے بعد انہیں بیوی سے جدا ہو جانا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ تھام کر دوسرا ہاتھ ہلایا اور پھر بہ مشکل ایک کار سے ٹکرانے سے بچے اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔

یہ اناڑی پن کا ثبوت تھا۔ ایک عمدہ پک اپ لے لینا کوئی بڑی بات نہیں لیکن ریس جاری رکھنا مہارت پر مبنی تھا اور انہوں نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کار جس طرح آگے بڑھائی تھی، وہ ان کے اناڑی پن کا ثبوت تھا۔ اگر دوسرا کھلاڑی اپنی کار نہ بچا لیتا تو تصادم لازمی تھا۔ بہرحال میں نے اپنی کار ان کے پیچھے لگا دی۔

کرکنز صاحب کافی تیز رفتاری سے جا رہے تھے اور میں ان سے ایک مخصوص فاصلہ برقرار رکھ رہا تھا، لیکن دوسرے لوگ یہ احتیاط کیوں رکھتے۔ ماہر ڈرائیور خوفناک انداز میں کاریں دوڑا رہے تھے۔ ہم بہت دور نکل آئے اور پھر پہلا خوفناک موڑ آیا۔ جہاں زمین بھی ناہموار رکھی گئی تھی۔

"ہوشیار" میرے ذہن نے نعرہ لگایا اور میں نے فاصلہ کم کرنا شروع کر دیا۔ کرکنز صاحب اس خوفناک موڑ کو دیکھ کر بدحواس ہو گئے، انہوں نے الٹا سیدھا اسٹیئرنگ گھمانا شروع کر دیا اور ایک بار ان کی کار کچے میں اتر گئی۔ گرد کا طوفان برپا ہو گیا اور وہ اس میں غروب ہو گئے۔ دوسرے لوگ اپنی زندگی بچا کر نکل گئے تھے لیکن کرکنز صاحب کو ابھی ہوش نہیں آیا تھا۔ انہوں نے کار پھر سڑک پر چڑھا دی اور آگے بڑھ گئے۔

"لعنت ہے......" میرے ذہن نے اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ پاگل آدمی نہ جانے کیوں زندگی کا دشمن بنا ہے اور اب ہم دوسرے خوفناک موڑ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس موڑ کے دوسری طرف چٹانیں تھیں جن سے ٹکرا کر کاریں تباہ ہو سکتی تھیں۔ شوہر نامدار کی کار آگے بڑھی لیکن اس بار انہوں نے حاضر دماغی سے کام لیا تھا۔ وہ سست رفتاری سے موڑ سے گزرے تھے لیکن اس طرح ان کے نمبر غائب ہو گئے تھے اور اب آخری کاروں میں ہم دو ہی تھے گویا میرا نمبر سب سے آخری تھا۔ لیکن مجھے اس بات کی کیا پروا

ہوسکتی تھی۔ موڑ سے بہ خیریت گزرنے کے بعد انہوں نے رفتار پھر تیز کردی۔ یہاں تک کہ تیسرا موڑ آگیا۔ یہ موڑ بھی بے حد خطرناک تھا۔ اس پر سڑک تنگ تھی اور اس کے کنارے پر کھائیاں تھیں۔ خاصی گہری کھائیاں لیکن یہ صرف حرف آخر نہیں تھا۔ چھٹے موڑ پر تو اتنی گہری کھائیاں تھیں کہ زندگی کا سوال ہی نہیں تھا۔

کھائیاں دیکھ کر کرکٹر صاحب کے اوسان خطا ہوگئے۔ انہوں نے رفتار پھر سست کردی۔ دوسری کاروں کا نام ونشان نہیں تھا اور اب مارکیٹ میں صرف دو دانے رہ گئے تھے۔ یعنی میں اور وہ...... کرکٹر صاحب نے انتہائی سست رفتاری سے موڑ طے کرتے ہی کار کچے پر اتار دی اور پھر میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ میری روح تک خوش ہوگئی تھی، شاید خدا نے اسے عقل دے دی۔ چنانچہ میں بھی اس کے قریب ہی رک گیا۔

وہ مجھے دیکھ کر جھینپے ہوئے انداز میں مسکرایا اور پھر چونک پڑا۔

"ارے آپ...... آپ تو وہی ہیں۔" اس نے کہا۔

"ہاں...... میں بھی آپ کو پہچان گیا۔ میری اور آپ کی ملاقات سوئمنگ پول میں ہوئی تھی۔"

"جی ہاں...... جی ہاں...... پھر میں آپ کو تلاش ہی کرتا رہ گیا تھا۔ اس دن تو آپ میرے لیے فرشتہ ثابت ہوئے تھے۔ نہ جانے آپ کہاں چلے گئے تھے۔ میں آپ کا شکریہ بھی ادا نہ کرسکا۔"

"مجھے اس کی حاجت نہ تھی۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں اپنا فرض پورا کرکے چلا گیا تھا۔"

"خوب ملاقات ہوئی اس وقت...... آپ بھی اس کھیل میں نئے شوقین ہیں شاید؟"

"جی ہاں......" میں نے گہری سانس لی۔

"میں نے بھی پہلی بار ایسے خوفناک راستوں پر کار دوڑائی ہے۔ اگلے موڑ تو اس سے بھی زیادہ خطرناک ہوں گے۔"

"کہیں زیادہ۔"

"اب تو ہم کوئی نمبر بھی نہ لے سکیں گے؟"

"یقیناً۔"

"پھر کوشش کرنے سے کیا فائدہ......؟ میرا خیال ہے، واپس چلیں؟ کوئی بہانہ کردیں گے کہ کار خراب ہوگئی تھی؟"

"کیوں نہ تھوڑی دیر گفتگو رہے محترم......!"

"ضرور...... ویسے میری بیوی میری منتظر ہوگی۔"

"گستاخی نہ ہو تو کچھ عرض کروں......؟"

"فرمایئے......!"

"وہ اب آپ کی منتظر نہ ہوں گی۔ انہیں یقین ہوگا کہ اب تک آپ کسی کھائی میں گر کر ہلاک ہوچکے ہوں گے۔"

"کیا مطلب......؟"

"وہ آپ کی موت کی اطلاع کی ضرور منتظر ہوں گی۔"

"نہ جانے آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"آپ مجھے اجازت دے چکے ہیں کہ میں جو چاہوں کہوں۔"

"مگر کہنا کیا چاہتے ہیں آپ......؟" وہ حیرت سے بولا۔

"اس سے قبل آپ نے کبھی ریس میں حصہ لیا ہے؟"

"کبھی نہیں۔"

"پھر آج یہ جرأت کیسے کی......؟"

"اوہ...... وہ...... میری بیوی کی خواہش تھی۔"

"اور اس دن سوئمنگ پول والی جھیل میں نہانے کی خواہش بھی آپ کی بیوی نے کی تھی۔"

"ایں...... نہیں...... وہ تو...... وہ تو میں خود......!"

"جبکہ آپ تیرنا بھی نہیں جانتے تھے؟"

"ہاں...... معمولی سی مشق تھی۔"

"میری خواہش ہے کہ ٹھنڈے دل سے میری باتیں سنیں، آپ کی بیوی آپ کو ہلاک کرنا چاہتی ہے۔"

"اوہ...... آپ بھی وہی فضول بکواس کریں گے جو دوسرے کرچکے ہیں۔"

"دوسرے کون؟"

"میرے دوست وغیرہ...... ان کا خیال ہے کہ شانہ فراڈ ہے۔ وہ شادی اس لیے کرتی ہے کہ اسے شوہروں کے بیمے کی رقم مل جائے، لیکن میں کہتا ہوں کہ اس نے کسی کو ہلاک نہیں کیا ہے، سب اتفاقی موت مرے ہیں۔"

"آپ بھی اس دن سوئمنگ پول پر اتفاقی موت مرجاتے اور اگر آج خدا آپ کو عقل نہ دیتا تو آج بھی آپ کسی موڑ پر کسی گہری کھائی میں جا پڑتے کیونکہ آپ ایک مشاق ڈرائیور نہیں ہیں۔"

"دیکھیے جناب، آپ جو بھی ہوں میں آپ سے درخواست کروں گا آپ میری بیوی کے بارے میں کچھ نہ کہیں۔ پتا نہیں لوگ دولت مندوں کے اتنے دشمن کیوں ہوجاتے ہیں۔ ایک عالم میری بیوی سے دشمنی پر آمادہ ہے لیکن میں اس کا شوہر ہوں۔ اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بے حد نفیس عورت ہے۔ اسے اپنی نحوست کا احساس ہے اور

بعض اوقات وہ اس بات پر گھنٹوں روتی ہے کہ لوگ اسے ایسا سمجھتے ہیں۔"

"صرف ایک بات بتا دیجیے جناب۔" میں نے لجاجت سے کہا۔ میں سمجھ گیا کہ اس پر گہری پالش ہے اور سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ وہ مجھے ناگواری کے انداز میں دیکھ رہا تھا۔

"آپ کی بیگم نے آپ کا اتنا قیمتی بیمہ کیوں کرایا ہے؟"

"آپ ذلیل ہیں...... کمینے ہیں۔ دفعان ہوجایئے...... اگر آپ میرے اوپر احسان نہ کرچکے ہوتے...... تو...... تو......" وہ غصیلے انداز میں خاموش ہوگیا اور میں صبر وسکون سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

"خدا آپ پر رحم کرے۔" بالآخر میں نے ٹھنڈی سانس لی اور پھر اپنی کار آگے بڑھا لے گیا۔ دوسری کاریں شاید پانچویں موڑ سے گزر رہی تھیں، لیکن میں درمیانی راستے سے واپس پلٹ پڑا اور تھوڑی دیر کے بعد واپس پہنچ گیا۔ میں تنہا ہی نہ تھا۔ دوسری بہت سے کاریں واپس آگئی تھیں جن میں زیادہ تر لڑکیاں تھیں۔ تیسرے موڑ سے گزرنے کے بعد ان کی ہمت جواب دے گئی تھی اس لیے میری طرف کسی نے خاص توجہ نہ دی۔ میں نے بل ادا کیا اور لباس اتار کر واپس سی ویو پہنچ گیا۔

اور سی ویو سے میں نے شانہ خان کو دیکھا۔ وہ پتھر کے بت کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثرات نہ تھے۔ شاید وہ قسمت کے فیصلے کی منتظر تھی اور پھر تقریباً پندرہ منٹ کے بعد کرکٹر صاحب درمیانی سڑک پر آتے ہوئے نظر آئے۔ میں نے شانہ خان کو چونکتے ہوئے دیکھا اور پھر اس کی گردن لٹک گئی۔

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ آج وہ پھر ناکام رہی لیکن اب کچھ کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ میں اس چالاک عورت کا طریقہ کار سمجھ گیا تھا۔ وہ کسی طور نہیں پھنس سکتی تھی۔ کرکٹر ہوش وحواس میں تھا۔ اپنی مرضی سے ریس میں شریک ہوا تھا۔ اگر وہ کسی حادثے کا شکار ہوجاتا تو شانہ پر کیا بات آسکتی تھی......! پھر ایسی عورت کو پھانسنا کسی قدر مشکل تھا۔ مجھے یہ بھی یقین ہوگیا کہ اس کا کوئی گروہ نہیں ہے۔ اس کا طریقہ کار ایسا ہے کہ اسے کسی گروہ کی ضرورت نہیں ہے۔ کاش کرکٹر بتا دیتا کہ وہ بیمہ کرانے پر کیسے تیار ہوا تھا؟

کافی دیر تک وہ لوگ یہاں رہے۔ شانہ خان کے چہرے سے اب کوئی احساس نہیں ٹپک رہا تھا۔ وہ ہنس ہنس کر شوہر سے باتیں کررہی تھی۔ مجھے شبہ تھا کہ کرکٹر صاحب میرے بارے میں نہ بتا دیں۔ وہ محتاط ہوجائے گی۔ لیکن بہرحال میں یہ نہ معلوم کرسکا کہ اس سلسلے میں اس نے کچھ بتایا یا نہیں۔ پھر جب وہ واپس چل پڑے تو میں نے بھی وہ علاقہ چھوڑ دیا۔

اور پھر رات کو میں نے زوار پاشا کو اس سلسلے میں اطلاع دی۔

"تمہاری کارکردگی اطمینان بخش ہے، مسٹر شاہد جمیل لیکن میں نے آج بیمہ کمپنی والوں سے بات کی تھی۔ اس طرح ہم کب تک باڈی گارڈ کے فرائض انجام دیتے رہیں گے۔ اس عورت کو پھانسنا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بے وقوف شکار ہوئے بغیر نہ رہ سکے گا۔ بہرحال تم اپنا کام جاری رکھو میں اس سلسلے میں کچھ اور سوچوں گا۔"

"اوکے......!" میں نے کہا۔

"اور ہاں...... ایک لاکھ کا چیک اور مل گیا ہے، تمہارا حصہ کل پہنچ جائے گا۔"

"شکریہ زوار پاشا!" میں نے خوش ہوکر کہا۔

بہرحال مجھے اور کیا چاہیے تھا۔ چنانچہ اس نیک انسان نے دوسرے دن پچاس ہزار روپے بھجوا دیے۔ میں نے اپنا کام جاری رکھا لیکن اب میں کافی احتیاط رکھتا تھا۔ کرکٹر صاحب مجھے پہچانتے تھے، ممکن ہے انہوں نے بیگم صاحبہ سے بھی مجھ بے وقوف کا تذکرہ کردیا ہو جو خوامخواہ انہیں ان کی بیوی سے بدظن کررہا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ اس دوران مجھے ایک اور کام مل گیا۔ میری توجہ اس طرف سے کم ہوگئی۔ زوار پاشا بھی شاید بور ہوگیا تھا۔ مگر میں انہیں فون پر بتاتا کہ میں غافل نہیں ہوں۔ چنانچہ اس شام جو کچھ ہوا۔ وہ میرے سامنے ہی ہوا...... اور میں آپ کو بتانے جارہا ہوں۔

ایک رفاہی ادارے کی طرف سے ایک عظیم الشان مینا بازار لگایا گیا تھا۔ ہر خاص وعام کو داخلے کی اجازت تھی۔ داخلہ ٹکٹ معمولی تھا اس لیے مینا بازار کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ میں شانہ خان کا تعاقب کرتا ہوا وہاں پہنچا تھا۔ شانہ اور اس کا کرکٹر شوہر بھی مینا بازار میں گھوم رہے تھے اور میں ان سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس وقت اتفاق سے میری نگاہ شانہ پر ہی تھی جب میں نے اسے کسی کو دیکھ کر مسکراتے دیکھا۔ میں نے چونک کر دیکھا...... لیکن وہ مجھے نظر نہ آسکا جسے دیکھ کر وہ مسکرائی تھی۔ میرے ذہن میں بہت سے شبہات جاگ اٹھے اور میں اس پر کڑی نگاہ رکھنے لگا۔ تھوڑی دور چل کر شانہ پھر مڑی، اس بار اس نے کسی کو زبان چڑا دی تھی۔

انداز بہت دلکش اور دل لبھانے والا تھا اور میں نے خطرناک شکل کے اس پہلوان نما آدمی کو مسکراتے دیکھا جس نے سلک کا کرتا اور پیلے رنگ کا لاچا باندھ رکھا تھا۔ چہرے سے ہی غنڈا اور خطرناک نظر آتا تھا۔ گھنی مونچھوں کے نیچے اس کی مسکراہٹ بہت خطرناک تھی، بات میری سمجھ میں نہ آسکی۔ پھر میں نے پہلوان کو آنکھ مارتے دیکھا۔ ثمانہ خان پھر مسکرا دی تھی اور اس کے بعد جو دردناک مناظر سامنے آئے ان میں کرکٹر کی موت اور میرا خانہ خراب شامل تھا......!

مجھے اسپتال آئے ہوئے تقریباً سات دن گزرے تھے کہ ایک دن سیاہ لباس میں ملبوس کوئی خاتون میرے کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے ہاتھوں میں پھول تھے اور ان کے پیچھے ایک نرس پھولوں کی ٹوکری اٹھائے ہوئے تھی۔

میں نے ان خاتون کی شکل دیکھی اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ ثمانہ خان تھی۔ چہرے پر غم کے سائے، آنکھوں میں سوگواری۔ ہونٹ خشک۔ وہ میرے قریب پہنچ گئی۔

"کیسے ہیں شاہد جمیل صاحب!" اس نے پوچھا۔

"ہم...... میں نے آپ کو پہچانا نہیں خاتون۔" میں نے بہ مشکل خود پر قابو پاکر کہا۔

"میرا نام ثمانہ خان ہے۔ میں وہی ہوں جس پر آپ نے دو دفعہ احسان کیا تھا اور تیسری دفعہ آپ زخمی ہوگئے۔ مرحوم ندیم صاحب میرے شوہر تھے۔"

"اوہ......" میرے منہ سے نکلا۔

"میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں۔"

"لیکن آپ کو میرے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟" میں نے کہا۔

"میں نے معلومات حاصل کی تھیں۔" اور میں خاموش ہوگیا۔ وہ کافی دیر میرے پاس بیٹھی رہی اور پھر وہ دوبارہ آنے کا وعدہ کرکے چلی گئی اور میرے ذہن میں ہلچل مچ گئی۔ اس کا مطلب ہے کہ اسے سب کچھ معلوم ہوگیا ہے اور اب وہ میرے اوپر طنز کرنے کے لیے آئی تھی۔

لیکن دوسرے روز وہ پھر آگئی۔ پھل اور پھول لائی تھی۔ اس روز وہ پہلے سے بھی زیادہ دیر میرے پاس بیٹھی رہی۔ اس نے اپنے نرم ونازک ہاتھ سے میری پیشانی بھی دبائی تھی، بیس دن تک میں اسپتال میں رہا اور وہ روز آتی رہی۔ اب اس کے ہونٹ مسکرانے لگے تھے۔ آنکھیں محبت برسانے لگی تھیں اور میں بوکھلاہٹ میں مبتلا ہوگیا تھا۔

پھر جب میں اسپتال سے ڈسچارج ہوا۔ اس دن وہ میرے ساتھ میرے گھر تک گئی۔ میرے حواس بحال نہ تھے۔ میری سیکریٹری بھی میرے ساتھ تھی، گھر کے دروازے پر اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں ایسا پریشان تھا کہ اس سے گھر میں آنے کے لیے بھی نہ کہہ سکا اور وہ خداحافظ کہہ کر چلی گئی۔ تیسرے روز سے میں نے پھر باقاعدہ اپنے دفتر جانا شروع کردیا اور جس روز میں پہلے دن دفتر گیا، اسی دن مجھے اس کا فون ملا۔

"آپ تو آواز بھی نہیں پہچانیں گے۔" اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"آپ ثمانہ خاتون ہیں۔"

"جی ہاں۔ بڑے بے مروت ہیں آپ۔ تین دن گزر گئے، خبر بھی نہیں لی۔ آج میں آپ کے آفس آرہی ہوں۔"

"تشریف لائیے۔" میں نے کہا اور اسی دن دوپہر کو وہ میرے آفس پہنچ گئی۔

"یاالٰہی یہ کیا چاہتی ہے۔ کیا سلسلہ ہے؟" میں پریشانی سے سوچ رہا تھا۔

"بس دل آپ کی طرف کھنچتا ہے شاہد صاحب! آپ بھی کیا سوچتے ہوں گے کہ یہ کیا مصیبت گلے پڑ گئی۔"

"ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔"

"میں بہت غمزدہ ہوں، شاہد صاحب! لوگ میرے بارے میں طرح طرح کی افواہیں اڑاتے ہیں۔ میرا مرجانے کو دل چاہتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں، کیا نہ کروں۔ پولیس والے الگ پریشان کررہے ہیں۔ مجھ غم کی ماری پر میرے شوہر کے قتل کا الزام لگا رہے ہیں حالانکہ قاتل پکڑا گیا ہے۔ عینی گواہ موجود ہیں لیکن وہ مجھ سے اس کا تعلق پیدا کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔"

"جی۔" میں نے کہا۔

"لیکن مجھے ان کی پروا نہیں ہے۔ میں بے گناہ ہوں، دیکھتی ہوں وہ مجھے کب تک پریشان کریں گے۔ ہاں، مجھے ایک ہمدرد کی ضرورت ہے۔ ایک ساتھی کی تلاش ہے، لیکن کون میرا ساتھی بننا پسند کرے گا؟" وہ گردن جھکا کر سسکیاں لینے لگی اور پھر اس نے اچانک اٹھ کر میرے سینے پر سر رکھ دیا۔

"مجھے سہارا دیجیے شاہد جمیل صاحب! مجھے سہارا دیجیے ورنہ یہ ظالم دنیا مجھ سے میری زندگی چھین لے گی۔"

اور میرا دل چاہا کہ سچ مچ اسے سہارا دے دوں لیکن مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے وہ اخبارات ناچتے نظر آئے جن میں میری موت کی اطلاع چھپی ہوئی ہوگی۔ چنانچہ میں تھوک نگل کر

ہر حال میں نے اسے خود سے جدا نہیں کیا۔ وہ کافی دیر ٹی رہی۔

میری طرف سے اسے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ بہرحال کافی دیر وہ بیٹھی رہی پھر دوسرے دن آنے کا وعدہ کرکے چلی گئی اور میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ کرنا تھا، مجھے کچھ کرنا تھا۔

پھر جب وہ دوسرے دن آئی تو میں کافی پریشان تھا لیکن اس دن اس کا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔ لباس تو سادہ تھا لیکن چہرے سے پرکاری ٹپک رہی تھی، مجھے پریشان دیکھ کر وہ سنجیدہ ہوگئی۔

"کیا بات ہے شاہد صاحب! آپ پریشان ہیں؟"

"کچھ نہیں...... ثمانہ صاحبہ بس وہ......"

"مجھ سے چھپائیں گے۔" اس نے آگے بڑھ کر میری گردن میں بانہیں ڈال دیں اور میں اس کی بے باکی پر حیران رہ گیا۔ اس نے چہرہ میرے قریب کرکے کہا۔

"بات کیا ہے، آپ کو میری قسم!"

"بس کچھ مالی پریشانیاں ہیں، کچھ لوگوں کو......" اور اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اتنی سی بات تھی اور آپ نے مجھ سے کہا نہیں۔"

"مگر ثمانہ صاحبہ......"

"کچھ نہیں...... یہ لیجیے۔ یہ آپ کو رکھنا ہوں گے، ورنہ میں زندگی بھر آپ سے نہ ملوں گی۔" اس نے اپنا پرس خالی کردیا۔ تقریباً ستر ہزار روپے تھے۔

"اس کے علاوہ جتنے پیسوں کی ضرورت ہو لے لیں۔ بس آپ کچھ کہیں گے نہیں ورنہ میں......"

"شکریہ ثمانہ صاحبہ! آپ نے میرے اوپر جو احسان کیا ہے اسے کبھی نہ بھولوں گا۔" میں نے نوٹ جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کے لیے زندگی حاضر ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر میں نے اس کی خاطر مدارات کی اور جب وہ چلی گئی تو میں نے دل کھول کر قہقہہ لگایا۔

دوسرے دن تقریباً بارہ بجے وہ آئی۔ میرے دفتر میں ممن خوبصورت بچے کھیل رہے تھے۔

"ارے یہ کس کے بچے ہیں؟" وہ چونک کر بولی۔

"اوہ...... ثمانہ صاحبہ۔ میری بیوی میکے سے واپس آگئی ہے۔ آپ اس سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ آیئے کسی دن۔ ممن بہت پیاری لڑکی ہے، آپ اس سے مل کر خوش ہوں گی۔"

"تت...... تت...... تو یہ آپ کے بچے ہیں؟"

"ہاں...... چلو...... گلو بیٹا...... آنٹی کو سلام کرو۔" میں نے ایک بچے سے کہا اور بچے نے سلیوٹ ماردیا۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ آنکھوں میں عجیب سی ویرانی سمٹ آئی تھی، پھر اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ سے معذرت کرنے آئی تھی، شاہد جمیل صاحب۔ کچھ ضروری کام ہیں اس لیے آج نہ رک سکوں گی، خداحافظ!"

"خداحافظ......" میں نے زور سے کہا اور وہ جلدی سے باہر نکل گئی۔ میں اور میری سیکریٹری پیٹ پکڑ کر ہنس رہے تھے۔

"بس اب تم اپنے بھائی کے بچوں کو واپس پہنچا دو ورنہ یہ پورے دفتر کا ستیاناس کردیں گے۔" میں نے سیکریٹری سے کہا اور اس نے گردن ہلا دی۔

میں زودار پاشا کے پاس موجود تھا۔ ایک طرف میری سیکریٹری بھی موجود تھی۔ زودار میرا بیان لینے کے لیے مضطرب تھا۔

"کیسے ہو شاہد جمیل؟"

"آپ کی دعائیں ہیں زودار صاحب! کیا کرکٹر......؟"

"ہاں...... وہ مارا گیا......؟ اس کے قاتل کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔"

"کیا اس کا تعلق ثمانہ خان سے ظاہر ہوا؟"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا...... وہ دور دراز کے ایک دیہات سے آیا ہوا تھا اور ایک خطرناک غنڈا تھا، تین بار کا سزا یافتہ...... کل ہی یہاں پہنچا تھا۔"

"اس نے کیا بیان دیا......؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں موقع پر ہی پکڑا گیا ہے، کہہ رہا تھا، اس آدمی نے اس سے ہاتھا پائی کی تھی جبکہ اس نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔"

"اوہ...... زودار صاحب...... میں نے ثمانہ کو اسے متوجہ کرتے دیکھا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔"

"تم کسی کی مسکراہٹ پر پابندی تو نہیں لگا سکتے۔"

"مگر وہ......"

"بے کار ہے۔ تمام کوششیں کرلی گئی ہیں۔ بہرحال میں نے سوچا کہ تم کوئی کام کی بات بتا سکو...... ویسے ثمانہ خان نے تمہارا ذکر بہت اچھے انداز میں کیا ہے۔ وہ بہت غمزدہ ہے لیکن اس نے تمہاری خیریت بھی پوچھی ہے۔ تم نے پہلے بھی اس کے شوہر کی مدد کی تھی۔"

میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ "بے شک وہ ایک چالاک مجرمہ ہے اور یہ کیس بھی میرے ناکام کیسوں میں سے ایک ہے۔" میں نے سوچا۔ میرے بازو کی ہڈی میں فریکچر تھا اور بھی کئی جگہ چوٹیں آئی تھیں۔ زودار پاشا تو چلا گیا۔ اب مزید کہنے کو کچھ نہ رہا تھا البتہ میری سیکریٹری روز آتی ہے۔ □

کشکول

انوار صدیقی

گیارھویں قسط

اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک

طویل سلسلہ

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیراثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

محبت کی یہ داستان نوشہرہ کے لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا انا پرست باپ سردار سرفراز خان طبقاتی فرق کی وجہ سے اپنے بیٹے کی محبت کا مخالف ہے۔ لیاقت اپنی چاہت، فرحین سے شادی کر کے کراچی آ جاتا ہے۔ باپ مخالف مگر ماں اس کی ہمدرد تھی۔ یہ جوڑا کراچی کی ایک کچی آبادی میں گل خان اور اس کی بیوی زرینہ کے ساتھ مشترکہ طور پر کرائے کے مکان میں قیام کرتا ہے، مکان سے متصل قبرستان میں فرحین ایک ہندو عامل پرتاب گھوش کو برہنہ حالت میں پراسرار عمل و رقص کرتے دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی ہے اسی دوران لیاقت حسین کو ایک قبر سے کھل کیا ہوا تعویذ ملتا ہے وہ اللہ کا نام لے کر اس عمل کو ختم کر دیتا ہے۔ لیاقت ملازمت کے لیے پریشان تھا کہ راہ میں ایک جلتے مکان سے جان پر کھیل کر ایک عورت کو نکال لانے پر اس کے بیٹے کے ذریعے اسے سیٹھ عثمان کے ہاں ملازمت مل جاتی ہے۔ سیٹھ عثمان اور ان کی سمز راحیلہ بیگم بہت سلجھے ہوئے ہمدرد انسان اور کامیاب بزنس مین ہیں جبکہ شیخ حامد بہ ظاہر
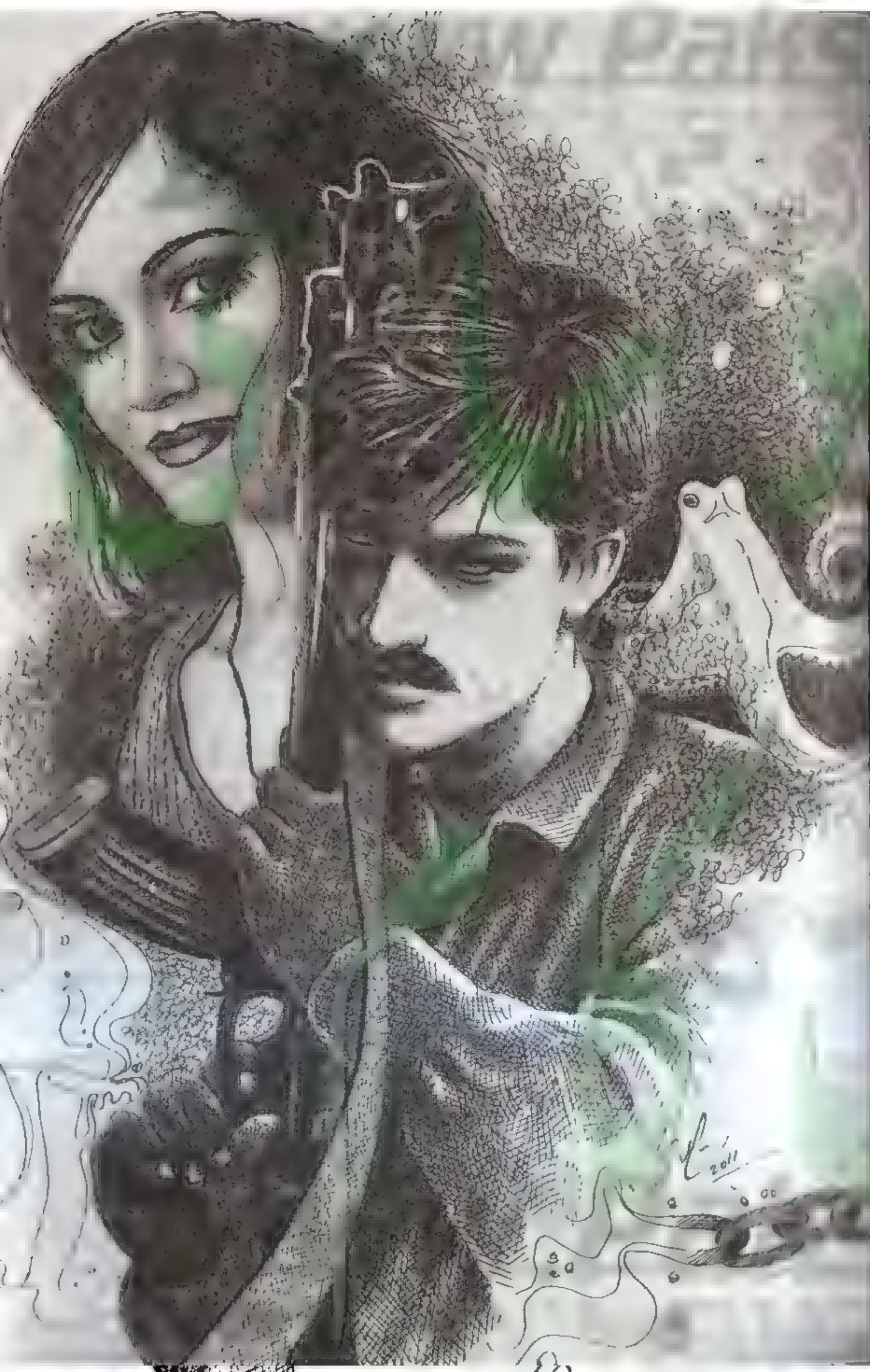
ان کا رفیق مگر درحقیقت حریف ہے اور اپنے دست راست افضل خان کے ذریعے اپنے مخالفین کو نقصان پہنچانے کے منصوبے بناتا رہتا ہے۔ دوسری جانب لیاقت حسین جسے ایک نابینا بزرگ کی جانب سے ایک ماورائی قوت یعنی ہمزاد میسر آ گیا ہے جو مشکل وقت میں اس کے کام آتا ہے لیکن لیاقت حسین کو اس کے متعلق کوئی ادراک نہیں ہے اسی پراسرار قوت کے باعث وہ ہر بار شیخ حامد کے منصوبوں کو ناکام بنا رہا ہے۔ میڈم روبی ایک دولت مند بیوہ ہے جو اپنے شوہر کی حادثاتی موت کے بعد بزنس اور سماجی مصروفیات میں شامل ہوتی ہے اور شوہر کی موت کا انتقام لینا چاہتی ہے اور اسی سلسلے میں شیخ حامد کے دست راست افضل خان سے راہ و رسم بڑھاتی ہے اس کے علاوہ شیخ حامد جو کہ مافیا کا سرغنہ ہے اور گوڈ ورڈ بلیک ٹائیگر کے تحت کئی خفیہ سرگرمیوں میں ملوث ہے۔ اس کے آفس کی ایک ورکر شبنم بھی بگ باس کے خلاف میڈم جیسے ہی مخالف جذبات رکھتی ہے اور اپنی ماں کا انتقام لینا چاہتی ہے۔ لیاقت حسین کے علاوہ سیٹھ عثمان کا ایک پولیس آفیسر دوست ڈی ایس پی سراج بھی اس کا مددگار ہے جو کہ ایک ایماندار افسر ہے اور افسر اعلیٰ علیم احمد کا قابل اعتماد ہے۔ شیخ حامد میڈم کو اپنے زیر اثر لانے کے لیے افضل خان کو استعمال کرتا ہے اور شراب کے نشے میں نیم بے ہوشی کی حالت میں میڈم کی قابل اعتراض تصاویر حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن عین وقت پر ایک پراسرار کال کے سبب وہ اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکا۔ متعدد مواقع پر لیاقت حسین شیخ حامد کے آڑے آتا رہا۔ لہٰذا وہ لیاقت حسین کا دشمن بن گیا اور اسے مجبور کرنے کے لیے فرحین کو اغوا کرا لیتا ہے لیکن یہاں بھی لیاقت حسین اپنے ہمزاد کے ذریعے کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ ناکامی کے بعد بگ باس شیخ حامد افضل خان کو سخت عتاب کا نشانہ بناتا ہے۔ دوسری جانب شبنم میڈم روبی سے ملتی ہے اور مشترکہ مقصد کے لیے تعاون کی درخواست کرتی ہے۔ اسی دوران اعلیٰ افسر علیم احمد ریٹائر ہو جاتا ہے اور آغا منظور اس کی جگہ لیتا ہے جو کہ ایک کرپٹ افسر ہے لیکن میڈم روبی کے لیے نرم گوشہ رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ پولیس ڈیپارٹمنٹ میں رد و بدل کے نتیجے میں نیا ڈی ایس پی لودھی تعینات ہوتا ہے جبکہ ایس پی کے عہدے پر اورنگزیب جوائن کرتا ہے جو کہ ایک ایماندار اور فرض شناس آفیسر ہے۔ سراج حکمت عملی کے تحت در پردہ شیخ حامد سے تعلقات استوار رکھتا ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی صبا کی کال سراج کو موصول ہوتی ہے جس میں وہ اپنی خودکشی کی اطلاع دیتی ہے اور اپنی ایک خفیہ تحریر کے متعلق بتاتی ہے جو اس نے سراج کے نام لکھی ہے جس میں کچھ انکشافات کیے گئے ہیں۔ سراج پریشان ہو جاتا ہے کہ موبائل پر اس کے نمبر دیکھ کر شیخ حامد اس سے برگشتہ ہو جائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا، حامد نے سراج کو حرف چھکانے کے لیے اس کی بیوی الماس کو اغوا کر لیا لیکن اس بار پھر لیاقت حسین کے ہمزاد نے اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔ صبا بیگم کی موت کی تحقیقات کے لیے اورنگزیب تندہی سے تفتیش کرتا ہے شیخ حامد انسپکٹر لودھی کے ذریعے جو اس کا گماشتہ ہے منصوبہ بندی کرتا ہے۔ سیٹھ عثمان لیاقت حسین کو اپنے یہاں ہی اینکسی میں رہائش دے دیتا ہے جبکہ فرحین بھی اپنے علاقے کا ایک چکر لگا کر آتی ہے اور وہاں کا احوال لیاقت حسین کو بتاتی ہے۔ دوران تفتیش انسپکٹر دانش سراج کو ایک اہم فائل کے متعلق بتاتا ہے، دوسری جانب شیخ حامد سخت مشتعل ہو کر انسپکٹر لودھی کی ملی بھگت سے بلیک ٹائیگر کے ذریعے تھانے پر حملہ کر کے انسپکٹر دانش کو قتل کرا دیتا ہے اور تھانے کا تمام ریکارڈ جلا دیتا ہے۔ لودھی معمولی زخمی ہو کر اسپتال پہنچ جاتا ہے۔ جبکہ افضل خان اسپتال سے فارغ ہو کر بے یار و مددگار مایوسی کے عالم میں خودکشی کے بارے میں سوچتا ہے کہ اسے شبنم اپنے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ لے جاتی ہے۔ شبنم بگ باس کے زیر اثر اسی کی ہدایت پر افضل خان کو اپنے فلیٹ میں لائی تھی اور اس کا مقصد آخری چالس کے طور پر شیخ حامد کے مخالفین کے خلاف استعمال کرنا تھا۔ دوسری جانب لیاقت حسین کو اغوا کرایا جاتا ہے جہاں ہمزاد پہنچ کر اسے آزاد کرا لیتا ہے۔ اورنگزیب سراج سے مل کر باہمی اعتماد کا اظہار کرتے ہیں۔ شیخ حامد کے گھر پر حملہ ہوتا ہے اور وہ چراغ پا ہو کر انسپکٹر لودھی سے باز پرس کرتا ہے اور ایک نئے حریف رستم علی آغا خانی کا کردار سامنے آتا ہے۔ مذکورہ حملہ بین الاقوامی ایجنٹ رکھنے والی سیون اسٹار تنظیم نے اپنے ایجنٹ ہاشم اینڈ کمپنی اور مقامی گینگسٹر جہانگیر بٹ عرف جگا کی مدد سے کیا تھا۔ شیخ حامد اپنی سیکریٹری کنول سے خفیہ شادی کا فیصلہ کرتا ہے۔ ہاشم بھی بگ باس سے ذاتی مخاصمت رکھتا ہے اور اسی سلسلے میں جگا سے ملتا ہے جبکہ شبنم افضل خان کو بگ باس کے دل میں جگہ بنانے کے لیے اس کے دشمن رستم علی کے خلاف کارروائی پر آمادہ کرتی ہے اور بگ باس کے مخصوص طریقہ کار کے مطابق رستم علی کی اپنی بیوی کے ساتھ نازیبا تصاویر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن اس کے مستقبل کا فیصلہ ابھی نہیں کیا گیا۔ ایس پی اورنگزیب نے لودھی کو تھانے پر حملے کی پاداش میں معطل کرا دیا۔ سیون اسٹار کے ایجنٹ ہاشم نے ڈوما کے ذریعے بگ باس کے سب سے اہم مہرے بلیک ٹائیگر کو ختم کرایا تو اس سے شیخ حامد کو ایک بڑا دھچکا لگا۔ سراج نے عثمان صاحب سے کچھ عرصے کے لیے لیاقت حسین کی خدمات حاصل کیں۔ دوسری جانب جہانگیر بٹ عرف جگا اپنے گرو امداد علی سے ملاقات کرتا ہے جو کہ ایک سابق پولیس آفیسر اور ریٹائرڈ ایک بہت اثر و رسوخ کا حامل ہے اور جہانگیر بٹ کی عملی تربیت اسی کے ذریعے ہوئی ہے۔ جگا اس ملاقات کے بعد جب اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو ایک شخص کو دیکھ کر چونک گیا جس سے ناکرے کے نتیجے میں چند انکشافات سامنے آئے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

''اس وقت کہاں جا رہے ہو استاد۔ ابھی تو تم نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا؟''

''میرا ذکر زبان پر مت لانا۔'' نووارد نے سرسراتے لہجے میں تحکمانہ انداز اختیار کیا تو جگا کے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ کسی ایسی طلسماتی سچویشن سے پہلے کبھی دوچار نہیں ہوا تھا۔ بدروحوں اور جن بھوتوں کے بارے میں اس نے صرف پراسرار کہانیاں سنی یا پڑھی تھیں لیکن اس وقت وہ سچ مچ کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے نووارد کو دیکھا جو اسے نظر آ رہا تھا لیکن شاید دروازے پر موجود شخص اسے نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ اسی کشمکش و پیچ کی کیفیت میں مبتلا تھا جب نووارد نے اسے بہ دستور سپاٹ آواز میں مخاطب کیا۔ ''اپنے ساتھی سے کہو کہ تم اس وقت کسی اہم کام سے تنہا کہیں جا رہے ہو۔ یہ تاکید بھی کر دو کہ تمہارے سارے آدمی بھی اس جگہ سے ایک گھنٹے کے اندر اندر جدھر سینگ سمائیں تو دو گیارہ ہو جائیں ورنہ وہ بھی لپیٹے میں آ جائیں گے۔''

ذہن مفلوج ہو رہا تھا، اس کی چھٹی حس بھی کام نہیں کر رہی تھی۔ دماغ میں صرف ایک جملہ صدائے بازگشت بن رہا تھا۔ ''جو کچھ کہا جا رہا ہے اس پر عمل کرنے میں ہی عافیت ہے... مان لو۔ ہوتا ہمیشہ وہی ہے جو اوپر والے کو منظور ہوتا ہے۔'' اس نے تن بہ تقدیر خود کو حالات کے حوالے کرنے کی ٹھان لی، وہ خائف نہیں تھا لیکن نادیدہ اور پراسرار قوتوں سے ٹکرانا بھی اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ نووارد کے کہنے پر اس نے فوری طور پر ایک گھنٹے کے اندر وہ جگہ خالی کرنے کی تاکید کی پھر...... اپنے ساتھی کی تمام باز پرس کو ٹالتا ہوا نووارد کے ساتھ قدم ملاتا۔ مکان سے باہر آ گیا۔

''استاد، اس وقت کہاں جا رہے ہو؟'' باہر موجود گارڈ نے بھی اسے تعجب سے دیکھا۔ ''ہم نے تمہارے ڈرائیور کو دو بجے گاڑی لانے کو بولا تھا، ابھی تو......''

''ایک ضروری اطلاع کے پیش نظر فوری جانا پڑ رہا ہے۔'' جگا نے گارڈ کو بھی ٹالتے ہوئے کہا۔ ''میں کوئی ٹیکسی پکڑ لوں گا۔''

عمارت سے نکل کر وہ سڑک پر آیا تو ایک خالی ٹیکسی بھی نظر آ گئی جس کے ڈرائیور نے نووارد کو دیکھا تو اطمینان کا سانس لیتا ہوا باہر آ گیا۔ ''مولا کا کرم ہے جو تم آ گئے۔'' ڈرائیور نے نووارد کو مخاطب کیا۔ ''میں سمجھا تھا کہ آج پھر کوئی چوٹ دے گیا۔ پہلے بھی ایک دو موقعے پر سواری سامنے کے دروازے سے گئی اور پچھلے راستے سے چھوٹ گئی۔ میں ناچارہ گیا۔''

جگا پر پھر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ نووارد جسے جگا کے آدمی بھی نہیں دیکھ سکے تھے، ٹیکسی ڈرائیور کو کس طرح نظر آ گیا؟ کیا وہ بھی اسی قبیلے کا پراسرار فرد تھا؟

''فکر مت کرو۔'' نووارد نے مسکرا کر کہا پھر جگا کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں اجرت کے ساتھ انعام بھی ملے گا۔''

''آپ کو میرا بات برا لگا ہو تو معاف کر دینا صاحب۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے اپنی سیٹ سنبھالتے ہوئے لجاجت سے کہا۔ ''جو مسافر گولی دے کر نکل جائے، میں اس کو بھی دل سے معاف کر دیتا ہوں۔''

ٹیکسی چل پڑی، جگا کا ذہن بہ دستور سنسنا رہا، اس وقت وہ جن حالات سے دوچار تھا وہ طلسم ہوشربا کی کہانیوں سے زیادہ ناقابل فہم تھے۔ اس کی نظریں بار بار نووارد کی طرف اٹھ رہی تھیں جو بڑا پرسکون نظر آ رہا تھا۔ جگا کے ذہن میں بے شمار سوالات گڈمڈ ہو رہے تھے لیکن کوشش کے باوجود وہ نووارد سے ان سوالوں کے بارے میں کوئی استفسار نہیں کر سکا۔ بیس منٹ بعد جگا کو حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا، نووارد نے ٹیکسی کو سروس روڈ کی دوسری جانب اس سڑک پر رکنے کو کہا جہاں سروس روڈ عبور کر کے وہ بنگلا تھا جہاں جگا کو دوپہر کے کھانے کے بعد آنا تھا۔ نووارد نے ٹیکسی سے نیچے اتر کر ایک بڑا نوٹ ڈرائیور کے ہاتھ پر رکھا۔ کسی رقم کی واپسی کا انتظار کیے بغیر جگا کا ہاتھ تھام کر سروس روڈ پر آ گیا، جگا کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ قدم ملا کر بڑھتا رہا۔ بنگلے سے کچھ دور رک کر نووارد نے جگا کو پھر خوابیدہ انداز میں مخاطب کیا۔

''جو کچھ تم نے دیکھا یا سنا اس کے بارے میں اپنی زبان بند ہی رکھنا۔ کھوج لگانے کی کوشش کی تو خود بھی اس طرح گم ہو جاؤ گے کہ اپنا سراغ بھی نہ پا سکو گے۔''

''کیا میں اپنے محسن کا نام دریافت کر سکتا ہوں؟'' جگا نے ہمت کر کے سوال کیا۔ اس سے زیادہ کچھ پوچھنے کی ہمت بھی نہ کر سکا۔

''صرف ایک نام ذہن میں محفوظ کر لو جہانگیر بٹ۔'' نووارد نے جگا کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر ٹھوس آواز میں کہا۔ ''ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج، اگر اس کی طرف سے کبھی کوئی حکم ملے تو انکار کرنے کی غلطی بھول کر بھی نہ کرنا۔ میں کون ہوں؟ یہ بات بھول جاؤ۔ میری ہدایت کا خیال رکھنا، جو کچھ ہو گیا اسے کبھی زبان پر نہ لانا ورنہ بڑی مشکل میں پڑ جاؤ گے۔''

جگا ڈی ایس پی سراج کا نام سن کر چونکا لیکن اس سے پیشتر کہ وہ نووارد سے کچھ معلوم کرتا وہ کسی چھلاوے کی طرح نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ جگا کا ذہن چکرا کر رہ گیا۔ وہ گینگ لیڈر تھا، موت سے آنکھیں ملا کر مسکرانے کا عادی تھا لیکن غیر مرئی اور جن بھوت کی قوتوں سے لڑنا کسی کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ جگا کے ذہن میں نووارد کے لیے کسی مافوق الفطرت ہستی کا ابھرنے والا تصور بھی اتنا اثر انگیز تھا کہ وہ سرسامی کیفیت کا شکار ہو گیا۔ اس کے مساموں سے پسینے چھوٹنے لگے، جسم اس طرح کپکپانے لگا جیسے سردی لگ کر بخار آ رہا ہو۔ ذہن پر اچانک طاری ہونے والی خوف و دہشت کی علامتیں بتدریج بڑھنے لگیں۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا پورا وجود بخار کی شدت سے پھنکا جا رہا ہو۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے مہیب اندھیرے رقص کرنے لگے۔ قدموں پر کھڑا رہنا دشوار ہو رہا تھا۔ اسی کیفیت میں لڑکھڑاتا ہوا وہ دس بارہ قدم آگے بڑھا تو اس کی ہمت جواب دینے لگی۔ اس کا مطلوبہ بنگلا نظروں کے سامنے تھا۔ گیٹ پر موجود گارڈ نے جگا کو دیکھا

رائفل سنبھالتا ہوا جگا کی طرف لپکا لیکن جگا کی سرسامی کیفیتوں نے اس کا توازن بگاڑ دیا۔ سنبھلتے سنبھلتے بھی وہ ڈگمگاتا ہوا زمین پر ڈھیر ہو گیا، نظروں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا اور اس کا ذہن دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

وہ کتنی دیر بے ہوشی کی کیفیت سے دو چار رہا، جگا کو یاد نہیں تھا۔ گزرتے وقت کا ایک دھندلا سا احساس اسے اس وقت ہوا جب دوبارہ اس کے بوجھل پپوٹوں میں زندگی کی رمق پیدا ہوئی۔ اس کی نظریں گھڑی پر پڑیں، کامل پانچ گھنٹے بعد اس کی گھٹن کو ذرا سہارا ملا تھا پھر...... اس نے دوبارہ آنکھ بند کرنا چاہیں تو ایک مانوس آواز نے اسے مخاطب کیا۔ اس نے نظروں کا زاویہ بدل کر داہنی جانب دیکھا، اس کا خاص ماتحت اس کے سامنے کھڑا اس سے پوچھ رہا تھا۔

''تمہیں اچانک یہ کیا ہو گیا استاد......؟ تم ہمیں خبر کیے بغیر ادھر کب اور کس طرح آ گئے؟ کسی کو خبر بھی نہیں دی۔''

''میرے سب...... سب ساتھی تو...... خیریت سے ہیں؟'' جگا نے ڈوبتے ذہن کی جگانے کی خاطر رک رک کر سوال کیا۔

''خدا کا شکر ہے استاد، تمہارے کہنے پر اگر ہم نے عین وقت پر ٹھکانا خالی کرنے میں ذرا دیر کی ہوتی تو سب مارے جاتے۔''

''وہ...... وہ میں نہیں...... وہ...... وہ......'' جگا نے تھم تھم کر کچھ کہنا چاہا لیکن پراسرار نو وارد کے تنبیہی جملے کانوں میں گونجے تو اس نے جلدی سے آنکھیں موند کر خاموشی اختیار کر لی۔

☠☠☠

پوش علاقے کے اس نئے بلاک میں چار سو اور چھ سو گز کے پلاٹس کو دو حصوں میں منقسم کر کے جدید طرز کے بڑے خوبصورت اور دیدہ زیب ون یونٹ بنگلے تعمیر کیے گئے تھے، نچلے حصے میں کچن، ڈرائنگ، ڈائننگ کے علاوہ ایک بیڈ روم اور مختصر سا لاؤنج بھی تھا۔ اوپری حصے میں دو کشادہ روم اور ایک اسٹڈی کے علاوہ خوبصورت ٹیرس بھی نکالا گیا تھا جہاں شام کے وقت کھلی فضا میں بیٹھ کر بیرونی ماحول سے لطف اندوز ہوا جا سکتا تھا، بارش کے دنوں میں بھی یہ ٹیرس اپنے مکینوں کے لیے دل بستگی کا موقع فراہم کرتا تھا۔ اسی علاقے میں لب سڑک سے ایک بلاک چھوڑ کر وہ شاندار بنگلا بھی تھا جس میں کنول اور اس کی ماں ایک روز قبل شفٹ ہوئے تھے۔ کنول اس نئی رہائش گاہ میں آنے کے بعد بہت خوش تھی جسے اسی کے نام سے خریدا گیا تھا۔ اسے وہاں کوئی اہتمام نہیں کرنا پڑا۔ ضرورت کی ہر شے وہاں پہلے سے موجود تھی، خوبصورت فرنیچر سے آراستہ بیڈ روم اور کچن کے علاوہ بیرونی حصے میں ایک مختصر سا لان بھی تھا جو ڈرائنگ روم کے پردے ہٹانے کے بعد نظر آ سکتا تھا۔ ٹیرس پر بیٹھنے کے لیے بھی اعلیٰ اور قیمتی ایزی چیئرز موجود تھیں، آسائش و آرام کا ہر وہ سامان جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا وہاں پہلے سے موجود تھا۔ گیٹ پر باوردی گارڈ بھی تعینات تھا، ایک نئی کار بھی موجود تھی۔

کنول کسی شوخ تتلی کی طرح پورے گھر کے ایک ایک گوشے میں اڑتی پھر رہی تھی، کبھی وہ بیڈ روم کی سجاوٹ کو دیکھتی تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے جاگتے میں کوئی حسین خواب دیکھ رہی ہے۔ ٹیرس پر جاتی تو ساحل سمندر کی سمت سے چلنے والی، بھیگی ہواؤں کی مہک اس کے ذہن میں نئی تازگی پیدا کر دیتی، جدید سامان سے لیس کچن میں جاتی تو ایسا لگتا جیسے اسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ مختصر لان پر جاتی تو مہکتے پھولوں کی خوشبو اس کا استقبال کرتی بیرونی دروازے پر آ کر وہ ڈیوٹی گارڈ کو چوری چوری دیکھتی تو اسے احساس ہوتا کہ وہ تحفظ اسے مل گیا ہے جس کے نہ ہونے سے اس کے باپ کو بھرے بازار میں بیدردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ پارکنگ میں موجود گہرے مرون کلر کی گاڑی دیکھتی تو اسے اپنے اچانک قد آور ہو جانے کا خیال بھی آتا۔ صرف ایک دن کے الٹ پھیر میں جیسے اس کی کایا ہی پلٹ کر رہ گئی تھی۔

ایک گھنٹے سے وہ اپنے نئے آشیانے کے ایک ایک حصے میں چکراتی پھر رہی تھی۔ جب تھک ہار کر ڈرائنگ روم میں آ کر ذرا سستانے کے لیے بیٹھی تو اس کی نظر اپنی ماں پر پڑی جو قریب ہی کھلے شیشے کے دوسری جانب بنے لان کے ایک پودے کو ٹکٹکی باندھے دیکھنے میں مصروف تھی۔ وقت نے اس کے چہرے کو ضرور کملا دیا تھا لیکن اس کے...... نقوش اب بھی اس بات کی نشاندہی کرتے تھے کہ حسن کی وہ متحرک مورت کبھی بے حد حسین اور پرکشش بھی رہی ہو گی۔ کنول ماں کے چہرے پر سنجیدگی دیکھ کر چونکی، ایک لمحے تک دور بیٹھی اس کی نظروں کا تعاقب کرتی رہی پھر اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔ ماں نے اس کی طرف توجہ دی تو وہ اس کی گود میں سر رکھ کر بڑے لاڈ سے صوفے پر دراز ہو گئی، ماں کی نظروں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''کیا بات ہے ماں۔ کیا تمہیں اپنا یہ چھوٹا سا پرسکون نشیمن پسند نہیں آیا؟''

''یہاں زیادہ تر کسی کے نشیمن پر ہی گرتی ہیں۔'' وہ میں کہہ گئی پھر کنول کی دلجوئی کی خاطر بات بدل کر ''تمہاری خوشی میں میری خوشی بھی ہے لیکن کچھ باتیں ہیں جو آج بھی مجھے پریشان کر دیتی ہیں۔ عورت کے سر پر مضبوط سائبان نہ ہو تو......''

''پلیز ماں......'' کنول نے مچل کر کہا۔ ''میں نے تمہیں ٹھنڈا دینے کی خاطر ہی سب کچھ کیا ہے۔''

ماں نے کنول کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا، زبان سے کچھ نہیں کہا۔

''یہاں کی ہر چیز بلا شرکت غیرے صرف اور صرف میرے نام ہے۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟''

''وقت بڑا ظالم ہوتا ہے کنول۔ حالات جب طوفان کا روپ اختیار کرتے ہیں تو عورت کی کمزوری اس کے منہ زور تھپیڑوں کو برداشت نہیں کر سکتی۔''

''تمہیں کس بات کا خوف ہے---؟'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اپنے اس ماضی کا جو ایک مرد کے چلے جانے سے خس و خاشاک کی طرح تباہ ہو گیا تھا۔''

''ان ہی حالات کو دوبارہ سنوارنے اور بنانے کی خاطر میں نے بھی حالات سے مجبوراً سمجھوتا کیا ہے۔''

''کنول......'' ماں نے اسے تجربے کار نظروں سے دیکھا۔ ''یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟ کیا تجھے یہ رشتہ پسند نہیں ہے؟''

''تم نے بھی اسے صرف میری خاطر منظور کیا ہو گا؟'' اس نے ماں کو دیکھتے ہوئے عجیب لہجے میں جواب دیا۔ ''مجھے بھی اپنی ملازمت عزیز تھی، دولت اور مرد کے آگے کوئی کمزور عورت اکیلے کچھ نہیں کر سکتی۔ میں خوشی سے ہاں نہ کرتی تو حالات میری نظریں جھکا دیتے۔ بہت سے خطروں کو بہت قریب سے دیکھنے کے بعد ہی میں نے فیصلہ کیا تھا۔ نہ کرتی تو بھی وہی ہوتا جو اب ہو گا۔'' وہ نظریں جھکا کر روانی میں بولتی رہی۔ ''فرق صرف اتنا ہے کہ اس وقت مجھے بغیر قیمت کے روند دیا جاتا۔ میری زندگی پر بدچلن اور آوارہ ہونے کا ٹھپا لگ جاتا۔ اب ایک کاغذ کے ٹکڑے پر دو گواہوں کی موجودگی میں جو کچھ ہو گا اس پر قانون یا مذہب کے ٹھیکے دار انگلیاں نہیں اٹھا سکیں گے۔ حالات ساز گار رہے تو تمہاری طرح مجھے بھی صرف بیوی کا روگ لگ جائے گا۔''

''کنول......'' ماں نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ ''یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟''

''وہی جو سچ ہے۔'' اس نے نظریں اٹھا کر ماں کے چہرے پر پھیلے تفکرات کو دیکھا پھر زبردستی مسکرا کر بولی۔ ''عمروں کے فرق سے کچھ نہیں ہوتا ماں۔ عزت کا بھرم قائم رہے یہی سب سے بڑی بات ہے۔''

''تو چاہے تو اب بھی انکار کر سکتی ہے۔'' ماں نے اس کی باتوں کی گہرائی سمجھتے ہوئے بھی اس کی دل جوئی کی خاطر ٹھوس لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی۔ ''ہم جس طرح بھی ہوا بری بھلی گزار لیں گے۔ پہلے بھی حالات کی گردش برداشت کر رہے تھے۔ اب بھی کسی نہ کسی طور زندگی گزر جائے گی لیکن تیری خوشیاں مجھے زیادہ عزیز ہیں۔''

''اسی طرح تمہارا سایہ بھی میرے لیے سب سے بڑی نعمت ہے، میں اس نعمت سے محروم نہیں ہونا چاہتی۔''

''کیا مطلب......؟'' ماں نے کنول کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

''جان بوجھ کر انجان نہ بنو ماں......'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ دل پہ جبر کر کے جواب دیا۔ ''کل کسی نے میری خاطر مجھے باپ کے سائے سے محروم کر دیا تھا۔ اب بھی کوئی میری خاطر مجھے تمہارے سائے سے محروم کر دے گا۔ تاریخ بھی اسی طرح اپنے آپ کو دہراتی رہی ہے۔''

''میں سمجھی نہیں...... کیا میری بیوگی کے پیچھے بھی......''

''پلیز ماں......'' اس نے تڑپ کر ماں کو ملتجی نظروں سے دیکھا۔ ''اپنی زبان پر قابو رکھو...... دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، جو کچھ بیت گیا، جو کچھ ہو رہا ہے دیکھتی جاؤ اور ماں کی زبان سے بیٹی کے حق میں نیک دعائیں کرتی رہو۔ اسی میں ہم دونوں کی بہتری ہے۔''

ماں جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی جب باہر کنول نے اپنے گیٹ پر ایک سیاہ رنگ کی بڑی گاڑی کو رکتے دیکھا، گاڑی کو دیکھ کر دروازے پر تعینات گارڈ بھی اٹینشن پوزیشن میں آ گیا۔ کنول کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں، اس نے ماں کو اشارہ کیا تو وہ لپک کر پیچھے والے کمرے میں چلی گئی۔ کنول نے دوبارہ گیٹ کی سمت دیکھا، شیخ حامد کو گاڑی سے اتر کر اندر آتا دیکھ کر اس نے جلدی سے اپنی بھیگی پلکیں خشک کر کے ایک دل آویز تبسم اپنے گداز ہونٹوں پر سجا لیا۔ دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتی ڈرائنگ سے نکل کر شیخ حامد کے استقبال کی خاطر مرکزی دروازے پر آ گئی۔ ہمیشہ کی طرح اس نے مسکراتی نظروں سے اس کا استقبال کیا۔

''تمہیں یہ چھوٹا سا گھر پسند آیا......؟'' شیخ حامد نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"یہ میری توقع سے کہیں زیادہ حسین اور دلفریب ہے۔" اس نے دل پر جبر کرکے جھوٹ بولا۔

"ہوگا لیکن تم میرے لیے اس سے زیادہ حسین ہو۔" اس نے کنول کو کمر میں ہاتھ ڈال کر خود سے قریب کرلیا پھر ذرا تکلف سے دبی زبان میں سوال کیا۔

"تمہاری ماں کہاں ہیں......؟"

"ادھر ہی تھیں۔ آپ کے آنے کی وجہ سے کمرے میں چلی گئیں۔"

شیخ حامد نے جواب میں کنول کا ہاتھ تھام کر اوپر جانے والی سیڑھیوں کا رخ کیا، وہ اس کے ساتھ قدم ملا کر سیڑھیاں طے کرتی ہوئی بلندی کی طرف جانے لگی۔ اوپر ایک بیڈروم میں پہنچ کر شیخ حامد نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ کنول کی گہری جھیل نما خوبصورت آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر اس کے ہونٹوں کا طویل بوسہ لیتے ہوئے بستر پر نیم دراز ہوگیا۔ کنول اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ وہ شیخ حامد کو بڑی والہانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی جب شیخ حامد نے سرسراتے لہجے میں سوال کیا۔

"ہمارے درمیان یہ عارضی دوری آج رات ختم ہوجائے گی لیکن...... میری بات یاد رکھنا، باقاعدہ نکاح کے بعد بھی تمہیں اور تمہاری ماں کو زبان بند رکھنی پڑے گی، جب تک میں اجازت نہ دوں۔"

"مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔" کنول نے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

"نکاح سے پیشتر میں تم سے پھر کھل کر ایک سوال کرنے آیا ہوں۔ تم اس شادی پر خوش تو ہو؟"

"خوش نہ ہوتی تو اس وقت اس چھت کے نیچے نہ ہوتی۔"

"تمہاری ماں نے کسی مجبوری کا سودا تو نہیں کیا؟"

"آپ کا کیا خیال ہے؟" اس نے بات ٹالنے کی خاطر شیخ حامد کو مخمور نظروں سے دیکھا۔

"میں...... میں تمہارے ساتھ کسی مجبوری کا سودا نہیں کرنا چاہتا۔" جواب کھرے اور بے باک انداز میں دیا گیا۔ "تم میری حیثیت اور شاید میری طاقت سے بے خبر بھی نہ ہوگی۔ اگر مجھے محض وقت گزارنا ہوتا تو شاید اس وقت تم مجھ سے نظریں ملا کر بات نہ کر رہی ہوتیں۔"

"آپ...... آپ اب بھی ایسی ہی پوزیشن میں ہیں۔" کنول نے ہونٹ چباتے ہوئے قدرے سنجیدگی سے جواب دیا پھر نظریں جھکالیں۔

"تم نے اپنی ماں کے سلسلے میں میری بات کا جواب نہیں دیا؟"

"انہوں نے سب کچھ میری مرضی پر چھوڑ دیا تھا، شاید اس لیے کہ وہ اپنی زندگی گزار چکی ہیں اور اب مجھے بھی اپنی زندگی گزارنے کا اختیار ہے۔" کنول نے کچھ سوچ کر اپنی بات جاری رکھی۔ "مجھے اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے لیکن...... ایک بار کسی نے مجھے ماڈل گرل کا پروفیشن اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں اس میدان میں غیر متوقع کامیابی حاصل کرسکتی ہوں۔"

"پھر...... تم نے اس کی بات ماننے سے گریز کیوں کیا......؟" شیخ حامد نے اسے معنی خیز انداز میں سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"اس لیے کہ میں لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا نہیں بننا چاہتی تھی۔"

"اسی لیے میں نے بھی تم سے کھیلنا مناسب نہیں سمجھا۔" شیخ حامد نے دوبارہ اسے اپنی آغوش میں سمیٹتے ہوئے بڑی گرمجوشی سے کہا، کچھ دیر تک دونوں کی بہکی بہکی سانسیں آپس میں گڈمڈ ہوتی رہیں پھر کنول نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

"رات آنے میں زیادہ دیر نہیں ہے، اس کے بعد آپ کو مجھ پر ہر طرح کا اختیار ہوگا۔"

"تھینکس......" شیخ حامد نے اسے اپنے شکنجوں سے آزاد کرتے ہوئے مسکرا کر دیکھا۔ "اچھا کیا جو تم نے مجھے بروقت ٹوک دیا۔"

کچھ دیر بعد وہ کنول کے ساتھ نیچے ڈرائنگ روم میں آگیا۔ کنول اس کے کہے بغیر ماں کو سامنے لے آئی، شیخ حامد سنبھل کر بیٹھ گیا، اس نے کنول کی ماں کو ایک نظر بغور دیکھا پھر رسمی طور پر ان سے بھی وہی سوال کیا جو کنول سے کرچکا تھا۔

"میں نے اپنی بچی کو آزادی دی تھی تو اس پر مجھے اعتماد بھی تھا۔" کنول کی ماں نے دل پر پتھر رکھ کر اپنی مرضی کے خلاف کہا۔ "آپ نے کنول کو اپنانے کا فیصلہ کیا ہے وہ بھی ہم پر ایک احسان ہی ہے۔"

"آپ شرمندہ کر رہی ہیں۔" شیخ حامد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اب اجازت چاہوں گا۔ رات کو دوبارہ حاضر ہوں گا۔"

کنول اس کو چھوڑنے دروازے تک آئی پھر واپسی پر اس نے ماں کو بتا دیا کہ رات اس کا اور شیخ حامد کا نکاح

ہوٹل سے ہوجائے گا۔ یہ اطلاع دیتے وقت اس کی خوب صورت آنکھوں میں جو حسرت ابھری وہ ایک ماں کی نظروں سے اوجھل نہ رہ سکی۔

***

بھرے بدن اور درمیانہ قد والا سیاہ فام ہاشم جس کا اصل جنوبی افریقا کے ایک غیر مہذب علاقے سے تھا۔ اس وقت بڑا مہذب اور بردبار نظر آرہا تھا، وہ اس وقت جس میک اپ میں تھا اس سے یہی گمان ہوتا تھا اس کا تعلق ویسٹ انڈیز کے کسی نوآباد علاقے سے ہوگا۔ فرنچ کٹ ڈاڑھی اور آنکھوں پر چشمے کے اضافے نے اس کی اصلیت کو اس حد تک تبدیل کردیا تھا کہ وہ میک اپ کرنے کے بعد خود بھی اپنی مہارت پر ششدر رہ گیا۔ حلیے کی وہ تبدیلی اس کے لیے ناگزیر تھی۔

سیون اسٹار کی طرف سے خطرناک مگرمچھ کا کریا کرم کرنے کی اجازت ملنے کے بعد وہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی جذباتی ہوگیا تھا۔ انتقام لینا اس کی سرشت میں شامل تھا۔ شیخ حامد کے گرگوں نے جس طرح اسے ایک موقعے پر زیر کرلیا تھا وہ اس کی زندگی کا سب سے خوفناک دن تھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ وہ دشمن کے ہاتھوں سے زندہ بچ سکے گا، پھر بھی اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ اسے یقین تھا کہ موت برحق ہے اور اس کے لیے جو وقت طے کردیا جائے وہ اٹل ہوتا ہے، چنانچہ آخری وقت تک موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا اس کی زندگی کا زریں اصول تھا، اسی اصول کے تحت اس نے اپنے اغوا کرنے والوں کے ساتھ کوئی جدوجہد نہیں کی تھی، کسی موقع کی تلاش میں وہ ان کے ساتھ خاموشی سے اس جگہ تک چلا گیا تھا جہاں لوچن شہباز گڈز ٹرانسپورٹ کے ایک مخصوص شخص کی زبان کھلوانے کی خاطر اس پر تھرڈ ڈگری کا اذیت ناک نسخہ استعمال کر رہا تھا۔ وہ ہاشم کو وہاں اچانک دیکھ کر بوکھلا گیا تھا۔ خود ہاشم نے بھی یہی سوچا تھا کہ اس نے وہاں جاکر کسی عقلمندی کا ثبوت نہیں دیا تھا لیکن ان حالات میں بھی اس نے حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ اس نے ایک ایسا آزمودہ نسخہ استعمال کیا کہ لوچن بھی تلملا کر بظاہر اس کا دشمن نظر آنے لگا۔ دشمن بھی ایک لمحے کو خوش فہمی کا شکار ہوگئے۔ اسی خوش فہمی سے فائدہ اٹھا کر لوچن نے، جو مارشل آرٹ کا ماہر تھا بڑی دور اندیشی سے بازی کا رخ پلٹ دیا تھا۔ ہاشم نے اس موقعے پر طے کرلیا تھا کہ وہ شیخ حامد کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس کی تربیت بھی ان ہی بنیادوں پر ہوئی تھی کہ آخری سانس تک دشمن کے سامنے ڈٹے رہو۔ وہ سیون اسٹار کا پابند نہ ہوتا تو وہ پہلی فرصت میں کوئی مناسب پلاننگ کرکے اپنے دشمن کو مار دیتا یا خود مر جاتا لیکن وہ معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہوگیا لیکن شیخ حامد کے مکان پر کامیاب حملہ اور اسے پوری طرح ہراساں کرنے کی پلاننگ میں کامیاب ہوجانے کے بعد سیون اسٹار کی طرف سے بھی گرین سگنل مل گیا تھا۔ یہ بھی ہدایت ملی تھی کہ کام اس طرح کیا جائے کہ کوئی رسک نہ ہو مگر حالات نے ایک نیا رخ اختیار کیا تو ہاشم نے اپنے پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی کرڈالی۔

کشمیر فرنیچر کے خفیہ کمرے میں ڈوما سے ملاقات کے بعد واپسی کے وقت اسے ایک چہرہ نظر آگیا جسے وہ پہلے بھی اپنے ہوٹل کے آس پاس منڈلاتا دیکھ چکا تھا۔ فوری طور پر اس وقت ہاشم نے یہی سمجھا تھا کہ شاید اس وقت بھی اس کا تعاقب کیا جارہا ہوگا۔ اپنے اس شبہے کو دور کرنے کی خاطر اس نے دو روز تک ہوٹل کے کمرے سے باہر نکلنے کی غلطی نہیں کی۔ ڈوما کو سیون اسٹار کا حوالہ دے کر اس نے مشتبہ آدمی کی نگرانی پر مامور کردیا تھا۔ پھر جب متعلقہ مشکوک آدمی کی طرف سے اس کا شبہ یقین میں بدل گیا تو اس کے ذہن میں ایک مصلحت نے سر ابھارا۔ راستے کی ان چھوٹی موٹی رکاوٹوں کو بھی دور کردیا جائے جو اس کے، شیخ حامد کے درمیان کوئی دشواری پیدا کرسکتی تھیں۔

اپنے پروگرام کے تحت اس نے ڈوما سے یہی کہا تھا کہ کسی طرح مشتبہ شخص کو قابو کرلیا جائے۔ اس طرح وہ اس کی زبان کھلوا کر اور بہت سی کام کی باتیں بھی معلوم کرسکتا تھا مگر...... ڈوما کے مجبوری ظاہر کرنے کے بعد اس نے جلد بازی میں یہی فیصلہ کیا تھا کہ مطلوبہ شخص کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ یہ حکم اگر وہ اپنی ذاتی حیثیت میں دیتا تو شاید ڈوما اس کی تعمیل میں کسی نہ کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ بھی کرتا چنانچہ کچھ لمحوں کے لیے اس نے موبائل کا رابطہ منقطع کیا پھر اسے دوبارہ کال کرکے یہی کہا کہ...... "سیون اسٹار کی طرف سے بھی گرین سگنل ملا ہے کہ کانٹا درمیان سے نکال دیا جائے۔"

ڈوما کو ضروری ہدایت دینے کے بعد ہی اس نے فوری طور پر ہوٹل سے نکلنے کا فیصلہ بھی کرلیا۔ ڈوما نے بھی اسے یہی مشورہ دیا تھا چنانچہ ہاشم نے نہ صرف ہوٹل تبدیل کردیا بلکہ اپنا حلیہ بھی اس مہارت سے بدلا کہ خود بھی اپنے آپ کو شناخت نہ کرسکا۔

اس وقت وہ کسی ہوٹل کے بجائے ایک پرائیویٹ گیسٹ ہاؤس کے ایئرکنڈیشنڈ روم میں بیٹھا پیش آنے والے حالات پر غور کررہا تھا۔ اس کے ذہن میں بار بار ایک خیال

ابھر رہا تھا۔ جتنی جلد ممکن ہو، بڑے مگرمچھ کا کریا کرم بھی کردیا جائے۔ سانپ کو آستین میں پالنا اور دودھ پلانا بھی اس کے اصولوں کے خلاف تھا۔ دوسرا ایک خیال یہ بھی کسی خطرے کا احساس دلا رہا تھا کہ اس نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سیون اسٹار کا مخصوص کوڈ استعمال کرنے میں بھی جلد بازی کا مظاہرہ کرڈالا تھا۔ اگر وہ خود رابطہ قائم کر کے صورت حال کی وضاحت کردیتا تو عین ممکن تھا کہ سیون اسٹار کی جانب سے بھی اس کی تجویز سے اتفاق کیا جاتا لیکن اس نے جلد بازی میں ڈوما کو از خود سیون اسٹار کے ہامی بھرنے کا یقین دلانے کی بھول کی تھی۔ ان حالات میں بھی یہ ضروری تھا کہ وہ مزید وقت ضائع کیے بغیر اپنے دشمن سے اپنا حساب کتاب برابر کرلے جس کی اجازت اسے بہرحال مل چکی تھی۔

وہ ان ہی باتوں پر غور کررہا تھا جب موبائل نے وائبریٹ کرنا شروع کیا۔ اسکرین پر ڈوما کے نمبر دیکھ کر اس نے موبائل آن کر کے کانوں سے لگالیا۔

"سوری......" اس نے معذرت کی۔ "کچھ حالات ایسے تھے کہ میں تمہیں دو گھنٹے بعد فون نہیں کرسکا، کیا خبر ہے؟"

"سوٹ کیس پارسل کردیا گیا ہے...... تم اس وقت کہاں ہو؟"

جواب میں ہاشم نے اسے اپنا پتا سمجھانے کے بعد پوچھا۔ "کوئی نئی خبر......؟"

"ہاں......" ایک لحہ توقف کے بعد ڈوما نے ناخوشگوار انداز میں جواب دیا۔ "یہ پہلا اتفاق ہے کہ کسی ٹیم کے ایک ممبر نے اپنے کسی دوسرے ساتھی کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالنے کی کوشش کی ہو۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو......؟" ہاشم، ڈوما کا جواب سن کر بری طرح چونکا، اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

"تم ایک تجربہ کار آدمی ہو میرے دوست۔" اس بار بھی ڈوما کے لہجے میں طنز کی آمیزش تھی۔ "اپنی زندگی بچانے کی خاطر کسی اور کے گلے میں پھندا ڈالنا بہرحال تمہیں زیب نہیں دیتا تھا...... دیٹ از آل۔" دوسری جانب سے رابطہ منقطع کردیا گیا۔

ہاشم نے فوری طور پر پے در پے تین بار ڈوما کے نمبر ملانے کی کوشش کی لیکن دوسری جانب سے موبائل بند ملا۔ یہ صورت حال اس کے لیے تشویش ناک تھی۔ پھانسی کے پھندے کے حوالے سے بات اس کے ذہن میں آچکی تھی۔

وہ کچھ دیر کشمکش و پیچ میں مبتلا رہا۔ ایک ثانیے کو اس کے ذہن میں یہ خیال بھی ابھرا کہ زندگی بچانے کی خاطر سارے معاہدوں کو بالائے طاق رکھ کر پہلی فلائٹ سے فرار ہوجائے لیکن اس نے اس بزدلانہ خیال کو خود ہی ترک کردیا۔ وہ جس پیشے سے منسلک تھا اس میں موت اور زندگی دونوں کا دارومدار اصول پسندی پر تھا۔ اس نے معاہدے کی خلاف ورزی حالات کے پیش نظر ضروری سمجھی تھی لیکن بہرحال سیون اسٹار سے اجازت نہیں لی تھی۔ اس نے فرار کا ابھرنے والا خیال رد کر کے سیون اسٹار سے رابطہ کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ تین گھنٹیوں کے بعد دوسری جانب سے کال ریسیو کی گئی۔

"کیا بات ہے......؟" کال ناگواری سے وصول کی گئی تھی۔

"میں ایک اہم سچویشن کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔"

"اب اس کا وقت گزر چکا ہے۔" بہ دستور سرد لہجے میں جواب ملا۔ "تم نے معاہدے کی خلاف ورزی کر کے غداری کی ہے اور غداری کی ایک سزا ہوتی ہے یہ بات شاید تم بھی جانتے ہوگے۔"

"لیکن......"

"بحث فضول ہے۔" اس کی بات رد کر کے سپاٹ انداز میں کہا گیا۔ "ہم پسند نہیں کریں گے کہ مرنے والے کی وجہ سے کسی طور پر کوئی ایجنسی ہمارے اوپر شبہ بھی کرے۔"

"تیر تو بہرحال کمان سے نکل چکا ہے...... لیکن، میں اپنی غلطی تسلیم کرنے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ بھی نہیں کروں گا۔"

"تم اس پوزیشن میں بھی نہیں ہو۔"

"اب میرے لیے کیا حکم ہے......؟" ہاشم نے دبنگ آواز میں سوال کیا۔

"سرخ کیپسول......" دوسری جانب سے فیصلہ سنا دیا گیا۔ "ایجنسی والوں کو تمہاری جیب سے ایک تحریر بھی ملنی چاہیے جس میں اس بات کو قبول کیا جائے کہ تم نے اسپورٹس کاروالے کو ذاتی دشمنی کی وجہ سے ٹھکانے لگایا تھا۔"

"اوکے میڈم۔" ہاشم نے مسکرا کر مردوں کی طرح جواب دیا۔ "سرخ کیپسول کھانے کے بعد میں ذاتی طور پر قریبی تھانے کو اپنا مکمل ایڈریس بھی ضرور بتادوں گا۔ یہ بھی عرض کردوں گا کہ ہاشم نے ہمیشہ موت کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر مسکرانا سیکھا ہے۔ اوکے، اینڈ گڈ بائی۔" موبائل بند کرنے کے بعد ہاشم کچھ دیر تک خاموش رہا پھر اس نے

...ی ستم ظریفی پر کسی غم کا اظہار کرنے کے بجائے دل ...ول گرفتگی سے بھرپور قہقہے لگانے شروع کیے۔ اس کے ...آرام سے صوفے پر بیٹھ کر اس نے اپنا پسندیدہ چینل ...یسرچ سے متعلق تھا...... لگایا، پھر ...سے ایک سرخ کیپسول نکال کر منہ میں ڈال لیا۔ کیپسول ...چبانے سے پیشتر اس نے سیون اسٹار سے کیے گئے ...دے کے مطابق علاقے کے تھانے کا نمبر ملا کر اپنا نام اور ...ایڈریس بھی تفصیل سے سمجھا دیا۔ اس عرصے میں اس کی نظریں بہ دستور ٹی وی اسکرین ہی پر جمی رہی تھیں۔ فون کرنے کے بعد اس نے سرخ کیپسول کو چبالیا۔ دس منٹ کے اندر اندر وہ زندگی کی بازی بھی ہار گیا۔

☠☠☠

شیخ حامد نے شبنم کو افضل خان کا لگژری اپارٹمنٹ دینے کی جو خوشخبری سنائی تھی وہ شبنم کے لیے حالات کے پیش نظر کسی طرح مناسب نہیں تھی۔ وہ بگ باس سے اس سلسلے میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھی لیکن وہ اس پہلو پر بڑی سنجیدگی سے غور کررہی تھی کہ اگر وہ بھی افضل خان کی جگہ ہوتی تو شاید اس فلیٹ کے سلسلے میں ایک نفسیاتی کمتری اور گھٹن کا شکار ضرور ہو جاتی۔ افضل خان چاہے اس بات کو زبان سے نہ کہتا لیکن دل میں اسے اس کا احساس ضرور ہوتا۔

وہ سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور کررہی تھی۔ اگر اس نے افضل خان کے ساتھ مل کر بگ باس کے خلاف کوئی خفیہ منصوبہ بنانے کی ضرورت پر غور نہ کیا ہوتا تو اور بات تھی لیکن اب وہ دوسرے زاویے سے تمام پہلوؤں پر غور کررہی تھی۔ اس پوزیشن میں بھی نہیں تھی کہ اپارٹمنٹ والی آفر کو کسی بہانے رد کردیتی۔ بگ باس انکار سننے کا عادی نہیں تھا۔ شبنم کی جو کمزوری تصویر کی شکل میں اس کی تحویل میں تھی، اس نے شبنم کو کسی آخری قدم سے بھی روک رکھا تھا۔ اگر وہ کسی موقع سے فائدہ اٹھا کر بگ باس کو ٹھکانے بھی لگاتی تو تصویریں سامنے آجانے کی صورت میں پولیس پھانسی کا پھندا اسی کے گلے میں ڈال دیتی۔ ایک تنہا عورت ہونے کی وجہ سے بھی وہ اتنا بڑا قدم اٹھانے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔

شیخ حامد نے ایک ماہر کھلاڑی کی طرح شبنم کو ہر طرف سے نہ صرف اپنے شکنجوں میں جکڑ رکھا تھا بلکہ اس کے ذریعے وہ افضل خان سے بھی اپنی من مانی کرا رہا تھا۔ افضل خان اگر پولیس کے ہاتھ لگتا تو شبنم کا نام بھی ضرور سامنے آجاتا، وہ اپنی زبان بند رکھتا تو بگ باس کسی اور ذریعے سے بھی اس کے اور افضل خان کے تعلق کو منظر عام پر لاسکتا تھا۔

شبنم کی ذاتی معلومات کے مطابق، افضل خان کے اسپتال سے فارغ ہونے کے بعد اس کے فلیٹ میں کچھ مدت قیام کی اطلاع بھی پولیس کے ریکارڈ پر آچکی تھی۔ اب بگ باس نے اسے پھر افضل خان کو اپنے ساتھ رکھنے کا حکم دیا تھا جس سے وہ انکار نہیں کر سکتی تھی لیکن یہ ضرور سمجھ رہی تھی کہ بگ باس نے اس کے گرد جو جال بچھایا تھا اس میں وہ پوری طرح پھنس چکی تھی۔ اب اس دلدل سے نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ وہ افضل خان کو صورت حال سے مکمل طور پر آگاہ کرنے کے بعد کھل کر یہ بھی ظاہر کر دیتی کہ اس نے اپنی آزادی کے لیے کیا پلان بنایا ہے۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ خود افضل خان کے سینے میں بھی دفن گرم راکھ کے اندر کوئی ایسی چنگاری ضرور دبی ہوگی جو بھڑک کر شعلہ بننے کا موقع تلاش کر رہی ہوگی۔ ممکن ہے وہ اپنے طور پر غلط اندازہ قائم کر رہی ہو لیکن بہر حال وہ اس اندھے جوئے کو کھیلنے پر مجبور تھی۔ اسی غرض سے اس نے ایک خطرناک رسک لیتے ہوئے اپنے ذاتی منصوبے اور اس کے مکمل پلان کو مختصراً ٹائپ کر کے اپنے پرس میں ڈال لیا تھا اور اس وقت اسٹار ان ہوٹل کی طرف جا رہی تھی جہاں بگ باس کی اطلاع کے مطابق افضل خان مقیم تھا۔ اس اطلاع کی فراہمی کے علاوہ یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ افضل خان سے مل کر بگ باس کے منصوبوں کے مطابق اپنا کردار ادا کرے۔

''اسٹاران ہوٹل'' جاتے وقت بھی شبنم کے ذہن میں اس کے ذاتی منصوبے کے مختلف پہلو کلبلا رہے تھے۔ ناکامی کی صورت میں اس کا حشر اس کی توقع سے کہیں زیادہ بھیانک ثابت ہوتا۔ وہ افضل خان کی جس مجبوری سے فائدہ اٹھانے کا سوچ رہی تھی۔ افضل خان بھی اسی صورت کو استعمال کر کے بگ باس کی نظروں میں سرخرو ہونے پر غور کر سکتا تھا۔ بہر حال شبنم اس کے لیے بھی پوری طرح آمادہ تھی، وہ جانتی تھی کہ ''بلائنڈ'' پتوں پر جیت کا انحصار کرنے والے اکثر بازی بری طرح ہار بھی جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں بار بار ''نو رسک، نو گیم'' کا فارمولا بھی کسی نیون سائن بورڈ کی طرح جل بجھ رہا تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں محو تھی جب ایک سگنل پر رکنے کے بعد اس کی نظر ''عقبی شیشے'' پر پڑی۔ گہرے سرخ رنگ کی وہ جیپ جسے سرسری طور پر پیچھے آتا دیکھ چکی تھی اس بار اس کے ذہن میں خطرے کا سگنل بن کر ابھری۔ بگ باس نے بھی اسٹاران ہوٹل اور افضل خان سے ملنے کا مشورہ دیتے وقت کہا تھا کہ وہ کسی ممکنہ تعاقب کے خطرے کو نظر انداز نہ کرے۔ کسی اہم ماتحت کے مارے جانے کے بعد بگ باس بھی خاصا محتاط ہو گیا تھا۔ ''وہ کون تھا؟'' شبنم کو اس کی خبر نہیں تھی لیکن وہ اس جیپ کو پہلے بھی کئی موقعوں پر دیکھ چکی تھی جو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ لودھی کی ملکیت تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ لودھی بھی عتاب میں ہے اور بگ باس بھی اس سے خوش نہیں ہے۔ ایسی صورت میں لودھی کا اس کے تعاقب میں آنا معنی خیز ہی تھا۔

شبنم نے ایک لمحے کو سوچا کہ وہ افضل خان کے پاس جانے کا ارادہ ترک کر دے لیکن پھر کسی خیال سے اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز تبسم جاگ اٹھا۔ سگنل کھلتے ہی شبنم نے ایک دو موڑ کاٹنے کے بعد مذکورہ جیپ کو پیچھے آتے دیکھا تو اپنے پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی کر دی۔ اسٹاران ہوٹل جانے کے بجائے وہ اس کے قریب واقع ایک تین منزلہ سپر اسٹور میں چلی گئی۔ بہ ظاہر وہ خود کو لاعلم ظاہر کر رہی تھی لیکن اس نے جیپ کو کچھ فاصلے پر رکتے دیکھ لیا تھا، ایک دکان سے کاسمیٹک کے ایک دو آئٹم خریدتے وقت اس نے لودھی کو بھی اندر آتے دیکھ لیا۔ اپنے خیال کی تصدیق کی خاطر وہ دیدہ و دانستہ سپر اسٹور کی تیسری منزل پر لفٹ کے ذریعے چلی گئی جہاں نچلی دو منزلوں کے مقابلے میں کم رش ہوتا تھا۔ ایک دو اسٹالوں پر وقت گزارنے کے بعد وہ جنرل اور میڈیکل سامان فروخت کرنے والی دکان پر رکی تو لودھی بھی اسی کاؤنٹر پر آگیا، اس نے دکان کے سیلز مین سے ایک انجکشن طلب کرنے کے ساتھ ہی اس طرح شبنم کی طرف دیکھا جیسے وہ ملاقات محض ایک اتفاق ہو۔

''ہیلو......'' اس نے روایتی انداز میں شبنم کو پوری توجہ سے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ یہاں کیا لینے آگئیں؟''

''ایک ضروری دوا لینی تھی جو کہیں اور نہیں مل رہی تھی۔'' شبنم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ وہ اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کر رہی تھی کہ ممکن ہے بگ باس کا کوئی سادہ لباس والا بھی لودھی یا اس کی نگرانی پر مامور ہو۔

''حیرت ہے۔'' لودھی نے اس بار دبی زبان میں بے تکلفی کا اظہار کیا۔ ''جو خود کئی امراض کا علاج ہو گیا وہ بھی کسی دوا کی ضرورت کی محتاج ہو سکتی ہے؟''

''کبھی کبھی وقت اور حالات انسان کو مجبور کر دیتے ہیں۔'' شبنم نے تلخی کے بجائے جان بوجھ کر مسکرا کر جواب دیا۔ وہ اس بات کی تصدیق کرنا چاہتی تھی کہ لودھی کے تعاقب کرنے کا خیال کہیں اس کا وہم نہ ہو۔

''یہ بات بھی مجھے ہضم نہیں ہوئی اس لیے کہ آپ

...'' پھر کہتے کہتے لودھی نے اپنا جملہ کسی فوری خیال سے ادھورا چھوڑ دیا۔

''آپ خاموش کیوں ہو گئے......؟'' شبنم نے اسے کریدنے کی ٹھان لی۔

''اس لیے کہ ایک بار دفتر میں آپ نے میرے ساتھ روکھا انداز اختیار کیا تھا۔''

''اوہ......'' شبنم نے بے تکلفی سے جواب دیا۔ ''دفتر میں کچھ بندشیں بھی ہوتی ہیں جس پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے... اور سنائیے، آج کل آپ کی لائف کیسی گزر رہی ہے...؟ سنا ہے کہ آپ کو......'' اس بار شبنم نے بھی دیدہ و دانستہ جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

''ٹھیک سنا ہے آپ نے۔'' لودھی نے اس کے قریب ہوتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''ایس پی اور نگ زیب نے ذاتی رنجش کی وجہ سے اپنے اثر و رسوخ استعمال کر کے مجھے معطل کرا دیا ہے۔''

''کیا......؟'' شبنم نے چونک کر بڑی خوبصورت اداکاری کرتے ہوئے تعجب کا اظہار کیا۔ ''کیا آپ کی طرف سے کسی نے جوابی کارروائی نہیں کی؟''

''اس میں بھی کچھ مصلحت ہے...... ایس پی نے مجھ سے دشمنی مول لے کر خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے...... وہ بھی کچھ دنوں کا مہمان ہے، اس کا تبادلہ ہو جانے کے بعد حالات پھر سازگار ہو جائیں گے۔''

لودھی کا مطلوبہ انجکشن لایا گیا تو گفتگو کا سلسلہ ٹھپ ہو گیا۔ شبنم نے بھی اپنا بل ادا کیا۔ دونوں ایک ساتھ واپسی کے ارادے سے پلٹے تو لودھی نے ایک جگہ رک کر کہا۔ ''اس وقت آپ سے اتفاقیہ ملاقات ہو گئی تو ایک ضروری کام بھی یاد آگیا۔''

''حیرت ہے۔'' شبنم نے اسی کا جملہ واپس کرتے ہوئے شوخی سے کہا۔ ''جو خود دوسروں کے کام آتا ہو اسے کیا کام پیش آسکتا ہے؟''

''میں اپنی ذاتی اور نجی حیثیت میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔'' خلاف توقع لودھی نے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اس وقت اگر آپ میرے کام آجائیں تو میں ہمیشہ آپ کا شکر گزار رہوں گا۔''

''خیریت......؟'' شبنم نے اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ لودھی اس سے کیا درخواست کرے گا، اس کا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ لودھی نے ایک لمحے کی جھجک کے بعد عاجزی سے کہا۔

''باس کسی وجہ سے میری ایک غلطی پر ناراض ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو شاید ڈی آئی جی کو بھی مجھے معطل کرنے سے پیشتر اپنی ملازمت کے بارے میں ضرور غور کرنا پڑتا۔''

''آئی سی۔'' شبنم نے انجان بن کر پوچھا۔ ''باس آپ کی کس غلطی پر خفا ہے؟ اور میں اس سلسلے میں بھلا کیا کر سکتی ہوں؟''

''آ......آپ کوئی مناسب موقع دیکھ کر باس سے میری سفارش کر دیں۔ مجھے یقین ہے وہ آپ کی بات رد نہیں کرے گا۔'' لودھی کے تعاقب کی وجہ شبنم کی سمجھ میں آگئی۔

''آپ میرے مقابلے میں باس سے زیادہ قریب رہ چکے ہیں۔ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ اس کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔'' شبنم نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ ''وہ کسی کی مداخلت بھی پسند کرنے کا عادی نہیں ہے۔''

''میں یہ بھی جانتا ہوں لیکن میں نے آپ سے درخواست کی ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی کی ہے۔'' لودھی نے اسے مخصوص انداز میں دیکھ کر دبی زبان میں کہا۔ ''ممکن ہے کہ میری ذاتی معلومات ناقص ہوں، پھر بھی میں آپ سے سفارش کی درخواست واپس نہیں لوں گا۔''

شبنم، لودھی کے جواب پر دل ہی دل میں چونکی، اسے علم تھا کہ بگ باس اور لودھی کے تعلقات کس قسم کے تھے، لودھی اپنی سطح سے گر کر بھی شیخ حامد کی نجی ضرورتیں پوری کرنے میں بھی شرم نہیں کرتا تھا، یہ بات شبنم کے علم میں تھی اس لیے اس نے لودھی کی معلومات کے بارے میں وضاحت طلب کرنے میں پس و پیش کا مظاہرہ کیا۔ کچھ توقف کے بعد بولی۔

''میں کوئی یقینی وعدہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ بہر حال، اگر آپ کے کسی کام آسکی تو مجھے خوشی ہوگی۔''

''میرے لیے آپ کا اتنا جواب بھی بہت ہے۔'' لودھی نے اس بار قدرے اعتماد سے کہا پھر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا لفٹ کی طرف چلا گیا۔ شبنم نے اس کے ساتھ جانے میں عجلت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ سپر اسٹور سے نکل کر اس نے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر یوں ہی دو چار سڑکوں کا چکر لگایا۔ لودھی کی جیپ اس کے تعاقب میں دور دور تک نظر نہیں آرہی تھی۔ اس نے اطمینان کا سانس لے کر گاڑی کا رخ ہوٹل اسٹاران کی طرف موڑ دیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ افضل خان کے ساتھ اس کے کمرے میں موجود تھی۔ رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد افضل خان نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تمہاری سفارش پر مجھے آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع مل گیا۔''

''آئندہ بھی ملتا رہے گا۔ بشرطیکہ تم مایوسی کا شکار ہونے کے بجائے عقلمندی سے کام لو۔''

''میرے لیے کوئی نیا حکم......؟''

''ایک اہم خبر سنانا چاہتی ہوں۔'' شبنم نے افضل خان کو نظروں کے مخصوص اشاروں سے کچھ سمجھاتے ہوئے جواب دیا۔ ''بگ باس تمہارے لگژری اپارٹمنٹ کو جدید انداز میں ٹھیک کرا رہا ہے۔''

''کیا میں اس خواب پر یقین کرلوں؟'' جواب میں بہ دستور حیرت اور تعجب کا اظہار کیا گیا تھا۔

''ہاں...... لیکن کچھ ترمیم کے ساتھ۔'' شبنم نے ٹھوس آواز میں کہا۔ ''یہ ہم دونوں کی کارکردگی کا ملا جلا انعام ہوگا۔''

''میں سمجھا نہیں......؟''

''میرے ایک سوال کا کھل کر صاف گوئی سے جواب دو۔ کیا تم میرے ساتھ رہنا گوارا کرو گے؟''

''یہی سوال میں تم سے بھی کرسکتا ہوں۔'' افضل خان نے جذباتی انداز میں کہا۔ ''کیا بگ باس کو میرا اور تمہارا ایک ساتھ رہنا گوارا ہوگا؟''

''اس کا اشارہ نہ ہوتا تو میں اس موضوع پر زبان کھولنے کی جرأت بھی نہ کرتی۔ اب تم کیا کہو گے؟''

''میرا خیال ہے کہ میرے پاس تمہارے کسی مشورے پر عمل کرنے کے علاوہ فی الحال کوئی آپشن بھی نہیں ہے۔''

''مجھے تمہارا جواب پسند آیا۔'' شبنم نے دیدہ و دانستہ اپنی برتری کا اظہار کیا۔ ''تم کو شاید ایک طویل عرصے تک اسی انداز میں ری ایکٹ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد بھی سب کچھ باس کی مرضی پر منحصر ہوگا۔''

''میں جانتا ہوں۔ میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ اگر بگ باس نے آڑے وقت میں میرا ہاتھ نہ تھاما ہوتا تو شاید میں بہت پہلے قانونی شکنجے میں الجھنے کے بعد زندگی کی بازی ہار چکا ہوتا۔'' افضل خان نے کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح اعتراف کیا۔ ''میں اس احسان کو زندگی کی آخری سانسوں تک فراموش نہیں کرسکتا، خواہ حالات کیسے ہی ہوں۔''

''میں تمہارے اس احساس کو بگ باس کے کانوں تک پہنچانے کی کوشش ضرور کروں گی۔'' شبنم نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''باس کا ردعمل کیا ہوگا اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اب چلتی ہوں، ہوسکتا ہے کہ ہمیں دو چار دنوں بعد اسی اپارٹمنٹ میں شفٹ ہونا پڑے جو بھی تمہارے پاس تھا۔''

شبنم نے جاتے وقت اپنا پرس کھول کر ٹائپ شدہ خط نکالا پھر اسے فرش پر گراتے ہوئے لمبے لمبے قدم اٹھاتی چلی گئی۔ افضل خان نے اس کے جانے کے بعد کاغذ کا بہ ظاہر بے کار صفحہ کھول کر تفصیل سے پڑھا تو اس کی آنکھوں میں کسی ایسے آدم خور درندے جیسی چمک ابھری جو اپنے کسی پسندیدہ شکار پر جھپٹ پڑنے کے لیے پوری طرح تیار ہو۔ اس نے ٹائپ شدہ مضمون کو کئی بار تفصیل سے پڑھا پھر پہلی فرصت میں اسے جلا کر اس کی راکھ واش بیسن میں بہادی۔

☆☆☆

لیاقت حسین کے سلسلے میں سراج کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ ڈیوٹی کانسٹیبل کے بیان کے مطابق وہ دس پندرہ منٹ میں واپسی کا کہہ کر کہیں قریب ہی کسی فوری ضرورت کے لیے گیا تھا لیکن ڈیڑھ گھنٹا گزر جانے کے بعد بھی وہ واپس نہیں آیا تھا۔ وہ اچانک کہاں اور کیوں چلا گیا؟ تھوڑی دیر کا کہہ کر جانے کے باوجود اس کی واپسی کیوں طول پکڑتی جارہی تھی؟ سراج ان ہی سوالات کے بارے میں غور کر رہا تھا جب لیاقت حسین انتہائی پرسکون حالت میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کی پریشانی یا الجھن کے تاثرات نہیں تھے۔ سراج اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ لیاقت حسین کے بارے میں چونکہ وہ کچھ پراسرار باتوں سے بھی واقف تھا اس لیے اس نے کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ لیاقت حسین اس کی اجازت حاصل کرکے بیٹھ گیا تو سراج نے سادگی سے پوچھا۔

''کہاں چلے گئے تھے لیاقت حسین؟ میں بڑی دیر سے تمہاری راہ دیکھ رہا ہوں۔''

''دس منٹ کے لیے تو گیا تھا صاحب۔'' لیاقت حسین نے معصومیت سے جواب دیا۔ ''آپ کو ضرورت تھی تو موبائل پر حکم دیدیتے، میں واپس آجاتا۔''

سراج سٹپٹا کر رہ گیا۔ لیاقت حسین کے جواب میں کوئی اداکاری، تصنع یا بناوٹ نہیں تھی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ اس کی واپسی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہی ہوئی تھی۔

''میرے کانسٹیبل کا کہنا ہے کہ تم کسی فوری ضرورت کا کہہ کر گئے تھے۔'' سراج نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''جب دفتر میں تمام سہولتیں موجود ہیں تو تمہیں کہیں اور جانے کی کیا ضرورت تھی؟''

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔
''تمہیں دیکھ کر مجھے طارق معظم یاد آتا ہے۔''
دوست نے کہا۔ ''مگر طارق معظم تو مجھ میں ذرا بھی مشابہت نہیں رکھتا۔''
پہلے دوست نے کہا۔ ''کیوں نہیں رکھتا۔ اس نے بھی تمہاری طرح مجھ سے پانچ سو روپے ادھار لیے ہوئے ہیں۔''

☆☆☆

ایک بچہ بیمار ہوگیا۔ اس کا باپ اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے بچے کے سینے پر آلہ رکھتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا، دس تک گنتی گنو۔''
یہ سن کر بچہ گھبرا گیا اور باپ سے کہنے لگا۔ ''آپ تو کہہ رہے تھے کہ اسپتال لے جا رہا ہوں۔ یہ تو آپ مجھے اسکول میں لے آئے ہیں۔''

''میں نے آپ کی غیر موجودگی میں کمرے میں بیٹھنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔'' لیاقت حسین نے کسمسا کر کہا۔ ''آپ نے عزت دی ہے وہ میری توقع سے زیادہ ہے صاحب لیکن دوسرے لوگ اسے عجیب نظروں سے دیکھیں گے۔ آپ برا نہ مانیں تو میں کمرے کے بجائے باہر کرسی ڈال کر بیٹھنے میں زیادہ سکون محسوس کروں گا۔''

''صرف اسی لیے تم ڈیڑھ گھنٹے تک سوچ بچار کرنے کی خاطر کہیں چلے گئے تھے؟''

سراج نے پہلی بار اس کی غیر حاضری کے سلسلے میں خفگی کا اظہار کیا تو لیاقت حسین نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا پھر، تصدیق کی خاطر جب اس نے دفتر میں لگی دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی تو اس کے چہرے پر ایک انجانی پریشانی سی طاری ہوگئی، وہ ڈیوٹی کانسٹیبل سے دس پندرہ منٹ کا کہہ کر چہل قدمی کے ارادے سے نکلا تھا۔ سراج کی غیر موجودگی میں اس کے کمرے میں بیٹھنے سے اسے گھٹن ہو رہی تھی۔ اس کا ذاتی خیال تھا کہ وہ پندرہ بیس منٹ سے زیادہ عرصہ باہر نہیں رہا تھا لیکن گھڑی دیکھنے کے بعد اس کا ذہن بھی چکرا کر رہ گیا۔ کچھ دیر تک وہ اسی کیفیت سے دوچار رہا پھر اس نے سراج کی جانب دیکھ کر بڑی عاجزی سے درخواست کی۔

''صاحب...... ایک بات عرض کروں اگر آپ برا نہ مانیں۔''

''کہو......'' سراج نے اس کے چہرے کی بدلتی کیفیت دیکھ کر دریافت کیا۔ ''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''آپ مجھے دماغ کا علاج کرنے والے کسی ڈاکٹر کو......''

''لیاقت حسین......'' سراج نے اس کا جملہ کاٹ کر تیزی سے کہا۔ ''اس سے پیشتر بھی جو باتیں تمہارے ساتھ ہوچکی ہیں ان کو مت کریدو۔ زیادہ الجھو گے تو بات اور خراب ہوجائے گی اور...... یہ بھی یاد رکھو کہ میں نے تمہیں ساتھ لاتے وقت کیا کہا تھا۔''

''وہ تو مجھے یاد ہے صاحب لیکن میرے ساتھ بار بار ایسا کیوں ہوتا ہے......؟'' لیاقت حسین نے الجھ کر جواب دیا۔ ''آپ کی اور بڑے صاحب کی بات اور ہے لیکن دوسرے ان باتوں پر یقین نہیں کریں گے۔ کہیں پھنس گیا تو آپ کو بھی میری وجہ سے پریشانی ہوگی۔''

''پریشان مت ہو...... صرف اتنا یاد رکھو کہ میں تمہیں دوست سمجھتا ہوں اور خدا کی رحمانی قوتیں بھی درپردہ تم سے کچھ نیکی اور بھلائی کے کام کرا رہی ہیں۔ تمہیں جو باتیں یاد نہیں رہتیں تو یہ بھی خدا کی مصلحت ہوگی۔ جب بھی تمہارے ذہن میں کوئی تجویز، کوئی نیا خیال ابھرے۔ مجھے ایک دوست کی حیثیت سے ضرور بتادینا۔'' سراج نے اسے تفصیل سے باور کرانے کی کوشش کی۔ ''ہم دونوں برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی خاطر کام کر رہے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھو کہ سیدھے اور سچے راستے پر چلنے والوں کے لیے کانٹوں سے گزرنا بھی ایک آزمائش ہوتی ہے۔ میرے علاوہ عثمان بھی تم پر اعتماد کرتا ہے۔ ذہن پر کوئی بوجھ نہ محسوس کرو، تم ڈیڑھ گھنٹے کہاں رہے؟ یہ بھی یاد کرنے کی کوشش نہ کرو، آنے والا وقت ہم دونوں کی خود رہنمائی کردے گا۔''

''آپ کی بڑی مہربانی صاحب جو اتنا خیال رکھتے ہیں مگر ایک درخواست میری بھی قبول کریں۔'' لیاقت حسین نے درخواست کی۔ ''میں آپ کے کمرے کے بجائے اگر کہیں باہر بیٹھا رہوں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی''

''ٹھیک ہے......'' سراج نے اس کی [illegible] محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اس کا بھی [illegible] لیکن اب تم دوبارہ کسی ذہنی کشمکش کا [illegible] نہیں کرو گے۔''

لیاقت حسین بہ دستور ذہنی طور پر الجھا [illegible]

وجود کے سناٹے میں ابھی تک ڈیڑھ گھنٹے کی گمشدگی کا معما چکرا رہا تھا۔ وہ سراج کے پرخلوص مشورے کا کوئی مناسب جواب دینے پر غور کر رہا تھا جب فون کی گھنٹی بجی، سراج نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگالیا، دوسری جانب سے ایس پی اورنگ زیب کی آواز سنائی دی۔

''آپ اس وقت مصروف تو نہیں ہیں؟''

''جب آپ نے دوست اور بھائی کہا ہے تو پھر اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟'' سراج نے بڑی اپنایت سے کہا۔ ''آپ حکم دیں......''

''روہیل کھنڈ نامی سوسائٹی میں واقع ڈریم فل گیسٹ ہاؤس میں پہنچنے کی کوشش کریں، میں بھی دفتر سے روانہ ہو رہا ہوں۔''

''خیریت تو ہے......؟'' سراج نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

''ایک غیر ملکی باشندے نے خودکشی کرلی ہے۔ مرنے سے پیشتر اس نے متعلقہ تھانے کو اپنے اقدام کی اطلاع بھی دی تھی۔''

سراج نے فوری طور پر اپنی کرسی چھوڑ دی۔ اس نے لیاقت حسین کو بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ فوری طور پر اس کے ذہن میں یہی خیال ابھرا تھا کہ ممکن ہے لیاقت حسین کے ڈیڑھ گھنٹے غائب رہنے کا کوئی تعلق اس خودکشی کے واقعے سے بھی ہو۔ آدھے گھنٹے کے اندر وہ ڈریم فل گیسٹ ہاؤس پہنچ گئے جہاں متعلقہ تھانے کی پولیس کے علاوہ کچھ لوگوں کی بھیڑ بھی نظر آرہی تھی، لیاقت حسین کو گاڑی میں بیٹھا رہنے کی تاکید کرکے وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اندر گیا، ایک سب انسپکٹر نے مطلوبہ کمرے تک اس کی رہنمائی کردی جہاں اس وقت ایس پی اورنگ زیب کے علاوہ پولیس سرجن بھی موجود تھا۔ متعلقہ تھانے کا سب انسپکٹر بھی سراج کے ساتھ ہی اندر چلا گیا۔

جائے حادثہ پر موجود ٹیلی وژن کی اسکرین بدستور روشن تھی۔ اینی مل پلانٹ کا چینل آن تھا جو اس بات کی ترجمانی کررہا تھا کہ خودکشی کرنے والا آخری وقت تک اس پروگرام کو دیکھتا رہا ہوگا۔ گیسٹ ہاؤس کے منیجر کے بیان کے مطابق اسے بھی غیر ملکی مہمان کی خودکشی کی اطلاع علاقہ پولیس کے آنے کے بعد ہی ہوئی تھی۔ سب انسپکٹر نے بھی تصدیق کی جس وقت پولیس پارٹی جائے حادثہ پر پہنچی تو کمرا اندر سے بند تھا جسے انتظامیہ کی مدد سے کھولا گیا تھا۔ سراج اور اورنگ زیب ہر زاویے سے مرنے والے کی پوزیشن کا جائزہ لے رہے تھے۔

لاش اس وقت بیڈروم سے ملحقہ ڈرائنگ روم میں ایک صوفے پر آڑھی ترچھی پڑی تھی۔ مرنے والے کے چہرے پر بہ ظاہر کسی تشدد یا کشمکش کے آثار بھی نظر نہیں آرہے تھے۔ پولیس سرجن نے بھی لاش کو ہاتھ لگائے بغیر اسی بات کا اظہار کیا تھا کہ خودکشی کرنے والے نے اپنی مرضی سے کی ہے۔ سراج کے علاوہ اورنگ زیب کا ذاتی تجربہ بھی یہی کچھ کہہ رہا تھا لیکن فنگر پرنٹس اٹھائے جانے اور لاش کے پوسٹ مارٹم کے بغیر کوئی یقینی نتیجہ اخذ نہیں جاسکتا تھا۔ علاقہ چونکہ اورنگ زیب کا تھا اس لیے ضروری تھا کہ جائزہ لینے کے بعد دوسری ٹیموں کو بھی اندر آکر کارروائی کرنے کی اجازت دے۔ خود سراج کو لے کر ایک طرف چلا گیا۔

''آپ کا کیا اندازہ ہے......؟'' اس نے سراج سے دریافت کیا۔

''بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مرنے والے نے ذاتی فیصلے کے بعد ہی خودکشی کی ہوگی لیکن ہم دوسرے شبہات کو بھی نظرانداز نہیں کرسکتے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسے کسی نے اس اقدام کے لیے مجبور کیا ہو۔'' سراج نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''مجبوری کا خیال میرے ذہن میں اس لیے آیا کہ اگر اس خودکشی میں صرف مرنے والے کے ذاتی ارادے کو دخل ہوتا تو اسے تھانے کو فون کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کمرے سے پھوٹنے والا تعفن دو تین روز میں خود دوسروں کو باخبر کردیتا۔''

''آئی ایگری ود یو لیکن ہمیں اس غیر ملکی کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرنی ہوگی کہ یہ کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ کس پروفیشن سے منسلک تھا اور اس گیسٹ ہاؤس میں کس مقصد سے ٹھہرا تھا؟ کیا آپ ذاتی دلچسپی لے کر یہ معلومات میری خاطر حاصل کرسکیں گے؟''

''مجھے خوشی ہے کہ آپ نے یہ ذمے داری ازخود مجھے سونپ دی ورنہ میں کسی وجہ سے خود بھی ان باتوں کی کھوج لگانے کی کوشش ضرور کرتا۔''

''کوئی خاص وجہ......؟'' اورنگ زیب نے سراج کو ٹٹولتی نظروں سے دیکھا۔

''مجھے آج رات آپ کے ساتھ ڈنر کا پروگرام یاد ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس وقت تک میں آپ کو کچھ ضروری معلومات اور بھی فراہم کرسکوں۔''

''ٹھیک ہے، ویسے بائی داوے...... کہیں آپ اس معاملے میں بھی آکٹوپس کا ہاتھ تو نہیں محسوس کررہے ہیں؟''

''ہو بھی سکتا ہے۔'' سراج نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ''ممکن ہے کہ رات تک میں اپنے ذرائع سے مزید کچھ

اہم باتیں معلوم کرلوں۔''

ضروری کارروائی کے بعد لاش پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کرنے سے پیشتر سراج نے اورنگ زیب کی اجازت سے، دو تین زاویوں سے مرنے والے کی تصویر کا کلوزاپ اپنے موبائل میں محفوظ کرلیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اس کی واپسی ممکن ہوئی۔ گاڑی ڈرائیو کرتے وقت بھی اس کے ذہن میں شیخ حامد کا خیال بار بار ابھر رہا تھا جس کے سلسلے میں اورنگ زیب نے دبی زبان میں اس خودکشی کے شبے کا ایک خیال ظاہر کیا تھا۔ جگا کے سلسلے میں میڈم روبی کی فون کال بھی بلامقصد نہیں رہی ہوگی؟ ممکن ہے کہ اس کال کا بھی سرا مرنے والے سے ملتا ہو؟ سراج کو علم تھا کہ میڈم روبی نے بھی اپنے تحفظ کی خاطر کچھ ایسے چہروں کا انتخاب کر رکھا ہے جو شیخ حامد اور اس کے درمیان ڈھال کا کام انجام دے سکیں۔ ایک موقعے پر سراج کے استفسار پر میڈم نے دبی زبان میں اس کا اقرار بھی کیا تھا اور بھی بے شمار باتیں تھیں جو اس کے ذہن میں گڈمڈ ہورہی تھیں۔ کچھ دیر کے لیے وہ گاڑی میں لیاقت کی موجودگی کو یکسر فراموش کرچکا تھا جس کا احساس اسے لیاقت حسین کی آواز سن کر ہوا۔

''کیا بات ہے صاحب؟ ہم جہاں آئے تھے وہاں کوئی واردات ہوئی تھی؟''

''او...... ہاں۔'' سراج نے چونک کر جواب دیا۔ ''ایک غیر ملکی نے خودکشی کرلی ہے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس نے خودکشی سے قبل تھانے کو باقاعدہ اس کی اطلاع بھی دی تھی۔''

''ان فرنگیوں کے رنگ ڈھنگ بھی نرالے ہوتے ہیں صاحب۔'' لیاقت حسین نے ایک عام بات کی۔ ''یہ کسی نہ کسی طرح ہر معاملے میں اپنی برتری اور گوری سی رنگت کے اندر چھپے عیبوں کا اظہار کرنے میں بھی فخر محسوس کرتے ہیں۔''

سراج نے اس تبصرے پر کوئی جواب نہیں دیا۔ دفتر پہنچ کر اس نے دوبارہ مرنے والے کا ذکر چھیڑ دیا پھر سوچی سمجھی اسکیم کے پیش نظر اس نے مرنے والے کے کلوزاپ بھی لیاقت حسین کو دکھائے لیکن وہ ان تصویروں کو دیکھ کر نہ چونکا، نہ کسی بات سے اس کا اظہار ہوا کہ اس نے مرنے والے کو کبھی کہیں دیکھا بھی ہو۔ البتہ تصویر پر نظر ڈالنے کے بعد اس نے اتنا ضرور کہا تھا۔

''یہ کوئی فرنگی تو نہیں ہے صاحب......؟''

''بہ ظاہر تمہارا اندازہ درست ہے مگر جب تک لاش کی پوسٹ مارٹم کی تفصیلی رپورٹ نہ آجائے کچھ یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔''

''کیا لاش کا کوئی والی وارث بھی سامنے نہیں آیا۔'' لیاقت حسین نے کسمسا کر پوچھا۔ ''ہوٹلوں میں یا کہیں کرائے پر رہنے والوں کا بھی کوئی نہ کوئی پتا ٹھکانا تو تحریری شکل میں ضرور ہوتا ہوگا۔''

''تمہارا خیال درست ہے، خودکشی کرنے والے نے خود کو سیاح بتایا تھا اور اپنی ضروری دستاویز بھی گیسٹ ہاؤس والوں کو دکھائی تھیں۔ پولیس نے وہ تمام ثبوت اور مرنے والے کے کمرے سے اس کی سفری دستاویزات اپنی تحویل میں لے لی ہیں۔ وہ کون تھا؟ کب یہاں آیا تھا اور کہاں کہاں ٹھہرا تھا؟ اس کی تفتیش کے بعد ہی تمام معلومات حاصل ہوسکیں گی۔''

لیاقت حسین نے کوئی مزید سوال نہیں کیا۔ سراج بھی کچھ ضروری کالیں کرنے میں مصروف ہوگیا، لیاقت حسین نے مرنے والے کی تصویر دیکھنے کے بعد کوئی ایسا تاثر ظاہر نہیں کیا تھا جس سے سراج کے شبہے کی تصدیق ہوسکے۔

❊❊❊

لوچن اس وقت ساحل سمندر کی ایک ہٹ کی بالائی منزل پر صرف ایک برائے نام نیکر پہنے چاروں خانے چت لیٹا سن باتھ لے رہا تھا جب اس کے موبائل پر سگنل آنا شروع ہوئے۔ اس وقت وہ پوری طرح اپنے شغل سے لطف اندوز ہورہا تھا لیکن اسے بہرحال موبائل کی طرف توجہ دینی پڑی جس پر ڈوما کا نمبر جگمگا رہا تھا۔

''ہیلو......'' لوچن نے برا سا منہ بنا کر موبائل آن کرلیا۔

''کہاں سے بات کررہے ہو......؟'' ڈوما نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''چھت کے اوپر اور آسمان کے نیچے آنکھ بند کیے سن باتھ لے رہا ہوں۔ تم نے اس وقت کیسے یاد کیا؟''

''کچھ ضروری بات کرنی ہے۔'' ڈوما کی سرسراتی آواز ابھری۔ ''تمہیں شاید نئی صورت حال کا علم نہیں ہے۔''

''درست خیال ہے تمہارا۔'' لوچن نے بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔ ''میں اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔ زیادہ روگ پالنا میرے اصول کے خلاف ہے۔''

''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں نے ہوٹل کی رہائش ترک کرکے ایک واقف کار فیملی کے ساتھ عارضی طور پر ایڈجسٹ کرلیا ہے۔''

''وہاں کوئی خوبصورت لڑکی بھی ہوگی۔'' لوچن نے

اسے چھیڑنے کی کوشش کی۔ ”محتاط ہی رہنا۔ پہلے بھی تمہاری نائٹ کلب کی ڈانسر فرینڈ کو سیون اسٹار نے چوبیس گھنٹے کی مہلت میں بیک ٹو پویلین کرادیا تھا۔“

”اس بار ایسا نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ سیون اسٹار کو فی الحال آم کھانے سے مطلب ہے، پیڑ گننے کا وقت اس کے پاس بھی نہیں ہے۔“

”اب تک کتنے پیگ حلق کے نیچے اتار چکے ہو؟“ لوچن نے سیون اسٹار کے حوالے پر دریافت کیا۔

”میں اس وقت پوری طرح ہوش و حواس میں ہوں۔“ ڈوما نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”کیا تم کچھ دیر کے لیے سنجیدگی سے میری بات نہیں سن سکتے؟“

”سن رہا ہوں لیکن ایک بات کا خیال رکھنا۔ مجھے کسی گرل فرینڈ کے بجائے سن باتھ زیادہ عزیز ہے اس لیے زیادہ وقت نہیں دے سکوں گا۔“

”تمہاری مرضی۔ مگر شاید ہاشم کے بارے میں سن کر تم کو بھی سن باتھ سے منہ موڑنا پڑ جائے۔ سنجیدگی سے سنو، ہاشم اب اس دنیا میں نہیں ہے۔“

”وہاٹ......“ لوچن کو یوں محسوس ہوا جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ اس نے تیزی سے اٹھتے ہوئے سوال کیا۔ ”کیا حادثہ پیش آگیا اسے؟“

”حادثہ نہیں مائی ڈیئر...... سیون اسٹار کے حکم پر اس نے سرخ کیپسول چبا کر نجات حاصل کرلی ہے۔“ ڈوما نے بات جاری رکھی۔ ”اس حکم کی تعمیل نہ کرتا تو شاید اسے موت کے گھاٹ اتارنے کا فرض بھی مجھے ادا کرنا پڑتا۔ کچھ دیر پہلے ہی ہاشم کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اٹھوا لیا گیا ہے۔“

”اسے کس جرم کی سزا دی گئی ہے......؟“

جواب میں ڈوما نے مختصر تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”سیون اسٹار نے فوری طور پر تمہارے لیے بھی یہی حکم جاری کیا ہے کہ کسی ایسی جگہ پناہ تلاش کرو جہاں پولیس تم تک نہ پہنچ سکے۔“

”لیکن ہاشم کی ایک غلطی کی سزا ہم کو کیوں دی جارہی ہے؟ میرا یا تمہارا اس کی غداری سے کیا تعلق ہے؟“

”نہ سہی لیکن...... ہاشم کا پاسپورٹ اور ضروری سامان پولیس کی تحویل میں ہے...... پولیس کی تفتیش کا دائرہ وسیع ہوا تو ہمارے نام بھی لسٹ پر آسکتے ہیں اس لیے کہ جس فلائٹ سے ہم یہاں پہنچے تھے اس کے فرسٹ کلاس کے مسافروں میں ہماری بدنصیبی سے کوئی اور مسافر نہیں تھا۔ ہم دونوں کا نام بھی جہاز کے مسافروں کی فہرست پر موجود ہوگا۔“

”تم شاید ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ہاشم......“ لوچن کچھ کہتے کہتے رک گیا، اب تک اس کے ذہن میں یہی شبہ تھا کہ ہاشم ہی کسی عورت کو استعمال کرکے سیون اسٹار کے کوڈ کے ذریعے ان کو کمانڈ کررہا تھا لیکن اس کی موت کی اطلاع نے اس شبہے کی تردید کردی تھی۔

”خاموش کیوں ہوگئے......؟“ ڈوما نے تجسس کا اظہار کیا۔ ”کیا تمہیں ابھی تک یہی گمان ہے کہ میں نشے کی حالت میں ہوں؟“

”ڈوما......“ لوچن نے اس کا جملہ نظرانداز کرتے ہوئے تیزی سے پوچھا۔ ”کیا تم مجھے اس شخص کا حلیہ بتانا پسند کرو گے جسے ہاشم نے سیون اسٹار کا کوڈ استعمال کرکے ٹھکانے لگانے کا حکم دیا تھا۔“

جواب میں ڈوما نے اسپورٹس کار والے کا جو حلیہ بیان کیا اسے سن کر لوچن دوبارہ چونکا۔ اسے فوری یاد آگیا کہ ہاشم سے اس کا آمنا سامنا کچھ دنوں پیشتر اس وقت ہوا تھا جب وہ جگا سے ملنے کشمیر فرنیچرز پر گیا تھا، واپسی پر ہاشم نے دبی زبان میں اس کا ذکر بھی کیا تھا۔ لوچن ابھی کچھ دیر سے اس کی اور ہاشم کی موت کی گتھی سلجھانے کی کوشش کررہا تھا جب ڈوما نے اسے سرسراتی آواز میں مخاطب کیا۔

”سیون اسٹار کا حکم ہے کہ ہمیں کچھ دنوں کے لیے ذاتی طور پر بھی خود کو پولیس کی نظروں سے بچانا ہے اس لیے فوری طور پر ہمیں بھی کسی محفوظ ٹھکانے کی تلاش کا حکم دیا گیا ہے۔ میں نے اس وقت تمہیں یہی اطلاع دینے کا فرض ادا کیا ہے۔ اب تم چاہو تو سن باتھ لیتے رہو۔“

دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کردیا گیا۔ لوچن نے ساحلی علاقے سے فوری واپسی میں بڑی عجلت کا مظاہرہ کیا۔ اس کا ذہن بدستور ہاشم اور حادثے میں ہلاک ہونے والے کے بارے میں غور کررہا تھا۔ جگا کا خیال بھی ان دونوں کے ساتھ ہی لوچن کو الجھا رہا تھا۔

☠☠☠

امداد علی نے جس پیمانے پر اپنا کالا دھندا پھیلا رکھا تھا اس کے بعد اسے ملازمت کی ضرورت بھی نہیں تھی چنانچہ اس نے ایک جعلی میڈیکل سرٹیفکیٹ کی بنیاد پر وقت سے پیشتر ہی پولیس کی ہیڈ کانسٹیبلی سے گلوخلاصی حاصل کرلی تھی لیکن وہ اب بھی سن گن لینے کی خاطر پرانے دوستوں اور ساتھیوں سے رابطہ رکھتا تھا تاکہ حالات سے پوری طرح باخبر رہے۔ اسے شیخ حامد کے بارے میں بھی خاصا کچھ معلوم تھا لیکن وہ دوسروں کے معاملے میں ٹانگ الجھانے کے اصول کے ل تھا۔ خود شیشے کے گھر میں بیٹھ کر دوسروں پر پتھر اچھالنا بھی اس کے نزدیک بلاوجہ کے خطرات کو دعوت دینے کے دل تھا لیکن جگا کی بات اور تھی۔

جگا سے اس کے مراسم بہت دیرینہ تھے اسے یہ بھی معلوم تھا کہ جگا نے بڑے گینگ لے کے بدمعاشوں کی پشت پناہی کرکے اپنی ٹیم مضبوط بنا رکھی تھی لیکن وہ بھی بلاوجہ کے کشت وخون کا عادی نہیں تھا البتہ اس نے دوسرے اڈے داروں پر اپنی دھاک ضرور بٹھا رکھی تھی۔ وہ اس پوزیشن میں تھا کہ شیخ حامد سے ٹکر لے سکتا تھا لیکن بلاوجہ کسی کے ساتھ الجھنا اس کے اصول کے خلاف تھا۔ امداد علی نے بھی اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ کم ازکم شیخ حامد سے الجھنے کی کوشش بھی نہ کرے۔ اسی نے حالات کے پیش نظر جگا کو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ اسپورٹس کار والے کے حادثے کے بعد کچھ دنوں کے لیے زیادہ محتاط ہوجائے اس لیے کہ مرنے والا شیخ حامد کا دست راست تھا اور شیخ حامد کسی بھی مشتبہ آدمی کو بخشنے کا عادی نہیں تھا۔

امداد علی ایک پرانے دوست کی حیثیت سے بھی جگا کا خیال رکھتا تھا۔ ہفتے میں ایک دوبار اس کی خیریت بھی معلوم کرتا رہتا تھا۔ کبھی جگا بھی اس سے رابطہ کرکے اس کا حال احوال دریافت کرتا رہتا تھا۔ دونوں کے درمیان خاصا پرانا یارانہ تھا۔ خاص طور پر جگا اس کا احسان مند تھا جس نے آڑے وقت میں بھی اس کے ساتھ دوستی نبھانے میں بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیا تھا۔ اسے جہانگیر بٹ سے جگا بنانے میں امداد علی کا ہاتھ تھا۔ جگا، امداد علی سے کوئی بات چھپانے کا عادی نہیں تھا۔ زیادہ تر مشورے بھی اسی سے لیتا تھا، امداد علی کے ذریعے اسے خاص طور پر پولیس کے محکمے کے بارے میں خاص خاص خبریں ملتی رہتی تھیں۔

جگا ہر آڑے وقت میں امداد علی سے اپنی الجھنیں شیئر کرنے کا عادی تھا لیکن پراسرار نووارد کی ملاقات کے بارے میں اس نے ابھی تک زبان نہیں کھولی تھی۔ وہ ماورائی کہانیوں پر یقین نہیں رکھتا تھا لیکن جو کچھ اس نے جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا اسے فراموش کردینا بھی اس کے بس سے باہر تھا۔ وہ نووارد کا احسان مند بھی تھا۔ اگر اس نے بروقت جگا اور اس کے آدمیوں کو آنے والے خطرے سے باخبر نہ کیا ہوتا تو شاید جگا اور کچھ خاص ساتھی اسی عمارت کے ملبے میں دفن ہوجاتے جسے دھماکے سے اڑایا گیا تھا۔ وہ دھماکا کس نے اور کس مقصد کے تحت کیا تھا اس کے بارے میں جگا کو صرف شیخ حامد پر شبہ تھا لیکن یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اس کا اندازہ درست ہی ہو۔ ممکن تھا کسی دوسرے گروہ کے سرغنہ نے حالات سے فائدہ اٹھا کر جگا کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی ہو اور بھی بہت سے امکانات تھے۔

بہت دیر سے وہ اسی گتھی کو سلجھانے کی کوشش کررہا تھا جب اس کا خاص کارندہ اس کی ہدایت پر اس کے پاس پہنچ گیا، اس کے چہرے پر ابھی تک دھماکے سے پیدا ہونے والے تاثرات موجود تھے۔

”ہماری نفری کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا؟“ جگا نے اس سے تفصیل جاننے کی خاطر پوچھا۔

”نہیں استاد...... تمہاری بروقت اطلاع نے نفری کو تو بچالیا لیکن اس عمارت میں ہمارا کچھ سامان ضرور ضائع ہوگیا۔“

”انسان زندہ رہے تو سامان بھی دوبارہ جمع کرلیتا ہے۔ جو ہوا اسے بھول جاؤ، صرف یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ کس سرپھرے نے جگا کے ساتھ بلاوجہ دشمنی مول لینے کی کوشش کی ہے۔“

”کئی نام ذہن میں کلبلا رہے ہیں استاد لیکن ابھی یقین سے کسی ایک کی طرف انگلی نہیں اٹھائی جاسکتی۔“

”اطمینان سے معلوم کرو لیکن یہ خیال رہے کہ ہماری خاموشی دشمن کو اور مغرور بھی کرسکتی ہے۔“

”تم فکر نہ کرو استاد...... میں نے ایک دو کھوجی لگائے ہیں۔ جس نے بھی اپنی موت کو دعوت دی ہے وہ زیادہ دنوں تک چھپر میں نہیں رہ سکے گا۔“

”باقی لوگ کہاں ہیں......؟“

”میں نے انہیں دوسرے ٹھکانوں پر ادھر ادھر بانٹ دیا ہے۔ ہمارا فی الحال کسی ایک جگہ زیادہ تعداد میں رہنا بھی مناسب نہیں ہے۔“

جگا کچھ سوچ رہا تھا کہ اس کے موبائل پر تھرتھراہٹ ہوئی۔ امداد علی کا نام دیکھ کر اس نے موبائل آن کرلیا۔

”سنا ہے تمہارے کسی ٹھکانے کو اڑا دیا گیا ہے؟ سب خیر تو ہے؟“

”اتفاق ہی سمجھو جو ہم نے دھماکے سے کچھ دیر پہلے وہاں سے کوچ کرلیا تھا ورنہ......“

”تمہارا دھیان کس کی طرف جارہا ہے؟“

”اوسان ٹھیک ہوجائیں تو اس پر غور کریں گے۔“ جگا نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ”تمہاری کیا اطلاع ہے؟“

”میرا شبہ اسی ولدالحرام کی طرف ہے جس کا خاص الخاص بندہ شکار کیا گیا تھا۔“ امداد علی نے کہا۔ ”آج بھی ایک

گرما گرم تازہ لاش پولیس کے ہاتھ لگی ہے میں تمہیں اسی کے بارے میں تفصیل بتانا چاہتا ہوں۔"

جگا بڑی سنجیدگی سے دوسری جانب سے فراہم کی جانے والی تفصیل سنتا رہا۔ امداد علی نے گیسٹ ہاؤس سے ملنے والی لاش کا جو حلیہ بیان کیا وہ جگا کے لیے نیا تھا لیکن جب اس کے سیاہ فام غیر ملکی ہونے کے بارے میں معلوم ہوا تو جگا چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

"یار امداد علی...... تمہارے مخبر نے کیا بتایا ہے مرنے والے کے بارے میں؟"

"صرف ایک بات اہم ہے......" دوسری طرف سے جواب ملا۔ "پولیس نے مرنے والے کا جو پاسپورٹ قبضے میں لیا ہے اس کی تصویر خودکشی کرنے والے کی شکل سے نہیں ملتی...... ہوسکتا ہے کہ اس نے میک اپ کیا ہوا ہو۔ ابھی یکی اطلاع نہیں ملی، لاش کا پوسٹ مارٹم ہو جائے تو چہرے مہرے کا بھید بھی کھل جائے گا۔"

"پاسپورٹ پر کوئی نام تو ہوگا......؟" جگا نے کرید کی۔

"جو کچھ میرے ہاتھ لگا ہے اسے اتفاق ہی سمجھو۔" امداد علی نے جواب دیا۔ "ایس پی اورنگ زیب کے علاوہ ڈی ایس پی سراج بھی ساتھ ساتھ نظر آئے تھے، حالانکہ دونوں کا علاقہ الگ الگ ہے لیکن آج کل دونوں بہت گھل مل رہے ہیں۔ یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ نیا ایس پی بھی خاصی پہنچ والا ہے۔ اسی لیے اس نے شیخ حامد سے پنگا بھی لے رکھا ہے۔"

"ڈی ایس پی سراج کے بارے میں تمہاری ذاتی رائے کیا ہے؟" جگا نے سوال کرنے کے بعد بات بناتے ہوئے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ وہ اصول کا پابند اور فرض شناس آفیسر ہے؟"

"میرا ذاتی تجربہ بھی یہی ہے لیکن ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ پولیس کی اگاڑی پچھاڑی سے انسان جتنا دور رہے اتنا ہی بہتر ہے۔ تم خاص طور پر سراج کے لیے کیوں معلوم کر رہے ہو؟"

"یوں ہی۔" جگا نے پھر بات گول کرنے کی کوشش کی۔ "پچھلے دنوں میرا ایک واقف بے گناہ رگڑے میں آگیا تھا۔ تفتیش کے بعد سراج ہی نے اسے ذاتی فیصلے پر چھوڑ بھی دیا تھا۔"

"میں بھی دو تین مہینے اس کے ساتھ کام کر چکا ہوں۔ دوسروں کے مقابلے میں وہ بہرحال زیادہ انصاف پسند ہے۔"

کچھ دیر تک امداد علی اور جگا کے درمیان مشترکہ امور پر گفتگو ہوتی رہی پھر جگا نے کہا۔

"گیسٹ ہاؤس سے جس کی لاش ملی ہے اس کا نام کسی طرح معلوم ہوسکے تو مجھے ضرور بتانا۔"

"کوئی خاص بات معلوم کرانی ہے؟"

"ہاں......" جگا نے سیاہ فام ہاشم کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ "اگر گیسٹ ہاؤس میں ملنے والی لاش اسی کی ہے تو پھر اس میں بھی شیخ حامد ہی ملوث ہوگا۔"

"کیوں؟ تم اتنے یقین سے کیسے کہہ رہے ہو؟"

"جس روز اسپورٹس کار کے حادثے میں مرنے والا میری فرنیچر والی دکان پر آیا تھا اسی روز ہاشم بھی مجھ سے ملا تھا۔ وہ کسی دوسری پارٹی کے لیے کام کر رہا تھا۔ تمہاری اطلاع کے لیے یہ بھی بتادوں کہ شیخ حامد کی رہائش پر حملہ کرانے کی خاطر ہاشم نے چار بندے مجھ سے بھی حاصل کیے تھے۔" جگا نے پوری تفصیل دہراتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "بڑا اکھڑ اور معاملے کا پکا بندہ تھا۔"

"کیا اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ کس پارٹی کے لیے کام کر رہا تھا؟"

"نہیں......"

"پھر یہ معاملہ بھی کھنگالنا پڑے گا۔" امداد علی نے سنجیدگی سے اظہارِ خیال کیا۔ "کھوج لگانا ہوگا کہ دوسری پارٹی کون ہے جو شیخ حامد جیسے خطرناک آدمی سے پنجہ لڑا رہی ہے؟"

"بندہ سر سے کفن باندھ لے تو طوفان کا منہ بھی پھیر سکتا ہے۔" جگا نے پھریری لے کر جواب دیا۔ "میں بھی زیادہ دنوں تک چھپن چھپائی کا کھیل جاری نہیں رکھ سکتا لیکن تم سے مشورہ کرنے کے بعد میں شیخ حامد کو بھی دیکھ لوں گا کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔"

"جلد بازی سے کام نہ لینا۔" امداد علی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "اگر اس کی نوبت آ ہی گئی تو پھر میں بھی تیرے ساتھ ہی شانہ بشانہ رہوں گا۔ کچھ چھوٹا موٹا قرض مجھے بھی نمٹانا ہے۔"

"یہ ہوئی نا بات...... ایک اور ایک مل کر ہم گیارہ ہو جائیں گے۔" جگا نے خوشی کا اظہار کیا پھر اس نے دوبارہ ہاشم کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے کہا۔

"تو فکر نہ کر...... میں مرنے والے کا نام بھی معلوم کرتا ہوں، کل تک بتا سکوں گا...... رب راکھا۔"

”رب راکھا......“ جگا نے موبائل آف کیا پھر اپنے ساتھی سے باتوں میں مشغول ہوگیا۔

☠☠☠

دارا رستم علی کو بیرون ملک سے تعلیم مکمل کرکے واپس آئے تقریباً ڈیڑھ سال گزر چکے تھے لیکن پانچ سال تک وہاں کے ماحول نے اس کے ذہن پر جو گہرے نقوش مرتب کیے تھے اس کا اثر ابھی تک اس کے دل و دماغ پر مسلط تھا۔ وہاں کی تہذیب اسلام کے منافی ضرور تھی لیکن وہاں کا رہن سہن، اپنے اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی، صاف ستھرا ماحول اور خاص طور پر قانون کی بالادستی نے اس قدر متاثر کیا تھا کہ وہ ابھی تک اسے بھول نہیں سکا تھا۔ وہاں قانونی معاملات میں جج اور جیوری جو فیصلہ کرتے اس میں چھوٹے بڑے کی تمیز سے بالاتر ہوکر صرف جرم کی نوعیت اور اس کی شدت کو پرکھا جاتا تھا۔ اسی کے مطابق فیصلہ بھی سنا دیا جاتا تھا۔ وہاں کسی قسم کی سفارش یا رشوت کو کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ اس ملک کے باشندوں کے علاوہ دوسرے ممالک کے بڑے بڑے سفارت کاروں کو بھی کم از کم جرائم اور اس کے سدباب کے سلسلے میں کوئی رعایت نہیں دی جاتی تھی، قانون کے فیصلے کا معیار سب کے لیے یکساں تھا۔

دارا نے وہاں کئی وارداتوں کی تفصیل اخبارات اور ٹیلی وژن پر بھی دیکھی اور پڑھی تھی سب سے تعجب اسے ایک ایسے کیس میں ہوا جہاں ایک ملک کے فرماں روا کو بھی جو کئی اعتبار سے اس ملک پر فوقیت رکھتا تھا، اپنے ایک شہزادے کے سلسلے میں بھی قانون کے سامنے زبان کھولنے اور کسی قسم کا احتجاج کرنے سے گریز کرنا پڑا۔ قانون کے ذمے داروں نے محض ایک ہفتے کی سماعت کے بعد واردات میں ملوث شہزادے کو عمر قید کی سزا سنا دی تھی۔ اس کیس میں ملوث شہزادے نے بھی یہ سوچ کر اپنے جرم کا اقرار کرلیا تھا کہ جو ملک کئی معاملات میں اس کے باپ کے سامنے سر جھکائے کھڑا رہتا تھا، اس کے ساتھ یقیناً اپنی مجبوری کے تحت رعایت سے کام لے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ قانون کا فیصلہ شہزادے کے باپ کو بھی تسلیم کرنا پڑا لیکن...... وہی دارا اب اپنے ملک میں حکومت کو ہر سال کروڑوں کا ٹیکس ادا کرنے کے بعد بھی ایک ایسے معاملے میں بے بس تھا جہاں ایک مشتبہ کاروباری حریف نے اس کے باپ کو اس کی اپنی چھت کے نیچے اپنے شکاری کتوں کے ذریعے زبان بند رکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کی ایک گھریلو ملازمہ کو گولی مار کر زخمی کر دیا گیا تھا جسے علاج کی خاطر بھی چوری چھپے ایک اسپتال میں داخل کرایا گیا۔ وہ ملازمہ قانون کے لیے ایک اہم اور ناقابلِ تردید ثبوت تھی لیکن سیٹھ رستم علی آغا خانی جو چیمبرس آف کامرس کا نائب صدر تھا وہ بھی اس جرم یا مجرموں کے خلاف زبان کھولنے سے خوفزدہ تھا، قانون تو دور کی بات تھی، اس نے خود دارا اور اس کی جرمن نژاد بیوی روشنا کو بھی اس معاملے کی کوئی بھنک نہیں لگنے دی تھی۔ دودھ کی مکھی ہی کی طرح الگ رکھنا مناسب خیال کیا تھا۔

اس وقت بھی دارا کے ذہن میں روشنا کی زبانی سنی ہوئی کہانی گونج رہی تھی۔ اس نے اپنے ذرائع سے اس بات کی تصدیق بھی کرائی تھی کہ اس کی گھریلو ملازمہ گلابو ابھی تک ایک اسپتال میں زیرِ علاج تھی جہاں اس کے مرض کی نوعیت کو دوسرا رنگ دیا گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اگر گولی لگنے والی کہانی سامنے آجاتی تو پولیس اور قانون کے ٹھیکیدار اسپتال کو اس بات کا ذمے دار ٹھہراتے تھے کہ انہوں نے قانون کے علم میں لائے بغیر اسے داخل کیوں کیا؟ دارا کے لیے یہ قانون بھی انوکھا تھا۔ اس نے دنیا کے جو ممالک دیکھے تھے وہاں کے اسپتالوں کا قانون اس سے مختلف تھا، وہاں انسانی جان کو سب سے پہلے بچانا ڈاکٹروں کا اولین فرض تھا۔ پولیس کو اس کی نوعیت سے آگاہ کرنا ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔

دو روز سے وہ اسی الجھن میں گرفتار تھا۔ ایک دو بار اس نے باپ سے بھی کھل کر بات کرنے کی کوشش کی لیکن کئی وجوہ سے خون کا گھونٹ پی کر چپ رہا مگر یہ بات اسے پریشان کررہی تھی کہ جو کاروباری حریف آج اس کے باپ کو غیر قانونی حرکت سے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر رہے تھے۔ کل اسے بھی اپنا ہدف بنانے سے گریز نہ کرتے۔ اسی خیال کے پیشِ نظر آج وہ ایک آخری فیصلہ کرکے باپ کے پرسنل آفس میں آیا تھا لیکن رستم علی کو ایک اہم میٹنگ میں جانا تھا اس لیے وہ اسی کمرے میں بیٹھ کر حالات کا جائزہ لے رہا تھا جب فون کی گھنٹی بجی، اس نے غیر اختیاری طور پر ریسیور اٹھا کر کان سے لگالیا۔ عام حالات میں وہ باپ کی کال ریسیو کرنے کے اصول کے خلاف ہی تھا۔

”ہیلو......“ اس نے ماؤتھ پیس میں حسبِ معمول ایک رٹا ہوا جملہ دہرایا۔ ”رستم علی گروپ آف انڈسٹریز......“

”مجھے خوشی ہے کہ تم نے گلابو کی خاطر بھی دور اندیشی سے کام لیا۔“ دوسری جانب سے کسی نے بازاری لب و لہجے میں اپنی برتری ظاہر کرنے کی خاطر بڑی دبنگ آواز میں کہا۔ ”آئندہ بھی اس بات کا خیال رکھنا کہ تم اب اس

حال میں نہیں ہو کہ زبان کھول سکو۔ دوسری شکل تم بھی جانتے ہو کہ جو ثبوت حاصل کیے گئے وہ تمہیں کسی کو منہ دکھانے کے بجائے خودکشی پر مجبور کردیں گے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”تم......“ دارا نے تیز لہجے میں جواب دینا چاہا لیکن پھر کسی فوری خیال سے خود پر قابو پاتے ہوئے پسپائی کا انداز اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اب تم کیا چاہتے ہو......؟“

”صرف ان کاروباری معاملات میں کسی گونگے کی طرح تمہاری خاموشی جن کے بارے میں تمہیں ایسا کرنے کا حکم دیا جائے۔“ اس بار بھی تضحیک آمیز انداز میں کہا گیا۔

”کیا ہم فون کے بجائے آمنے سامنے بیٹھ کر بات نہیں کرسکتے؟“ دارا نے اپنی رگوں میں کھولتے ہوئے خون کی شدت پر قابو پانے کی کوشش کی۔

”تم نے غلط اندازہ لگایا رستم علی...... میں وہ نہیں بول رہا جو تم سمجھ رہے ہو؟“

”پھر...... تم کون ہو......؟“

”باس کے حکم پر دم ہلانے والا ایک ادنیٰ خادم...... جو زبان چلانے کے علاوہ باس کے حکم پر اپنی کنپٹی پر پستول رکھ کر لبلبی دبانے سے بھی کبھی دریغ نہیں کرتا۔“ دوسری جانب سے بولنے والے کا لب و لہجہ سرد و سفاک ہوگیا۔ ”جو کہا گیا ہے...... اسی پر تم بھی دم ہلاتے رہو۔ زبان کھولنے یا کوئی چال چلنے کی غلطی کی تو پھر تمہارے بیٹے اور اس کی خوبصورت بیوی کا نمبر بھی آسکتا ہے۔“

دارا کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ اسے جس بات کا خطرہ تھا وہ بات کھل کر اب اس کے سامنے آرہی تھی۔ اس نے پہلو بدل کر تلملاتے ہوئے کہا۔ ”ایک بات تم بھی یاد رکھو، بات اگر دارا یا روشنا تک پہنچی تو پھر میں بھی برداشت نہیں کروں گا۔“

”کیا کرو گے آغا خانی......؟“ خشک انداز میں سوال کیا گیا۔ ”اب خودکشی کرنے کے سوا تمہارے پاس اور کیا آپشن رہ گیا ہے؟“

”جب انسان مرنے کی ٹھان لے تو پھر وہ اپنے ساتھ دوسرے کو ختم کردینے یا کرا دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔“ دارا نے اس بار بھڑک کر جواب دیا۔ ”میں سیٹھ عثمان نہیں ہوں جو تمہارے سامنے ہتھیار ڈال گیا۔“

”کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے......؟“

”میں تم جیسے پالتو، دم ہلانے والوں سے بات نہیں کرسکتا۔“ دارا نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”اپنے بگ باس سے کہو کہ مجھ سے براہِ راست بات کرے۔“

”تمہیں یہ جسارت بھی مہنگی پڑے گی۔“ دوسری جانب سے ڈھکے چھپے انداز میں ایک وارننگ دینے کے ساتھ ہی لائن منقطع کردی گئی۔ دارا کا پورا وجود سلگ اٹھا۔ بات اب اس کی برداشت سے باہر ہورہی تھی۔ وہ باپ کے کمرے سے اٹھ کر اپنے دفتر میں آگیا۔ اپنے ذرائع سے اس نے یہ معلوم کرانے کی کوشش کی کہ کچھ دیر قبل آخری بار کس نمبر سے رستم علی کے نمبر کو کال کیا گیا تھا۔ جواب اس کی توقع کے عین مطابق تھا، مذکورہ کال کسی پبلک بوتھ سے کی گئی تھی۔

دارا کا ذہن اس وقت اس قابل بھی نہیں رہا تھا کہ پُرسکون انداز میں دفتری امور کو دیکھتا، اس کے ذہن میں ”شیخ حامد“ کا نام کسی نیون سائن کی طرح خطرے کی علامت بن کر بار بار جل بجھ رہا تھا۔ اس کے پاس حالات کی روشنی میں صرف تین آپشنز تھے۔ پہلا یہ کہ روشنا کے ذریعے جو کچھ معلوم ہوا تھا اور ماں نے بھی جس انداز میں اصل باتیں چھپانے کی خاطر ایک فرضی کہانی سنائی تھی اسے یکسر ذہن سے نکال دیتا۔ صرف اپنے کام سے کام رکھتا لیکن...... رستم علی کی واحد اولاد ہونے کے رشتے سے یہ بات اس کے لیے ممکن نہیں تھی۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ باپ سے کھل کر بات کرتا اور وہ بات معلوم کرنے کی کوشش کرتا جس کے منظرِ عام پر آنے کے بعد...... فون کرنے والے کی دھمکی کے مطابق رستم علی زبان کھولنے کی پوزیشن میں نہیں تھا، کسی کو منہ دکھانا بھی اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ وہ ایسا کیا ثبوت تھا جس کے سامنے آجانے کے بعد اس کا باپ زندگی پر موت کو ترجیح دیتا؟ تیسرا راستہ یہ تھا کہ دارا ذاتی طور پر ان معاملات کی چھان بین کرکے اینٹ کا جواب پتھر سے دیتا یا پھر...... خاموشی سے باپ کو حالات کے رحم و کرم پر تنہا چھوڑ کر خود روشنا کے ساتھ ہمیشہ کے لیے بیرون ملک چلا جاتا۔ تادیر وہ ان تمام ممکنہ آپشنز پر غور کرتا رہا پھر اس نے ایک آخری فیصلہ کرلیا۔ اپنی ذاتی حیثیت میں مشتبہ فرد کو کھوج لگا کر پردہ سے باہر لانا اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا فیصلہ۔ اس اہم فیصلے کی روشنی میں اس نے اپنے ایک پرانے جگری دوست عاطف سے ملنے کا فیصلہ کرلیا۔

عاطف، دارا کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا اور چار ماہ پیشتر ہی فوج سے بحیثیت میجر ریٹائر ہوا تھا۔ اس کی ریٹائرمنٹ میں اس کی عمر کا نہیں بلکہ ایک حادثے کا دخل تھا جس کے بعد اسے تمام اعزازات اور تمغۂ شجاعت سے نوازنے کے بعد ریٹائر کیا گیا تھا۔ میجر عاطف ایک نڈر، بے خوف اور فرض

شناس آفیسر تھا، اپنی ذہانت، کارکردگی اور بڑے باپ کا بیٹا ہونے کے سبب اعلیٰ حلقوں میں اس کا اثر و رسوخ بھی تھا۔ عاطف اور دارا کی ہر دس پندرہ دن بعد ملاقاتیں بھی ہوتی رہتی تھیں، ان ملاقاتوں میں وہ ہمیشہ بے تکلف دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے دنیا جہان کی باتیں کرتے تھے۔ میجر عاطف ...... ریٹائر ہونے کے دو ماہ بعد ہی ایک اور صدمہ بھی لاحق ہوا تھا، اس کی محبوب بیوی جسے وہ بے پناہ چاہتا تھا اچانک ہارٹ اٹیک کا شکار ہو کر اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ اس سانحے کے بعد دارا بر ابر اس کا غم بٹانے کی اپنی سی ہر ممکن کوشش کرتا رہا تھا، روشنا نے بھی دارا کا بھرپور ساتھ دیا تھا جس کی وجہ سے میجر عاطف نے جلد ہی اپنے غم کو دل کے نہاں خانوں تک محدود کر لیا۔

دارا نے ایک آخری فیصلہ کر کے اسی وقت عاطف کو کال کیا پھر اسی شام دفتر سے اٹھ کر وہ سیدھا عاطف کے پاس چلا گیا۔ اس موقعے پر اس نے روشنا کو ساتھ لینا مناسب نہیں سمجھا۔ عاطف سے بہت دیر تک وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ عاطف بھی اس کے ساتھ گھل مل کر باتیں کر رہا تھا لیکن پھر اچانک اس نے دارا کو سنجیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"میرا اندازہ اگر غلط نہیں ہے تو تم نے آج کسی خاص وجہ سے روشنا کو ساتھ لانا مناسب نہیں سمجھا۔"

"مجھے خوشی ہے کہ تمہاری مطلوبہ ذہانت ابھی تک برقرار ہے۔"

"کوئی خاص مسئلہ درپیش ہے؟" عاطف نے بہ دستور سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"ہاں...... لیکن ایک شرط ہے۔" دارا نے کسمسا کر جواب دیا۔ "تم اس کا ذکر کسی سے نہیں کرو گے۔ روشنا سے بھی نہیں۔"

عاطف نے اقرار میں گردن کو جنبش دی، وہ دارا سے تفصیل جاننے کا منتظر تھا۔ دارا نے کچھ توقف کے بعد اسے پوری تفصیل سنائی۔ جو فون کال ریسیو ہوئی تھی اس کے بارے میں بھی بتا دیا۔ گلابو کے سلسلے میں روشنا نے جو معلومات فراہم کی تھیں وہ بھی دہرا دیں۔ اپنا منصوبہ بغیر کسی ترمیم کے بیان کر دیا۔ عاطف پوری توجہ سے سنتا رہا پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔

"تم نے جو فیصلہ کیا ہے وہ مجھے پسند آیا۔ حالات کے پیش نظر انکل کو تنہا چھوڑ دینا تمہیں زیب بھی نہیں دے گا۔"

"ایک بات اور......" دارا نے کہا۔ "بہتر ہوگا کہ تم کوئی ایسا مشورہ دو کہ میں بھی منظر عام پر نہ آؤں۔ مجھے اپنی فکر نہیں لیکن دشمن روشنا کو بھی اپنا ہدف بنا سکتے ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو پھر شاید میں کسی بھی مصلحت کو خاطر میں لائے بغیر کچھ بھی کر گزروں گا۔"

"ریلیکس۔" عاطف نے دارا کو سمجھایا۔ "جلد بازی اور جذبات پر اگر انسان کی گرفت کمزور پڑ جائے تو پھر وہ کوئی جنگ نہیں جیت سکتا، میں تمہاری تمام باتوں کو سمجھ رہا ہوں۔ تم فی الحال سامنے نہیں آنا چاہتے تو نہ آؤ لیکن ایک بار دشمن کے بارے میں یقین ہو جانے کے بعد تمہیں یا انکل کو بہرحال سامنے آنا پڑے گا۔"

"یو آر رائٹ۔" دارا نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ "اگر ضرورت پڑے تو پھر میں ڈیڈ کے بجائے خود سامنا کرنے سے پیچھے بھی نہیں ہٹوں گا۔"

"تمہیں اس بات کا شبہ کس حد تک ہے کہ شیخ حامد ہی ہمارا وانٹڈ کرمنل ...... ہے؟" عاطف نے بڑی سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"نوے فیصد۔" دارا نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "ڈیڈ سے پیشتر وہ ہاشر ڈسیلوا عثمان کو بھی میدان سے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر چکا ہے۔"

"اوکے...... پہلے اسی کو چیک کرا لیتے ہیں۔" میجر عاطف نے بڑے سکون سے کہا پھر اپنا موبائل اٹھا کر کسی کے نمبر پنچ کرنے لگا۔ رابطہ قائم ہو جانے کے بعد اس نے موبائل کا مائیک آن کر دیا تاکہ دارا بھی تفصیلی گفتگو سن سکے۔

"ہیلو...... ڈاٹ، ڈاٹ، ون فور آن دی لائن۔" دوسری جانب سے کسی نے ٹھوس آواز میں مخصوص کوڈ نمبر سے اپنی شناخت کرائی۔

"اٹ از آپریشن تھرٹی سکس۔" عاطف نے بھی کوئی مخصوص ریفرنس دیا۔

"ہیلو سر...... کیسے یاد کیا خادم کو......؟" اس بار بے تکلفی کے ساتھ بڑے مہذب انداز میں پوچھا گیا۔

"تمہاری ضرورت پیش آگئی ہے۔ کام ٹاپ سیکریٹ نوعیت کا ہے اس لیے میں نے تمہیں تکلیف دینے کے لیے......"

"نو فارملٹی سر......" عاطف کی بات کاٹ کر کہا گیا۔ "میں اب بھی آپ کے کسی حکم سے انکار نہیں کر سکتا۔ آپ کام بتائیں۔"

"ایک مشتبہ شخص کی نقل و حرکت واچ کرنی ہے۔" عاطف نے سنجیدگی سے مطلب کی بات کی۔ "ایک ہفتے بعد تمہاری رپورٹ کے بعد ہی کوئی فائنل آپریشن کا فیصلہ کروں

گا۔ میرا ذاتی ہی کام سمجھنا۔"

"آپ نام اور پتا بتا دیں سر...... میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔"

جواب میں عاطف نے شیخ حامد کا نام اور دیگر ضروری کوائف بتانے کے بعد کچھ رسمی جملے ادا کیے پھر کال منقطع کر دی۔

"کون تھا......؟" دارا نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"ہے ایک کمانڈوز کا سب سے ذہین آدمی......" عاطف نے جواب دیا۔ "کسی وجہ سے آج بھی میری بے حد عزت کرتا ہے۔ اس کے لیے ایک ہفتے کی مہلت بھی بہت ہوگی۔ اتنا باصلاحیت ہے کہ کسی سب میرین کے پیندے میں سوراخ کرنے کا کام انجام دینے میں بھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔"

"گلابو کے سلسلے میں تمہارا کیا مشورہ ہے؟ کیا میں کسی ذریعے سے اس کی زبان سے سچ اگلوانے کی کوشش کروں۔ ہوسکتا ہے وہ اس شخص کی کچھ نشاندہی کر سکے جس کی گولی نے اسے موت اور زندگی کی کشمکش سے دوچار کر دیا تھا۔"

"یہ ذمے داری بھی میرے اوپر چھوڑ دو۔ پولیس کے محکمے کے کچھ سینئر آفیسرز سے بھی میری سلام دعا ہے۔" عاطف نے مسکرا کر کہا۔ "وہ بھی ڈاٹ، ڈاٹ ون فور کی طرح میری عزت کرتے ہیں۔ بکنے والے لوگ بھی نہیں ہیں۔"

دارا نے عاطف کا جواب سن کر اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے بعد ان کے درمیان کچھ دوسرے موضوعات پر کھل کر ہنسی مذاق کی بے تکلفانہ باتیں شروع ہو گئیں۔ دارا کو محسوس ہو رہا تھا کہ عاطف سے اپنی پریشانی بانٹنے کے بعد اس کے ذہن سے جیسے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔

☆☆☆

شیخ حامد اس وقت اپنے مخصوص ساؤنڈ پروف کمرے میں بیٹھا دوسرا پیگ ختم کر رہا تھا۔

عام حالات میں وہ دفتر میں پینے پلانے کے خلاف تھا لیکن...... آج وہ خلاف معمول بہت خوش تھا، اس کی نظریں بار بار کنول کے کمرے کے اس دروازے کی جانب اٹھ رہی تھیں جو اس وقت بند تھا۔ دفتر کے لوگوں کو اس بات پر حیرت تھی کہ کنول نے اچانک ملازمت سے استعفیٰ کیوں دے دیا ہے؟ یہ بات بھی قابل توجہ تھی کہ بگ باس نے وہ استعفیٰ منظور کس طرح کر لیا؟ سب ہی محسوس کر رہے تھے کہ کنول ایک حسین اور انمول نگینہ تھی اور شیخ حامد اس قسم کی حسین لڑکیوں کو آسانی سے اپنے جال سے نکلنے کی اجازت کبھی نہیں دیتا تھا۔ ایسا صرف اسی صورت میں ممکن تھا جب وہ اس ہیرے کی تراش خراش سے بھی پوری طرح سیر ہو کر اپنی پیاس بجھا لے اور دل کی حسرتیں اچھی طرح پوری...... ہو جائیں۔ کنول کو اس نے جو خاص مراعات دے رکھی تھیں، وہ بھی اس سے پہلے کسی اور خاتون ورکر کو حاصل نہیں تھیں۔ پھر کنول کا اچانک ملازمت ترک کر دینا اور بگ باس کی خاموشی۔ دونوں ہی ایسے سوال تھے جن کا جواب دفتر کے لوگوں کے لیے تعجب خیز تھا مگر وہ اس بارے میں صرف دل ہی دل میں سوچ سکتے تھے، زبان کھولنے کی جرأت کسی میں نہیں تھی۔

شیخ حامد کا دفتری اوقات میں شراب نوشی کرنا بھی خلاف معمول تھا۔ خود شبنم بھی ساؤنڈ پروف کمرے میں قدم رکھتے وقت چونکی تھی۔ اس کے اپنے ذہن میں بھی کچھ خطرات نے سر ابھارنا شروع کر دیا تھا۔ "ہوسکتا ہے اس شراب نوشی کا خمار اسی کی ذات پر سر د ہوتا۔" یہ تصور ہی اس کے لیے کسی بھونچال سے کم نہیں تھا لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ الٹے قدموں واپس لوٹ جاتی۔ اس لیے اس کی عزت کا بھرم بھی "مخرب اخلاق تصویروں" کی شکل میں شیخ حامد کے پاس محفوظ تھا۔ وہ جبراً مسکراتے ہوئے آگے بڑھی۔ شیخ حامد نے اسے مسکرا کر بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر ایک چسکی لے کر کنول کے بند دروازے کی سمت دیکھتے ہوئے عجیب انداز میں بولا۔

"آج تم خلاف معمول زیادہ میک اپ اور ٹپ ٹاپ کنڈیشن میں نہیں ہو......؟ کوئی خاص وجہ؟"

"صبح آنکھ دیر سے کھلی تھی اس لیے موقع نہیں ملا۔"

"مجھے اطلاع مل چکی ہے کہ تم نے کل کا دن کن مصروفیات میں گزارا تھا۔" شیخ حامد نے شبنم کے خدوخال پر ایک اچٹتی نظر ڈال کر کہا۔

"آپ نے نہ بلایا ہوتا تو میں خود رپورٹ دینے آتی۔"

"کوئی خاص بات......؟"

"میں نے افضل خان کو پوری طرح کھنگال کر دیکھ لیا ہے۔" شبنم نے سنبھل کر کہا۔ "وہ اب اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ آپ کے کسی حکم سے انکار کر سکے۔ میں نے اسے اپارٹمنٹ میں ساتھ رہنے والی بات بھی بتا دی۔ اس نے کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔"

"ہوں......" شیخ حامد نے ایک گھونٹ لیتے ہوئے شبنم کو بڑی گہری نظروں سے دیکھا۔ "اسے دکھ تو ہوا ہوگا کہ اب اس اپارٹمنٹ میں اس کی حیثیت وہ نہیں ہوگی جو پہلے تھی۔"

شبنم نے کسمسا کر دبی زبان میں جواب دیا۔ ”میں نے اس پر فی الحال یہ ظاہر کیا ہے کہ اس اپارٹمنٹ کو نئے سرے سے فرنشڈ کرا کے ہم دونوں کو مشترکہ طور پر بہ طور حسن کارکردگی، انعام دیا گیا ہے۔“

شیخ حامد نے کسی ردعمل کا اظہار کرنے کے بجائے شبنم کو وضاحت طلب نظروں سے گھورا۔

”سوری سر......“ شبنم نے پہلو بدل کر کہا۔ ”میں نے یہ بات اس لیے کہی ہے کہ کچھ دنوں ساتھ رہ کر افضل خان کو قریب سے چیک کروں اور...... خود کو اس طرح پوز کروں کہ اسے خود بھی میری حیثیت کا اندازہ ہو جائے۔ اس کے بعد وہ جس ردعمل کا مظاہرہ کرے گا وہ ہمارے لیے زیادہ کارآمد ہوگا۔“

”گڈ......“ شیخ حامد نے اس بار خشک لہجے میں اسے سراہنے کے ساتھ ساتھ تنبیہ بھی کی۔ ”تمہاری یہ پالیسی زیادہ کارآمد ہو سکتی ہے لیکن آئندہ محتاط رہنا۔ مجھ سے مشورہ کیے بغیر آئندہ کبھی ایسی غلطی نہ کرنا۔“

”اوکے۔ باس!“ شبنم نے شپٹا کر اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔

”افضل خان کی دم کچھ سیدھی ہوئی یا نہیں؟“

”ایسی ویسی......“ شبنم نے سنجیدگی سے کہا پھر افضل خان کے وہ آخری جملے لفظ بہ لفظ دہرائے جو اس نے بگ باس کے سلسلے میں اور اس کی سابقہ مہربانیوں کا بہ طور خاص ذکر کرتے ہوئے کہے تھے۔

شیخ حامد نے ایک بار پھر...... کن انکھیوں سے کنول کے بند دروازے کی جانب دیکھا۔ گلاس میں بچی لال پری کو ایک ہی گھونٹ میں حلق کے نیچے اتارا پھر شبنم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا اس کے جملوں کے اندر تمہیں کسی دومنہ والے سانپ کا خیال نہیں آیا جو ایک طرف خطرہ دیکھ کر بڑی عیاری سے دوسرا رخ اختیار کرتا ہے۔“ شیخ حامد نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ”محبت اور جنگ میں بھی ہر قسم کے حربے استعمال کرنے کو جائز سمجھا جاتا ہے۔“

”اس شبہے کو نظرانداز بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن...... اگر افضل خان نے ایسا کیا تو وہ اس کی زندگی کا آخری دن......“

”یہ سوچنا میرا کام ہے جان من......“ اس بار شیخ حامد نے شبنم کو مخمور نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ان نظروں میں ایک بہکے ہوئے شرابی کے لڑکھڑاتے قدم دیکھ کر ہی شبنم کو پھریری آ گئی لیکن اسی وقت سامنے رکھے ہوئے موبائل کی وائبریشن نے شیخ حامد کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ اس نے اسکرین پر نظر آنے والے نمبروں کو دیکھ کر موبائل اٹھا کر کانوں سے لگا لیا۔ بے حد سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”کیا رپورٹ ہے......؟“

”باس...... ڈی ایس پی اور ایس پی میں آج کل کچھ زیادہ ہی ٹھننے لگی ہے۔ ہاشم کے معاملے میں بھی دونوں بڑی سرگرمی دکھا رہے ہیں۔“

”اس کی موت کی پشت پر کس کا ہاتھ ہے......؟“

”اس نے خودکشی نہ کی ہوتی تو ہم نے اس کا قصہ پاک کر دیا ہوتا لیکن یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ......“

”نان سنس!“ شیخ حامد نے جھلا کر کہا۔ ”جتنا پوچھا گیا ہے صرف اس کا جواب دو۔“

”سوری باس...... میں نے آدمی پیچھے لگا دیے ہیں۔ جس نے ہم سے پہلے شکار کر لیا ابھی اس کا کھوج نہیں ملا لیکن......“

”دوسرے باسٹرڈ کی کیا رپورٹ ہے؟“ اس بار بھی دوسری طرف سے پورا جملہ سنے بغیر سوال کیا گیا۔

”ہم نے وہ پورا ٹھکانا ہی اڑا دیا تھا مگر وہاں سے کوئی لاش نہیں ملی۔“

”پھر...... تمہاری اس کارکردگی پر کیا انعام دیا جائے؟“ شیخ حامد کا لہجہ ایک دم ہی خطرناک ہو گیا۔

”ہم کوشش کر رہے ہیں باس...... بہت جلد اس کا سراغ بھی لگا لیں گے۔“ دوسری طرف سے عاجزی کا اظہار کیا گیا۔ ”ہمارے لوگ پوری طرح محتاط اور چوکس تھے، مطلوبہ آدمی کیسے اور کس طرح نکل گیا یہ بات......“

”ربش......!“ شیخ حامد نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے سفاک لہجے میں کہا۔ ”میں پراسرار کہانیاں سننے کا عادی نہیں ہوں۔ تمہیں صرف دو روز کی مہلت اور دی جا رہی ہے۔“

”رائٹ سر......“

”جو لوگ سر جوڑ رہے ہیں، انہیں بھی اب ایک ہلکے شاک کی ضرورت ہے۔ اس بات کا خیال رہے کہ بات مرہم پٹی سے گزر کر قبرستان تک نہ پہنچے۔“

”سمجھ گیا باس......“

”آج رات کے لیے جو ہدایت دی ہے اس کا خیال رکھنا۔“ شیخ حامد نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا پھر موبائل آف کر دیا۔

”باس......“ شبنم نے ہمت کر کے دبی زبان میں پوچھا۔ ”کیا میں کسی کام آ سکتی ہوں؟“

”کنول کے ملازمت چھوڑنے کے سلسلے میں دفتر میں کیا چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں......؟“ شیخ حامد نے شبنم کی اعتدال کراسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھا۔

”سب خاموش ہیں، کسی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا لیکن...... بہ ظاہر یہی اندازہ ہوا ہے کہ سب کو اس بات پر حیرت ہی ہو رہی ہے۔“

”کیوں......؟ اس میں حیرت اور تعجب کی کیا بات ہے؟“

”میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔“ شبنم نے جان بچانے کی کوشش کی۔

”مجبوریوں سے فائدہ اٹھانا بھی انسان کی سرشت اور خصلت میں شامل ہے۔ تم اپنی ہی مثال لے لو۔“ شیخ حامد نے کینچلی بدل کر شبنم کے سراپا پر نظر ڈالی۔ ”کیا تم اس پوزیشن میں ہو کہ میری کسی بھی خواہش سے انکار کر سکو؟“

”ن...... نہیں۔“ شبنم ہکلا کر رہ گئی۔

”وجہ......؟“

”میری ایک غفلت یا کمزوری آپ کے پاس محفوظ ہے......“ اس نے نظریں جھکا کر صاف گوئی سے جواب دیا۔ ”میں اپنی زندگی کو موت کے حوالے تو کر سکتی ہوں لیکن...... انکار نہیں۔“

”یو آر رائٹ۔“ شیخ حامد نے فاتحانہ مسکراہٹ سے کہا پھر ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ ”کنول کے سلسلے میں مجھ سے ایک چوک ہو گئی۔ اس سے پیشتر کہ میں اس کے پر کترتا وہ ہاتھ سے نکل گئی، میں اب بھی اس پوزیشن میں ہوں کہ اسے اپنے قدموں میں جھکا سکوں لیکن مجھے اپنی ریپوٹیشن کا زیادہ خیال ہے۔“

شبنم نے نظریں اٹھا کر بگ باس کو دیکھا لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔

”فارگٹ دس ٹاپک...... یہ بتاؤ کہ افضل خان سے ملاقات کے دوران تم نے اور کیا محسوس کیا؟“

”یہی کہ اب وہ آپ کے اشاروں پر اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالنے سے بھی انکار نہیں کرے گا۔“

”اور کچھ......؟“

”ایک بات اور بھی ہے باس۔“ شبنم نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ لودھی کے بارے میں غور کرتے ہوئے بڑی صاف گوئی سے اس کی ملاقات کا پورا احوال بھی سنا دیا۔ شاید بگ باس بھی یہی کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ شبنم کو شبہ تھا کہ اس کا تعاقب بھی ضرور کیا گیا ہوگا۔

"تمہارا کیا مشورہ ہے لودھی کے سلسلے میں؟"
"ہم کسی کو شکار کرنے کی خاطر بہ طور چارا بھی استعمال کر سکتے ہیں۔" شبنم نے ہچکچا کر جواب دیا۔
"گڈ...... مجھے تمہارا یہ مشورہ پسند آیا۔" اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا پھر شبنم کے قریب آ کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر جس بے باکی سے جھک کر اس کے گال کو چوما وہ شبنم کے خون میں نفرت کی لہر دوڑانے کے لیے کافی تھا۔ وہ ذرا سی کسمسائی تو شیخ حامد نے اس کے گالوں پر چٹکی لیتے ہوئے کہا۔ "ڈونٹ وری سوئٹ ہنی...... مجھے اپنا وعدہ یاد ہے، میں ایک حد سے تجاوز نہیں کروں گا۔"
"باس......" شبنم نے وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ایک سوال کر سکتی ہوں؟"
"پوچھو...... لیکن، اس بات کا خیال رہے کہ تمہارا سوال میرے لیے ناقابل برداشت نہ ہو۔"
"آج خلاف معمول، آپ نے دفتر میں......"
"بے نوشی کیوں کی؟" شیخ حامد نے خود ہی اس کا جملہ پورا کیا پھر بے تکلفی سے اس کے شانوں کو دباتے ہوئے بولا۔ "کچھ باتیں راز کی بھی ہوتی ہیں جن کو زبان تک لانا بھی مناسب نہیں ہوتا، مثلاً تمہارا اپنا ہی راز...... جو میری مٹھی میں بند ہے۔"
شبنم ایک بار پھر کسمسا کر رہ گئی۔ دس منٹ بعد ساؤنڈ پروف کمرے سے نکلتے وقت بھی اس کے دل میں بگ باس سے نفرت اور حقارت کا سیلاب رہ رہ کر اُمڈ رہا تھا۔ ایک خیال یہ بھی ذہن کے گوشے میں کلبلا رہا تھا کہ شیخ حامد بار بار اس دروازے کی سمت کیوں دیکھ رہا تھا جہاں کنول بیٹھا کرتی تھی۔ وہ دروازہ تو کنول کے استعفیٰ نے اس پر بند کر دیا تھا؟

☠☠☠

سیاہ فام ہاشم کے پاسپورٹ کے اندراجات نے سراج کی بہت ساری مشکلات حل کر دیں۔ ایئر کمپنی کی مینی فسٹ کے ذریعے یہ بات بھی اس نے نوٹ کی تھی کہ مذکورہ فلائٹ سے صرف تین غیر ملکی مسافر فرسٹ کلاس میں آئے تھے جن میں سے ہاشم خودکشی کر چکا تھا۔ سراج نے مذکورہ فلائٹ کی ایئر ہوسٹس سے بھی ملاقات کی جس نے یہ بات بڑے یقین سے کہی تھی کہ خودکشی کرنے والے نے ایک دوسرے چائنیز مسافر لوچن سے بھی کچھ دیر گھل مل کر بات چیت کی تھی لیکن تیسرا مسافر اس میں شریک نہیں ہوا تھا۔ تینوں مسافروں کی نشستیں ایک دوسرے سے دور دور تھیں اور بہ ظاہر وہ پہلے سے ایک دوسرے سے واقف نہیں لگتے تھے۔

ہاشم کی تفصیلی رپورٹ کے علاوہ سراج کے ذہن میں میڈم کی شخصیت بھی خاصی اہمیت اختیار کر چکی تھی۔ شیخ حامد کے گھر پر ہونے والے حملے کے بارے میں میڈم نے کھل کر اقرار نہیں کیا تھا لیکن اتنا ضرور کہا تھا کہ پاؤں کے نیچے دبی ہوئی چیونٹی بھی پلٹ کر کاٹنے کا اختیار رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ میڈم نے جگا کے بارے میں بھی جن معلومات کا اظہار کیا تھا انہیں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے بڑے یقین سے کہا تھا کہ اسپورٹس کار میں جس شخص کو گولی مار کر ہلاک کیا گیا وہ بگ باس کا خاص آدمی تھا جس کی موت کے بعد جگا بھی بگ باس کی لسٹ پر آ گیا تھا۔ یہ بھی بڑے وثوق سے کہا تھا کہ جس روز اسپورٹس کار والے کو گولی ماری گئی تھی اس سے دو روز قبل وہ جگا کے خفیہ ٹھکانے پر دیکھا گیا تھا جس کی وجہ سے جگا کی زندگی بھی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ میڈم نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر اس موقعے پر قانون جگا کو تحفظ دے تو وہ بہت کارآمد بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ جگا کے علاوہ میڈم نے افضل خان کے بارے میں بھی یہ بات کی تھی کہ وہ تین چار روز انڈر گراؤنڈ رہنے کے بعد ہوٹل اسٹاران میں نظر آیا تھا۔
ان تمام باتوں کے پیش نظر سراج کے ذہن میں کچھ اہم سوالات کا ابھرنا قدرتی امر تھا۔ میڈم روبی کو جگا جیسے گینگ لیڈر اور اسپورٹس کار میں مرنے والے کی خفیہ ملاقات کا علم کس طرح ہوا؟ وہ جگا کو کس وجہ سے تحفظ فراہم کرنے کا مطالبہ کر رہی تھی؟ جگا سے میڈم کا کیا تعلق تھا؟ اسے اسپورٹس کار میں گولی کا نشانہ بننے والے کے بارے میں یہ یقین کس طرح ہوا کہ وہ بگ باس کا دست راست تھا؟ اس کے علاوہ میڈم نے کہا تھا کہ وہ ایک دو روز میں کچھ اہم معلومات بھی فراہم کرے گی۔ کیا ان معلومات کا تعلق ہاشم کی خودکشی سے بھی ہو سکتا تھا؟ اور اگر ایسا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ میڈم کسی نہ کسی طور ہاشم سے بھی واقف تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ہاشم کے علاوہ لوچن اور جہاز کے تیسرے مسافر سے بھی بے خبر نہ ہو؟ اور بھی بہت ساری باتیں سراج کے ذہن میں ابھر رہی تھیں۔ خاص طور پر میڈم کا بگ باس کے بارے میں ایک جملہ رہ رہ کر سراج کے کانوں میں گونج رہا تھا۔
"آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ مگر مچھ سے میرے مراسم کس قسم کے ہیں؟"

سراج نے ذاتی طور پر جگا کے بارے میں بھی اپنے خاص کارندوں سے یہ بات معلوم کرائی تھی کہ وہ بھی موقع محل دیکھ کر کہیں انڈر گراؤنڈ ہو گیا ہے۔ ایک مکان کو دھماکے سے اڑا دیے جانے والی واردات کی اطلاع بھی سراج کو مل چکی

تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ مکان کے ملبے سے کسی انسانی لاش کے کوئی باقیات بھی نہیں ملے تھے۔ پھر، اس دھماکے کا مقصد کیا تھا؟
شام تک وہ ذہنی طور پر الجھا رہا۔ پھر نہا دھو کر فریش ہونے کے بعد اس نے اورنگ زیب کے گھر ڈنر پر جانے سے پہلے میڈم روبی کو کال کرنا بھی ضروری سمجھا۔
"اس وقت کیسے یاد کیا؟" دوسری جانب سے میڈم کی مانوس آواز ابھری۔
"میں اس وقت آپ سے اپنی سرکاری حیثیت میں کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" سراج نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔
"اگر ممکن ہوا تو میں آپ کے ساتھ تعاون سے گریز بھی نہیں کروں گی۔" میڈم روبی نے محتاط انداز میں جواب دیا۔
"آپ جگا کو اور اسپورٹس کار میں مرنے والے کو کس طرح جانتی ہیں؟"
"ویری سمپل......" میڈم نے سنبھل کر کہا۔ "اگر بگ باس کا کوئی نمائندہ جگا سے ملنے اور اس کی خدمات حاصل کرنے کی خاطر پلاننگ کر سکتا ہے تو یہ حق دوسروں کو بھی حاصل ہے۔"
"آپ کی ذاتی اطلاع کے لیے بتا دوں کہ آج ایک غیر ملکی نے بھی ڈریم فل نامی گیسٹ ہاؤس میں زہر کھا کر خودکشی کر لی ہے۔" سراج نے کچھ سوچ کر ایک ٹرمپ کارڈ استعمال کیا۔
"میں نہیں سمجھی کہ آپ یہ بات میری اطلاع کی خاطر کیوں دے رہے ہیں؟" میڈم نے سپاٹ لہجے میں حیرت کا اظہار کیا۔ "ضروری تو نہیں کہ پولیس کی طرح میں بھی شہر میں ہونے والے تمام حادثات کا باقاعدہ ریکارڈ رکھوں۔"
"کیا آپ نے کبھی کسی حوالے سے لوچن، ہاشم یا ڈوما کا نام بھی سنا ہے؟ یہ تینوں غیر ملکی ایک ہی فلائٹ سے یہاں آئے تھے۔"
"آئے ہوں گے لیکن میں ان کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"
"آپ نے جس جگا کو قانونی تحفظ دینے کی بات کی تھی، وہ بھی کچھ دنوں سے انڈر گراؤنڈ ہے۔" سراج نے تلملا کر کہا۔
"میرا خیال ہے کہ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ اسپورٹس کار میں مارا جانے والا دو روز قبل جگا سے ملا تھا اور بگ باس اسے بھی مشکوک سمجھ کر قابل عتاب سمجھ رہا ہے۔ اسی صورت میں جگا کی روپوشی کو میں اس کی دانش مندی ہی قرار دے سکتی ہوں۔"
"آپ نے کچھ نئی اطلاعات فراہم کرنے کی بھی بات کی تھی؟"
"ضروری تھی لیکن اب مجھے اس کے بارے میں سوچنا پڑے گا۔"
"میں سمجھا نہیں۔"
"آپ نے ابھی فرمایا تھا کہ اس وقت آپ اپنی سرکاری حیثیت میں بات کر رہے ہیں جبکہ میں نے آپ کو ہمیشہ اپنا ہمدرد اور محسن ہی سمجھا ہے۔ اب بھی سمجھتی ہوں۔"
"میرا خیال ہے کہ اب میری اور آپ کی دوبدو ملاقات ناگزیر ہو گئی ہے۔" سراج نے خود کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کی۔
"اس میں ہم دونوں کے لیے کچھ نئے خطرات پیدا ہونے کا امکان بھی ہے۔ بہر حال، اگر آپ سرکاری حیثیت میں حکم دیں گے تو میں انکار بھی نہیں کروں گی۔"
"اوکے، میں آپ کو دوبارہ فون کروں گا۔" سراج نے الجھ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ پھر وہ لیاقت حسین کے ساتھ ایس پی اورنگ زیب کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ فوری طور پر دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد حاصل ہونے والی معلومات اورنگ زیب کے علم میں لانا ضروری سمجھ رہا تھا۔ پچیس منٹ بعد وہ اورنگ زیب کے ساتھ اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تمام معلومات بڑی وضاحت سے بیان کر رہا تھا۔ میڈم روبی کا ذکر کرنا اس نے جان بوجھ کر مناسب نہیں سمجھا تھا۔
"شکریہ سراج۔" اورنگ زیب نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ "آپ نے ایک دن میں ہی جو معلومات حاصل کر لیں وہ بہت اہم ہیں لیکن کیا آپ کو اسپورٹس کار میں مرنے والے اور ہاشم کی خودکشی میں بھی کوئی تعلق نظر آتا ہے؟"
"ہو بھی سکتا ہے مگر ابھی بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔"
"آکٹوپس کو کس حد تک ان وارداتوں میں ملوث سمجھا جا سکتا ہے؟" اورنگ زیب نے ہونٹ چباتے ہوئے سوال کیا۔
"اسپورٹس کار والے کی موت اس کے کھاتے میں نہیں ڈالی جا سکتی۔" سراج نے جواب دیا۔ "وہ اسی کا خاص آدمی تھا لیکن سیاہ فام ہاشم کی موت کا معما ابھی تک پوری طرح حل نہیں ہوا۔ بہر حال یہ اسپورٹس کار والے کی موت کا ردعمل بھی ہو سکتا ہے۔"
"گڈ......" اورنگ زیب نے ستائشی انداز میں

جواب دیا۔ ”میں بھی ان ہی امکانات پر غور کررہا ہوں لیکن خودکشی والی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر آکٹوپس کا ہاتھ ہوتا تو پھر سیاوقام کو اتنے سکون کے بجائے کسی نہ کسی اذیت ناک مرحلے سے گزار کر موت کے حوالے کیا جاتا۔“

”پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کیا کہانی سناتی ہے؟“ سراج نے پوچھا۔

”موت کسی سریع الاثر زہر کا نتیجہ ہے۔ ہم نے جن حالات اور پوزیشن میں لاش کو دیکھا اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مرنے والے نے کسی وجہ سے ازخود زہر پینے کی ٹھان لی تھی ورنہ وہ آخری وقت ٹیلی وژن سے لطف اندوز نہ ہو رہا ہوتا۔“

”میں آپ کے خیال سے متفق ہوں۔ میں نے ایک دو آدمیوں کو لوچن اور ڈوما کی تلاش کا کام بھی سونپ دیا ہے، ممکن ہے ان میں سے کسی کے ہاتھ آجانے کے بعد خودکشی کی گتھی سلجھانے میں آسانی ہو۔“

ایس پی اورنگ زیب ایک لمحے خاموش رہا پھر اس نے سراج کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”جگا کے بارے میں آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟“

”میں سمجھا نہیں۔“ سراج، جگا کے حوالے پر چونکا پھر سنبھل کر بولا۔ ”پولیس ریکارڈ کے مطابق اسے ایک گینگ لیڈر ہی ظاہر کیا گیا ہے لیکن وہ صرف ایک بار گرفتار ہوا تھا، اس کی سزا بھی اسے مل چکی ہے، اس کے بعد وہ ہمارے ریکارڈ کے حوالے سے کسی معاملے میں ملوث نہیں پایا گیا۔ ہوسکتا ہے پولیس کے محکمے کی کچھ کالی بھیڑیں بھی اس کا تحفظ کررہی ہوں۔“

”میں نے آج جگا کی فائل کو بہت غور سے پڑھا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ مجرم نہیں تھا۔ جس معاملے میں اسے سزا ملی، وہ اس کا صحیح طور پر دفاع بھی نہیں کرسکا۔“ اورنگ زیب نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔ ”کوئی بھی سزا یافتہ مجرم ہمارے معاشرے میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا اس لیے اپنی معاشی پریشانی دور کرنے کی خاطر اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑتا ہے۔“

سراج کے ذہن میں میڈم کی باتیں صدائے بازگشت بن کر گونجنے لگیں۔ اس نے بھی جگا کے بارے میں ایسے ہی تاثرات کا اظہار کیا تھا اور اب اورنگ زیب جیسا ٹھوس کردار کا حامل ایک ذمے دار پولیس آفیسر بھی ان ہی خطوط پر اپنے خیالات کا اظہار کررہا تھا۔

”آپ نے جو رائے قائم کی ہے میں اس سے انکار نہیں کروں گا لیکن موجودہ معاملات میں جگا......“

”کا تعلق بھی کسی نہ کسی زاویے سے ہوسکتا ہے۔“ اورنگ زیب نے سراج کے جملے کو اپنی سوچ کے مطابق آگے بڑھاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہوسکتا ہے کہ آکٹوپس جگا کی پشت پناہی کررہا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جس پارٹی نے آکٹوپس کے مکان پر حملہ کردیا تھا۔ جگا کے آدمی اس کے لیے کام کررہے ہوں، دونوں ہی صورتوں میں جگا کا نام درمیان میں لیا جاسکتا ہے۔“

”دوسری پارٹی کون ہوسکتی ہے؟“ سراج نے جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ کے ذہن میں کوئی نام ہے؟“

”ہاں......“ اورنگ زیب نے مسکرا کر کہا۔ ”ایک پارٹی تو آپ کے کلاس فیلو سیٹھ عثمان کی بھی ہوسکتی ہے جسے آکٹوپس کے سامنے اپنی شرافت کی وجہ سے گھٹنے ٹیکنے پڑے لیکن...... میں نہیں سمجھتا کہ سیٹھ عثمان جیسا نیک اور سہل پسند کاروباری شخص کوئی غلط اقدام اٹھانے کے بارے میں سوچ بھی سکتا ہو۔ کل تک میرے ذہن میں یہی ایک نام تھا مگر آج ایک نام اتفاقاً میری لسٹ پر اور آگیا ہے۔“

”وہ کون ہے؟“ سراج نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ پہلے ہم ڈنر کے ساتھ انصاف کرلیں پھر باقی باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔“

کھانے میں اورنگ زیب نے خاص اہتمام کیا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر اس نے ہلکے پھلکے مذاق اور تفریح کی باتیں کیں۔ کھانے کے بعد اس نے کولڈ کافی کا اہتمام موسم کی مطابقت سے کیا تھا۔ اس سے فارغ ہوکر وہ دوبارہ ڈرائنگ روم میں آئے تو اورنگ زیب نے مسکرا کر کہا۔

”میرے ملازم نے اس آدمی کو نظرانداز نہیں کیا جو آپ کے ہمراہ آیا تھا۔ کیا وہ آپ کا ملازم، میرا مطلب ہے کہ پرائیویٹ ڈرائیور یا کوئی اعتماد والا آدمی ہے۔“

”وہ سیٹھ عثمان کا ڈرائیور ہے، میں نے اسے دس بارہ روز کے لیے اپنے پاس بلالیا ہے۔“ سراج نے کہا پھر اس نے دبی زبان میں لیاقت حسین کے بارے میں کچھ باتیں بھی اورنگ زیب کو بتادیں۔

”حیرت انگیز۔“ اورنگ زیب نے سراج کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ ”کیا آپ کو یقین ہے کہ لیاقت حسین کے سر پر کسی مہربان جن یا کسی پہنچے ہوئے بزرگ کا سایہ ہے؟“

”میں اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا

میں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا وہ یقیناً آپ کے ان خیالوں میں سے کسی ایک کی تائید ضرور کرتا ہے۔“

”ہو بھی سکتا ہے اس لیے کہ خدا کے معجزے ہر دور میں کسی نہ کسی طور رونما ہوتے رہتے ہیں جنہیں ہماری موٹی عقلیں تسلیم نہیں کرتیں۔ میں آپ کے مشاہدوں سے بھی انکار نہیں کروں گا۔“

”ڈنر سے قبل آپ نے کسی دوسری پارٹی کا ذکر کیا تھا۔“ سراج نے موضوع بدل کر اصل مقصد کی طرف آنے کی کوشش کی۔ ”کیا عثمان کے علاوہ کوئی اور نام بھی سامنے آیا ہے؟“

”ہاں......“ اورنگ زیب نے مسکرا کر دوستانہ انداز میں جواب دیا۔ ”کھانے کے بعد اگر ہم کچھ دیر ساحل پر چہل قدمی کرلیں تو کیا حرج ہے؟“

”اچھا خیال ہے۔“ سراج نے بے تکلفی سے کہا۔ ”ساحل کا سکون بخش ماحول ہم لوگوں کے لیے کسی ٹانک سے کم بھی نہیں ہے۔“

”ویل سیڈ یہ بہت مناسب ہے“ اورنگ زیب جواب دینے کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ سراج بھی اس کے ساتھ باہر آگیا جہاں دونوں کی گاڑیوں کے علاوہ ڈرائیور بھی موجود تھے۔ اورنگ زیب نے لیاقت حسین سے بڑی محبت کے ساتھ مصافحہ کیا پھر اس نے سراج ہی کی گاڑی میں باہر جانے کو ترجیح دی۔

اس وقت رات کے دس کا عمل رہا ہوگا۔ اورنگ زیب کے کہنے پر لیاقت حسین نے ساحل کی طرف جانے والا راستہ اپنالیا۔ ساحل پر پہنچ کر اورنگ زیب بڑی دیر تک سراج کے ساتھ چہل قدمی کرتا رہا۔ سراج کو اس کی بے پروائی پر حیرت بھی تھی لیکن اورنگ زیب بے فکر نظر آرہا تھا۔ ایک لمبا چکر لگا کر گاڑی کی طرف واپس آتے وقت اورنگ زیب نے سراج کے دل کا چور پکڑتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے آپ اس وقت ماحول سے لطف اندوز ہونے کے بجائے کسی اور بات سے فکرمند ہیں؟“

”میں انکار نہیں کروں گا۔“ سراج نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”آکٹوپس کا زور بھی سمندر کے آس پاس زیادہ چلتا ہے اور میں آپ کو باخبر بھی کرچکا ہوں کہ ہمارے مشترکہ دشمن کسی بھی موقعے سے فائدہ اٹھانے سے دریغ نہیں کریں گے۔“

”اور میں نے اس کے جواب میں کہا تھا کہ آپ کے شہر میں ڈیوٹی جوائن کرنے سے پیشتر ہی میں نے اپنی سیکیورٹی کا معقول بندوبست کرلیا تھا۔“ اورنگ زیب نے بے پروائی سے کہا۔ ”اس وقت بھی کچھ مخصوص لوگ آکٹوپس کی طرف سے پوری طرح چوکس ہوں گے۔ ویسے موت اگر لکھ دی گئی تو اس کے مقررکردہ وقت اور جگہ کو کوئی بھی نہیں ٹال سکتا۔“

تقریباً ساڑھے گیارہ بجے وہ گاڑی میں بیٹھ کر دوبارہ شہر کی جانب روانہ ہوئے۔ سراج نے ایک بار پھر دوسری پارٹی کا ذکر چھیڑا تو اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔

”ہم اس وقت اسی پارٹی کے ایک زخمی کی عیادت کے لیے چل رہے ہیں، فی الحال ہمیں سب کچھ آن آفیشلی کرنا ہے۔ یہ کام ایک دیرینہ دوست نے مجھے سونپا ہے، آپ کی اطلاع کے لیے یہ بھی بتادوں کہ وہ بھی سیٹھ عثمان کی طرح ایک شریف آدمی ہے لیکن غالباً آکٹوپس نے کسی طور اسے بھی اپنے چنگل میں دبوچ لیا ہے۔“

نصف رات گئے اورنگ زیب کی ہدایت پر لیاقت حسین نے ایک نجی اسپتال کے مرکزی دروازے پر گاڑی روکی تو ایک گارڈ قدم اٹھاتا ہوا قریب آگیا۔

”اندر پارکنگ کی اجازت نہیں جناب اس لیے......“

گارڈ اپنا جملہ پورا نہیں کرسکا۔ اورنگ زیب نے اپنا مخصوص شناختی کارڈ نکال کر اسے دکھایا تو وہ سلام کرتا ہوا الٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔ گیٹ کھولا گیا تو لیاقت حسین نے گاڑی اندر لے جاکر پارک کردی۔ اس وقت اسپتال میں زیادہ رش نہیں تھا۔ اورنگ زیب سراج کے ساتھ قدم بڑھاتا ہوا سیدھا بڑے ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوا جو ایک لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ کسی مریض کے بارے میں ڈسکس کررہا تھا۔

”فرمایئے۔“ ڈاکٹر نے اورنگ زیب کو مہذب لہجے میں مخاطب کیا۔

”آپ فارغ ہولیں...... ہمیں آپ سے کچھ ضروری معلومات کرنی ہیں۔“

معلومات کے حوالے پر بڑے ڈاکٹر نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر دو تین منٹ بعد لیڈی ڈاکٹر کو فارغ کرنے کے بعد اس نے دوبارہ اورنگ زیب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔“

”ہم بھی عوام ہی کے خادم ہیں۔“ سراج نے اس بار اپنا کارڈ نکال کر ڈاکٹر کو دکھایا پھر اورنگ زیب کا تعارف بھی مخصوص انداز میں کرایا۔ ”مائی سینئر آفیسر۔“

”مجھے خوشی ہوگی اگر آپ حضرات کے کسی کام آسکا۔“

”ہمیں آپ کے پرائیویٹ روم نمبر تھری ہنڈریڈ ٹوئنٹی کی مریضہ کے بارے میں کچھ معلومات درکار ہیں۔“ اورنگ زیب نے ڈاکٹر کو گہری نظروں سے دیکھا۔

"مریضہ کی حالت اب خاصی بہتر ہے، ہوسکتا ہے اسے کل یا پرسوں ڈسچارج کر دیا جائے۔" ڈاکٹر نے کسمسا کر جواب دیا۔

"اسے کیا مرض لاحق تھا؟"

"اس کا داخلہ میرے ایک ماتحت ڈاکٹر نے کیا تھا۔" ڈاکٹر نے ہونٹ چباتے ہوئے صاف گوئی سے جواب دیا۔ "میں آپ سے حقیقت چھپانے کی کوشش نہیں کروں گا لیکن جس وقت وہ اسپتال لائی گئی تھی اس کے جسم سے خاصا خون بہہ چکا تھا۔ ہم پولیس کی کارروائی میں پڑتے تو اس کی جان کو خطرہ بھی لاحق ہوسکتا تھا، اس کے علاوہ جس شخص نے ہمیں فون کیا تھا وہ بھی ہمارے اسپتال کا ایک ذمے دار ٹرسٹی ہے اس لیے ڈاکٹر آن ڈیوٹی کو......"

"میں آپ کی مجبوری سمجھ رہا ہوں ڈاکٹر۔" اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ "ہم اس وقت قانونی چارہ جوئی کی خاطر نہیں آئے ہیں۔ آپ سے ایک ضروری تعاون کی درخواست کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں آپ ایک تحریری رپورٹ خفیہ طور پر فراہم کر دیں کہ مریضہ کس حالت میں لائی گئی تھی اور آپ کے ڈاکٹر نے کس ٹرسٹی کے کہنے پر اسے اسپتال میں داخل کیا تھا؟"

جواب میں ڈاکٹر نے مسمسی صورت بنا کر کہا۔ "تحریر لکھ دینے کے بعد تو میں بھی گلے گلے پھنس سکتا ہوں۔"

"ایسا نہیں ہوگا...... مجھے آپ کی پوزیشن کا خیال رہے گا، ویسے اگر میں چاہوں تو آفیشلی بھی......"

"میرا وہ مطلب نہیں جناب جو آپ سمجھ رہے ہیں۔" ڈاکٹر اپنی کرسی پر پہلو بدلنے لگا۔ "آپ جو کہیں وہ میں لکھ کر دینے پر آمادہ ہوں لیکن ذاتی طور پر میں اس مریضہ کے بارے میں......"

"ڈونٹ وری ڈاکٹر۔" اورنگ زیب نے اسے تسلی دی۔ "میں از خود بھی اس کارروائی کو خفیہ رکھنے کے حق میں ہوں۔ آپ کی تحریر کی ضرورت اس لیے درکار ہے کہ ہم کسی مجرم کو بے نقاب کرنا چاہتے ہیں اور...... جس کے حکم پر مریضہ کو داخل کیا گیا، اس کی زبان کھلوانی بھی ضروری ہے۔"

"اس کا کیا قصور ہے؟" ڈاکٹر نے حیرت سے دریافت کیا۔

"صرف اتنا کہ وہ کسی خوف کی وجہ سے اس شخص کا نام زبان تک لانے سے گریز کر رہا ہے جس کی وجہ سے ایک غریب اور بے قصور ملازمہ کو ان حالات کا شکار ہونا پڑا۔"

"آئی سی......" ڈاکٹر نے طویل سانس لی پھر اس نے اپنے آفس کے لیٹر ہیڈ پر وہ تحریر بھی لکھ کر اورنگ زیب کے حوالے کر دی جس کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر کے کمرے سے نکل کر اورنگ زیب باہر جانے لگا تو سراج نے پوچھا۔

"ہم یہاں کس مریضہ کی خاطر آئے تھے؟"

"سیٹھ رستم علی کی ایک خادمہ...... گلابو، جسے گولی لگنے کے بعد یہاں داخل کرایا گیا ہے۔" اورنگ زیب نے تفصیل بیان کی۔ "میرے ایک پرانے دوست نے یہ اطلاع مجھے دے کر ضروری تفتیش پر آمادہ کیا ہے۔"

"کیا ہم مریضہ کو کریدنے کی کوشش نہیں کریں گے" سراج نے ایک قانونی نکتہ پیش کیا۔ "ہوسکتا ہے کہ وہ اس شخص کی نشاندہی کر دے جس نے گولی ماری تھی۔"

"وقت کی بربادی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوگا رستم علی نے گلابو کے سلسلے میں اپنے بیٹے اور بہو کو بھی ابھی تک اندھیرے میں رکھا ہے۔ جس نے واردات کی ہوگی وہ اپنے اصلی حلیے میں سامنے نہیں آیا ہوگا۔"

"آکٹوپس؟......" سراج نے اورنگ زیب کی طرف سوالیہ انداز سے دیکھتے ہوئے مختصراً کہا۔

"شاید......"

"لیکن ڈاکٹر کی تحریر......"

"رستم علی کی زبان سے سچ اگلوانے کی ایک اہم کڑی ثابت ہوگی۔" اورنگزیب نے مسکرا کر کہا پھر وہ سراج کے ساتھ آکر باہر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

لیاقت حسین اسٹیئرنگ پر پوری طرح مستعد نظر آ رہا تھا۔ سراج اور اورنگ زیب کے درمیان رستم علی اور زخمی ہونے والی ملازمہ کی بات ہو رہی تھی جب لیاقت حسین نے اچانک اسٹیئرنگ کو اس تیزی سے گھمایا کہ گاڑی دو پہیوں پر چرچرا کر پھر سیدھی ہوگئی۔ اورنگ زیب اور سراج بھی توازن کھو بیٹھے تھے پھر اس سے پہلے کہ سراج، لیاقت حسین سے کچھ پوچھتا، قریب ہی کہیں سے ایک دھماکا سنائی دیا۔ اس کے بعد فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونجنے لگی۔ فائرنگ کا انداز ایسا ہی تھا جیسے دو مختلف پارٹیاں آپس میں ٹکرا کر ایک دوسرے کو پسپا کرنے کی خاطر اندھا دھند گولیاں چلانے میں الجھ گئی ہوں۔ سراج کے منع کرنے کے باوجود لیاقت حسین بھی ہیڈ لائٹس بجھانے کے بعد دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

اس پراسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

بعض اوقات ادب کے پرانے شاہکار نئے پیرائے میں دہرائے جاتے ہیں۔

ایسی ہی ایک روسی کہانی ہے۔ لیکن میں اس کہانی کو نہیں دہرا رہا بلکہ اس کے نئے پہلو کو دیکھ رہا ہوں جو آج کی صورتِ حال میں ہے۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ یہ واقعہ خود میرے ساتھ پیش آیا ہے ویسے یہ آپ کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے۔

اخبار میں ایک بہت پیارے بچے کی تصویر چھپی تھی جس کے نیچے لکھا تھا۔ "تلاش گمشدہ" اور تلاش کرنے والے کو دس لاکھ روپے انعام دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ وہ بچہ کسی امیر گھرانے کا تھا۔ اسی لیے اس پر دس لاکھ کا انعام تھا ورنہ غریب بے چارے تو اپنی گمشدہ اولاد کو رو پیٹ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ دس لاکھ بہت بڑی رقم تھی۔ ہمارے نہ جانے کتنے مسائل حل ہوسکتے تھے۔ ہم ایک چھوٹا موٹا فلیٹ لے سکتے تھے، کرائے سے جان چھڑا سکتے تھے۔ نہ جانے کتنے ارمان، کتنی خواہشیں ان دس لاکھ میں پوشیدہ تھیں۔

میری بیوی اس دوران میں چائے لے کر آگئی تھی۔ میں نے چائے کا گھونٹ لے کر برا سا منہ بناتے ہوئے فوزیہ کی طرف دیکھا۔ "کیا بات ہے آج اس میں چینی نہیں ڈالی؟"

"چینی ہو تو ڈالوں۔" فوزیہ نے کہا۔ "دکاندار نے صاف منع کر دیا ہے۔ کہہ رہا تھا جب تک پچھلے پیسے نہیں ملتے، مزید کوئی چیز نہیں دوں گا۔"

لب ساحل ایک پیاسے جوڑے کی حماقتوں کا قصہ

قلندر پر شاکر رہنا اگرچہ ایک خوبی سہی مگر... ہر ایک اس کا متحمل ہو سکتا تو نہیں۔ دوسروں کے رستے پر چل کر انسان کبھی اپنی منزل نہیں پاسکتا۔ یہ حقیقت واضح ہے کہ دوسرے کے مال پر اپنا حق جتانا اخلاقی جرم ہے مگر... کیا کیا جائے کہ یہ دل بے ایمان مانتا ہی نہیں ہے۔

اپنا بچہ

منظر امام

"فوزیہ اس کم بخت سے کہو کہ ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ صرف چھ مہینے سے پیسے رکے ہوئے ہیں اور اتنا شور کیے جا رہا ہے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے چھ مہینے کم ہوتے ہیں؟" فوزیہ تنک کر بولی۔

"بہت کم...... درانی صاحب کے تو پانچ سال سے پیسے نہیں دے سکا ہوں۔"

فوزیہ نے اب مزید کچھ کہنے کے بجائے اخبار اٹھا لیا۔ وہ بھی اس بچے کی تصویر دیکھ کر چونک اٹھی۔ "کتنا پیارا بچہ ہے۔"

"ہاں فوزیہ اور اس کی دل کشی کی ایک وجہ دس لاکھ کا انعام ہے۔"

"اگر یہ بچہ ہمیں مل جائے تو کتنا اچھا ہو۔"

"ہمیں تو اب تک خود اپنا بچہ نہیں مل سکا، کسی اور کا کہاں سے ملے گا۔" میں نے کہا۔

میرا اشارہ بے اولادی کی طرف تھا۔ ابھی تک ہمارے یہاں اولاد نہیں ہو سکی تھی۔ فوزیہ کچھ کہنے والی تھی کہ باہر سے سبزی والے کی آواز سنائی دی۔ "آلو لے لو، پیاز لے لو۔"

"یہ بتائیں آپ کے پاس کچھ پیسے ہیں یا آج بھی سبزی ادھار لے لوں؟" فوزیہ نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ آج بھی ادھار ہی پر رکھو۔" میں نے کہا۔

فوزیہ بھناتی ہوئی چلی گئی میں پھر اخبار کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دو منٹ بعد ہی فوزیہ کی واپسی ہو گئی تھی۔ وہ بہت پُرجوش دکھائی دے رہی تھی۔ شدت جذبات سے اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ "وہ...... وہ......"

"کیا ہوا۔ کیا سبزی والے نے کوئی الٹی سیدھی بات کہہ دی؟"

"نہیں۔ وہ...... وہ بچہ......"

"کون سا بچہ؟"

"یہ اخبار والا۔" فوزیہ نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ہمارے دروازے کے باہر کھڑا ہے۔"

"کیا......!" میں چونک اٹھا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟"

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔" اس نے بتایا۔ "آپ خود چل کر دیکھ لیں یہ وہی بچہ ہے۔"

میں بھی جلدی سے باہر آ گیا۔ احتیاطاً میں اخبار بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ واقعی یہ وہی بچہ تھا، بالکل وہی۔ دروازے کے باہر چپ چاپ کھڑا تھا۔ وہ بچہ نہیں دس لاکھ کی رقم تھی جو ہمارے دروازے تک آ گئی تھی۔

"بیٹا کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"خرم۔" بچے نے دھیرے سے بتایا۔

اخبار میں بھی اس کا یہی نام لکھا تھا، خرم۔

"کتنا پیارا بچہ ہے۔" میری بیوی نے کہا۔

"بیٹے کہاں رہتے ہو؟"

اس سے پہلے کہ بچہ کوئی جواب دیتا، فوزیہ بول پڑی "کیا کر رہے ہیں اسے اندر لے چلیں اگر کسی اور نے دیکھ لیا تو وہ بھی اپنا حق جتانے لگے گا۔"

فوزیہ کی بات معقول تھی۔ میں اس بچے کا ہاتھ تھام اسے اندر لے آیا۔ بچہ بڑی سعادت مندی سے اندر آ گیا تھا۔

میں نے اسے صوفے پر بٹھا دیا تھا۔ "ہاں بیٹے۔ اب بتاؤ کہاں رہتے ہو؟" میں نے دوبارہ پوچھا۔

"وہ۔ اس طرف......" بچے نے ایک سمت انگلی سے اشارہ کر دیا۔

"دیکھا۔ ڈیفنس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔" فوزیہ نے کہا۔

"فوزیہ اسے جلدی سے کچھ کھانے کو دو۔"

"بیٹے کیا کھاؤ گے؟" فوزیہ نے پیار کرتے ہوئے پوچھا۔

"آئس کریم۔" بچے نے بتایا۔

"فوزیہ، تم اس بچے کو سنبھالو میں سامنے اسٹور سے آئس کریم لے کر آتا ہوں۔"

جب میں آئس کریم لے کر آیا تو اس وقت فوزیہ اسے حاتم طائی کی کہانی سنا رہی تھی۔ اس کے تصور میں اس بچے کا باپ ہوگا، جو ہمیں دس لاکھ دینے والا تھا۔

بچے نے آئس کریم کھانا شروع کر دی۔

اس دوران اچانک محلے کا ایک بچہ اپنی بال ڈھونڈتے ہوئے کھلے دروازے سے اندر آ گیا اور اس بچے کو دیکھنے کے بعد اس نے شور شروع کر دیا۔ "خرم تو یہاں بیٹھا ہے۔ تیرے ابو تجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔"

"بیٹے کیا تم اس کو پہچانتے ہو؟" میں نے اس بچے سے پوچھا۔

"جی ہاں انکل یہ ہمارے ماسٹر صاحب کا بیٹا ہے۔" اس نے بتایا۔ "اسی گلی کے موڑ پر رہتے ہیں۔"

وہ تو اتنا کہہ کر چلا گیا اور ہم دونوں میاں بیوی غصے سے اس بچے کو دیکھنے لگے جو بڑی بے پروائی سے آئس کریم کھانے میں لگا ہوا تھا۔

"تھیں لو کم بخت سے آئس کریم۔" میں نے جھلا کر کہا

"کیا فائدہ آدھی سے زیادہ تو کھا ہی چکا ہے۔" فوزیہ نے کہا۔

"نکال باہر کرو اسے۔ ہم بھی اسے خواہ مخواہ لے کر بیٹھ گئے۔"

اسی وقت دروازے پر ہونے والی دستک نے ہمیں چونکا دیا تھا۔ میں دروازے پر آیا تو ایک صاحب پریشان حال کھڑے تھے۔ "جناب میرا نام ماسٹر غلام ہے۔" اس نے کہا۔ "میں صبح سے اپنے بچے کو ڈھونڈ رہا ہوں، نہ جانے کہاں چلا گیا ہے؟ ایک بچے نے بتایا کہ وہ آپ کے گھر ہے۔"

"جی جناب! وہ سامنے بیٹھا آئس کریم کھا رہا ہے۔" میں نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔

"کیوں مذاق کر رہے ہیں جناب۔" وہ بچے کو دیکھ کر بولا۔ "ایک غریب استاد سے مذاق کرتے ہوئے آپ کو شرم آنی چاہیے۔"

"کیا مطلب؟"

"یہ میرا بچہ نہیں ہے جناب۔" اس نے بتایا۔ "یہ کوئی اور ہے۔"

وہ دل گرفتہ سا واپس چلا گیا۔ میں جلدی سے فوزیہ اور بچے کے پاس آ گیا۔ "مبارک ہو فوزیہ۔ یہ بچہ ماسٹر صاحب کا نہیں ہے۔"

"تو پھر کون ہو سکتا ہے؟"

"ظاہر ہے۔ یہ وہی ہے تصویر والا۔ اس بچے نے غلط بتایا تھا۔"

"اسی لیے تو میں بھی سوچ رہی تھی کہ اتنا شریف، اتنا مہذب بچہ اس محلے کا کس طرح ہو گیا۔"

"ارے اس کی پیشانی پر تو دولت مندی لکھی ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔

"اور ہے کتنا مہذب۔ کتنے سلیقے سے ساری آئس کریم کھا گیا ہے۔ مجال ہے جو ذرا سا بھی نیچے گری ہو۔"

"فوزیہ، ایسے گھرانوں کے بچے تمیزدار ہی ہوتے ہیں، انہیں باقاعدہ ٹریننگ دی جاتی ہے۔"

"اب یہ بتائیں کہ اس کا کیا ہوگا؟" فوزیہ نے پوچھا۔ "اخبار میں فون نمبر بھی چھپا ہے آپ فون کر کے بتا دیں کہ ان کا بیٹا ہمارے پاس ہے۔"

"نہیں، ایسے لوگوں کو اس طرح اطلاع نہیں دیتے۔ ہمیں خود جانا ہوگا لیکن ذرا سلیقے کی ڈریسنگ کر لینا۔"

"ظاہر ہے اب اس طرح تو نہیں چلی جاؤں گی نا۔" فوزیہ نے کہا۔ "اور آپ بھی ذرا ڈھنگ سے چلیے گا۔ آپ کے پاس تو کوئی سوٹ بھی نہیں ہے۔"

"سنو...... کیوں نہ میں اپنے لیے ایک نیا سوٹ خرید کر لے آؤں۔ دس بارہ سو میں مل جائے گا۔"

"پیسے کہاں ہیں آپ کے پاس؟"

"کرائے والے رکھے ہیں نا۔ ان ہی میں سے دے دوں گا۔"

"اور کرایہ کہاں سے پورا ہوگا؟"

"حد کرتی ہو۔ جب دس لاکھ مل رہے ہیں تو کرائے کی کیا فکر کرنے لگیں۔ سب ہو جائے گا۔ بس میں سوٹ لے کر آتا ہوں۔"

"جلدی آیئے گا میں جب تک بچے کو سلا دیتی ہوں۔"

مارکیٹ میرے گھر سے کچھ فاصلے پر تھی۔ اٹھارہ سو روپے کا بہترین سوٹ مل گیا تھا۔ میں جب سوٹ لے کر گھر پہنچا تو اب وہاں ایک دوسرا ڈراما کھڑا ہوا تھا۔

گھر میں محلے کی ایک عورت موجود تھی جو قسمیں کھا کر بتا رہی تھی کہ یہ آپا زینب کا بیٹا ہے۔

"کون آپا زینب؟" میں نے جھلا کر پوچھا۔

"وہی جو کپڑے سیتی ہیں۔" عورت نے بتایا۔ "اسی طرح گھر سے نکل جاتا ہے۔ زینب کو بھی پروا نہیں ہوتی۔ جانتی ہے کہ لوٹ کر آ ہی جائے گا۔"

"تم پہچانتی بھی ہو یا یونہی بولے جا رہی ہو؟"

"یہ لو، اب کیا میں اندھی ہو گئی ہوں۔" عورت نے کہا۔ "دن بھر میں دس بار آنا جانا ہوتا ہے۔ ہزار دفعہ دیکھتی ہوں اس کو...... چلو اچھا ہوا اب یہ تمہارے پاس آ گیا ہے۔ دو چار دن رکھنا اسے کھلانا پلانا۔ بے چاری زینب کے یہاں تو بہت پریشانی ہے۔"

وہ عورت تو یہ آگ لگا کر چلی گئی جبکہ میں اپنا سر تھام کر رہ گیا تھا۔ "یہ لو کرائے میں سے اٹھارہ سو بھی نکل گئے اس کمبخت کے چکر میں۔"

"میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ یہ بس یونہی فالتو ہے۔ خود سوچیں اچھی فیملی کا لڑکا اتنی دور پیدل چلتا ہوا یہاں کیوں آتا اور ذرا سونے کا انداز تو دیکھیں، لگتا ہے جیسے فٹ پاتھ پر سویا ہوا ہے۔ عادت ہوگی نا فٹ پاتھ پر سونے کی۔"

"اب یہ بتاؤ۔ کیا کرنا ہے؟"

"کرنا کیا ہے۔ میں آپا زینب کو بلا کر لاتی ہوں، لے

جائیں گی اسے اٹھا کر۔"

لیکن فوزیہ جب آپا زینب کے یہاں سے واپس آئی تو بہت پُرجوش ہو رہی تھی۔ "سن لیا۔ یہ بچہ آپا زینب کا نہیں ہے۔"

"کیا؟"

"ہاں اسی طرح کا آپا زینب کا اپنا بچہ تو ان کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔"

اب یہ نئی کہانی سنیں۔ تقدیر ہمیں بار بار چانس دے رہی ہے اور ہم اس کی طرف سے آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں۔ فوزیہ نے کہا۔ "اب اٹھائیں اسے اور لے چلیں یہاں سے ورنہ یہ پھر کسی اور کی اولاد نکل آئے گا۔"

"اچھا یہ بتاؤ۔ رات کا کھانا کس ہوٹل میں کھانا پسند کرو گی؟"

"اوہو پہلے پیسے تو مل جائیں پھر ایسی باتیں کرنا۔"

"پیسے تو اب مل ہی جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "یہ وہی بچہ ہے اس کے علاوہ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ تم اس کے سونے کا انداز تو دیکھو۔ لگتا ہے جیسے کوئی فرشتہ سو رہا ہو۔"

ہم دونوں نے اپنے کپڑے بدلے۔ فوزیہ نے ہلکا ہلکا میک اپ بھی کر لیا اور ہم ابھی روانہ ہونے ہی والے تھے کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔

"اب کون آ گیا؟"

"ہوگا کوئی۔ میں دیکھ لیتا ہوں۔"

میں نے دروازہ کھولا تو حکیم صاحب کھڑے تھے۔ یہ کوئی حکیم نہیں تھے صرف ان کا نام حکیم تھا۔ انتہائی فضول قسم کے انسان۔ "جی فرمائیں؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

"بھائی صاحب۔ میرا بھتیجا آپ کے پاس ہے، براہ کرم اسے واپس کر دیں۔ خرم نام ہے اس کا۔"

اب یہ سن کر میرے ارمانوں پر اوس پڑ گئی تھی۔ "آئیں آ کر لے جائیں اس کم بخت کو۔" میں نے جل کر کہا۔ "اس وقت سویا ہوا ہے۔ بہت ہی بے ہودہ بچہ معلوم ہوتا ہے۔"

"جی جناب۔ ہم بھی اس سے عاجز آ چکے ہیں لیکن کیا، کیا جائے۔ اپنا خون ہے، پھینک تو نہیں سکتے۔"

"آئیں آ کر لے جائیں۔"

میں حکیم صاحب کو لے کر سوئے ہوئے بچے کے پاس پہنچ گیا۔ "خدا کا شکر ہے۔" حکیم بچے کو دیکھ کر خوشی سے بے قابو ہو گئے تھے۔ "کب سے پریشان تھے اس کے لیے۔"

"اب سوچ کیا رہے ہیں لے جائیں۔"

حکیم صاحب نے بچے کو گود میں اٹھایا اور لے کر باہر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد فوزیہ میرے پاس آ گئی۔ وہ بہت اداس دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "ہماری قسمت ہی خراب ہے۔" اس نے کہا۔ "میں سمجھا تھا کہ دس لاکھ مل جائیں گے تو کتنے کام نکل آئیں لیکن یہاں تو وہ بچہ حکیم کا بھتیجا نکل آیا۔"

"فوزیہ، آسان روپیہ ہمارے لیے نہیں ہے۔" میں دکھی ہو کر بولا۔ "ہماری قسمت میں محنت مزدوری ہے اور ہمیں سارا دن جھک مارنی ہے۔"

"اب یہ تو سوچیں کہ کرائے کا کیا ہوگا؟"

"پتا نہیں۔ میں تو سوچ سوچ کر تھک گیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

دوسری شام کو حکیم صاحب پھر ہمارے گھر آ گئے۔ اپنے ساتھ مٹھائی کا ایک ڈبہ لے کر آئے تھے۔ "یہ لو بھائی۔ ہماری طرف سے یہ مٹھائی۔"

"سمجھ گیا۔ اپنے بھتیجے کے ملنے کی خوشی میں کھلا رہے تھے۔"

"بھائی۔ اب تم سے کیا چھپانا۔" وہ شرارت بھرے انداز میں ہنس پڑے۔ "وہ بچہ میرا بھتیجا نہیں تھا۔"

"کیا!" گلاب جامن میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا تھا۔ "تو پھر کون تھا؟"

"ایک امیر گھرانے کا بچہ تھا جس کے لیے دس لاکھ انعام رکھا گیا تھا۔" انہوں نے بتایا۔

"ذلیل کمینے۔ تو نے۔ تو نے دھوکا دیا ہمیں۔" میری زبان سے مغلظات برآمد کرنے لگے۔

"یار۔ اب کچھ بھی کہتے رہو۔ مجھے تو دس لاکھ مل گئے۔" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا اور جلدی سے آگے بڑھ گئے۔

اس کے بعد میری اور فوزیہ کی جو حالت ہوئی ہوگی، اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ "پریشان نہ ہو۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔ "خدا ہمیں کسی اور بہانے سے دے دے گا۔ یاد رکھو کہ ہمیں کام کرنا ہے۔ صرف کام۔"

ایک ہفتے بعد فوزیہ جب سبزی لے کر گھر واپس آئی تو بہت پُرجوش دکھائی دے رہی تھی۔ "سنیں، ہمارے دروازے کے باہر ایک بہت پیارا سا بچہ کھڑا ہوا ہے۔"

"ہوگا۔" میں نے اس کی طرف دیکھا۔ "یاد رکھو فوزیہ۔ ہمیں صرف اپنا ہی بچہ راس آئے گا، کسی اور کا نہیں.... چاہے وہ کچھ بھی ہو۔"

فوزیہ نے شرما کر اپنی گردن جھکالی تھی۔

◆◆

شرارتی

مختار آزاد

شرارت اور ذہانت کا امتزاج... بلاشبہ زندگی کی رونق کو بڑھا دیتا ہے مگر... ہمیشہ ایسا ممکن نہیں۔ کبھی کبھی جب وار الٹا ہو جائے تو زندگی داؤ پر بھی لگ سکتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے انہوں نے کسی کی نصیحت کو مذاق کا نشانہ بنایا اور خطرات کو کھیل تماشا سمجھتے ہوئے نظرانداز کر دیا مگر... مصیبتیں انہیں نظرانداز نہ کر سکیں۔ وہاں کچھ تو ایسا تھا کہ ان کی سانسیں تھم گئی تھیں۔

اپنے مرکز سے ہٹنے والے چند شرارتی دوستوں کا ماجرا

"لو اب بھگتو۔" فریڈی نے گھبرا کر سوکھے درخت کے تنے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ہم راستہ بھٹک چکے ہیں۔ اب نئی مصیبت کا سامنا کرو۔" اس کے لہجے سے گھبراہٹ اور پریشانی صاف جھلک رہی تھی

فریڈی کی بات تشویشناک تھی لیکن لیوایہ پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ اس نے بڑے سکون سے اس کی بات سنی اور پھر اپنی بیس بال کیپ اتار کر بڑے آرام سے ماتھے سے پسینا صاف کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "بھٹکنے کا تو سوال ہی نہیں

پیدا ہوتا۔ ہم ہرگز راستہ نہیں بھول سکتے......" یہ کہہ کر اس نے غور سے اپنے ساتھی کو دیکھا۔ "گھبراؤ مت۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ بس! یہ یاد رکھو کہ ہم بوائے اسکاؤٹس ہیں۔"

"ہم بوائے اسکاؤٹس ہیں مگر اس وقت یہ کوئی نہیں جانتا کہ ہم کہاں ہیں حتیٰ کہ ہم خود بھی نہیں جانتے۔" فریڈی نے تڑپ کر کہا۔ "اس کا مطلب جانتے ہو؟" اس نے مطمئن نظر آنے والے لیوایر کی طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔" لیوایر نے بے فکری سے کندھے اچکا کر جواب دیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"مطلب صاف ہے کہ ہم راستہ بھٹک چکے ہیں اور اب دوسروں کے لیے لاپتا ہیں۔" فریڈی نے الفاظ چبا چبا کر کہا۔

"میرا خیال ہے کہ مجھے اپنا میگا فون استعمال کرنا چاہیے۔" لیوایر نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے تجویز دی۔

"اے...... ایک منٹ۔" فریڈی نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "تمہارا میگا فون...... کیا مطلب ہے تمہارا۔" وہ بدستور جھلایا ہوا تھا۔ "میں ٹیم لیڈر ہوں۔ تم نے سنا نہیں تھا کہ مسٹر آرتھر نے ہمیں ہدایت دی تھی کہ جب کسی مشکل میں پھنس جاؤ تو زیادہ اونچی آواز میں بات مت کرنا۔ ممکن ہے کوئی تمہیں مشکل میں تنہا پا کر نقصان پہنچانے کی کوشش کرے۔" یہ کہہ کر اس نے برا سا منہ بنایا۔ "اور اب تم کہہ رہے ہو کہ میرا میگا فون۔ مطلب کہ چیخ چیخ کر سب کو بتائیں کہ ہم راستہ بھٹک گئے ہیں۔" فریڈی کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"میرا خیال ہے کہ انہوں نے کبھی تمہیں بولتے ہوئے سنا نہیں ہوگا۔" اس بار لیوایر بھی ذرا غصے میں نظر آرہا تھا۔ "تم سرگوشی میں بھی بولو تو دس فٹ دور تک آواز سنائی دیتی ہے اور وہ بھی بالکل صاف...... سمجھے۔" یہ کہہ کر اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

"میں نے اپنی بات نہیں، مسٹر آرتھر کی بات دہرائی ہے۔"

"چھوڑو اس بات کو۔" لیوایر نے گردن موڑ کر فریڈی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ویسے اب ٹیم ہی نہیں رہی تو تم ٹیم لیڈر کس طرح ہوئے۔ اس لیے میں اپنے میگا فون کے استعمال کے بارے میں اب تمہاری ہدایات ماننے کا پابند بالکل نہیں رہا۔" اس کا لہجہ کاٹ دار تھا۔

"دیکھو لیوایر، یہ وقت بحث میں الجھنے کا نہیں ہے۔" اس بار فریڈی نے مصالحت آمیز رویہ اختیار کیا۔ "میں اس وقت مسٹر آرتھر سے بات کرنا چاہتا ہوں مگر فی الوقت یہ ممکن نظر نہیں آتا۔"

"یہ تو خطرناک صورتِ حال ہے۔" لیوایر کے چہرے پر اچانک پریشانی کے آثار نمودار ہوئے۔ "نہ تو انکل کو پتا ہے ہم اُن کی طرف جانے کے لیے نکلے ہیں اور نہ ہی اسکاؤٹ ماسٹر کو پتا ہے کہ ہم بغیر اجازت کہاں سے کدھر گئے ہیں۔"

"یہی بات مجھے پریشان کر رہی ہے۔ سب لا اور ہم لاپتا۔ اب ہمیں کسی نہ کسی طرح خود ان سے رابطہ کرنا پڑے گا۔" فریڈی نے جواب دیا اور سر گھما کر اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ "اب تو دن بھی ڈھلتا جا رہا ہے۔ بہتر ہے کہ رابطے کی کوشش کے ساتھ ساتھ یہاں رات بسر کرنے کے انتظامات بھی کر لیں۔ ہوسکتا ہے کہ رابطہ نہ ہو پائے۔" فریڈی نے پریشانی سے کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" لیوایر نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی...... اسے بھی وقت کی نزاکت کا احساس ہوگیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جن حالات میں وہ پھنس چکے ہیں، ان میں بہتر یہی ہے کہ فریڈی کی ہدایت پر عمل کر لیا جائے۔ ویسے وہ فریڈی کی ذہانت کا دل سے قائل تھا۔

فریڈی اور لیوایر ریورٹاؤن کاؤنٹی میں رہتے تھے۔ پہلی جماعت سے ایک ساتھ تعلیم حاصل کر رہے تھے دونوں نے اکٹھے ہی بوائے اسکاؤٹس میں شمولیت اختیار کی تھی۔ کیونکہ دونوں کو ہی ایڈونچر، گھومنے پھرنے اور نت نئی شرارتوں کا شوق تھا۔

بارہ دن کے لیے وہ دو روز پہلے ہی کاؤنٹی کے مضافات میں واقع پہاڑی علاقے میں موسم بہار کی تربیتی مشقوں میں لیے آئے تھے۔ مگر دوسرے ہی دن اسکاؤٹ ماسٹر نے انہیں بقیہ تربیت کے لیے معطل کر دیا۔ انہیں یہ سزا اس لیے ملی تھی کیمپ فائر کے دوران جب ان کے سب ساتھی قصے کہانیاں سنانے میں مصروف تھے، وہ دونوں سب کی نظروں سے بچاتے غائب ہوئے اور کچھ ہی دیر میں اپنی کارروائی مکمل کر کے لوٹ آئے مگر اگلی صبح ان کے ساتھی کے ذریعے ان کی تکلیف دہ شرارت کا راز فاش ہوگیا جس نے اتفاق سے ان دونوں کو اسکاؤٹ ماسٹر کے خیمے سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اسکاؤٹ ماسٹر کے سلیپنگ بیگ میں چیونٹیاں چھوڑ دینے کا جرم ثابت ہونے پر ان دونوں کو چار دن کے لیے بطور سزا سرگرمیوں میں حصہ لینے سے روک دیا گیا تھا۔ تربیتی مشقوں کے دوران، انہیں اپنے اپنے خیموں میں چپ چاپ بیٹھے رہنا تھا مگر یہ اُن سے کہاں ہوسکتا تھا۔ وہ سزا کے پہلے دن دو گھنٹے تک تو خیمے میں دُبکے بیٹھے رہے مگر پھر اُن دونوں کے تیز شرارتی دماغوں نے مل کر ایک نیا منصوبہ بنایا۔ وہ دونوں اپنے اپنے اسکاؤٹ تھیلوں کے ساتھ بہت ہی خاموشی سے کیمپ سائٹ سے فرار ہوگئے۔

ان کا منصوبہ تھا کہ وہ چند گھنٹوں کی پیدل مسافت طے کر کے اوپر پہاڑ پر گھر بنا کر رہنے والے اپنے بوڑھے انکل کے ہاں جائیں گے۔ دو دن عیش کریں گے اور پھر لوٹ کر کیمپ آجائیں گے۔ انہیں اس بات کی قطعی پرواہ نہیں تھی کہ اس پر کیا سزا ملے گی، فی الحال وہ بیتے وقت کو انجوائے کرنا چاہتے تھے۔

فریڈی کی عمر چودہ برس تھی۔ لیوایر بھی اس کا ہم عمر تھا۔ دونوں کے گھر بھی قریب تھے۔ اس لیے ان میں بچپن سے ہی بہت گہری دوستی تھی۔ وہ دونوں ہی بے حد شرارتی تھے۔ وہ اچھے دوست ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے بھی الجھتے رہتے تھے۔

صبح کے دس بجے وہ کیمپ سے فرار ہوئے تھے۔ اور اب شام ہو رہی تھی مگر اس کے باوجود وہ ویرانے میں بھٹک رہے تھے۔ فریڈی نے نکلتے ہوئے لیوایر کو یقین دلایا تھا کہ دو تین گھنٹے میں وہ انکل کے گھر میں ہوں گے مگر یہاں تو سارا دن گزر گیا تھا مگر انہیں کسی کا بھی گھر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ انہیں یقین ہو چکا تھا کہ وہ راستہ بھٹک چکے ہیں۔

اگرچہ وہ اس ویرانے میں تنہا تھے مگر اس کے باوجود انہوں نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ انہیں یقین تھا کہ وہ واپس اپنے کیمپ تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ دونوں اس بات پر غور کر رہے تھے کہ کس طرح وہ اپنے ساتھیوں تک پہنچنے کی کوشش کریں، کیسے ان تک اپنی گمشدگی کی اطلاع پہنچائیں۔ فریڈی اپنے مزاج کے برخلاف اس وقت بہت سنجیدہ نظر آرہا تھا مگر لیوایر حسبِ عادت پُرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا یہی سکون فریڈی کا غصہ بڑھا رہا تھا۔ اُن کی سزا پوری ہونے میں پورے چار دن باقی تھے۔ فریڈی کو یقین تھا کہ انہیں مزہ چکھانے کے لیے بھی کوئی انہیں تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اب وہ ویرانے میں بھٹکتے ہوئے یہ بھی سوچ رہے تھے کہ وہ سزا کے دوران بنا اجازت فرار ہوئے۔ لہٰذا اب انہیں مزید سزا بھگتنی پڑ سکتی ہے۔ وہ دونوں گھومنے پھرنے کے شوقین تھے اور اسکاؤٹ گروپ میں ان کا یہ مقصد پورا ہو جاتا تھا مگر اس بار ان دونوں نے جو ایڈونچر کیا، اس کا نتیجہ بہت برا تھا۔ نہ ان کے پاس موبائل فون تھے نہ واکی ٹاکی۔ صبح سے خالی پیٹ چلتے چلتے تھکن سے برا حال تھا۔ اب وہ ایک کٹے درخت کے سوکھے تنے پر بیٹھے سوچ رہے تھے کہ کیا کیا جائے۔

"میرا خیال ہے ہم میگا فون کے ذریعے اپنے ساتھیوں کو پکارتے ہیں۔ ممکن ہے اس طرح کوئی ہماری آواز سن لے اور مدد کو پہنچ جائے۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد فریڈی نے تھوک نگلتے ہوئے تجویز دی۔ "مگر میگا......"

"میگا، مائیکرو...... کچھ بھی ہو، کام چل جائے گا۔" لیوایر نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا اور اپنی پیٹھ پر لدے تھیلے کو اتارا۔ زپ کھول کر اندر سے بیٹری سے چلنے والا چھوٹا سا اسپیکر اور مائیکروفون نکالا۔ "یہ ہے میرے پاس...... میرا میگا فون۔" اس نے وہ چھوٹا سا آلہ فریڈی کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ "مگر مجھے یقین نہیں کہ ہم اس کے ذریعے اپنی بات بہت دور موجود لوگوں تک پہنچا پائیں گے۔ یہ زیادہ طاقتور نہیں ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اسے رہنے ہی دو۔" فریڈی نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ "مجھے ڈر ہے کہ اس طرح غلط لوگ بھی ہماری طرف متوجہ ہوسکتے ہیں۔"

"غلط لوگ، یہ کون ہوسکتے ہیں؟" لیوایر نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"چور، اُچکے، ڈاکو، بدمعاش......" فریڈی نے وضاحت کی۔ "تم خبریں نہیں سنتے ہو۔ اخبار میں نہیں پڑھا کہ جرائم پیشہ لوگ ویرانوں میں اپنے ٹھکانے بنا کر رہتے ہیں۔ اگر انہوں نے اسپیکر پر ہماری آواز سن لی اور یہاں تک پہنچ گئے تو پھر ایک اور نئی مصیبت ہمارے سامنے کھڑی ہوسکتی ہے۔" فریڈی دور کی کوڑی لایا تھا۔

"میں ٹی وی پر خبریں سنتا ہوں۔" لیوایر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ارے سنو، مجھے یاد آیا۔" اچانک اس نے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "تین چار دن پہلے ہمارے ٹاؤن میں بینک ڈکیتی بھی ہوئی تھی نا، میں نے وہ خبر ٹی وی پر سنی تھی۔"

"وہ تو میں نے بھی سنی تھی تو پھر کیا ہوا۔" فریڈی نے قطع کلامی کرتے ہوئے خشک لہجے میں کہا۔

"ٹی وی رپورٹر بتا رہا تھا کہ پولیس والے کہتے ہیں کہ بینک ڈکیتی میں ملوث ڈاکو جنوب کی سمت فرار ہوئے تھے...... پہاڑی چوٹیوں کی طرف۔" اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ہم جہاں ہیں، یہ وہی علاقہ ہے نا جس کے بارے میں رپورٹر کہہ رہا تھا۔"

"نہیں...... وہ جنوب کی بات کر رہا تھا اور یہ شمالی علاقہ ہے۔" فریڈی نے جواب دیا۔ "ویسے تمہارا مطلب کیا ہے؟"

لیوایر کی بات سن کر فریڈی نے سر اوپر اٹھایا اور سامنے

والے درخت کو تکتے ہوئے کہنے لگا۔ ”تم کہیں یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ وہ ڈاکو یہیں کہیں ہمارے قریب ہی موجود ہیں۔“ اس نے سر گھما کر چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس وقت دور دور تک خاموشی کا راج تھا۔ مگر لیوایر کی خدشے بھری بات سے وہ سمجھا کہ ان کے اردگرد خطرناک لوگ موجود ہیں۔

”یہ تو میں نہیں جانتا کہ یہاں قریب میں خطرناک ڈاکو موجود ہیں یا نہیں۔“ لیوایر نے سرد مہری سے جواب دیا۔ اور پھر سر گھما کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

”میرا خیال ہے کہ میگا فون کا استعمال رہنے ہی دیتے ہیں۔“ فریڈی نے اچانک اپنی رائے بدل لی اور پھر سرگوشی میں کہنے لگا۔ ”ویرانے میں کچھ بھی ممکن ہے۔ اگر تمہیں اس علاقے میں خطرناک لوگوں کی موجودگی کا ذرہ بھر بھی یقین ہے، تب تو میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ وہ ہماری یہاں موجودگی سے باخبر ہوں۔“ یہ کہنے کے بعد فریڈی ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا اور بڑے غور سے سامنے دیکھنے لگا۔ وہاں پائین کا کافی اونچا درخت کھڑا تھا۔ البتہ زمین پر درخت کاٹے جانے کے کئی نشانات موجود تھے۔ جہاں کبھی پائین کے درختوں کا جھنڈ رہا ہوگا، وہاں اب چٹیل میدان نظر آرہا تھا۔

”میں اس درخت پر چڑھ کر دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ ہمارے سوا یہاں کوئی اور تو موجود نہیں۔“ فریڈی نے انگلی سے اکلوتے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لیوایر سے کہا اور اپنی جیکٹ کی زپ کھول کر اسے اتارنے لگا۔ فریڈی نے بیگ سے رسی نکال کر کمر پر باندھی تاکہ آسانی سے درخت پر چڑھ سکے اور اگر خدانخواستہ نیچے گرے تو اس کی وجہ سے زمین پر گر کر ہڈیاں تڑوانے سے بچ جائے۔

”جب تک میں اوپر چڑھتا ہوں تم جلانے کے لیے ادھر اُدھر سے کچھ خشک ٹہنیاں جمع کرلو۔“ اس نے تیاری مکمل کرکے آگے بڑھنے سے پہلے لیوایر کو ہدایت دی۔

”جلانے کے لیے لکڑیاں؟“ یہ سن کر اس نے حیرت سے کہا۔

”ہاں..... شام ہورہی ہے اور اگر ہم اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے یہاں سے نہیں نکل سکے تو رات کو اسی جگہ کیمپ کریں گے۔“ فریڈی نے بھانپ لیا تھا کہ وہ اس کا منصوبہ سن کر پریشان ہوگیا تھا۔ اسی لیے اس نے وضاحت کی۔

”بہت اچھا۔“ یہ کہہ کر لیوایر نے چاروں طرف اس انداز سے دیکھا جیسے سب کچھ پہلی بار دیکھ رہا ہے۔ ”ہمارے ساتھی یقیناً ہمیں ڈھونڈ رہے ہوں گے، ممکن ہے وہ تمہیں نظر آجائیں۔“ کہنے کو تو اس نے کہہ دیا مگر اپنے کہے پر اسے خود یقین نہ تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ہوسکتا ہے ایسا نہ ہو۔ پھر بھی اس نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ برے وقت میں بری باتیں سوچنا اچھی بات نہیں۔ کٹھن وقت میں انسان کو امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔

”ویسے میرا خیال ہے کہ ہماری تلاش میں کوئی نہیں ہوگا۔“ فریڈی نے کچھ ضروری چیزیں بیگ سے نکال کر پتلون کی جیبوں میں ٹھونستے ہوئے کہا۔ ”وہ سب یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ ہم یہاں سے فرار ہوکر سیدھے انکل کے ہاں ہی جائیں گے۔ ہمارے کئی ساتھی انکل نیڈ اور ان کی فارمنگ کے بارے میں جانتے ہیں۔ ہماری غیر موجودگی سے کوئی پریشان نہیں ہونے والا..... وہ یہ سمجھیں گے کہ ہم رات کو انکل نیڈ کے ہاں رک گئے ہوں گے۔“

”لیکن میں جانتا ہوں کہ ان کے ہاں تو ایک فون تک نہیں۔“ فریڈی کی بات سن کر اس کا دل ٹوٹ گیا تھا مگر پھر بھی وہ امید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے حسب عادت پھر بحث شروع کردی۔ ”ہمارے ساتھیوں کو سوچنا چاہیے کہ جن لوگوں کے گھر میں فون تک نہیں، اگر وہاں رات بھر ٹھہرتے ہیں تو ہمارے لیے بستر تک کا انتظام نہیں ہو پائے گا تو پھر کیسے.....“

”میرے انکل کی حد تک تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ فریڈی نے گلے میں دوربین لٹکاتے ہوئے کہا۔ ”مگر یہ ضروری نہیں کہ انکل نیڈ کے بارے میں جو کچھ تم جانتے ہو وہ ہمارے سب ساتھیوں کے علم میں بھی ہو۔“ یہ کہہ کر وہ رکا اور پھر اسے دیکھ کر مسکرایا۔ ”میرا مشورہ مانو اور زیادہ خوش فہمی میں نہ رہو۔“

”یہ کس کی ہے۔“ لیوایر نے انگلی سے اس کے گلے میں لٹکی دوربین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”یہ میرے دادا کی ہے۔ وہ بحری جہاز پر کھڑے ہوکر اس کی مدد سے سمندر میں دور دور تک دیکھا کرتے تھے۔“ فریڈی نے فخر سے کہا۔

”کافی وزنی لگتی ہے۔“

”پانچ پونڈ وزن ہے اس کا مگر ہے بہت طاقتور۔“ فریڈی نے کہا۔ ”اس سے دور دور کی چیزیں بھی صاف نظر آتی ہیں۔“

”تم درخت پر چڑھنے جارہے ہو، اس کی ضرورت کس لیے؟“

”تاکہ اگر کچھ مطلب کی چیز نظر آئے تو اسے زیادہ قریب سے دیکھ سکوں۔“ فریڈی نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”ویسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارا میگا فون

بھی لے جارہا ہوں، ممکن ہے اس کی بھی ضرورت پڑ جائے۔" یہ کہہ کر اس نے بیٹری والا اسپیکر اور مائیکروفون اٹھا کر پھولی ہوئی جیب میں اڑسنے کی کوشش کی۔

"اوہ......" لیوایر نے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔

"دیکھو میں جارہا ہوں اور تم ان سب چیزوں کا خیال رکھنا۔ کچھ گم نہ ہونے پائے۔" اس نے درخت کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے اسے تاکید کی۔ اس کا تھیلا اور کچھ دیگر چیزیں اس سوکھے تنے کے قریب زمین پر رکھی ہوئی تھیں جس پر لیوایر پریشان چہرہ بنائے بیٹھا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد فریڈی اپنے ہاتھوں اور ٹانگوں کی مدد سے کسی ریچھ کی طرح درخت کا تنا پکڑ پکڑ کر دس فٹ اوپر تک پہنچ چکا تھا۔ اس وقت وہ سوچ رہا تھا کہ اسکاؤٹنگ میں درخت پر چڑھنے کی تربیت کتنے کام آتی ہے۔ اگر اس نے درخت پر چڑھنا نہ سیکھا ہوتا تو وہ دو چار فٹ اوپر بھی نہیں چڑھ سکتا تھا۔

دوسری طرف جلانے کے لیے خشک لکڑیاں جمع کرتے ہوئے اب لیوایر دل ہی دل میں فریڈی کی عقلمندی کا معترف ہورہا تھا۔ اب وہ بھی یہی سوچ رہا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ انہیں ڈھونڈنے کوئی نہ نکلے اور ایسے میں اگر انہیں اس ویرانے میں رات بسر کرنا پڑتی ہے تو لکڑیاں نہ ہونے کی صورت میں رات بھر الاؤ نہیں جل سکتا تھا۔ ایسے میں کوئی جنگلی درندہ انہیں نقصان پہنچا سکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے مزید تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے درختوں کی بکھری خشک ٹہنیوں کو جمع کرنا شروع کردیا۔ "ویسے یہ جگہ کیمپ سائٹ کے لیے بری نہیں۔" اس نے لکڑیاں چنتے چنتے خودکلامی کی۔ "کاش یہ میرا آئیڈیا ہوتا۔"

لیوایر سوچ رہا تھا کہ کاش اس وقت اُن کے پاس موبائل فون ہوتا مگر وہ جانتا تھا کہ اس کے والدین غریب ہیں اور چاہنے کے باوجود اس کی خواہش پوری نہیں کرسکتے مگر فریڈی کی بات دوسری تھی۔ اس کے والدین خوش حال تھے۔ انہوں نے اسے موبائل فون بھی لے کر دیا تھا مگر چند ہفتے پہلے انہوں نے تنگ آکر بطور سزا اس سے فون واپس لے لیا تھا۔ انہیں کئی بار شکایتیں موصول ہوئی تھیں کہ وہ لوگوں کو اپنے موبائل سے فون کرکے پریشان کرتا تھا۔ اب لیوایر سوچ رہا تھا کہ کاش فریڈی نے یہ غلطی نہ کی ہوتی تو وہ گھر والوں کو فون کرکے کب کی یہ اطلاع دے چکے ہوتے کہ وہ وادی میں راستہ بھٹک گئے ہیں۔

لکڑیاں جمع کرنے کے دوران وہ بار بار موبائل فون کی افادیت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ "کاش میں کسی سے موبائل ادھار مانگ لیتا۔" وہ بڑبڑایا مگر پھر یہ سوچ کر رہ گیا کہ وہ کس سے موبائل مانگتا۔ وہ سوچ رہا تھا اور دل ہی دل میں لعن طعن کیے جارہا تھا کہ اکیسویں صدی کے دور میں موبائل فون کے بغیر۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے اخباروں میں ہوتا ہے "آپ یقین کریں یا نہ کریں مگر یہ حقیقت ہے۔"

تقریباً دس منٹ کے اندر اندر لیوایر نے خشک ٹہنیو کا اچھا خاصا ڈھیر جمع کرلیا تھا۔ اس نے بیگ سے برش نکا کر کیمپ سائٹ کے لیے جگہ صاف کرنا شروع کی۔ ا دوران اچانک اُس کی نظر سامنے جھاڑیوں پر پڑ گئی۔ وہا سرخ رنگ کی کوئی شے آہستہ آہستہ ہل رہی تھی یا پھر لیوایر اسے ہلتا ہوا محسوس کیا تھا۔ اس نے زمین کی صفائی چھوڑ دی ا جھاڑیوں پر نظریں گاڑ دیں۔ وہ چند لمحے تک کچھ نہیں سمجھ کہ وہاں کیا ہے مگر اس کی چھٹی حس احساس دلا رہی تھی وہا کچھ خاص ہے، ویسے بھی انہیں ممکنہ طور پر اس جگہ پوری رات گزارنی تھی۔ کچھ سوچ کر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا وہ جھاڑیاں تقریباً دس بارہ فٹ کی دوری پر۔

لیوایر احتیاط سے چلتا ہوا وہاں تک پہنچا۔ وہ سرخ رنگ کا ایک بڑا سا رومال تھا، جس پر کوئی پاؤ ڈیڑھ پاؤ کے قریب جنگلی بیریاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک بڑا سا خاکی لفافہ تھا، جس کے اندر غالباً کچھ کھانے پینے کا سامان ہوگا۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ کر ان چیزوں کو دیکھنے لگا۔ وہ سرخ رومال کینوس کے ایک بڑے تھیلے کے اوپر رکھا ہوا اس طرح کا رومال تھا جسے شوقین مزاج لوگ بل دے کر گلے میں باندھا کرتے ہیں۔ جیسے ہی اس تھیلے پر لیوایر کی نظر پڑی، وہ چونک گیا۔ تھیلے پر نیلے رنگ میں موٹے موٹے حروف میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ وہ ایک نام تھا۔ جیسے ہی لیوایر نے اسے پڑھا، لحہ بھر میں خوف اور دہشت کی ملی جلی کیفیت کے باعث اس کے چہرے کا رنگ زرد ہوگیا اور حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔ "فرسٹ ویسٹرن بینک۔" لیوایر نے تھوک نگل کر گلے کو تر کیا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

"اے لڑکے......" اچانک اس کے عقب سے کسی نے کرخت آواز میں پکارا۔ لیوایر کا دم نکل گیا۔ اس نے بیٹھے بیٹھے گردن موڑی۔

"تم سے پوچھ رہا ہوں۔" ڈینم کی جیکٹ اور جینز میں لمبے قد کا درشت چہرہ شخص اس کے پیچھے کھڑا غصے سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ "تم یہاں کیا کررہے ہو؟" اس نے غصے سے کہا مگر لیوایر خاموش تھا۔ خوف کے مارے آواز ہی غائب ہوچکی تھی۔

وہاں دو آدمی کھڑے تھے۔ ایک تو جیکٹ اور ڈینم کی پینٹ والا، جو لیوایر سے سوال کررہا تھا۔ اس کی کمر سے بندھی بیلٹ سے پستول لٹک رہا تھا۔ دوسرا شخص تھا سرخ بالوں والا، جو اس کے ساتھ کھڑا لیوایر کو گھورے جارہا تھا۔ چوڑا ہیٹ سر پر اوڑھے ہوئے اُس خاموش شخص کے کندھے سے رائفل لٹک رہی تھی۔ اُس کے لمبے سرخ بال کندھے تک پھیلے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ اس نے ہاتھوں میں لکڑیوں کا ایک گٹھا اٹھا رکھا تھا۔ وہ بھی اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔

"میں...... میں، میں، وہ......" لیوایر نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر وہ کہہ نہ سکا۔ اسے بالکل سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اُن کے سوالوں کا کیا جواب دے۔ اسی دوران سرخ بالوں والے نے نظریں گھما کر کینوس کے تھیلے کی طرف دیکھا اور چند لمحوں تک اُس کا بغور جائزہ لینے کے بعد دوبارہ اُس پر نظریں گاڑ دیں۔

"ایک منٹ......" یہ کہتے ہوئے سرخ بالوں والے شخص نے لکڑیوں کا گٹھا زمین پر پھینکا۔ "تم اس پر نظر رکھو۔ میں دیکھتا ہوں کہیں اس کے ساتھ کوئی اور تو نہیں ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے کندھے سے رائفل اتار کر بولٹ چڑھایا اور جھاڑیوں کی طرف بڑھا۔ چند سیکنڈ تک وہ اِدھر اُدھر دیکھتا رہا اور پھر واپس اُن کی طرف آیا۔ "لگتا ہے یہ اکیلا ہی ہے۔" اس نے تیز نظروں سے ارد گرد دیکھتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔

دوسری طرف لیوایر کی حالت بہت بری تھی۔ وہ بری طرح سہم چکا تھا۔ وہ دل ہی دل میں سخت خوف زدہ تھا کہ بیٹھے بٹھائے اچانک کس مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ اس بیابان جنگل میں لے دے کر صرف فریڈی اس کا مونس و غمخوار تھا مگر اس وقت تو وہ بھی اس سے کافی دور تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسے میں کرے تو کیا۔ جس انداز میں وہ دونوں اجنبی اس کے سامنے آئے تھے، اس سے تو صاف ظاہر تھا کہ وہ اچھے آدمی تو ہرگز نہیں ہوسکتے تھے۔ یہ دونوں بدمعاش تو اب لیوایر کی جان کے لیے خطرہ بن چکے تھے۔

سرخ بالوں والا شخص رائفل ہاتھ میں تھامے کافی دیر تک تیز نظروں سے اطراف کا جائزہ لیتا۔ جب کئی منٹ گزر جانے کے باوجود وہ منہ سے کچھ نہ بولا تو اس کے ساتھی نے استفساریہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب ہم اس کا کیا کریں؟"

"بہت اچھا سوال کیا ہے تم نے۔" یہ کہتے ہوئے وہ

آگے بڑھا اور لیواپر کی بیس بال کیپ اتار کر جھاڑیوں کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ ٹوپی کو الٹا کیا اور رومال پر رکھی بیریوں سے مٹھی بھر کے کیپ میں ڈالیں۔

لیواپر بہ دستور گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔ خوف سے اس کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نہ جانے اب یہ دونوں بدمعاش اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔

"اٹھو..... اور اس درخت کے نیچے جا کر بیٹھ جاؤ۔" سرخ بالوں والے نے کافی دیر تک اسے گھورنے کے بعد انگلی سے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا۔ یہ پائن کا وہی درخت تھا، جس پر فریڈی چڑھا بیٹھا تھا۔ سرخ بالوں والے کا حکم سنتے ہی وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور مرے مرے قدموں سے میدان کے واحد درخت کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے اور آگے بڑھتے ہوئے وہ محسوس کر رہا تھا کہ بس اب گرا کہ تب گرا۔ خوف سے اس کی حالت غیر ہو چکی تھی۔

وہ چپ چاپ جا کر درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اس نے نظر گھما کر دیکھا۔ سامنے سوکھے تنے کے ساتھ دونوں کے تھیلے رکھے تھے۔ سامنے جھاڑیوں کے قریب کھڑا سرخ بالوں والا ساری جنگلی بیریوں کو اس کی بیس بال کیپ میں بھر کر اب اس بڑے رومال کو پھاڑ کر پٹیاں بنا رہا تھا۔ دوسرا شخص لیواپر پر نظریں رکھے کھڑا تھا۔ لیواپر کی آنکھیں نم تھیں بلکہ ایک دو آنسو لڑھک کر اس کے گالوں پر آ جاتے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب تک ان اجنبیوں کی نظریں ان کے تھیلے کی طرف نہیں پڑی تھیں، جو سوکھے تنے کے قریب رکھے تھے۔ اگر وہ ان دو تھیلوں کو دیکھ لیتے تو شک میں مبتلا ہونا یقینی تھا کہ ایک لڑکا اور دو تھیلے...... یہ سوچتے ہی اس کا خون خشک ہونے لگا۔ سرخ بالوں والے نے رومال کو پھاڑ کر لمبی لمبی پٹیاں بنالی تھیں اور اب انہیں کھینچ کر یقین کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ مضبوط ہیں یا نہیں۔ یہ دیکھتے ہوئے لیواپر سوچ رہا تھا کہ کچھ دیر بعد وہ اس کی جانب آئے گا اور اس کپڑے سے اس کے دونوں ہاتھ پاؤں باندھ دے گا۔ اس کے بعد..... لیواپر نے سر جھٹکا۔ وہ اس سے آگے مزید کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا۔

"دن ڈھلے تم سے ملاقات ہونے کا یقین تو نہیں تھا اجنبی لڑکے۔" سرخ بالوں والا اس کے قریب آیا اور یہ کہتے ہوئے اُس کے برابر بیٹھ گیا۔ "اب اگر اتفاق سے ملاقات ہو ہی گئی ہے تو ہمیں میزبانی کا موقع دو۔" اس نے خباثت بھری مسکراہٹ لبوں پہ سجائی اور اشارے سے ہاتھ آگے کرنے کو کہا۔ لیواپر نے دونوں ہاتھ خاموشی سے بڑھا دیے اور وہ اس کی کلائیاں باندھنے لگا۔ ہاتھ باندھنے کے بعد وہ کچھ دیر تک اس کے برابر بیٹھا رہا اور بیس بال کیپ میں بھری جنگلی بیریاں دانہ دانہ کر کے رہا۔ سامنے، جھاڑیوں کے پاس اس کا ساتھی آگ جلا کوشش کر رہا تھا۔ لیواپر دم سادھے بیٹھا رہا۔

"بیریاں کھاؤ گے؟" اجنبی نے اس سے پوچھا اور خباثت بھرا قہقہہ لگایا۔ لیواپر اور سہم گیا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ کیا فریڈی نے اسے دیکھ لیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے اپنے خیال کو خود ہی مسترد کر دیا۔ نے خود دیکھا تھا کہ فریڈی تیزی سے اوپر چڑھتا جا رہا جہاں پائن کی گھنی شاخیں تھیں۔ وہ عین درخت کے بیٹھا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ فریڈی اسے نیچے بیٹھا ہوا شاید دیکھ سکے مگر ایسا کب تک ہوگا۔ جلد یا بدیر اسے درخت نیچے اترنا تو ہوگا۔ ویسے بھی اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر فریڈی نیچے پیش آنے والے تمام تر واقعات سے بے خبر ہے اور اس بے خبری میں وہ نیچے اتر آیا تو پھر کیا، اس سوال کا کوئی جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

لیواپر کے متعلق اس کے دوستوں میں پہلے ہی یہ مشہور تھی کہ بہ ظاہر وہ جتنا عقلمند نظر آنے کی کوشش کرتا ہے، اس سے کہیں زیادہ بے وقوف ہے۔ جتنا وہ خود کو پرسکون مطمئن ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ اتنی ہی جلد گھبرا جانے والا لڑکا تھا۔ اب اسے صرف یہ لاحق تھی کہ اگر فریڈی نے اسے اجنبیوں کے ہتھے چڑھتا لیا ہے تو وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا اور ایسا نہ کر سکا تو...... سوچ سوچ کر اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ پہلے تو وہ صرف اس وادی میں راستہ بھٹکے تھے مگر اب تو وہ جرائم پیشہ لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ ایک دن میں تین مصیبتیں اُن کے نازل ہو گئی تھیں۔ پہلی مصیبت سزا تھی، دوسری مصیبت کی صورت میں انہوں نے خود مول لی اور اب یہ اُفتاد۔

سرخ بالوں والا کچھ دیر اس کے قریب بیٹھا رہا اور پھر بنا کچھ کہے، خاموشی سے اٹھا اور اپنے ساتھی کی طرف چل دیا۔

رات کا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ دن کی نسبت اس وقت فضا میں خنکی بڑھ چکی تھی۔ اُن دونوں بدمعاشوں نے آگ جلانے کے بعد خاکی لفافے سے کچھ نکالا اور کھانے لگے اگرچہ وہ اس سے تھوڑے فاصلے پر تھے، لیکن وہ خود کھا رہے، مروت میں بھی لیواپر سے نہ پوچھا۔ ایک تو بے چارہ دن بھر کا بھوکا، دوسرا گھنٹوں پیدل چلتا رہا۔ اب انہیں کھا

لیواپر کے پیٹ میں چوہے دوڑے تو منہ میں رال کا بھر آیا۔ وہ دونوں پیٹ پوجا سے فارغ ہوئے تو زمین پر لیٹ گئے۔ ڈینم کی جیکٹ والا تو سویا ہوا نظر آ رہا تھا مگر سرخ بالوں والا بہ دستور جاگ رہا تھا۔ اس کی نظریں اب لیواپر پر گڑی تھیں۔ ایک تو چاندنی رات اوپر سے آگ بھڑکتا الاؤ...... دودھیا چاندنی اور سرخ روشنی میں وہ دونوں ایک دوسرے کو صاف دیکھ سکتے تھے۔

فریڈی اب تک درخت کے اوپر چھپا بیٹھا تھا۔ لیواپر سوچ رہا تھا کہ اگر کاؤبوائے حلیے والے یہ دونوں بدمعاش جاگتے رہے، کبھی فریڈی نیچے اترے گا۔ اب تک اُس کے نیچے نہ آنے کے سبب لیواپر کو یقین ہو چکا تھا کہ وہ ان دونوں کو دیکھ چکا ہے۔ وہ جان گیا ہے کہ نیچے لیواپر کے سر پر مصیبت کا کیسا پہاڑ ٹوٹ گیا ہے۔ سرخ بالوں والا اب تک جاگ رہا تھا۔ اگر یہ رات بھر یونہی جاگتا رہا تو...... یہ خیال آتے ہی اس کا دل تیزی سے دھڑک کر رہ گیا۔

معاملہ لیواپر کی سمجھ میں آ چکا تھا۔ وہ دونوں ڈاکو تھے، انہوں نے چند روز پیشتر سٹیزن بینک لوٹا تھا۔ اگرچہ ٹی وی اور اخبارات کی خبر تھی کہ وہ دونوں ڈاکو ڈکیتی کے بعد جنوب کی سمت ویران پہاڑوں کی طرف فرار ہو گئے تھے۔ پولیس انہیں وہاں تلاش کر رہی تھی مگر یہ دونوں مزے سے اس کے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ لیواپر سوچ رہا تھا کہ کس طرح یہ اطلاع پولیس تک پہنچے گی کہ دو بوائے اسکاؤٹس راستہ بھٹک کر اب ان دو ڈاکوؤں کے قیدی بن چکے ہیں۔

اُس کے ہاتھ پاؤں بندھے تھے۔ وہ بھاگ نہیں سکتا تھا اور جب تک فریڈی آ کر اسے نجات نہ دلاتا، وہ یونہی بےبس پڑا رہتا مگر اس کے باوجود سرخ بالوں والے کو اس کے فرار کا ڈر تھا۔ تب ہی وہ اپنے ساتھی کی طرح خراٹے لینے کے بجائے جاگ کر پہرا دے رہا تھا۔ آگ بجھنے لگی تو وہ اٹھا اور اس میں مزید لکڑیاں جھونک دیں۔ الاؤ پھر تیزی سے دہکنے لگا۔ لیواپر سمجھ گیا کہ وہ اسے آسانی سے چھوڑنے والا نہیں۔ اس کا دماغ تیزی سے چل رہا تھا مگر اس مشکل سے نکلنے کی کوئی ترکیب اسے نہیں سوجھ رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر رات یونہی گزر گئی اور دن نکلنے پر وہ آگے بڑھے تو یا اسے قتل کر کے جائیں گے یا یونہی بندھا چھوڑ دیں گے اور اگر کوئی اتفاق سے یہاں آ گیا تو اس کے ہاتھ پاؤں کھول کر رہائی دلوا دے گا ورنہ مشکل ہے۔ اب ان حالات میں اس بیابان میں لے دے کر فریڈی ہی اس کی آخری امید کا روشن چراغ تھا۔

سرخ بالوں والا سر کے نیچے ہاتھ رکھے لیٹا تھا۔ اس کی نظریں بہ دستور لیواپر پر تھیں۔ آگ کسی حد تک بجھنے لگی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ اٹھا اور اِدھر اُدھر سے خشک لکڑیاں جمع کرنے لگا۔ جیسے ہی اس کی نگاہیں ہٹیں، لیواپر نے موقع غنیمت دیکھ کر سر اوپر اٹھایا اور منہ سے آواز نکالے بغیر اسے پیغام دیا۔ "اب ہم کیا کریں؟"

اسے یقین تھا کہ فریڈی اگر اسے دیکھ رہا ہے تو اس کے ہونٹوں کو دیکھ کر پیغام سمجھ چکا ہوگا۔ ویسے بھی چاندنی رات میں وہ اسے اچھی طرح دیکھ سکتا ہوگا۔ اس وقت وہ سوچ رہا تھا کہ اسکاؤٹس کی تربیت عملی زندگی میں کتنے کام کی چیز ہے۔ کچھ ہی لمحوں میں فریڈی کا جواب بھی اسے مل گیا۔ یہ ایک خشک پائن کون پر ربر بینڈ سے لپٹا کاغذ تھا جو کوئی آواز پیدا کیے بنا ہی اس کی جھولی میں آن گرا تھا۔ سرخ بالوں والا ڈاکو بہ دستور اس کی طرف پشت کیے زمین پر سے خشک لکڑیاں چن چن کر الاؤ کے لیے جمع کر رہا تھا۔ لیواپر نے سکھ کا سانس لیا کہ اس نے پائن کون گرتے نہیں دیکھا تھا۔

لیواپر کو فریڈی کے پیغام کی صورت پہلی بار سکھ کا سانس ملا تھا مگر گود میں رکھے اس کے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ اس نے سامنے نظر ڈالی۔ وہ بہ دستور اس کی طرف سے غافل تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے ربر بینڈ ہٹا کر کاغذ کھولا۔ نہایت گندی ہینڈ رائٹنگ میں اس نے پیغام دیا تھا "اس پر قابو پاؤ۔"

لیواپر سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ ان دونوں نے کئی بار ٹی وی پر وہ فلم اکٹھے بیٹھ کر دیکھی تھی جس میں درخت کے نیچے ایک ڈاکو بیٹھا ہوتا تھا اور درخت پر چھپا ہیرو اچانک اس پر چھلانگ لگا کر اسے قابو کر لیتا ہے۔ وہ سمجھا کہ فریڈی چاہتا ہے کہ کسی طرح وہ درخت کے نیچے آئے اور وہ فلمی سین دہرائے مگر یہ فلمی سچویشن نہیں، حقیقی زندگی تھی۔

فریڈی صرف چودہ برس کا لڑکا تھا، جس کا وزن بہ مشکل سو پونڈ ہوگا مگر یہ بدمعاش نہایت ہٹے کٹے تھے۔ یہ دونوں مل کر بھی ان میں سے کسی ایک پر قابو نہیں پا سکتے تھے۔ اوپر سے اُن دونوں کے پاس اسلحہ بھی تھا۔ ایسے میں لیواپر کو محسوس ہوا کہ فریڈی جو سوچ رہا ہے، شاید وہ قابلِ عمل نہ ہو۔ اس نے بندھے ہاتھوں سے کاغذ کا ٹکڑا منہ میں ڈالا اور کچھ دیر چبانے کے بعد نگل گیا۔

لیواپر۔۔ ایک بار پھر پریشانی کا شکار تھا۔ وہ سوچ رہا تھا اگر فریڈی نے ایسا کیا تو اس کے بعد کیا ہوگا۔ آیا وہ کامیاب ہو جائیں گے یا کوئی اور نئی اُفتاد سر پر آن پڑے

گی۔ اب وہ تہہ دل سے دعا مانگ رہا تھا کہ اے خدا ان بدمعاشوں کے چنگل سے نکلنے کی کوئی سبیل پیدا کردے۔ اس کے ساتھ ساتھ ذہن میں اسکاؤٹس ماسٹر کی ہر وہ ترکیب دہرائے جارہا تھا جو مشکل وقت سے نکلنے کے لیے انہیں سکھائی گئی تھی مگر لاکھ کوشش کے باوجود اسے اب تک ایسی کوئی ترکیب یاد نہیں آئی جو درپیش صورتِ حال میں کارگر ثابت ہوسکتی تھی۔

آگ دوبارہ دہک اٹھی تھی اور سرخ بالوں والے کی نظریں ایک بار پھر اس پر جم گئی تھیں۔ اچانک اس کے ذہن میں بجلی کا کوندا سا لپکا۔ ”کب تک یونہی......“ لیوایر نے دل ہی دل میں کہا۔ ”ابھی۔ یا پھر کبھی نہیں۔“ اچانک اس کے دل میں حالات سے مقابلہ کرنے کی تڑپ انگڑائی لے کر بیدار ہوئی۔ یہ فیصلہ کرتے ہی اسے اپنے جسم میں نئی توانائی محسوس ہوئی تھی۔

”اے مسٹر......“ لیوایر نے سرخ بالوں والے کو پکارا۔ ”ذرا ادھر آؤ۔“

یہ سن کر سرخ بالوں والا کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ ”کیا بات ہے؟“ اس نے درشت لہجے میں کہا۔ لیوایر نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کئی روز سے چین کی نیند نہیں سوسکا ہوگا۔ البتہ اس کے ساتھی کے خراٹوں کی آوازیں سنسان فضا میں گونج رہی تھیں۔

”یہاں چیونٹیاں ہیں۔“ اس نے کسمساتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کئی جگہ کاٹ چکی ہیں پلیز......“

”تو پھر......“ اس نے بات کاٹتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔ ”یہاں ہر جگہ چیونٹیاں ہیں تو میں کیا کروں۔“ اس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے بیزاری سے کہا۔ لگ رہا تھا کہ اسے یہ گفتگو کم از کم اس وقت بالکل پسند نہیں آئی تھی جب کہ اس کی پلکیں نیند سے بوجھل ہورہی تھیں۔ ویسے بھی اس کے جاگنے کا بنیادی سبب تو یہی مصیبت تھی، جس سے وہ اس وقت بات کررہا تھا۔

”اب کیا کہوں، کیا کروں؟“ لیوایر نے دل ہی دل میں خود سے سوال کیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس شخص کو عین درخت کے نیچے تک تو لے آیا ہے مگر اب تک نہ تو فریڈی نے اس پر چھلانگ لگائی ہے اور نہ ہی اسے کوئی ایسی بات سوجھ رہی تھی جس سے وہ تھکے ماندے اس بدمعاش کو مزید کچھ دیر تک یہاں درخت کے نیچے، فریڈی کے ممکنہ نشانے پر روک سکتا۔

اچانک سرخ بالوں والا زمین پر بیٹھ گیا اور غور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ”مجھے تو یہاں چیونٹیاں نظر نہیں آ رہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ کھڑا ہوا۔ ”اے! تم کیا کرنا چاہ رہے ہو؟“ اس نے ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔

یہ سنتے ہی لیوایر کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ واقعی وہاں دور دور چیونٹیوں کا نام ونشان نہیں تھا۔ یہ تو اس نے ترنگ لڑائی تھی۔ ”اب کیا کہوں اسے۔“ اس نے دل ہی دل میں خود سے سوال کیا۔ اس کا چہرہ خوف میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے بنا سوچے سمجھے نظریں اوپر اٹھائیں اور درخت کی شاخوں کی طرف دیکھا۔ اگرچہ اس نے پل بھر کے لیے اوپر کی طرف دیکھا تھا مگر سرخ بالوں والا تاڑ گیا۔ اس نے فوراً بیلٹ اُڑسا پستول نکالا اور لیوایر کے سر کی طرف تانتے ہوئے اوپر کی جانب دیکھا۔ وہ عین درخت کے نیچے تھا۔ اس کے چہرے سے تشویش کے آثار صاف جھلک رہے تھے۔ اپنے سر کو اس کی پستول کی زد پہ دیکھ کر لیوایر کے اوسان خطا ہوچکے تھے۔ وہ سخت سراسیمگی کے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا۔

اچانک صورتِ حال نے پلٹا کھایا۔ اوپر سے پانچ کلو وزنی، فریڈی کے کپتان دادا کی بھاری بھرکم دوربین اس کے سر پر گری۔ ایک تو بھاری دوربین، دوسرے وہ کافی اوپر سے نیچے گری تو اس کی شدت میں اور اضافہ ہوگیا۔ جیسے ہی وہ سرخ بالوں والے کے سر پر گری، وہ چکرایا اور پھر گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ بنا آواز کے زمین پر ڈھیر ہوچکا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر ایک طرف پڑا تھا۔ اسی دوران اسے اپنے پیچھے درخت کے تنے پر کپڑوں کی سرسراہٹ اور کسی کے اترنے کی آواز محسوس ہوئی اور پھر ہلکے سے دھپ کی آواز آئی۔ لمحہ بھر بعد فریڈی اپنے سوئس شکاری چاقو سے اس کے ہاتھ پیر پر بندھی بندشیں کاٹ رہا تھا۔ سرخ بالوں والا بے حس وحرکت اس کے عین سامنے پڑا ہوا تھا۔ جیسے ہی فریڈی کے ہاتھ پاؤں بندشوں سے آزاد ہوئے، دونوں نے مل کر سب سے پہلے اس بدمعاش کا پستول قبضے میں کیا۔ ہاتھ پاؤں باندھے اور پھر اسے گھسیٹ کر درخت کے دوسری طرف اندھیرے میں لے گئے۔ دونوں نے اس کے ہاتھ پاؤں اتنی مضبوطی سے باندھے تھے کہ وہ لاکھ کوشش کرے تب بھی نہ کھول پائے۔ وہ بہ دستور بے ہوش تھا۔

”ایک مصیبت تو کم ہوئی۔“ فریڈی اس کام سے فارغ ہوتے ہی کھڑا ہوا اور لیوایر سے کہا۔

”آدھی مصیبت...... آدھی وہ پڑی سورہی ہے۔“ لیوایر نے انگلی سے اس سمت اشارہ کیا، جہاں سے خراٹوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

”اسے دفع کرو اور جتنی جلد ہوسکے، یہاں سے بھاگ لو۔“ فریڈی نے سرگوشی میں ہدایت دی۔

اُن دونوں نے جلدی جلدی اپنے تھیلے پیٹھ پر لادے مگر یہ ان کی بدقسمتی تھی کہ اگلے ہی قدم پر فریڈی کو زوردار ٹھوکر لگی اور نیچے گر گیا۔ اس کے تھیلے کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے گرنے اور تھیلے سے چیزوں کے نکل کر باہر گرنے سے آواز ہوئی اور نہ جانے کیسے اس سوئے ہوئے شخص کی آنکھ اس ہلکی سی آواز سے کھل گئی۔ اس نے جلدی سے کروٹ لے کر ادھر دیکھا اور اپنے ساتھی کو نہ پاکر اس نے ہاتھ بڑھا کر رائفل اٹھائی اور ایک دم اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ بے یقینی سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ پورے چاند کی چاندنی تھی۔ لیوایر کو یقین ہوگیا کہ اب پھر پکڑے گئے مگر اچانک گہرے سیاہ بادلوں کی ایک ٹکڑی نے چاند کو ڈھانپ لیا۔ وہ منظر جو لمحہ بھر پہلے دودھیا روشنی میں نہایا ہوا تھا، پل بھر کے اندر مکمل تاریکی میں گم ہوگیا۔ اب فضا میں آگ کے بجھتے الاؤ کی ٹمٹماہٹ ہی باقی تھی۔ ان دونوں کو یہ غیبی مدد تھی۔

خوف کے مارے لیوایر کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ لمحہ بھر میں چاند بادلوں کی اوٹ سے نکل آئے گا اور پھر ان کے دیکھے اور پکڑے جانے کا خطرہ یقینی ہوگا۔

لیوایر اپنے تخیل میں دیکھ رہا تھا کہ اس میدان میں وہ ایک بدمعاش اپنے ساتھی کی مدد سے ان پر گولیاں چلا رہا تھا۔ وہ دونوں خاک وخون میں لت پت تڑپ رہے تھے۔ اور پھر کئی روز بعد ٹی وی نیوز کاسٹر لوگوں کو بتارہی تھی:

”یوک کنٹری ہلز کی وادی سے دو نوجوان بوائے اسکاؤٹس کی مسخ شدہ لاشیں ملی ہیں جو چند روز قبل اپنے گروپ سے لاپتا ہوگئے تھے۔“

وہ دل ہی دل میں خدا سے گناہوں کی معافی مانگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، اس کے دونوں گال آنسوؤں سے تر تھے۔ وہ زمین پر بے حس وحرکت اوندھے منہ اس انداز سے لیٹا تھا کہ جیسے وہ اذیت سے گزر رہے ہیں۔

”اے جم......“ اچانک اندھیرے میں تیز آواز گونجی۔ ”یہ یہاں کیا ہورہا ہے، کہاں ہو تم؟“ اس کی آواز سے خوف جھلک رہا تھا۔ فریڈی اور لیوایر کا اندازہ درست تھا۔ اپنے ساتھی کو نہ پاکر وہ سخت پریشان تھا۔ ایک تو وہ گہری نیند سے

> **”انقلاب“**
>
> ایک عورت نے اپنے شرابی شوہر کو سدھارنے کے لیے ڈانٹ پھٹکار اور لڑائی جھگڑے کا طریقہ چھوڑ کر محبت کا حربہ آزمانے کی ٹھانی۔ رات گئے اس کا شوہر نشے میں دھت گھر آیا تو اس نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔ اس کے جوتے موزے اتارے، اسے کھانا کھلایا۔ آرام سے بستر پر لٹادیا اور اس سے پیار بھری باتیں کرنے لگی پھر اس نے شوہر سے کہا۔ ”پیارے اب تم سوجاؤ۔“
>
> شوہر گھبرا کر بولا۔ ”یہاں اور میں؟ اگر میں ساری رات یہاں گزار کر گھر پہنچا تو میری بیوی مجھے کچا چبا جائے گی۔“
>
> مرسلہ: راشد صغیر، لاہور

اٹھا تھا، اوپر سے اس کا ساتھی غائب تھا۔ ایسے میں انسان کے اوسان کو نارمل ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ فریڈی سوچ رہا تھا کہ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کرے، انہیں اس کی بے خبری اور غنودگی کا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔

”اے جم...... کہاں ہو تم؟“ چند لمحوں تک جب اسے اپنے ساتھی کا کوئی جواب نہ ملا تو اس نے پھر چلا کر کہا۔ اس بار اس کی آواز میں خوف بھی صاف محسوس کیا جاسکتا تھا۔

چاند بہ دستور گھنے سیاہ بادلوں کی اوٹ میں تھا۔ ہر طرف تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔ اس کی پکار کے جواب میں بھی صرف خاموشی تھی۔ اچانک ایک زوردار آواز گونجی۔ ”اپنے ہتھیار پھینک دو، تم ہمارے نشانے پر ہو۔“

”کون ہو تم؟“ اس کی خوف زدہ آواز سنائی دی۔

”بکواس مت کرو، اپنے ہتھیار پھینک دو ورنہ......“

”گولی مت چلانا......“ اس بدمعاش کی گھگھیائی ہوئی آواز گونجی۔

”تو جلدی کرو، ہتھیار نیچے پھینک دو۔“ گرج دار اور بارعب آواز گونجی۔ ”جلدی کرو نہیں تو......“

”پھینکتا ہوں۔“ اس نے کہا تو سہی مگر رائفل بہ دستور اس کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ خوف زدہ تھا مگر پھر بھی رائفل نہیں پھینکنا چاہتا تھا۔

”جلدی کرو نہیں تو تمہاری کھوپڑی ہمارے نشانے پر ہے۔“

"مجھے گولی نہیں مار سکتے، تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔" اچانک اس کی آواز گونجی۔ "اس اندھیرے میں......"

"بکواس بند کرو، ہم نے انفراریڈ چشمہ پہنا ہوا ہے اور تمہاری پیشانی کے بیچوں بیچ ہم گولی مار سکتے ہیں۔"

"خدا کے لیے گولی نہ چلانا۔" وہ چلایا۔ اس بار اس کی آواز سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ موت کے خوف سے سہم گیا ہے۔ اس کی آواز بھی لڑکھڑا رہی تھی۔ اس نے رائفل اپنے قریب ہی پھینکی اور دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ "میں نے ہتھیار پھینک دیا ہے، خدا کے لیے......"

"نہیں چلائیں گے گولی۔" بارعب آواز نے قطع کلامی کی اور پھر ایک زوردار... قہقہہ سنائی دیا۔ "اب گھٹنوں کے بل بیٹھ جاؤ، ہاتھ پیچھے کرو اور گردن جھکا کر آنکھیں بند کرلو۔"

"اوکے۔" وہ گردن جھکا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ "جیسا تم کہو گے میں ویسا ہی کروں گا مگر خدا کے لیے، پلیز ...... مجھے مارنا مت۔" اس نے کانپتی آواز میں اپنی زندگی کی بھیک مانگی۔

"تم میرے ساتھی کے نشانے پر ہو۔" رعب دار آواز نے اب اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "چپ چاپ بیٹھے، اپنے ہاتھ پاؤں بندھوا لو ورنہ..."

"اوکے۔"

ایک منٹ کے اندر اندر اس کی بھی مشکیں کسی جا چکی تھیں۔

دوسری طرف لیوایر زمین پر اوندھے منہ پڑا، خدا سے معافیاں مانگ رہا تھا۔ خاموشی میں گونجنے والی بھاری اور رعب دار آواز نے اس کے جسم سے جان ہی نکال دی تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ ان دو ڈاکوؤں کے دشمن بھی پہنچ چکے ہیں۔ جیسے ہی چاند بادلوں کی اوٹ سے نکلے گا، وہ بھی دیکھ لیے جائیں گے۔ پھر گولیاں چلیں گی اور قصہ ختم۔

"اے لیوایر اٹھو۔" اچانک کسی نے سرگوشی کی۔ یہ فریڈی کی آواز تھی۔

"کیا ہوا؟" اس نے بھرائی آواز میں بے یقینی سے پوچھا۔ "فریڈی ہم مرنے والے ہیں۔"

"نہیں...... ہم بچ گئے ہیں۔" اس نے جوش سے کہا۔ یہ سنتے ہی لیوایر جھٹ سے اٹھ بیٹھا۔

"کیا ہوا؟"

"میں نے اس کو بھی باندھ دیا۔" فریڈی نے کہا۔ "مجھے موبائل فون مل گیا۔" فریڈی نے خوشی سے کہا۔

"کیا......" یہ سنتے ہی وہ چلا اٹھا۔

اسی دوران بادلوں کی اوٹ سے چاند باہر نکل آیا۔ ماحول ایک بار پھر روشن ہو گیا۔

"اٹھو، اسے بھی اس کے ساتھی کے برابر لٹا دیں۔"

"چلو۔" یہ سنتے ہی لیوایر جوش سے کھڑا ہو گیا۔

جب وہ دونوں اسے گھسیٹ کر درخت کے تنے کے ساتھ لٹا رہے تھے تو اس کے سرخ بالوں والے ساتھی جم کو بھی ہوش میں آ گیا تھا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے کرب ناک آواز میں کہا۔ لگ رہا تھا کہ اس کے سر پر لگی چوٹ کافی درد کر رہی تھی۔ ایک دو بار وہ تکلیف سے کراہا بھی تھا۔

"وہی، جو تم نے میرے ساتھ کیا تھا۔" لیوایر نے فخر سے جواب دیا۔

"میں نے تو اس کے ہاتھ پاؤں باندھتے ہی تلاشی لے ڈالی تھی۔" فریڈی نے کھڑے کھڑے موبائل سے پولیس کی مددگار سروس کا نمبر ملاتے ہوئے کہا۔ "اب پولیس آئے گی، یہ تو جائیں گے ہی، ہم دونوں بھی یہاں سے نکل لیں گے۔"

"کیا تم پولیس کو فون کر رہے ہو۔" یہ سنتے ہی ان دونوں نے بیک آواز کہا۔ "تم ایسا نہ کرو، پلیز...... ہمیں چھوڑ دو۔ ہم تمہیں انعام میں بہت پیسے دیں گے۔" جم نے پیشکش کی۔

"انعام تو ہمیں لینا ہی ہے مگر پولیس سے۔" لیوایر نے سینہ تان کر کہا۔

"کیسا انعام......؟" یہ سنتے ہی فریڈی نے چونک کر کہا۔

"یہی وہ ڈاکو ہیں جنہوں نے سٹیزن بینک لوٹا تھا اور لوٹی گئی رقم کا تھیلا وہاں رکھا ہے۔"

"اوہ میرے خدا۔" فریڈی نے چونک کر کہا۔ "میں تو انہیں سیدھا سادا بدمعاش سمجھا تھا۔" یہ کہہ کر وہ لیوایر کی طرف مڑا۔ "اور تم بھی یہ بات مجھے اب بتا رہے ہو۔" اس کے لہجے سے ناراضی عیاں تھی۔

"بتانے کا موقع ہی کہاں مل سکا تھا۔"

"ارے ہاں......" اس نے اپنی غلطی مانتے ہوئے کہا۔

"اب چھوڑو، جلدی سے فون ملاؤ، سخت بھوک لگ رہی ہے۔" لیوایر نے کہا۔ "پولیس آئے تو ہماری بھی جان چھوٹے۔"

"جان نہیں چھوٹتی۔" فریڈی نے شرارت سے کہا۔ "رات بھر پولیس کی شاباشیاں، ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات والوں کو انٹرویو بھی دینا ہے۔" وہ کان سے موبائل لگائے ہوئے تھا۔

"ہیلو......"

جیسے ہی مددگار پولیس سروس کا فون اٹینڈ ہوا، فریڈی نے پورا قصہ انہیں سنا دیا۔

"ہم نے تمہاری کال سے لوکیشن ٹریس کرلی ہے۔" دوسری جانب موجود پولیس افسر نے گرمجوشی سے کہا۔ "تم آگ کا الاؤ روشن کرلو، تاکہ ہم تمہیں آسانی سے تلاش کر سکیں۔ بس ہم پندرہ بیس منٹ میں پہنچتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے مزید ہدایات دیں۔

"اوکے سر! ہم انتظار کر رہے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے فریڈی نے فون بند کر کے جیب میں اڑس لیا۔ "میں ان دونوں پر نظر رکھتا ہوں، تم الاؤ روشن کر دو۔" اس نے لیوایر کو ہدایت دی۔

"اب بھی وقت ہے......" جم نے کراہتے ہوئے کہا۔

"خاموش......" فریڈی نے ڈانٹا۔

"تم دو بالشت کے لڑکے......" اس نے نفرت سے زمین پر تھوکتے ہوئے کہا۔ "چھوڑوں گا نہیں۔"

"نہیں چھوڑنا۔" فریڈی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مگر یہ یاد رکھنا کہ ہم سے نمٹنے کے لیے پولیس تمہیں اتنی جلدی چھوڑنے والی نہیں۔"

"تم...... کمینے لڑکے۔"

"بکواس نہ کرو۔" اس دوران لیوایر بھی پہنچ گیا تھا۔ اس نے بھی یہ سن لیا اور ڈانٹ کر کہا۔ "تم جانتے ہو، ہم صرف دو لڑکے نہیں، دو بہادر بوائے اسکاؤٹس ہیں۔" اس نے سینہ تان کر کہا۔

"ارے فریڈی...... وہ اتنی بھاری آواز کس کی تھی۔" لیوایر اچانک اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"میری۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"مگر...... تم نے کیسے کیا؟"

"تمہارا مائیکرو......" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ "سوری لیو، وہ سب تمہارے میگافون کا کمال تھا۔"

"دیکھا، کتنا کام آیا وہ۔" یہ سن کر اس کا سینہ فخر سے اور پھول گیا۔ "تم خوامخواہ اس کی ہنسی اڑا رہے تھے۔"

"اب نہیں اڑاؤں گا۔" فریڈی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "مجھے سو فیصد یقین ہے ہمارے اس کارنامے کے عوض اسکاؤٹ ماسٹر ہماری باقی سزا معاف کر دیں گے۔"

"واقعی...... ایسا ہوا تو ہمیں کیمپنگ کے بقایا دنوں میں کارکردگی دکھانے کا موقع مل جائے گا۔" لیوایر نے کہا۔

اسی دوران انہیں پولیس گاڑیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ کچھ ہی دیر بعد تین پولیس گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس سے وہ جگہ روشن ہو رہی تھی۔ پولیس کے ساتھ ان کے اسکاؤٹ ماسٹر سر آرتھر بھی آئے تھے۔

"سر آپ......" انہیں دیکھتے ہی دونوں نے ہم زبان ہو کر کہا۔

"مجھے دوپہر کو ہی تمہارے فرار کا پتا چل گیا تھا۔" انہوں نے ہلکا سا مسکرا کر کہا۔ "میں پولیس والوں کے ساتھ مل کر تمہاری تلاش کر رہا تھا کہ اسی دوران تمہارا فون بھی آ گیا۔"

"اوہ...... سوری سر!"

"مگر کس لیے؟"

"وہ ہم نے آپ کے سلیپنگ بیگ میں چیونٹیاں......"

"فی الحال بھول جاؤ اس بات کو۔" انہوں نے پیار سے ڈانٹ کر کہا۔

تھوڑی دیر میں دونوں ڈاکوؤں کو ہتھکڑیاں لگا کر پولیس گاڑی میں بٹھا دیا گیا تھا۔ "اگر آپ ان بچوں کے بیانات کل کیمپ سائٹ پر آ کر لے لیں تو کوئی حرج تو نہیں ہوگا۔" روانہ ہوتے وقت اسکاؤٹ ماسٹر نے شیرف سے کہا۔ "دراصل یہ صبح سے بھوکے ہیں۔ رات کافی ہو گئی ہے اور کل صبح سے انہیں دوبارہ کیمپ ٹریننگ جوائن کرنا ہے۔"

"کوئی بات نہیں، ایسا ہی کرلیں گے۔" شیرف نے ہنستے ہوئے کہا۔ "البتہ مجھے یقین ہے کہ ٹی وی اور اخبارات والے رات کو ہی آپ کے کیمپ پہنچ جائیں گے۔"

"انہیں میں سنبھال لوں گا۔" اسکاؤٹ ماسٹر نے مسکرا کر کہا۔

"جیسی آپ کی مرضی۔" شیرف بھی مسکرا دیا۔ "ویسے یہ ہیں دونوں بڑے بہادر۔" اس نے ہاتھ سے دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میری تربیت ملی ہے انہیں۔"

"مگر ہماری سزا......" فریڈی نے پوچھا۔

"اس کارنامے کے بعد معاف کر دی ہے۔" اسکاؤٹ ماسٹر نے کہا۔ "مگر آئندہ کوئی شرارت کرتے وقت یاد رکھنا کہ معافی کا اس جیسا سنہری موقع بار بار نہیں ملتا۔"

فریڈی اور لیوایر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے ہوئے اور دونوں نے شرارتی مسکراہٹ لبوں پہ سجاتے ہوئے کہا۔ "اوکے سر!"

✤

سیدھی بات

ملک صفدر حیات

بعض اوقات سامنے کی بات انسان کو اتنا الجھا دیتی ہے کہ اپنی کم علمی کا احساس شرمندہ کر جاتا ہے... اور کبھی ایک نکتے سے پوری داستان ورق ورق بن کر کھل جاتی ہے۔ وہ بھی وہم و گمان کی بندگلیوں میں دوڑتے پھر رہے تھے کہ اچانک نئی سمت پر قدم پڑتے ہی تمام چہرے سامنے آگئے۔ بات تو سیدھی سی ہے مگر سمجھ مشکل سے آتی ہے، پہلے مجرم جرم سے دوستی کرتا ہے پھر جرم حق دوستی ادا کرتے ہوئے اسے خود سے جدا نہیں ہونے دیتا... اسی فارمولے پر غور کرتے ہوئے جب ملک صاحب کی تفتیش کا دائرہ تنگ ہوا تو مجرم کے گلے میں پھندا بن کر اٹک گیا۔

...رہبروں کے روپ میں رہزنوں کی سنگ دلی کا قصہ

میں ایک روز حسبِ معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو اپنے کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے، میں نے برآمدے میں ایک پریشان حال عورت کو بینچ پر بیٹھے دیکھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اسے صبح صبح کون سی مصیبت پڑ گئی ہے جو تھانے میں بیٹھی ہوئی ہے۔ میں اس سے کوئی بات کیے بغیر اپنے کمرے میں پہنچا اور ایک کانسٹیبل کو اپنے پاس بلا لیا۔

"جی ملک صاحب!" کانسٹیبل وحید نے مجھے سلیوٹ کیا پھر بولا۔ "حکم......!"

"یہ باہر برآمدے میں کون عورت بیٹھی ہوئی ہے؟" میں نے کانسٹیبل سے پوچھا۔ "اس کے ساتھ کیا پریشانی ہے؟"

"ملک صاحب! یہ کافی دیر سے یہاں بیٹھی آپ کا انتظار کر رہی ہے۔" کانسٹیبل نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ "بڑی دکھی لگتی ہے جناب......!"

"وہی تو میں بھی پوچھ رہا ہوں۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "آخر وہ کون سا دکھ ہے جو اسے یہاں کھینچ لایا ہے؟"

"میں نے بہت کریدنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ کچھ بتانے کو تیار نہیں۔" کانسٹیبل وحید نے جواب دیا۔ "کہہ رہی ہے، اپنی مشکل تھانے دار صاحب ہی کو بتائے گی۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اسے اندر بھیجتا ہوں۔"

"اس نیک کام کے لیے بھلا اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔ "اسے فوراً بھیجو میرے پاس......"

کانسٹیبل "جی ملک صاحب!" کہہ کر چلا گیا اور اگلے ہی لمحے وہ مذکورہ عورت کے ساتھ میرے سامنے حاضر تھا۔ میں نے آنکھ کے اشارے سے وحید کو واپس جانے کے لیے کہا پھر اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"بیٹھ جاؤ بی بی......!"

وہ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد سامنے کرسی پر بیٹھ گئی اور امداد طلب نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے گہری نگاہ سے اس کا جائزہ لیا اور پوچھا۔

"بی بی! تمہارا نام کیا ہے؟"

"جی...... صغریٰ......!"

"صغریٰ بی بی!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ "مجھے بتایا گیا ہے کہ تم بہت پریشان ہو، آخر کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟"

"تھانے دار صاحب!" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں اپنے جوان بیٹے کی وجہ سے سخت پریشان ہوں۔"

”اس پریشانی کا سبب کیا ہے.....“ میں نے پوچھا۔ ”اور یہ بتاؤ کہ تمہارے جوان جہان بیٹے کا نام کیا ہے؟“

”یعقوب..... میرے بیٹے کا نام یعقوب ہے جی۔“ وہ غم زدہ لہجے میں بولی۔ ”وہ کل سے غائب ہے۔“

”غائب ہے..... کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”یعقوب کل صبح موضع کمال پور گیا تھا اور کہا تھا کہ رات کو واپس آجائے گا۔ کل کا سورج غروب ہو گیا اور اب تو آج کا نیا سورج بھی طلوع ہو چکا ہے لیکن وہ ابھی تک واپس نہیں آیا.....“ لمحاتی توقف کر کے اس نے اپنی سانس کو ہموار کیا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”میں نے ساری رات جاگ کر اس کی راہ دیکھی ہے اور صبح ہی صبح آپ کے پاس آگئی ہوں۔ اب آپ ہی میرے بیٹے کی تلاش کے سلسلے میں کچھ کریں.....“

”وہ کمال پور کیا لینے گیا تھا؟“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”ادھر کمال پور میں میری بڑی بہن رہتی ہے جس کا نام کبریٰ ہے۔“ صغریٰ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”میں نے یعقوب کے ہاتھ کبریٰ کے لیے کچھ رقم بھجوائی تھی۔“

”کتنی رقم؟“ میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

”پندرہ سو روپے!“ صغریٰ نے بتایا۔ ”اور ساتھ ہی میں نے اسے تاکید کر دی تھی کہ ہر قیمت پر وہ سورج غروب ہونے سے پہلے گھر واپس آجائے لیکن ابھی تک.....“ بولتے بولتے اس کی آواز رندھ گئی۔

پندرہ سو یعنی ڈیڑھ ہزار روپے آج کل کے حساب سے ایک معمولی سی رقم ہے لیکن جس زمانے کی یہ کہانی ہے اس دور میں پندرہ سو روپے بہت تگڑی رقم تصور کی جاتی تھی۔ ایک عام آدمی کی تنخواہ ساٹھ سے اسی یا زیادہ سے زیادہ سو روپے ہوا کرتی تھی اور بیس پچیس روپے میں کسی متوسط فیملی کے گھر میں مہینے بھر کا راشن بھرا جا سکتا تھا۔ اگر آج کل کے تناظر میں حساب کرنے بیٹھیں تو ایک محتاط انداز کے مطابق یہ رقم لگ بھگ ڈیڑھ لاکھ روپے بنتی تھی۔

میں نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ ”زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں صغریٰ بی بی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہارا بیٹا رات کو اپنی خالہ کے گھر ہی میں رک گیا ہو اور دوپہر تک واپس آجائے۔“

”یعقوب نے آج تک میری بات رد نہیں کی۔“ وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ ”میں نے جو کہہ دیا، بس کہہ دیا۔ وہ میرے کہے سے ایک سوت بھی اِدھر اُدھر نہیں ہلتا۔ میں نے بڑی سختی سے اسے تاکید کی تھی کہ چاہے کچھ بھی ہو اور کتنی بھی دیر ہو جائے، وہ رات کو ضرور واپس آجائے۔ برکت علی نے مرتے وقت یعقوب کو ایک ہی نصیحت کی تھی کہ اسے میری بات ماننا ہے۔“ وہ تھوڑی دیر کے لیے تھمی، دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں خشک کرنے کی کوشش کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”اگر ہر طرف خیریت رہتی تو یعقوب رات میں ضرور واپس آجاتا۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میرے بیٹے کے ساتھ کوئی نہ کوئی.....!“

وہ بولتے بولتے ایک مرتبہ پھر خاموش ہو گئی۔ غم کے بوجھ نے اس کی آواز کو گلے میں پھنسا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے اس کی دلجوئی کرنے کی خاطر ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

”صغریٰ بی بی! میری بات دھیان سے سنو.....!“

وہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھایا۔

”مجھے امید ہے کہ تمہارا بیٹا دوپہر تک واپس آجائے گا۔“

”اور اگر وہ دوپہر تک بھی نہ لوٹا تو.....؟“ وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔

صغریٰ بی بی کی آنکھوں میں مجسم استفسار نے مجھے دل گرفتہ کر دیا۔ وہ ان لمحات میں مجروح ممتا کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”اگر وہ دوپہر تک واپس نہ آیا تو پھر میں اپنے دو جوانوں کو ادھر کمال پور تمہارے بیٹے کی تلاش کے لیے بھیجوں گا۔ شام سے پہلے پہلے تمہیں کوئی اچھی خبر سننے کو ملے گی۔“

”اللہ آپ کا بھلا کرے تھانے دار صاحب۔“ وہ دعائیہ انداز میں بولی۔

”اللہ تو سب کا بھلا ہی کرتا ہے.....“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم بھی فکر نہ کرو، انشاء اللہ! یعقوب خیر خیریت سے واپس آجائے گا۔“

میں نے تسلی تشفی دے کر اسے رخصت کر دیا۔

میرے حساب سے یہ کوئی تشویش ناک بات نہیں تھی کہ یعقوب رات کو واپس نہیں آیا تھا۔ صغریٰ کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ یعقوب اس کا اکلوتا بیٹا تھا اور اس کی عمر اٹھارہ، انیس سال کے درمیان تھی۔ وہ کوئی ننھا بچہ نہیں تھا کہ کہیں کھو جاتا۔ یعقوب کا باپ برکت علی چند سال پہلے حادثاتی موت کا شکار ہو کر دوسری دنیا میں جا چکا تھا، کھیتوں میں کام کرتے ہوئے ایک زہریلے سانپ نے اسے ڈس لیا اور یہ قول شخصے، وہ پانی

مانگے بغیر ہی اس جہان سے اس جہان چلا گیا تھا۔ اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ برکت علی نے اپنی اکلوتی اولاد کی بڑی مناسب تربیت کی تھی اور یعقوب اپنے والدین کا فرماں بردار تھا لیکن اس فرماں برداری کی روشنی میں یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یعقوب پچھلی رات کسی بھی قیمت پر اپنی خالہ کے گھر نہیں رک سکتا تھا۔

صغریٰ ایک ماں تھی اور یعقوب اس کی اکلوتی اولاد۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ بیوہ بھی تھی۔ اس قسم کی مصیبت شناس عورتوں کی حساسیت بہت بڑھ جاتی ہے اور وہ چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی بہت سنگین محسوس کرنے لگتی ہیں۔ اکلوتی اولاد ان کے جینے مرنے کا بہانہ بلکہ زندگی اور موت کی وجہ بن جاتی ہے جیسا کہ یعقوب کے معاملے میں صغریٰ کے ساتھ ہو رہا تھا۔ شوہر کی وفات کے بعد چونکہ یعقوب ہی اس کی سوچ کا مرکز بن گیا تھا۔ اس لیے وہ اس کی خاطر مختلف نوعیت کے اندیشوں اور وسوسوں میں گھری ہوئی تھی اور یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ ایک بیوہ ماں کو اپنی اکلوتی جوان اولاد کے لیے ایسے ہی جذباتی اور فکر انگیز انداز میں سوچنا چاہیے تھا۔

میں نے صغریٰ کو رخصت کرنے سے پہلے اس کی بہن کبریٰ کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل کر لی تھیں مثلاً یہ کہ وہ صغریٰ سے عمر میں بڑی تھی اور اس کی ماشاء اللہ! سات اولادیں تھیں۔ چار بیٹیاں، پھر ان سے چھوٹے تین بیٹے تھے۔ کبریٰ کا شوہر جان محمد ادھر کمال پور میں کریانے کی ایک چھوٹی سی دکان چلاتا تھا جو بس ”ایویں“ سی چلتی تھی۔ جان محمد اس دکان سے جو کچھ بھی کماتا تھا، وہ نو افراد کا پیٹ پالنے کے لیے کافی نہیں تھا لہٰذا تنگ دستی اور عسرت نے ان کا گھر دیکھ رکھا تھا۔ بس، وہ لوگ جیسے تیسے گزارہ کر رہے تھے۔

کبریٰ کی نسبت اللہ تعالیٰ نے صغریٰ کو خوب نواز رکھا تھا۔ اچھے وقتوں میں اس کی شادی ایک چھوٹے زمیں دار سے ہو گئی تھی۔ برکت علی نامی اس زمیندار نے اپنی زندگی ہی میں صغریٰ کو بھی زمینداری سکھا دی تھی۔ وہ ان تمام زمینی اور موسمی رازوں سے واقف ہو گئی تھی جو زراعت کے شعبے کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسی لیے برکت علی کی وفات کے بعد اسے ان مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا جیسا کہ عموماً عورتوں کو پیش آتی ہیں۔ برکت علی مرتے وقت اپنے لواحقین کے لیے ایک شاندار گھر اور پچیس ایکڑ زرعی، نہری زمین چھوڑ گیا تھا۔ گھر میں وہ تمام زرعی آلات بھی موجود تھے جو کسی بھی زمیندار کی انتہائی ضرورت ہوتے ہیں۔ جب سے صغریٰ کھیت مزدوروں کی مدد سے اپنی نگرانی اور یعقوب کے تعاون سے کاشتکاری کے امور بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے رہی تھی۔

ان تمام تر معاشی ومعاشرتی حالات میں صغریٰ کو اپنی بڑی بہن کبریٰ کا بڑا خیال تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ان لوگوں کا گزارہ بڑی مشکل سے ہوتا تھا اسی لیے وہ ان کی مدد کرتی رہتی تھی۔ اسی مقصد کی خاطر اس نے کل یعقوب کو پندرہ سو روپے دے کر کمال پور بھیجا تھا۔ کبریٰ کی بڑی بیٹی رضیہ کی شادی ہونے والی تھی۔ یہ پندرہ سو روپے رضیہ کے جہیز اور شادی کے دیگر اخراجات کے لیے تھے۔

کبریٰ اور صغریٰ کے درمیان بہن کے رشتے کے علاوہ بھی ایک اور رشتہ استوار ہونے جا رہا تھا۔ رضیہ سے چھوٹی بہن سلمیٰ کو صغریٰ نے اپنے بیٹے یعقوب کے لیے منتخب کر لیا تھا اور اس رشتے کے حوالے سے ان کی باقاعدہ منگنی بھی ہو چکی تھی۔ شادی کا ارادہ ڈیڑھ، دو سال بعد کا تھا۔ سلمیٰ اس وقت محض سترہ سال کی تھی، یعنی وہ یعقوب سے لگ بھگ دو سال چھوٹی تھی۔

اس دہری رشتے داری کی روشنی میں بھی میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ عین ممکن ہے، یعقوب اپنی ہونے والی سسرال ہی میں رات گزارنے کے لیے رک گیا ہو، منگیتر کے گھر کے چکر لگانے اور وہاں قیام کرنے کے لیے تو انسان خواہ مخواہ بھی بہانے ڈھونڈتا ہے۔

◊◊◊

جس زمانے کا یہ واقعہ ہے، ان دنوں میں ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے ایک چھوٹے سے قصبے شرف آباد کے تھانے میں تعینات تھا۔ شرف آباد سے کمال پور لگ بھگ چھ میل کے فاصلے پر مغرب میں واقع تھا۔ ایک چھوٹی نہر شرقاً غرباً بہتے ہوئے ان دونوں گاؤں کو بیچ کرتی تھی یعنی یہ دونوں گاؤں مذکورہ نہر کے کنارے پر واقع تھے۔ یہ نہر مشرق سے مغرب کی سمت رواں دواں تھی اور اسی نہر کے ساتھ ساتھ ایک کچا راستہ بھی بنا ہوا تھا جہاں تانگے، بیل گاڑیاں اور گھڑ سوار حسب ضرورت محو سفر رہتے تھے۔ ان دونوں گاؤں کو آپس میں ملانے کے لیے یہ واحد کچا راستہ تھا ورنہ ایک چھوٹا سا جنگل ان کے بیچ ادھر سے ادھر پھیلا نظر آتا تھا۔

میں جیسے ہی دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوا، صغریٰ ایک مرتبہ پھر تھانے میں آن موجود ہوئی۔ اب کی بار وہ پہلے سے بھی زیادہ متفکر اور پریشان دکھائی دیتی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات کوئی اچھی خبر نہیں سنا رہے تھے تاہم میں

نے فوراً اسے اپنے پاس بلالیا۔

"صغریٰ بی بی! تمہارا بیٹا گھر آگیا؟"

"اگر یعقوب واپس آگیا ہوتا تو میں آپ کو اتنی ٹوٹی پھوٹی حالت میں نہ نظر آتی۔" وہ دکھی لہجے میں بولی۔ "تھانے دار صاحب...... آپ کچھ کرتے ہیں یا میں کمال پور جانے کی تیاری کروں؟"

یعقوب کی عدم واپسی نے اب تو مجھے بھی تشویش میں ڈال دیا تھا۔ میں نے ایک لمحہ سوچا اور پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہم یہ دونوں کام کریں گے۔"

"دونوں کام!" وہ الجھن زدہ نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "کون سے دونوں کام تھانے دار صاحب......؟"

"کام نمبر ایک، تمہیں ضرور کمال پور جانا چاہیے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "کام نمبر دو، میں تمہارے بیٹے کی تلاش کے لیے اپنے بندوں کو دوڑاتا ہوں اور...... یہ دونوں کام ایک وقت میں اور ایک ساتھ ہی ہوں گے......!"

"ایک ساتھ کیسے؟" وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "تم میرے دو آدمیوں کے ساتھ تانگے میں بیٹھ کرابھی اوراسی وقت کمال پور جاؤ گی۔ سب سے پہلے یعقوب کو تمہاری بہن کبریٰ کے گھر میں چیک کیا جائے گا۔ مجھے امید ہے، وہ ادھر ہی مل جائے گا یا راستے میں بھی اس سے ملاقات ہوسکتی ہے۔" میں نے تھوڑا توقف کرکے سوچتی ہوئی نظر سے اسے دیکھا پھر پوچھا۔

"تمہارا بیٹا کس چیز پر بیٹھ کر کمال پور گیا تھا؟"

"وہ گھوڑے پر سوار ہوکر کبریٰ کے گھر گیا تھا۔" اس نے بتایا۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "تم اپنے گھر پہنچ کر تیاری کرو۔ تھوڑی دیر میں، میں اپنے بندوں کو ادھر ہی بھیجتا ہوں۔"

"اور اگر وہ......" وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی۔ "کبریٰ کے گھر میں بھی نہ ہوا تو......؟"

"حوصلہ کرو صغریٰ......!" میں نے اس کی دل شکستگی کو سہارا دیتے ہوئے کہا۔ "اللہ بہتری کرے گا۔ تم ہمت نہ ہارو، یعقوب کو کچھ نہیں ہوگا۔"

وہ چند لمحات تک یقین اور بے یقینی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ مجھے تکتی رہی پھر ایک افسردہ سی سانس خارج کرنے کے بعد رخصت ہوگئی۔

صغریٰ کے جانے کے بعد میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اب تو مجھے بھی تشویش ہونے لگی تھی۔ اگر واقعی یعقوب کمال پور میں نہ ہوتا تو پھر پریشانی والی بات تھی۔ میں نے اے ایس آئی شوکت علی اور کانسٹیبل خالد کو اپنے پاس بلایا، انہیں حالات کی سنگینی سے آگاہ کیا پھر ضروری ہدایات کے ساتھ صغریٰ کی جانب روانہ کردیا۔ پروگرام کے مطابق، وہ صغریٰ کے ساتھ تانگے میں بیٹھ کر کمال پور جاتے۔

دوپہر سے سہ پہر ہوئی، سہ پہر سے شام اور شام سے رات لیکن کمال پور جانے والوں میں سے کوئی بھی واپس نہیں آیا۔ اس زمانے میں موبائل فون تو ہوا نہیں کرتے تھے اور نہ ہی گاؤں دیہات کی سطح پر لینڈ لائن فون کا وجود نظر آتا تھا۔ اگر اس قسم کی کوئی سہولت میسر ہوتی تو میں فوراً ادھر کی خبر لے لیتا۔ سو، سوائے انتظار کے میرے پاس کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

خدا خدا کرکے یہ انتظار اختتام پذیر ہوا اور رات کے آٹھ بجے مجھے اپنے عملے کے افراد کی شکل نظر آئی۔ خالد اور شوکت علی نہ صرف ناکام ونامراد واپس آگئے تھے بلکہ وہ اپنے ساتھ ایک بری خبر بھی لائے تھے۔

وہ گھوڑا جس پر سوار ہوکر یعقوب کمال پور گیا تھا اس کی لاش جنگل کے اندرونی حصے سے مل گئی تھی۔

میں ابھی تک انہی کی واپسی کے انتظار میں بیٹھا تھا ورنہ عام دنوں میں، میں اس وقت تک تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر میں جاچکا ہوتا تھا۔ میں نے ان دونوں کو فوراً اپنے کمرے میں بلالیا اور استفساریہ نظر سے انہیں دیکھنے لگا۔

اے ایس آئی شوکت علی نے کہا۔ "ملک صاحب! یہ تو کہانی ہی الٹ گئی ہے۔ ہمیں اس گھوڑے کی لاش جنگل کے اندرونی حصے میں پڑی ملی ہے، جس پر صغریٰ کا بیٹا سوار ہوکر یہاں سے کمال پور کی جانب روانہ ہوا تھا اور پھر کمال پور سے واپس اس طرف آیا تھا۔"

"اور صغریٰ کا جوان بیٹا یعقوب؟"

"اس کی کچھ خبر نہیں ملی۔" شوکت علی گمبھیر لہجے میں بولا۔ "رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا، لہٰذا ہم نے جنگل کے اندر مزید آگے جانے کی کوشش نہیں کی۔ تلاش کا باقی کام کل صبح ہی ہوسکے گا۔"

"گھوڑے کی لاش جنگل کے کس حصے میں پائی گئی ہے؟" میں نے تشویش بھرے انداز میں دریافت کیا۔

"وہ مقام کمال پور کے نزدیک اور شرف آباد سے

تھوڑے دور واقع ہے۔" شوکت علی نے جواب دیا۔ "بس یوں سمجھیں کہ جائے وقوعہ کمال پور کے مشرق میں زیادہ سے زیادہ ایک میل کے فاصلے پر ہوگا یعنی جب یعقوب کمال پور سے واپس شرف آباد کی طرف آرہا تھا تو اس کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آگیا ہوگا۔ گھوڑے کی لاش کو دیکھ کر تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے سوار کے ساتھ بھی کوئی اچھا سلوک نہیں ہوا ہوگا۔"

"تم کس بنا پر اتنے وثوق سے کہہ رہے ہو کہ جس گھوڑے کی لاش تمہیں جنگل میں پڑی ملی ہے وہ صغریٰ کے بیٹے یعقوب ہی سے تعلق رکھتا تھا؟" میں نے اپنے ذہن میں سر اٹھانے والے خدشات میں سے ایک کی تسکین کی خاطر پوچھ لیا۔

اس مرتبہ کانسٹیبل خالد نے جواب دیا۔ "ملک صاحب! ہم راستے بھر صغریٰ سے کرید کرید کر سوال پوچھتے رہے تھے اور اس گفتگو کے دوران میں بارہا یعقوب کے گھوڑے کا بھی ذکر آیا تھا۔ صغریٰ نے مذکورہ گھوڑے کی جو نشانیاں ہمیں بتائی تھیں، وہ مردہ گھوڑا ان پر پورا اترتا ہے۔"

"کمال پور میں ہم نے صغریٰ کی بہن اور بہنوئی سے بھی پوچھ گچھ کی ہے جناب!" اے ایس آئی شوکت علی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "جہاں ان لوگوں نے یہ بتایا ہے کہ یعقوب کل سہ پہر میں کمال پور سے شرف آباد کے لیے روانہ ہوگیا تھا، وہیں اس کے گھوڑے کے بارے میں بھی ہمیں تفصیل فراہم کردی ہے اور میں نے جس مردہ گھوڑے کا تذکرہ کیا ہے وہ سو فیصد وہی گھوڑا ہے جناب......!"

"خشا......!" میرا تجسس بڑھتا جارہا تھا۔ "اس گھوڑے کی ایسی کون سی نشانی بتائی گئی ہے جو یہ تصدیق کرتی ہے کہ وہی یعقوب کا گھوڑا ہے...... بلکہ یعقوب کا گھوڑا تھا، اب تو وہ گھوڑا لاش کی صورت اختیار کرچکا ہے اور اس کا مالک یعقوب بھی لاپتا ہے؟"

"جناب" دیگر چھوٹی بڑی نشانیوں کے علاوہ اس گھوڑے کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ اس کی گردن میں بڑے بڑے سفید سوتیوں (منکوں) کی ایک مالا پڑی ہوئی ہے جو اس کی گردن کے ساتھ بالکل فٹ ہے۔"

"ہوں......!" میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر پوچھا۔ "کیا صغریٰ کے بہن بہنوئی نے اس امر کی تصدیق کی ہے کہ یعقوب کل سہ پہر میں، ان کے گھر سے واپسی کے لیے روانہ ہوگیا تھا؟"

"جی ہاں" شوکت علی اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ان کے گھر کا تو ہر چھوٹا بڑا اس بات کی تصدیق کررہا ہے کہ یعقوب کل وہاں سے واپس آگیا تھا۔"

"یعقوب کل سہ پہر میں کمال پور سے شرف آباد کی طرف روانہ ہوگیا تھا۔" میں نے پُرخیال انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "یہ خبر سن کر صغریٰ پر کیا اثر ہوا ہے؟"

"اس کی حالت پہلے ہی کچھ اچھی نہیں تھی ملک صاحب۔" وہ افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "جب اسے پتا چلا کہ یعقوب کل ہی وہاں سے روانہ ہوگیا تھا تو وہ غش کھا کر گر پڑی۔ اس کو ہوش میں لانے میں کوئی ایک گھنٹا لگ گیا تھا۔ وہ ہوش میں تو آگئی لیکن اس کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں۔"

"کیا تم لوگ صغریٰ کو اس کے گھر پہنچانے کے بعد تھانے آئے ہو؟" میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔

"نہیں جناب۔" اے ایس آئی نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "وہ تو ادھر کمال پور ہی میں ہے۔"

"اوہ......!" میں ایک گہری سانس خارج کرکے رہ گیا۔

"جناب! اسے کبریٰ اور جان محمد نے ضد کرکے اپنے پاس روک لیا ہے۔" شوکت علی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اس کی ذہنی حالت کو دیکھتے ہوئے جان محمد نے اسے شرف آباد آنے کی اجازت نہیں دی اور ہمیں یہ ہدایت کی ہے کہ ہم جلد از جلد یعقوب کا سراغ لگانے کی کوشش کریں۔ جب تک اس کا اتا پتا نہیں مل جاتا، وہ لوگ صغریٰ کو اپنے پاس ہی سنبھال کر رکھیں گے۔"

"یہ بھی اچھی بات ہے۔" میں نے کہا پھر پوچھا۔ "کیا مردہ گھوڑے کے بارے میں صغریٰ یا کبریٰ اینڈ کمپنی کو خبر ہوگئی ہے؟"

"نہیں جناب، بالکل نہیں۔" شوکت نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی اور بتایا۔ "ہم جنگل سے سیدھے ادھر ہی آئے ہیں۔"

"یہ تم لوگوں نے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔" میں نے سراہنے والے انداز میں باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ "صغریٰ پر تو پہلے ہی قیامت ٹوٹی ہوئی ہے۔ اگر اسے اپنے گم شدہ بیٹے کے گھوڑے کا حشر پتا چل جاتا تو غم کی شدت سے اس کا دماغ بھی الٹ سکتا تھا۔"

"ملک صاحب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" اے ایس آئی تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "صغریٰ کی نازک حالت کے پیش نظر ہی تو ہم نے اسے گھوڑے کی موت کی خبر نہیں دی اور چپ چاپ آپ کے

پاس چلے آئے ہیں۔''

''میں نے اس کارنامے پر انہیں شاباشی دی پھر ایک اہم سوال کیا۔ ''صغریٰ نے کل صبح ایک تگڑی رقم کے ساتھ یعقوب کو کمال پور کی جانب روانہ کیا تھا۔ کیا وہ رقم کبریٰ تک بہ خیر و عافیت پہنچ گئی ہے؟''

جی ہاں، میں نے کبریٰ سے اس امر کی تصدیق کر لی ہے ملک صاحب۔'' اے ایس آئی نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''وہ رقم بڑے محفوظ انداز میں کل ہی کبریٰ کو مل گئی تھی۔''

میں نے ایک مطمئن اور پُرسکون سانس لی پھر شوکت علی سے دریافت کیا۔ ''تم نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ یعقوب کے گھوڑے کو کس طرح موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے؟''

''گھوڑے کا سارا بدن خصوصاً ٹانگیں اور گردن لہولہان ہو رہی تھی۔'' اے ایس آئی ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔ ''دن کی روشنی بہت کم رہ گئی تھی تاہم میرا اندازہ ہے کہ گھوڑے پر کسی تیز دھار آلے مثلاً کلہاڑی وغیرہ سے پے در پے خطرناک اور مہلک وار کیے گئے ہیں۔''

''اس طرز کی وحشیانہ دشمنی گھوڑے سے تو کسی شخص کی ہو نہیں سکتی۔'' میں نے تشویش میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''قاتل جو کوئی بھی تھا یا تھے وہ یقیناً یعقوب کے تعاقب میں ہوں گے۔ پتا نہیں، ان بدبختوں نے بے چارے یعقوب کا کیا حشر نشر کیا ہوگا......؟''

''میں بھی اس نوجوان کے لیے بہت پریشان ہوں ملک صاحب۔'' شوکت علی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''گھوڑے کی لاش جنگل کے اندرونی حصے میں پڑی ملی ہے اور یہ حصہ نہر والے کچے راستے سے زیادہ فاصلے پر نہیں۔ میرے اندازے کے مطابق کمال پور سے شرف آباد کی طرف آتے ہوئے کوئی دشمن اس کے پیچھے لگ گیا تھا پھر وہ اسے گھوڑے سمیت گھیر گھار کر جنگل کے اندر لے گیا اور وہاں اس پر حملہ کر دیا۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ دشمن گھیر کر اسے جنگل میں نہ لے گیا ہو بلکہ وہ دشمن سے بچنے کے لیے نہر والا کچا راستہ چھوڑ کر جنگل کے اندر گھس گیا ہو۔'' میں نے خیال آرائی کی۔ ''لیکن ہر دو صورت میں یہ سوال اپنی جگہ موجود ہے کہ یعقوب کہاں غائب ہے۔ اگر اس کی سواری کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے تو دشمن نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے......؟''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب!'' اے ایس آئی تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یعقوب گمشدگی کو لگ بھگ چوبیس گھنٹے گزر چکے ہیں۔ اگر اب تک اس کی کوئی خیر خبر سامنے نہیں آئی تو ہمیں بڑے افسوس کے ساتھ یہی سوچنا پڑے گا کہ اس بے چارے کے ساتھ کوئی سنگین حادثہ پیش آ چکا ہے۔''

میں معنی خیز انداز میں سر کو اثباتی جنبش دے کر رہ گیا۔

ہمارے درمیان مزید بیس پچیس منٹ تک یعقوب کی گمشدگی اور اس کے گھوڑے کی ہلاکت کے بارے میں بات ہوتی رہی پھر میں نے اٹھنے سے پہلے اے ایس آئی کو کچھ اس انداز میں ہدایات دیں۔

''شوکت علی! کل صبح تم میرے ساتھ، یعقوب کی تلاش میں جنگل کی طرف جاؤ گے۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب!'' وہ فرماں برداری سے بولا۔ ''جو آپ کا حکم۔''

''اور ہم یہاں سے علی الصباح نکل جائیں گے تاکہ جب ہم جائے وقوعہ پر پہنچیں تو سورج نکل رہا ہو، اس طرح ہمیں کام کرنے کے لیے زیادہ وقت مل جائے گا۔ آج کل ویسے بھی دن کافی چھوٹا ہو چکا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم رات ہی میں ضروری تیاری کر لینا۔ سواری کے لیے تانگے کا بندوبست کرو گے یا......؟''

''میرے خیال میں گھوڑے زیادہ مناسب رہیں گے۔'' میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ بول اٹھا۔ ''جائے وقوعہ تک رسائی کے لیے تو تانگا ٹھیک ہے لیکن یعقوب کی تلاش میں پتا نہیں، ہمیں جنگل کی کس گہرائی تک جانا پڑے۔ گھنے درختوں کے بیچوں بیچ تانگے کو آگے بڑھانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ثابت ہوگا۔''

''میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں شوکت علی!'' میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم نے بڑی عاقلانہ تجویز دی ہے۔ اب ہم صبح ہی ملیں گے۔ جیسے ہی سپیدۂ سحر نمودار ہوگا، ہم تھانے سے روانہ ہو جائیں گے۔''

میں مطمئن ہو کر تھانے سے نکلا اور اپنے سرکاری کوارٹر میں آ گیا۔ میں نے خلاف معمول رات کا کھانا تھوڑی تاخیر سے کھایا پھر عشا کی نماز ادا کرنے کے بعد سونے کے لیے لیٹ گیا۔ اس رات مجھے آسانی سے نیند نہ آئی۔ بستر پر لیٹے لیٹے میں کافی دیر تک یعقوب کے بارے ہی میں سوچتا رہا۔

ایک بات تو طے تھی کہ کسی شخص کو یعقوب کے گھوڑے سے قطعاً کوئی دشمنی نہیں ہو سکتی تھی۔ قاتل جو کوئی بھی تھا وہ یقیناً یعقوب کے تعاقب میں تھا اور اس نے یعقوب کو زیر کرنے کے

لیے اس پر بھی خطرناک حملہ کیا ہوگا۔ جب وہ بے زبان گھوڑا حملوں کی تاب نہ لاتے ہوئے لقمۂ اجل بن گیا تھا تو یہ سوچنا سراسر حماقت ہوتی کہ یعقوب کہیں صحیح سلامت بیٹھا ہوگا۔

گھوڑے کی موت اور یعقوب کے ساتھ پیش آنے والی مبہم صورت حالات کے اسباب پر غور کریں تو اس رقم کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا جو صغریٰ بی بی نے اپنی بڑی بہن کبریٰ بی بی کے لیے بھیجی تھی۔ کوئی بھی شخص اس رقم کے لیے یعقوب کی جان کا دشمن بن سکتا تھا لیکن اس تھیوری میں ایک بہت بڑا سقم مجھے شروع ہی سے نظر آ رہا تھا۔

اور وہ یہ کہ...... اگر کوئی شخص یعقوب کے ساتھ اس رقم کی خاطر کوئی اونچ نیچ کرتا تو پھر یہ افسوس ناک واقعہ شرف آباد سے کمال پور کی جانب سفر کے دوران میں پیش آنا چاہیے تھا۔ اگر کوئی شخص اس راز سے آگاہ ہو گیا تھا کہ یعقوب ایک موٹی رقم لے کر شرف آباد سے کمال پور جا رہا ہے تو ایسے شخص کو یعقوب کے کمال پور پہنچنے سے پہلے، راستے میں کہیں ''کارروائی'' کرنا چاہیے تھی لیکن واقعہ اس کے برعکس پیش آیا تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ یہ سارا ہنگامہ رقم کی وجہ سے ہرگز نہیں تھا۔

٭٭٭

اگلے روز میں علی الصباح تیار ہو کر تھانے پہنچا تو ایک نئی صورت حال میری منتظر تھی، میں جیسے ہی اپنے کمرے کی جانب بڑھا، صغریٰ بی بی ایک ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ وہاں آن موجود ہوئی۔ میں اتنی صبح اسے اپنے سامنے دیکھ کر چونک اٹھا کیونکہ میری معلومات کے مطابق صغریٰ کے بہن بہنوئی نے اس کی ذہنی حالت کے پیش نظر اسے ادھر کمال پور ہی میں روک لیا تھا۔ اگر وہ اتنی صبح تھانے میں موجود تھی تو اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اس طرف کوئی بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے۔

میں نے صغریٰ اور اس کے ساتھی کو فوراً اپنے کمرے میں بلا لیا۔ بعد ازاں پتا لگا کہ ساتھ آنے والا شخص صغریٰ کا بہنوئی جان محمد تھا۔ میں نے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا پھر صغریٰ کی جانب دیکھتے ہوئے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔

''خیریت تو ہے نا صغریٰ......؟''

''تھانے دار صاحب!'' صغریٰ کے بجائے اس کے بہنوئی جان محمد نے جواب دیا۔ ''صغریٰ اپنے جوان بیٹے کی جدائی میں نیم پاگل ہو گئی ہے۔ کل آپ کے عملے کے دو افراد کے ساتھ یہ ہمارے پاس آئی تھی اور جب اسے پتا چلا کہ یعقوب ہمارے گھر سے صحیح وسلامت روانہ ہو گیا تھا تو اس کی طبیعت بگڑ گئی، مجبوراً ہم نے اسے ادھر کمال پور ہی میں روک لیا تھا اور......''

''ہاں، یہ بات تو رات ہی کو میرے علم میں آ گئی تھی کہ صغریٰ کو تم لوگوں نے اپنے پاس روک لیا ہے۔'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''اور اب اتنی صبح تم لوگ یہاں ہو، یہ کیا ماجرا ہے جان محمد......؟''

جان محمد کی عمر پچپن سے متجاوز نظر آتی تھی۔ وہ ایک متناسب البدن اور دراز قامت شخص تھا۔ اس کے سر کے بالوں میں سفیدی اور سیاہی کا تناسب یکساں تھا۔ سات بچوں کا باپ بھی تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ محنت اولاد کی تعداد بڑھانے پر کی تھی۔ بعد ازاں مجھے یہ بھی پتا چلا کہ درحقیقت کبریٰ کے بطن سے دس بچے پیدا ہوئے تھے۔ چار لڑکیاں اور چھ لڑکے...... جن میں سے تین لڑکے اوائل عمری ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ اسی جان محمد نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''تھانے دار جی! ہم نے تو صغریٰ کے بھلے ہی کے لیے اسے اپنے گھر میں روک لیا تھا کہ جب تک یعقوب کی خیر خبر نہیں مل جاتی یہ ہمارے ساتھ رہے لیکن جناب، ہم نے پوری رات جاگ کر گزار دی اور فجر کی اذان کے وقت میں اس کی ضد کے سامنے مجبور ہو گیا اور اسے اپنے ساتھ لے کر یہاں آ گیا ہوں۔ اس کا خیال یہ ہے کہ اسے اپنے گھر میں رہتے ہوئے یعقوب کا انتظار کرنا چاہیے۔'' ذرا ذرا کر کے وہ متوقف ہوا، ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''ہم ابھی ابھی یہاں پہنچے ہیں۔ میں صغریٰ کو لے کر اس کے گھر کی طرف جا رہا تھا کہ اس کی ضد پر ادھر آ گیا ہوں۔ یہ گھر میں قدم رکھنے سے پہلے آپ سے ملنا چاہتی تھی۔ اب آپ خود اس سے بات کر لیں۔''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا جیسے اس کے بولنے کا کوٹا ختم ہو گیا ہو۔ جان محمد کے چپ ہوتے ہی صغریٰ پھٹ پڑی۔

''تھانے دار جی...... میرے یعقوب کا کچھ پتا چلا؟''

اس کا یہ سوال کرب میں ڈوبا ہوا تھا۔

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہاں، ایک سراغ ملا تو ہے۔''

''دیکھا، میں نے کہا تھا نا......'' وہ اپنے بہنوئی کی طرف دیکھتے ہوئے جوشیلے انداز میں بولی۔ ''تھانے دار جی ضرور میرے یعقوب کو ڈھونڈ نکالیں گے اسی لیے تو میں شرف آباد آنے کی ضد کر رہی تھی۔'' پھر وہ دوبارہ میری طرف متوجہ ہو گئی اور سراپا سوال بنی آواز میں پوچھا۔

''یعقوب کہاں ہے تھانے دار جی؟''

"تم نے میرے الفاظ پر غور نہیں کیا صغریٰ بی بی!" میں نے اس کی ذہنی کیفیت کے پیش نظر نرم لہجے میں کہا۔ "میں نے یعقوب کی نہیں، اس کا سراغ ملنے کی بات کی ہے۔"

"جی..... کیا مطلب؟" وہ بے تابی سے تڑپ کر بولی۔

میں نے صغریٰ کو حقیقتِ حالات سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ گھوڑے کی موت والی خبر کو اس سے چھپا کر رکھنا ٹھیک نہیں تھا لہٰذا میں نے نہایت ہی مختصر اور جامع الفاظ میں اسے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر صغریٰ نے دھاڑیں مار کر رونا شروع کردیا۔ اس کی آہ و بکا کا فوکس اسی نقطے پر تھا کہ جب یعقوب کے گھوڑے کو اتنی بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہے تو پھر خود اس کے بیٹے کا کیا حشر ہوا ہوگا۔

اس کا موقف تو سولہ آنے درست تھا، میں خود بھی اس سے متفق تھا، لیکن تھانے میں اس چیخ پکار کا کوئی فائدہ نہیں تھا لہٰذا میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔

"صغریٰ! اس وقت میں تمہارے بیٹے کی تلاش ہی میں جارہا ہوں۔ تم بھی گھر جا کر آرام کرو، انشااللہ دوپہر تک میں تمہارے لیے کوئی اچھی خبر ہی لے کر آؤں گا۔"

وہ تھانے سے جانے کے لیے تیار نہیں تھی بلکہ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا۔ "تھانے دار جی، میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔"

"نہیں..... یہ مناسب نہیں ہوگا۔" میں نے دوٹوک الفاظ میں اسے منع کردیا۔ "یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھ رہی ہو۔ تمہیں یہاں سے سیدھا اپنے گھر ہی جانا چاہیے۔"

جان محمد نے بھی اسے یہی سمجھایا کہ پولیس کے تفتیشی معاملات میں اسے نہیں کودنا چاہیے۔ "تھانے دار صاحب بالکل ٹھیک مشورہ دے رہے ہیں۔ اول تو تمہیں کمال پور سے آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ ضد کر کے آ ہی گئی ہو تو سیدھی اپنے گھر چلو۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

ہم دونوں کے سمجھانے بجھانے پر وہ راضی ہوگئی۔ ہم لوگ ایک ساتھ ہی تھانے سے باہر نکلے۔ مجھے اور شوکت علی کو گھوڑوں پر سوار ہو کر یعقوب کی تلاش میں جنگل کی طرف جانا تھا اور صغریٰ کو جان محمد کے ساتھ اپنے گھر۔ ہم تھانے کے احاطے سے باہر نکلے تو ایک ناخوشگوار صورتِ حال ہماری راہ دیکھ رہی تھی۔

صغریٰ، جان محمد کے ساتھ جس تانگے میں بیٹھ کر کمال پور سے یہاں پہنچی تھی وہ اپنے کوچوان سمیت تھانے کی باؤنڈری وال کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس سے تھوڑے فاصلے تھانے کے داخلی راستے کے قریب ہی ایک اور سجا سجایا تانگا بھی نظر آرہا تھا جس پر کوچوان کے علاوہ بھی ایک بھاری بھرکم شخص موجود تھا۔ صغریٰ پر نظر پڑتے ہی مذکورہ شخص تانگے سے نیچے اتر آیا اور تیز قدموں سے صغریٰ کی جانب بڑھنے لگا۔

صغریٰ نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اور اسے دیکھتے ہی صغریٰ کے اعصاب تن گئے تھے۔ میں نے اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرتے دیکھے تو ٹھٹک گیا، پھر صغریٰ سے ہی پوچھ لیا۔

"یہ کون ہے صغریٰ؟"

جواب دینے کے بجائے اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔ "یہ کم بخت یہاں کیوں آیا ہے.....؟"

"اگر مجھے اس بدبخت کے بارے میں کچھ معلوم ہوتا تو تم سے کیوں پوچھتا۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی اپنا سوال بھی دہرا دیا۔ "یہ ہے کون جسے دیکھتے ہی تم اچانک غصے میں آگئی ہو؟"

مذکورہ شخص جیسا خود بھاری بھرکم تھا، اسی مناسبت سے اس نے کنگ سائز مونچھیں بھی رکھ چھوڑی تھیں۔ صغریٰ نے دستور اس شخص پر نگاہ رکھتے ہوئے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

"یہ رحمت علی ہے جناب..... میرا جیٹھ!"

"تمہارے تیور بتا رہے ہیں کہ تم رحمت علی کو پسند نہیں کرتی ہو۔" میں نے قدرے دھیمے انداز میں کہا۔

"ناپسند کرنا تو بہت ہی چھوٹی بات ہوگی۔" وہ تپتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میں تو اس سے شدید نفرت کرتی ہوں۔ یہ یہاں کیا کر رہا ہے۔ اسے دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا ہے تھانے دار جی....."

"تم فکر نہ کرو صغریٰ!" میں نے دھیمی آواز میں اسے تسلی دی۔ "میں خود ہی پوچھ لیتا ہوں کہ یہ صبح ہی صبح یہاں کس مقصد سے آیا ہے؟"

اس دوران میں رحمت علی ہمارے قریب پہنچ گیا اور میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ صغریٰ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"بھابی! تم کل سے یعقوب کے لیے اِدھر اُدھر پریشان پھر رہی ہو۔ مجھے تو بتایا ہوتا۔ میں تمہارا دشمن تو نہیں ہوں۔"

"تم کون ہوتے ہو دوست اور دشمن کا فیصلہ کرنے والے؟" صغریٰ تڑخ کر بولی۔ "جب میں تم سے ہر تعلق توڑ چکی ہوں تو پھر تم بہانے بہانے سے میری راہ میں آنے کی کوشش کیوں کرتے ہو؟"

صغریٰ کے جارحانہ بلکہ منہ توڑ جواب نے رحمت علی کو گھبراہٹ میں مبتلا کردیا۔ وہ چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی کہ ان بھابی جیٹھ کے بیچ بڑی شدید نوعیت کی کشیدگی پائی جاتی تھی۔ اس موقعے پر میں نے صورتِ حال کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور رحمت علی سے مخاطب ہو کر قدرے سخت لہجے میں کہا۔

"تم خواہ مخواہ اپنی بھابی کو کیوں تنگ کر رہے ہو۔ یہ پہلے ہی بہت پریشان ہے۔"

"سرکار! میں کہاں صغریٰ کو تنگ کر رہا ہوں۔" وہ میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ "میں تو اپنی بھابی کا خیرخواہ ہوں جناب۔ پتا نہیں، یہ مجھ سے اتنی خفا کیوں ہے۔"

"مجھے تمہاری خیرخواہی کی ضرورت نہیں۔" صغریٰ نے ناگواری سے کہا۔ "اس لیے تم مجھ سے دور ہی رہو تو اچھا ہے۔"

"دیکھا آپ نے تھانے دار جی!" وہ شکایتی انداز میں مجھ سے بولا۔ "میں اپنے دل میں اس کے لیے کتنی ہمدردی رکھتا ہوں اور یہ....."

"میں نے کہا ہے نا، نہیں چاہیے مجھے تمہاری ہمدردی!" صغریٰ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ "تمہارے لیے بھی اچھا ہے کہ تم فوراً میری نظر سے دور ہوجاؤ۔"

"تھانے دار صاحب! مجھے پتا چلا تھا کہ صغریٰ کا بیٹا کہیں گم ہوگیا ہے۔" رحمت نے مجھ سے کہا۔ "میں تو اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں، اس کی پریشانی بانٹنا چاہتا ہوں اور یہ سمجھ رہی ہے کہ میں اسے تنگ کر رہا ہوں۔ میں سمجھنا چاہتا ہوں کہ میرا بھتیجا یعقوب آخر کہاں چلا گیا ہے؟"

"اگر صرف اتنی سی بات ہے تو تم فکر نہ کرو، یہ سارا چکر میں تمہیں سمجھا دوں گا۔" میں نے وقت کی نزاکت کے پیش نظر کہا۔ "تم اپنی بھابی کا خیال دل سے نکال دو۔"

"ٹھیک ہے جی، آپ جیسے کہہ رہے ہیں، میں ویسے ہی کرلیتا ہوں۔" وہ بڑی فرماں برداری سے بولا۔

میں نے صغریٰ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بی بی! تم بیٹھو تانگے میں اور گھر جا کر آرام کرو۔ میں شام سے پہلے تمہاری طرف چکر لگاؤں گا، جو بھی صورتِ حال سامنے آئے گی وہ میں تمہیں بتا دوں گا۔"

صغریٰ نے گھور کر ناپسندیدہ نظر سے اپنے جیٹھ رحمت علی کی طرف دیکھا پھر منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر وہ تانگے پر سوار ہوئی اور جان محمد کے ساتھ اپنے گھر کی جانب روانہ ہوگئی۔

میں نے دانستہ ان جیٹھ بھابی کی تلخ گفتگو کو طویل نہیں ہونے دیا تھا۔ اس سے سوائے وقت ضائع ہونے کے اور کچھ بھی نہ ہوتا۔ صغریٰ کے جانے کے بعد میں نے اے ایس آئی شوکت علی کو روانہ ہونے کا اشارہ کر دیا اور رحمت علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم اپنے تانگے پر ہمارے پیچھے آؤ۔''

''ہمیں جانا کہاں ہے؟'' وہ الجھن زدہ لہجے میں مستفسر ہوا۔

''یعقوب کو ڈھونڈنے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ادھر جنگل میں۔''

''جنگل میں......؟'' اس کی حیرت دوچند ہو گئی۔

میں نے گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے یعقوب کے گھوڑے کو پیش آنے والے اندوہناک واقعے سے آگاہ کیا پھر گہری سنجیدگی سے کہا۔

''دیکھو رحمت! مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ تمہارا صغریٰ کے ساتھ کیا جھگڑا ہے اور میں یہ بھی نہیں جاننا چاہوں گا کہ تم دونوں کے بیچ کس نوعیت کے اختلافات ہیں۔ میں تو پہلی فرصت میں تمہارے بھتیجے یعقوب کو ڈھونڈ نکالنا چاہتا ہوں۔ پتا نہیں، وہ بے چارہ کہاں اور کس حال میں ہوگا؟'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اس کی جانب گردن گھما کر پوچھا۔

''تم اس سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتے ہو؟''

اب ہم تھانے کو پیچھے چھوڑ آئے تھے اور کمال پور کی جانب ہمارا سفر شروع ہو چکا تھا۔ اے ایس آئی شوکت علی اور میں گھوڑوں پر سوار تھے جبکہ رحمت علی اپنے تانگے پر بیٹھا ہوا تھا۔ شوکت کسی راہنما کے مانند ہم سب سے آگے تھا اور میرا گھوڑا رحمت علی کے تانگے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، اس طرح کہ ہم بہ آسانی بات چیت بھی کرتے چلے جا رہے تھے۔ بچپن کا ہندسہ عبور کرنے کے باوجود بھی وہ خاصا مستعد دکھائی دیتا تھا۔

رحمت نے میرے استفسار کے جواب میں کہا۔ ''تھانے دار جی! مجھے آپ کی مدد کرنے میں تو کوئی اعتراض نہیں لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ جب تک مجھے حالات کا پوری طرح علم نہ ہو۔''

''حالات کا مکمل علم تو کسی کو بھی نہیں ہے رحمت!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ابھی تک اس سلسلے میں جو پیش رفت ہوئی ہے وہ میں نے تمہیں بتا دی ہے۔''

وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یہ تو بڑی تشویش ناک صورت حال ہے جناب!''

میں نے تھوڑی دیر پہلے، تھانے کے سامنے رحمت اور صغریٰ کے درمیان ہونے والی گفتگو کو بڑی توجہ سے سنا تھا۔ رحمت کا انداز تعاون آمیز تھا جبکہ صغریٰ اس سے سخت ناراض اور برہم نظر آئی تھی۔ ان کے بیچ اصل وجہ کیا تھا وہ تو ابھی مجھے معلوم نہیں تھی اسی لیے میں رحمت سے بات کرتے ہوئے اس کے چہرے کے تاثرات کو بھی خصوصاً نوٹ کرتا جا رہا تھا تاکہ اسے سمجھنے میں مجھے آسانی رہے۔

''رحمت! تمہارا ذہن اس معاملے کو کس انداز میں لے رہا ہے؟'' میں نے سنجیدہ لہجے میں اس سے سوال کیا۔ ''تمہارے خیال میں یعقوب کو کس قسم کے حالات پیش آئے ہوں گے۔''

''میں سمجھتا ہوں، صغریٰ کے بیٹے کو کوئی سنگین حادثہ پیش آ چکا ہے۔'' وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ ''آپ نے جو حالات بتائے ہیں وہ تو اسی جانب اشارہ کرتے ہیں۔''

''ہوں......!'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

''شرف آباد اور کمال پور کے درمیان جنگل کا ایک بڑا حصہ پڑتا ہے۔'' رحمت نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''یہ جنگل لگ بھگ دو، ڈھائی میل تک پھیلا ہوا ہے۔ مجھے تو یہ کوئی راہ زنی کی واردات لگتی ہے جناب......!''

''راہ زنی!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہارا مطلب کہ کمال پور سے شرف آباد کی طرف آتے ہوئے ڈاکوؤں نے یعقوب کو لوٹنے کی کوشش کی ہوگی؟''

''ایسا ناممکن تو نہیں ہے جناب۔'' وہ ٹھوس انداز میں بولا۔ ''آپ تو جانتے ہی ہیں، یہ جنگل ڈاکوؤں کے وجود سے خالی نہیں۔ اکا دکا وارداتیں تو سامنے آتی ہی رہتی ہیں، جب گھوڑے کی لاش جنگل کے اندرونی حصے سے ملی ہے تو یعقوب کا سراغ بھی اسی جنگل سے ملے گا جناب۔ ہمیں جنگل کے اس حصے کو خاص طور پر اچھی طرح کھنگالنا چاہیے جہاں یعقوب کے گھوڑے کی لاش پڑی ملی ہے۔''

''ہم اسی طرف جا رہے ہیں رحمت......!'' میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

وہ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

☆☆☆

لگ بھگ ایک گھنٹے کے بعد اے ایس آئی شوکت علی کی راہنمائی میں ہم اس مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں یعقوب کے گھوڑے کی لاش پڑی تھی۔ میں نے پہلے کھڑے کھڑے اور پھر اکڑوں بیٹھ کر گھوڑے کی لاش کا تفصیلی جائزہ لیا۔ واقعی

اس بے زبان جانور پر بڑا ستم توڑا گیا تھا۔ اس کا پورا بدن زخموں سے چور چور تھا۔ گردن پر لگنے والے وار نے اس کی شہ رگ کو کاٹ ڈالا تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق اسی خطرناک زخم سے اس کی موت واقع ہوئی تھی۔

ہم اس وقت جنگل کے ابتدائی حصے میں کھڑے تھے۔ میں گھوڑے کی لاش کے معائنے سے فارغ ہوا تو شوکت علی نے کہا۔

''ملک صاحب! اب کیا کرنا ہے؟''

''کرنا تو وہی ہے جو ہم یہاں کرنے آئے ہیں۔'' میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''یعنی یعقوب کی تلاش......''

''اس کا کیا کرنا ہے؟'' اس بار اے ایس آئی نے گھوڑے کی لاش کی جانب اشارہ کیا۔

''اگر یہ کسی انسان کا جسد خاکی ہوتا تو میں ضابطہ کی ضروری کارروائی کے فوراً بعد اسے پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوا دیتا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''فی الحال اس کو یہیں چھوڑ کر ہمیں یعقوب کی تلاش میں آگے بڑھنا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب! بسم اللہ کریں۔'' وہ سر کو تائیدی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ اور ہم نے بسم اللہ کر دی۔

''ہم'' سے میری مراد میں، اے ایس آئی شوکت علی اور گمشدہ یعقوب کا تایا رحمت علی تھے۔ رحمت نے کوچوان کو تانگے ہی میں چھوڑ دیا تھا جو لاش سے تھوڑے فاصلے پر کھڑا تھا۔

میں ''تلاش یعقوب'' کی تفصیل میں جا کر آپ کو بور نہیں کروں گا کیونکہ گھنے جنگل میں اس نوعیت کا کام خاصا اکتاہٹ آمیز اور دشوار گزار ہوتا ہے۔ اس دوران میں ہمارے بیچ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ایک سوال صبح ہی سے میری سوچ کو ڈسٹرب کر رہا تھا لہٰذا اپنے ذہن کی تشفی کے لیے میں نے رحمت علی سے پوچھ لیا۔

''رحمت! میں نے واضح طور پر محسوس کیا ہے کہ تمہاری بھابی تم سے سخت ناراض ہے۔ یہ کیا ماجرا ہے؟''

''جناب! یہ ماجرا تو آج تک میری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں، اسے مجھ سے خدا واسطے کا بیر کیوں ہے جبکہ آج تک میں نے ایک پیسے کا نقصان اسے نہیں پہنچایا۔''

''اتنی شدید نفرت خوامخواہ نہیں پیدا ہو جاتی رحمت۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''میں نے صغریٰ کی آنکھوں میں تمہارے لیے ناپسندیدگی امڈتے دیکھی ہے۔ اس نوعیت کی رنجش کا کوئی نہ کوئی سبب تو ہوگا نا......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم بتانا نہ چاہو تو الگ بات ہے......''

''ایسی بات نہیں ہے ملک صاحب۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں صرف اس لیے اپنی زبان نہیں کھول رہا کہ کہیں آپ یہ نہ سمجھیں کہ، میں صغریٰ کے خلاف زہر اگل رہا ہوں۔ اس کی پیٹھ پیچھے برائی کرنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔''

انسانی جان بچانے کے لیے اور تفتیش کی گاڑی کو آگے بڑھانے کے لیے نظریۂ ضرورت کے تحت اسے جائز سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک کسی بھی قانون قاعدے سے زیادہ اہم انسان ہوتا ہے اور......وہ صورت حال اہم ہوتی ہے جس کے اندر انسان پھنسا ہوا ہو۔ ہم اس وقت جس مشن پر ہیں اس کا مقصد نیک اور مثبت ہے لہٰذا اگر یعقوب تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مجھے تمہاری زبان سے صغریٰ کی اور صغریٰ کی زبان سے تمہاری برائی بھی اگلوانا پڑے تو میں اس میں ایک لمحے کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کروں گا۔'' میں نے توقف کر کے بڑی گہری نظر سے رحمت علی کی طرف دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اگر میری بات تمہاری سمجھ میں آ گئی ہو تو بتا دو کہ تمہاری صغریٰ سے یا صغریٰ کی تم سے کیا دشمنی ہے......وہ تم سے اتنی شدید نفرت کیوں کرتی ہے؟''

''میری تو اس سے قطعاً کوئی دشمنی نہیں ہے ملک صاحب!'' وہ بڑے کھلے ڈلے انداز میں بولا۔ ''اب جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ وہ مجھے کیوں ناپسند کرتی ہے تو میں اس سلسلے میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ وہ ایک سازشی اور فتنہ پرور عورت ہے۔ میں چونکہ کھری بات کرتا ہوں اس لیے وہ مجھ سے اپنی نفرت کا اظہار کرتی ہے۔ اس عورت کی چال بازیوں نے ہمارا ہنستا بستا گھر اجاڑ کر رکھ دیا ہے۔''

یہ ایک بالکل نئی کہانی سامنے آ رہی تھی۔ میں نے یعقوب کی تلاش کا کام جاری رکھتے ہوئے رحمت علی سے کہا۔

''رحمت! ابھی تم نے صغریٰ کے حوالے سے جن گھریلو حالات و واقعات کا ذکر کیا ہے، مجھے تفصیلاً اس کے بارے میں بتاؤ، میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔''

میں نے گرین سگنل دیا تو وہ اللہ کا بندہ شروع ہو گیا۔ اس نے تو مجھے ایک لمبا چوڑا قصہ سنا ڈالا تھا لیکن میں اس کے بیان میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ صغریٰ بی بی کا پس منظر آپ

کے سامنے اجاگر ہو جائے۔ ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ یہ رحمت علی کا موقف ہے جو اس نے میرے گوش گزار کیا اور میں آپ تک پہنچا رہا ہوں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ صغریٰ، رحمت کے موقف سے اتفاق بھی کرے بلکہ مجھے جو حالات نظر آ رہے تھے ان کی روشنی میں ایک بات میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ صغریٰ اس سے مکمل اختلاف ہی کرے گی۔

رحمت علی کے بیان کے مطابق صغریٰ بہت ہی چنٹ اور چالاک عورت تھی۔ اس کی مکاری اور چال بازی کو سمجھنا ہما شما کے بس کی بات نہیں تھی لہٰذا مرحوم برکت علی (صغریٰ کا شوہر اور رحمت علی کا چھوٹا بھائی) بھی اس کے دام فریب کا شکار ہو گیا۔ صغریٰ کا تعلق دوسرے خاندان سے تھا اور رحمت کا باپ سلامت علی اس رشتے کے لیے تیار نہیں تھا۔ صغریٰ نے ایسا چکر چلایا کہ اسے پانے کے لیے برکت علی نے والدین کی مخالفت مول لینے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ معاملہ جب حدود سے تجاوز کرنے لگا تو سلامت علی نے بہت ہی دانش مندانہ اقدام کیا حالانکہ رحمت علی اور اس کی ماں کنیز فاطمہ بھی برکت اور صغریٰ کی شادی کے حق میں نہیں تھے۔ سلامت علی نے اس بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں کو ٹھنڈا کرنے اور خاندان کی بقا کے لیے تمام تر اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر برکت علی کو صغریٰ سے شادی کرنے کی اجازت دے دی۔

برکت اور رحمت صرف دو بھائی تھے۔ ان کی کوئی بہن نہیں تھی۔ رحمت کی شادی چند سال پہلے اپنے ماموں کی بیٹی سے ہوئی تھی اور یہ سب لوگ مل جل کر ایک ہی بڑے سے گھر میں رہتے تھے۔ سلامت علی، شرف آباد کے چودھری مرغوب حسین کے بعد دوسرے درجے کے چودھریوں میں پہلے نمبر پر شمار کیا جاتا تھا۔ اس کی اچھی خاصی اراضی تھی اور گھر کے اندر ہر سکون اور آسائش میسر تھی۔ صغریٰ بھی بیاہ کر اسی گھر میں آ گئی تھی۔

دو تین ماہ تو ہنستے کھیلتے گزر گئے۔ اس کے بعد رحمت علی کے مطابق صغریٰ نے پر پرزے نکالنا شروع کر دیے۔ سب سے پہلے تو دیورانی اور جیٹھانی میں محاذ جنگ کھل گیا۔ یہ جھگڑے بکھیڑے اتنے بڑھے کہ اپنی بیویوں کی حمایت میں دونوں بھائی ایک دوسرے کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ اس صورت حال نے بوڑھے والدین کو مشکل میں ڈال دیا۔ سلامت علی ایک دانا و بینا شخص تھا۔ اسے معاملے کی تہ تک پہنچنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور اس نے ایک مکان اور پچیس ایکڑ نہری زرعی اراضی دے کر برکت علی اور اس کی بیوی صغریٰ کو الگ کر دیا۔ رحمت علی کے مطابق صغریٰ نے یہ سارا قسادا الگ ہونے کے لیے ہی برپا کیا تھا، بالآخر وہ اپنی مذموم کوشش یا جھگڑالو سازش میں کامیاب ہو گئی تھی۔

اس علیحدگی کے بعد صغریٰ نے پلٹ کر اپنی سسرال میں قدم نہیں رکھا تھا البتہ دونوں بھائیوں میں کبھی کبھار میل ملاقات ہو جاتی تھی۔ گاہے بہ گاہے برکت علی اپنے والدین سے ملنے بھی چلا جاتا تھا۔ انہی حالات میں سال پر سال گزرتے چلے گئے۔ اس دوران میں سلامت علی اور کنیز فاطمہ کا انتقال ہو گیا۔ سلامت علی کے پاس کل ستر ایکڑ زمین تھی۔ جب برکت علی الگ ہوا تو اسے ایک مکان کے علاوہ انہی ستر میں سے پچیس ایکڑ زمین دے دی گئی تھی لہٰذا باقی بچ رہنے والے پینتالیس ایکڑ رحمت علی کے حصے میں آ گئے تھے۔ وہ اب اپنے بیوی بچوں کے ساتھ والدین والے بڑے گھر میں رہ رہا تھا۔

رحمت نے مجھے بتایا کہ سلامت علی اور کنیز فاطمہ کے انتقال کے بعد صغریٰ نے ایک مرتبہ پھر تنازع کھڑا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا مطالبہ تھا کہ والدین کے انتقال کے بعد دونوں بھائیوں میں زمین و جائداد کی منصفانہ تقسیم ہونا چاہیے یعنی دونوں کے حصے میں پینتیس، پینتیس ایکڑ زمین آنا چاہیے۔ اس سلسلے میں چونکہ برکت علی نے کوئی دباؤ نہیں ڈالا تھا لہٰذا رحمت علی نے بھی صغریٰ کے واویلے کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا تھا۔ پھر کچھ عرصے بعد جب برکت علی حادثاتی موت کا شکار ہو کر دوسری دنیا میں منتقل ہو گیا تو یہ معاملہ بھی دب دبا گیا۔ رحمت علی کا ضمیر مطمئن تھا کہ اس نے کسی کا حق نہیں کھایا۔ جب والد صاحب نے ایک شاندار مکان اور پچیس ایکڑ زرعی اراضی دے کر برکت علی کو اسی کے مطالبے پر الگ کیا تھا تو جائداد کی تقسیم اسی دن ہو گئی تھی۔ اب جو کچھ بھی باقی بچا تھا اس پر صرف اور صرف اسی کا حق تھا۔

اپنے بیان کے آخر میں رحمت علی نے بڑے افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔ ”ملک صاحب! میں صغریٰ کی ہر زیادتی کو نظر انداز کر سکتا ہوں لیکن برکت کے انتقال کے کچھ عرصے بعد اس نے ایک ایسی گھٹیا حرکت کی کہ مجھے بھی اس سے شدید نفرت ہو گئی تھی اور......“ اس نے توقف کر کے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”کیا کروں جناب صغریٰ تو غیر تھی اور اب تک غیر ہی بنی ہوئی ہے لیکن یعقوب تو میرے بھائی کا خون ہے نا...... اس کی گمشدگی سے میرا دل نہیں دکھے گا تو پھر کس کا دکھے گا۔ بس، دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اور اپنے خون کی پکار پر میں ادھر آ گیا تھا ورنہ صغریٰ کی تو شکل دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔“

وہ خاموش ہوا تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ”صغریٰ نے تمہارے ساتھ ایسی کون سی گھٹیا حرکت کی تھی جو تمہارا دل برا ہو گیا......؟“

”اس نے مجھ پر یہ گھناؤنا الزام لگایا تھا کہ ایک رات میں نے اس کی عزت سے کھیلنے کی کوشش کی تھی۔“ اتنا بتانے کے بعد وہ افسردہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

”اوہ......!“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

اس کے بعد ہمارے درمیان خاموشی کا ایک طویل دور آیا پھر یعقوب کی تلاش کے ساتھ ہی ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ آئندہ چند گھنٹوں میں، میں نے جنگل کا تقریباً چپا چپا چھان مارا لیکن مجھے بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ یعقوب کا ہمیں کوئی سراغ نہیں ملا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں اڑن چھو ہو گیا اب یہی کہا جا سکتا تھا کہ اسے آسمان نے کھایا تھا اور نہ ہی زمین نے نگلا تھا۔ وہ اگر اس جنگل میں داخل ہوا تھا تو پھر وہ جنگل سے نکل کر آگے کہیں اور چلا گیا تھا یا اسے کہیں اور پہنچا دیا گیا تھا۔ اس کا گھوڑا زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔ اگر خدانخواستہ یعقوب کے ساتھ بھی اسی نوعیت کا کوئی سنگین اور جان لیوا معاملہ پیش آ گیا تھا تو آج کی تلاش کے دوران میں مجھے اس کی لاش بھی مل جانا چاہیے تھی۔ سر دست میں یہی سوچنے پر مجبور تھا کہ یعقوب اس جنگل سے نکل کر کہیں اور چلا گیا تھا۔

ہم یعقوب کی تلاش والے مشن میں ناکام و نامراد واپس لوٹ آئے۔ میرا ذہن الجھن زدہ اور دل بوجھل تھا اور میں مسلسل ایک ہی نکتے پر غور کر رہا تھا کہ یعقوب کا ایسا خطرناک دشمن کون ہو سکتا ہے جس نے پہلے اس کے گھوڑے کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا اور پھر خود اسے بھی غائب کر دیا۔ ایسا کام کسی دوست کا تو ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔

شروع میں میرا دھیان ڈاکوؤں کی کارروائی کی طرف گیا تھا لیکن جنگل کا مکمل سروے کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ گھوڑے کی دردناک موت اور یعقوب کے غائب میں کوئی ڈاکو یا ان کا گروہ ملوث نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر یہ ڈاکوؤں کا کارنامہ ہوتا تو وہ یعقوب کو لوٹنے کے بعد آگے بڑھ جاتے۔ انہیں گھوڑے کو موت کے گھاٹ اتارنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور بالفرض محال، کسی چھینا جھپٹی اور کھینچا تانی میں گھوڑا شدید زخمی ہو بھی گیا تھا تو پھر یعقوب کا بھی صحیح و سالم بچ جانا ممکن نہیں تھا۔ وہ زندہ یا مردہ اسی جنگل میں دستیاب ہو جاتا...... چونکہ ایسا نہیں ہوا تھا اس لیے میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ یہ واقعہ کسی بھی زاویے سے ڈاکوؤں کے کھاتے میں نہیں ڈالا جا سکتا تھا......

میں سوچ کے گھوڑے دوڑا ہی رہا تھا کہ رحمت علی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”ملک صاحب! مجھے تو یہ کوئی اور ہی چکر لگتا ہے۔“

میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”کیسا چکر رحمت علی؟“

”مجھے تو یوں لگتا ہے، یعقوب کے ساتھ جنگل میں کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”میں کافی سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یعقوب چپ چاپ خود ہی کہیں نکل گیا ہے۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

”چپ چاپ وہ کیوں چلا جائے گا......؟“ میری الجھن بجا تھی۔

”ہو سکتا ہے، یہ کوئی لڑکی وغیرہ کا چکر ہو......!“ وہ اتنی دھیمی آواز میں بولا کہ اے ایس آئی شوکت علی ہماری جانب متوجہ نہ ہو سکے۔ ”وہ کہیں کسی لڑکی کو تو بھگا نہیں لے گیا؟“

”عقل کو ہاتھ مارو رحمت علی!“ میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔ ”یعقوب کو قصبے سے غائب ہوئے آج تیسرا دن ہے۔ اگر یہ لڑکی کو بھگا لے جانے کا کوئی واقعہ ہوتا تو اب تک اس مبینہ لڑکی کے ورثا ضرور حرکت میں آ چکے ہوتے۔ شرف آباد میں اتنی خاموشی نظر نہ آتی اور پھر......“ میں نے رک کر ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”شاید یہ بات تمہارے علم میں نہیں کہ یعقوب کی منگنی کبریٰ کی بیٹی سلمٰی سے ہو چکی ہے اور ڈیڑھ، دو سال میں ان کی شادی ہونے والی ہے۔ ان حالات میں وہ کسی لڑکی کو کیسے بھگا کر کہیں لے جا سکتا ہے؟“

”میں اس کی منگنی سے اچھی طرح واقف ہوں ملک صاحب۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”عین ممکن ہے، وہ اپنی خالہ کی بیٹی کو پسند نہ کرتا ہو، صغریٰ نے یہ منگنی زبردستی کر دی ہو۔ وہ چپکے چپکے کسی اور لڑکی کو چاہتا ہو اور موقع ملتے ہی وہ اس لڑکی کے ساتھ کہیں فرار ہو گیا ہو...... یہ ناممکن تو نہیں ہے جناب۔ عشق اور محبت کے معاملات بعض اوقات بڑے حیرت انگیز اور سمجھ میں نہ آنے والے واقعات کو جنم دیتے ہیں۔“

”ہاں، رحمت علی! ایسا ہو جانا ناممکن تو نہیں۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن اس صورت میں تم یعقوب کے گھوڑے کی دردناک موت کو کس خانے میں

فٹ کرو گے؟"

"یہ ڈراما خود یعقوب کا رچایا ہوا بھی تو ہوسکتا ہے جناب!" وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ "تاکہ سب کا دھیان ڈاکوؤں کی کارروائی کی طرف جائے اور کوئی اس کے اصل مقصد تک رسائی حاصل نہ کرسکے جیسا کہ ہم نے بھی یہی سوچا اور پانچ چھ گھنٹے جنگل میں اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد واپس آگئے......؟"

"تمہاری باتوں میں خاصا وزن ہے رحمت علی!" میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا وہ اتنا ہی شقی القلب ہے کہ اپنی ماں کو تن تنہا چھوڑ کر کسی لڑکی کے ساتھ کہیں رفوچکر ہوگیا ہے۔"

"میرے ذہن میں جو بات آئی، وہ میں نے آپ کو بتادی ہے۔" وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ "یقین کریں یا نہ کریں، یہ تو آپ کی مرضی ہے جناب......!"

"یقین نہ کرنے والی تو کوئی بات ہی نہیں ہے رحمت علی۔" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "تفتیش کی گاڑی تو ہمیشہ شک کے پیٹرول ہی سے چلتی ہے اور تم نے اس سلسلے میں مجھے عملی اقدام کے لیے کئی راہیں دکھادی ہیں۔ میں تمہارے اس تعاون کے لیے شکر گزار ہوں۔"

"جناب! یہ تو میرا فرض تھا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "صغریٰ مجھے لاکھ اپنا دشمن سمجھتی رہے لیکن یعقوب تو میرا بھتیجا ہے اور ہمیشہ بھتیجا ہی رہے گا۔ میں تو یہی چاہوں گا کہ اس کا کوئی نقصان نہ ہو۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں رحمت علی!" میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "اور اس سلسلے میں تم سے میری ایک درخواست ہے۔"

"درخواست نہیں، آپ حکم کریں ملک صاحب۔" وہ جذباتی ہوگیا۔

میں نے کہا۔ "یعقوب کی تلاش اور بازیابی کے لیے تم اپنے طور پر جو بھی کوشش کرنا چاہو، میں تمہیں روکوں گا نہیں لیکن صغریٰ کو اس بات کی خبر نہیں ہونا چاہیے کہ اس تفتیش میں تم بہ نفسِ نفیس ملوث ہو۔ تم سمجھ رہے ہو نا، میں یہ بات کیوں کہہ رہا ہوں؟"

"جی ملک صاحب! بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "وہ مجھے پسند نہیں کرتی۔ جب اسے پتا چلے گا کہ یعقوب کی تلاش کے سلسلے میں، میں آپ کے ساتھ کسی قسم کا تعاون کررہا ہوں تو وہ جتے سے اکھڑ جائے گی۔"

"ہاں، بالکل یہی بات ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ "تم درپردہ رہ کر کام کرو گے اور کوشش کی رپورٹ پہنچاتے رہو گے......"

"آپ بھی مجھ سے کچھ نہیں چھپائیں گے" وہ اپنائیت سے بولا "اس سلسلے میں جو بھی پیش رفت ہوگی اس سے آگاہ کرتے رہیں گے......؟"

"ٹھیک ہے......" میں نے دو لفظی جواب پر اکتفا کیا۔

لگ بھگ چار بجے سہ پہر ہم واپس تھانے پہنچ گئے

☆☆☆

سورج غروب ہونے سے تھوڑی دیر پہلے میں صغریٰ سے ملنے اس کے گھر چلا گیا۔ آج کا پورا دن بہت بھاگ دوڑ بلکہ شدید نوعیت کی مشقت میں گزرا تھا۔ کام تو ہم روز ہی کرتے تھے اور ظاہر ہے، اس کام سے تھکاوٹ بھی ہوتی ہے لیکن آخر میں انسان کو اس کا مقصد حاصل ہوجائے تو پھر یہ تھکن راحت میں بدل جاتی ہے۔ میرے ساتھ چونکہ ایسا نہیں ہوا تھا لہٰذا دن بھر کی تکان نے اعصاب اور حواس پر ایک عجیب سی اکتاہٹ اور بےزاری طاری کردی تھی۔

یہ تو میرے جی جان کی کیفیت تھی، اس ماں کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی جس کا جوان جہان بیٹا پچھلے دو دن سے لاپتا تھا......بس یہی سوچ کر میں صغریٰ سے ملنے چلا آیا تھا۔ یہاں آکر پتا چلا کہ کمال پور سے کبریٰ اور عمران بھی آئے ہوئے ہیں۔ عمران کبریٰ کا بڑا بیٹا تھا جس کی عمر کم و بیش دس سال تھی۔ وہ اس وقت باہر گلی میں دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ یہ لوگ کوئی ایک گھنٹا پہلے کمال پور سے شرف آباد پہنچے تھے۔ کبریٰ کو اپنی بہن کے ساتھ ساتھ ہونے والے داماد کی فکر بھی کھائے جارہی تھی لہٰذا وہ اپنے بیٹے کو لے کر ادھر ہی آگئی تھی۔

میں گھر کے اندر پہنچا تو جان محمد، صغریٰ اور کبریٰ کی یاسیت بھری سوالیہ نگاہوں نے مجھے گھیر لیا۔ ان کے اضطراری استفسارات کے جواب میں، میں نے نہایت مختصر اور جامع الفاظ میں انہیں تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کردیا۔ دنیا کا سب سے مشکل کام یہی ہوتا ہے کہ کسی کی بندھی ہوئی امید کو توڑ دیا جائے۔

ان کے چہرے اتر گئے اور وہاں پر گہرے رنج و الم کی گھٹاؤں نے ڈیرا جمالیا۔

میں نے صغریٰ کو مخاطب کرتے ہوئے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ "دیکھو بی بی! تمہارے بیٹے کے ساتھ

کیا واقعہ پیش آیا ہوگا ابھی اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن مجھے امید ہے کہ میں بہت جلد اس کا سراغ لگالوں گا۔" لمحاتی توقف کرکے میں نے ان الفاظ کا اضافہ کردیا۔

"میں تمہارے دکھ درد میں برابر کا شریک ہوں۔ میں اور میرے تھانے کا پورا عملہ یعقوب کی تلاش کے سلسلے میں سرگرداں ہے لیکن اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے مجھے تمہارے بھرپور تعاون کی بھی ضرورت ہے۔"

"جی......" وہ روہانسی ہوگئی۔ "آپ مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہیں؟"

"میں تمہاری مدد سے اس شخص تک پہنچنا چاہتا ہوں جو کسی بھی حوالے سے اپنے دل میں یعقوب کے لیے دشمنی کے جذبات رکھتا ہو......؟" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"دیکھیں جی، دلوں کے حال تو صرف خدا ہی جانتا ہے۔" وہ دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے بولی۔ "میں تو یعقوب کے کسی دشمن کو نہیں جانتی۔ وہ تو سب کے ساتھ بنا کر رکھنے والا بچہ تھا۔"

"یعقوب کے گھوڑے کو جس بےدردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے وہ کسی ظالم اور سفاک شخص کا کارنامہ دکھائی دیتا ہے اور ایسا کام کوئی دشمن ہی کرسکتا ہے۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "لہٰذا جب تک مجھے یہ پتا نہیں چلے گا کہ یعقوب کس کی آنکھ میں کھٹکتا تھا، میں تفتیش کی گاڑی کو موثر انداز میں آگے نہیں بڑھا سکتا۔"

"تھانے دار جی...... یہ کام راہزنوں اور ڈاکوؤں کا بھی تو ہوسکتا ہے۔" جان محمد نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔ "یہ دو ڈھائی میل تک پھیلا ہوا جنگل بہت ہی خطرناک ہے۔"

"میں نے ڈاکوؤں والے پہلو پر بہت غور کیا ہے جان محمد!" میں نے جان محمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ مجھے ان کا کیا دھرا نہیں لگتا۔"

"جناب! یہ بات آپ کس بنا پر کہہ رہے ہیں؟" وہ پوچھ بیٹھا۔

"بتا......!" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "پہلی بات تو یہ کہ ڈاکو اور خصوصاً وہ ڈاکو جو جنگل کا سہارا لے کر مسافروں کو لوٹتے ہیں وہ اس قسم کی کارروائی دن دہاڑے نہیں کیا کرتے۔ جنگل کو یہ لوگ اپنے مسکن کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھا کر وہ اپنے مسکن سے دور کوئی خطرناک واردات کرتے ہیں پھر جنگل میں آکر چھپ جاتے ہیں۔" میں نے تھوڑی دیر کے لیے رک کر ان تینوں کے چہروں کا جائزہ لیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یعقوب دن کے اجالے میں کمال پور سے روانہ ہوا تھا اور جب وہ جائے وقوعہ پر پہنچا اس وقت بھی اچھی خاصی روشنی ہوگی لہٰذا ڈاکوؤں کی کارروائی کا امکان تو رد ہی کردیں، البتہ کسی راہزن کے بارے میں تھوڑی دیر کے لیے سوچا جاسکتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اس لیے کہ مجھے نہیں امید، یہ کسی راہزن کا کیا دھرا ہو کیونکہ راہزن بڑی جلدی میں ہوتا ہے اور وہ قتل و غارت گری سے حتی الامکان گریز کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا مطمحِ نظر مسافر کو لوٹنا اور بڑی سرعت سے آگے بڑھ جانا ہوتا ہے۔ وہ اس قسم کے معاملات میں نہیں پڑتا جیسا کہ یعقوب کے گھوڑے کے ساتھ ہوا ہے۔"

جان محمد سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یہ اغوا برائے تاوان کا بھی تو واقعہ ہوسکتا ہے؟"

"ہرگز نہیں!" میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ "اگر یعقوب کو کسی تاوان کی غرض سے اغوا کیا گیا ہوتا تو اب تک اغوا کنندگان کی جانب سے کوئی مطالبہ سامنے آچکا ہوتا اور اغوا کرنے والے مغوی کی سواری کو عبرت ناک موت سے دوچار نہیں کیا کرتے۔"

"پھر......آپ کے خیال میں یعقوب کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہوگا؟" یہ سوال کبریٰ کی طرف سے اٹھایا گیا تھا۔

"میں نے یعقوب کی گمشدگی کے حوالے سے اب تک جو تفتیش کی ہے اس سے میرے سامنے صرف دو وجوہات آئی ہیں۔" میں نے باری باری ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "فی الحال، کوئی تیسرا سبب سمجھ میں نہیں آرہا......"

"اور وہ دو وجوہات کون سی ہیں؟" جان محمد نے سنسنی خیز انداز میں مجھ سے پوچھا۔ "کیا آپ ہمیں بھی بتائیں گے۔"

"کیوں نہیں......" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں اسی لیے تو یہاں آیا ہوں کہ اپنے اور آپ لوگوں کے خیالات کو ملا کر کوئی جامع منصوبہ بندی کرسکوں۔ مجھے آپ لوگوں سے زیادہ یعقوب کو بازیاب کرانے کی جلدی ہے۔" میں نے تھوڑی دیر کو رک کر ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"میری نظر میں یہ یعقوب کے کسی جانے پہچانے دشمن کی کارستانی ہے۔ وہ کمال پور ہی سے اس کے تعاقب میں تھا اور یہ بھی ہوسکتا ہے، وہ شرف آباد سے اس کے پیچھے گیا ہو۔ اسے راستے میں وار کرنے کا موقع نہ ملا ہو لہٰذا اس نے واپسی

پر اپنا کام دکھا دیا۔ یعقوب کو جیسے ہی حملہ آور کا احساس ہوا، اس نے اپنے گھوڑے کو بھگانے کی کوشش کی ہوگی لہٰذا حملہ آور کے زیادہ تر وار گھوڑے کے بدن پر لگے اور وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسا۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یعقوب کہاں چلا گیا......؟ میں نے آج جنگل کا چپا چپا اور کونا کونا چھان مارا ہے، زندہ، یا زخمی یا مردہ یعقوب کے آثار کہیں دکھائی نہیں دیے۔ اس راز سے وہ شخص ہی پردہ اٹھا سکتا ہے جس نے گھوڑے کو اذیت ناک موت مرنے پر مجبور کر دیا تھا...... وہی دراصل یعقوب کا دشمن ہے جس کی مجھے تلاش ہے۔"

"اور دوسری وجہ......؟" میرے خاموش ہونے پر جان محمد نے سوال کیا۔

"دوسری وجہ خود یعقوب ہی ہو سکتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"جی...... کیا مطلب......؟" صغریٰ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

"یہ بھی ممکن ہے کہ یعقوب کسی لڑکی کو یہاں سے بھگا لے گیا ہو۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "گھوڑے کو موت کے گھاٹ اتار کر اس نے اغوا وغیرہ کا ڈراما رچایا ہو، یہ لڑکی شرف آباد کی رہنے والی بھی ہو سکتی ہے اور کمال پور کی وسنیک بھی۔ آپ لوگوں کا اس بارے میں کیا خیال ہے......؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھانے دار صاحب!" صغریٰ بڑے وثوق سے بولی۔ "اگر اس کا کسی لڑکی کے ساتھ کوئی چکر ہوتا تو مجھ سے چھپ نہیں سکتا تھا اور پھر اس کی تو منگنی بھی ہو چکی ہے۔"

ہر ماں کا اپنی اولاد کے بارے میں یہی دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ ان کے چھوٹے سے چھوٹے معاملے کی بھی خبر رکھتی ہے۔ انہی خیالات کا اظہار صغریٰ بی بی نے بھی کیا تھا۔ میں اس کے دعوے کو چیلنج کر کے بحث کا کوئی نیا دروازہ نہیں کھول سکتا تھا لہٰذا کبریٰ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یعقوب کی ادھر کمال پور میں تو کسی سے دشمنی وغیرہ نہیں تھی؟"

"نہیں جی...... وہ تو کسی سے گھلتا ملتا ہی نہیں تھا۔" کبریٰ نے جواب دیا۔ "یعقوب اپنے کام سے کام رکھنے والا بچہ تھا۔"

ایک فوری خیال کے تحت میں نے جان محمد سے پوچھ لیا۔ "ایک بڑا نازک اور ذاتی نوعیت کا سوال ہے لیکن آپ لوگوں کو اس کا بہت سوچ سمجھ کر جواب دینا ہوگا۔"

"جی پوچھیں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "ہم یعقوب کی بازیابی کے لیے سخت پریشان ہیں۔ آپ، جو بھی سوال کریں گے، ہم اس کا بالکل درست جواب دیں گے۔"

میں نے یکے بعد دیگرے جان محمد اور کبریٰ کی طرف دیکھا پھر سوال کیا۔ "کیا سلمٰی اور یعقوب کی منگنی سے پہلے سلمٰی کا کہیں اور سے بھی رشتہ آیا تھا؟"

"جی ہاں، سلمٰی کے تین رشتے آئے تھے۔" کبریٰ نے بتایا۔ "لیکن میں چونکہ صغریٰ کو زبان دے چکی تھی اس لیے ہم نے ان سب کو صاف انکار کر دیا۔"

"کیا ان لوگوں کا تعلق کمال پور ہی سے تھا؟"

"جی ہاں!" کبریٰ نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"تم مجھے ان تینوں کے نام اور گھر کے پتے نوٹ کرا دو۔" میں نے اپنی جیب سے پاکٹ ڈائری اور قلم نکالتے ہوئے کہا۔

اس دوران میں جان محمد خاموش بیٹھا بڑی گہری نظر سے میرا جائزہ لیتا رہا تھا۔ کبریٰ نے ایک ہی سانس میں مجھے ان لڑکوں کے نام اور پتے لکھوا دیے جن کے رشتے اس کی بیٹی سلمٰی کے لیے آئے تھے۔ ان لڑکوں کے نام علی الترتیب کچھ اس طرح تھے۔ ساجد علی، امیر خان اور پرویز احمد۔

"رشتے ٹھکرائے جانے پر ان لوگوں میں سے کسی نے کوئی احتجاج وغیرہ بھی کیا تھا؟" میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔ "اپنی برہمی یا ناراضی وغیرہ کا اظہار کیا ہو......"

"ساجد علی اور پرویز احمد نے تو ہمارے انکار کو بالکل عام انداز میں لیا تھا۔" کبریٰ نے جواب دیا۔ "لیکن امیر خان اور اس کے گھر والوں کو ہمارا منع کرنا بہت برا لگا تھا۔ اسی روز سے انہوں نے ہم سے بول چال اور ملنا جلنا بھی ختم کر دیا ہے۔"

"امیر خان......!" میں نے زیرِ لب دہرایا پھر ڈائری میں درج اس نام پر دائرہ لگا دیا۔ جان محمد سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"تھانے دار صاحب! میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ سلمٰی کے مسترد کیے جانے والے رشتوں کے بارے میں اتنا کرید کرید کر کیوں پوچھ رہے ہیں۔ آپ کے ذہن میں یہ بات ہے کہ ممکن ہے، انہی میں سے کسی نے حاسدانہ جذبات سے مغلوب ہو کر یعقوب کو نقصان پہنچایا ہو......!"

"یہ ناممکن تو نہیں ہے......!" میں نے سوالیہ نظر سے جان محمد کی طرف دیکھا۔ "مجھے تو ہر وہ راہ اختیار کرنا ہے جو مجھے اصل مجرم تک پہنچا دے اور مجھے یقین ہے، آپ لوگ بھی یہی چاہتے ہیں؟"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب...... بے شک ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔" جان محمد نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "آپ جیسے مناسب سمجھتے ہیں، ضرور تفتیش کریں۔ ویسے میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ادھر کمال پور سے کسی نے یعقوب کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔"

میں نے جان محمد کی بات سنی اور اس کے خاموش ہونے پر صغریٰ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ "تو تم یعقوب کے کسی دشمن کو نہیں جانتی ہو......؟"

"جی ہاں، جو حقیقت ہے وہ میں نے آپ کو بتا دی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "دشمن نہیں تو یعقوب کے چند ایسے دوستوں ہی کے نام بتا دو جن کے ساتھ اس کا زیادہ اٹھنا بیٹھنا تھا......؟"

"ان میں ایک کا نام تو نور شاہ ہے اور دوسرے کا نام حنیف خان۔" اس نے بتایا۔ "یعقوب کی زیادہ میل ملاقات انہی دو لڑکوں سے تھی۔"

"کیا حنیف خان اور نور شاہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ یعقوب پچھلے دو دن سے غائب ہے؟" میں نے صغریٰ سے سوال کیا۔

"جی۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "یہ دونوں بھی یعقوب کی گمشدگی کی وجہ سے سخت پریشان ہیں۔"

"ہوں......!" میں نے پرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا پھر کہا۔ "ٹھیک ہے، میں ان کو تھانے بلا کر ضرور پوچھ گچھ کروں گا۔ کیا یہ بھی اسی محلے میں رہتے ہیں؟"

صغریٰ نے مجھے ان کے گھروں کے حدود اربعہ کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا۔ میں نے ضروری معلومات کو اپنی ڈائری میں درج کرنے کے بعد نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"صغریٰ! میں تم سے تنہائی میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

میرے الفاظ سے ٹپکتی سنجیدگی بلکہ سنگینی کو محسوس کر کے کبریٰ اور جان محمد نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر صغریٰ کی سمت دیکھتے ہوئے جان محمد نے کہا۔

"صغریٰ! ہم دوسرے کمرے میں جا رہے ہیں۔ تم اطمینان سے بیٹھ کر تھانے دار صاحب کی بات سن لو۔"

پھر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر وہ میاں بیوی خاموشی سے اٹھے اور کمرے سے باہر چلے گئے۔ تنہائی میسر آتے ہی میں نے صغریٰ سے پوچھا۔

"یہ تمہارے جیٹھ رحمت علی کا کیا معاملہ ہے......؟"

"کیوں......" وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ "کیا اس نے میرے بارے میں کوئی بکواس کی ہے......؟"

میں نے صغریٰ کو یہ بتانا ضروری نہ سمجھا کہ یعقوب کی تلاش میں رحمت علی کو دن بھر میں نے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ یہ جان کر خواہ مخواہ اس کا پارا چڑھ جاتا۔ یہ بات میں نے اچھی طرح جان لی تھی کہ صغریٰ، رحمت علی کے لیے اپنے دل میں نفرت کے جذبات رکھتی تھی۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔

"میں نہیں جانتا، اس نے بکواس کی ہے یا حقیقت بیانی سے کام لیا ہے۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ اس کی بھابی یعنی تم اس سے قدر خفا کیوں ہو تو اس نے مجھے اس چپقلش کا خاندانی پس منظر بتا دیا۔ مجھے ان باتوں سے تو غرض نہیں کہ تم لوگوں کے بیچ کس نوعیت کے تنازعات رہے ہیں لیکن ایک امر کی تصدیق میں ضروری سمجھتا ہوں اسی لیے میں نے تم سے تنہائی میں بات کرنے کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ اس معاملے کا تعلق براہ راست تمہاری ذات سے ہے۔"

اس کی پیشانی پر الجھن کی لکیریں پھیل گئیں، متامل لہجے میں بولی۔ "ایسا کون سا معاملہ ہے تھانے دار صاحب؟"

"رحمت علی نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے اس پر کوئی گھناؤنا الزام لگایا تھا......؟"

"الزام نہیں، حقیقت کہیں تھانے دار صاحب۔" وہ تلخ انداز میں بولی۔ "جب اس نے زبان کھول ہی دی ہے تو میں بھی خاموش نہیں رہوں گی۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم مجھے اصل بات بتاؤ۔" میں نے اس کا اعتماد حاصل کرنے کی غرض سے دھیمے لہجے میں کہا۔ "رحمت نے جو کچھ بھی بتایا ہے، مجھے تو اس پر یقین نہیں آیا۔ بھلا تم ایسا کیوں کرو گی۔ یہ تو تمہاری بدنامی کا سبب بھی تھا۔"

"جی ہاں، اس میں سراسر میری بدنامی کا بھی امکان تھا۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "لیکن چونکہ وہ ایک کھلا سچ تھا اس لیے میں نے کسی بات کی پروا نہیں کی تھی۔"

"آخر ہوا کیا تھا صغریٰ......؟" میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں پوچھا۔

"یہ برکت علی کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد کی بات ہے۔" وہ خواب ناک انداز میں مجھے بتانے لگی۔ "ایک رات رحمت علی میرے دروازے پر آیا......"

آئندہ آدھے گھنٹے میں صغریٰ نے مجھے اس افسوس ناک واقعے کی جس تفصیل سے آگاہ کیا، میں اس میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

اس رات صغریٰ گھر پر اکیلی تھی۔ یعقوب کی عمر اس وقت محض آٹھ سال تھی اور وہ اپنے خالو جان محمد کے ساتھ کمال پور گیا ہوا تھا۔ اسے ایک ہفتہ وہاں رہ کر واپس آنا تھا۔ صغریٰ کا شرف آباد میں رکنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ ان دنوں فصل کی کٹائی کا سیزن چل رہا تھا۔ نصف شب سے تھوڑی دیر پہلے جب اس کے دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونک اٹھی۔ دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے پوچھنا ضروری سمجھا۔

"کون ہے......؟"

"میں ہوں بھابی، رحمت علی......!" باہر سے آواز آئی۔

صغریٰ نے اپنے جیٹھ کی آواز کو فوراً پہچان لیا اور قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ "یہاں کیوں آئے ہو رحمت علی؟"

"صغریٰ! میں تم سے چند ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔" رحمت نے ندامت آمیز انداز میں کہا۔ "میں اپنے اب تک کے رویوں پر سخت شرمندہ ہوں۔ یوں سمجھو کہ میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ دروازہ کھول دو۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی مجھے تمہارے دروازے کے سامنے کھڑا دیکھے۔"

صغریٰ کے جی میں پتا نہیں کیا آئی کہ اس نے رحمت علی کے لیے اپنے گھر کا دروازہ کھول دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں صغریٰ کی بیٹھک میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ رحمت علی نے بڑی محبت سے پوچھا۔

"بھابی! تمہیں برکت علی کے بغیر زندگی کیسی لگتی ہے؟"

"بہت ہی اداس اور ویران......!" صغریٰ نے جواب دیا۔

وہ شرمندہ سے انداز میں بولا۔ "میں نے آج تک آپ لوگوں کے ساتھ جو بھی زیادتی کی ہے، میں اس کے لیے سچے دل سے معافی چاہتا ہوں۔ اگر آپ میری درخواست مان لو گی تو میں وعدہ کرتا ہوں، تمہارے ہر نقصان کی تلافی کر دوں گا۔"

صغریٰ کو رحمت کا بدلا ہوا مہذب انداز بڑا عجیب محسوس ہو رہا تھا۔ بہرحال، وہ اسے گھر کے اندر لے آئی تھی اس کی بات سننا بھی ضروری تھا۔ یہ وہ پہلے والا رحمت ہرگز نہیں آ رہا تھا۔ اس نے کھوجتی ہوئی نظر سے اپنے جیٹھ کو دیکھا اور پوچھا۔

"تم کس طرح ماضی کی زیادتیوں کی تلافی کرو گے؟"

"تمہارا خیال رکھ کر۔" رحمت علی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "برکت کو زہریلے ناگ نے ڈس کر تم سے چھین لیا ہے تو کیا ہوا، میں ہوں نا...... اگر تم چاہو گی تو میں تمہیں کبھی برکت کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گا۔"

صغریٰ کو رحمت کی باتوں سے الجھن ہونے لگی۔ وہ بیزاری سے بولی۔ "میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، تم کیا کہہ رہے ہو......؟"

"میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور صغریٰ کے قریب آتے ہوئے بولا۔ "اگر تم تعاون کرو تو ہم دونوں کی زندگی میں بہار آ سکتی ہے۔"

"تعاون......؟" صغریٰ کی چھٹی حس نے اسے وارننگ دی کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ "تم کس قسم کے تعاون کی بات کر رہے ہو؟" اس نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

"باہمی تعاون کی بات کر رہا ہوں صغریٰ" وہ ہونٹوں پر مخصوص مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ "اگر تم راز کو راز رکھنے کا وعدہ کرو تو ہم اسی طرح رات کی تاریکی اور تنہائی میں ملتے رہیں گے۔ اس میں ہم دونوں کا ہی فائدہ ہے......"

صغریٰ کے ذہن میں خطرے کا الارم تو بج ہی چکا تھا، رہی سہی کسر رحمت کے الفاظ نے پوری کر دی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور سخت لہجے میں بولی۔

"رحمت! یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ کیا تم نے مجھے بکاؤ مال سمجھا ہوا ہے؟"

"یہ بکواس نہیں، تمہاری محبت ہے صغریٰ!" وہ مخمور لہجے میں بولا۔ "میں اپنے دل سے مجبور ہو کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ تم خود کو بکاؤ مال نہ کہو۔ میں دل و جان سے تمہاری قدر کرتا ہوں۔ تم میرے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔"

صغریٰ کو یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دشواری نہ ہوئی کہ رحمت علی اس وقت نشے میں بھی تھا۔ اسے گھر کے اندر بلا کر صغریٰ نے بہت بڑی غلطی کی تھی اور اس غلطی کو سنبھالنا بھی اسی کو تھا، وہ قدرے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"رحمت! تم جس طرح خاموشی سے یہاں آئے ہو ویسے ہی چپ چاپ واپس چلے جاؤ، مجھے تم سے یا تمہارے

دلی جذبات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"تم ایک مرتبہ میری بانہوں میں آجاؤ پھر میں تمہارے گھر سے واپس چلا جاؤں گا۔" وہ دونوں بازو وا کر کے صغریٰ کی جانب بڑھا۔

"رحمت! اگر یہ تمہارا کوئی ڈراما ہے تو اس ڈرامے کو یہیں ختم کردو۔" اس نے آخری مرتبہ اپنے جیٹھ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ تمہارے اس فعل سے برکت علی کی روح کو کس قدر اذیت ہورہی ہوگی۔"

"میں زندہ تمہارے پاس موجود ہوں اور تم مرحوم کو یاد کررہی ہو۔" رحمت نے اس کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے کہا۔ "میں بھائی کی روح کو خود جواب دے دوں گا۔ تم میری بات مان لو۔" اس کے ہاتھ اب بھی آگے کو پھیلے ہوئے تھے۔

"مجھے چھونے کی کوشش نہ کرنا رحمت۔" صغریٰ نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ "ورنہ میں شور مچادوں گی۔"

"شور مچانے میں تمہارا بھلا نہیں ہوگا۔" وہ عجیب سے انداز میں ہنسا اور مزید کہا۔ "بلکہ اس طرح تو تم بدنام ہوکر رہ جاؤ گی۔"

"میں...... میں کیوں بدنام ہوں گی۔" صغریٰ نے غصے کے عالم میں استفسار کیا۔ "میرے شور مچانے پر تو لوگ جمع ہوجائیں گے پھر تمہارے کالے کرتوت سب کے سامنے آجائیں گے۔ وہ تم پر ہی تھو کیں گے۔"

"میں چیخ چیخ کر لوگوں کو بتاؤں گا کہ تم بلاتی ہو تو میں یہاں آتا ہوں۔" وہ بڑے مکروہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ "جب گاؤں والوں کو میری زبانی یہ پتا چلے گا کہ میں رات کی تاریکی میں پہلے بھی تمہارے پاس آتا رہا ہوں تو تم کسی شخص کو صورت دکھانے کے قابل نہیں رہو گی۔ تم اندازہ نہیں کرسکتیں کہ تمہاری کس قدر رسوائی ہوگی۔ لوگ مجھ پر نہیں بلکہ تم پر تھو تھو کریں گے۔ جب چاروں طرف سے تم پر انگلیاں اٹھیں گی تو کس کس کا ہاتھ اور کس کس کی زبان کو روکو گی صغریٰ......!"

اس رات صغریٰ نے انتہائی بہادری اور رحمت نے بے حد بزدلی کا ثبوت فراہم کیا تھا۔ صغریٰ نے مجھے بتایا کہ اپنے جیٹھ کی نیت کھل جانے کے بعد اس نے ہر مصلحت اور احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر چیخنے اور چلانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اسے اس بات کی قطعاً کوئی پروا نہیں رہی تھی کہ لوگ اس کے بارے میں کیا سوچتے، ان نازک اور سنگین لمحات میں پہلی ترجیح اپنی عزت کی حفاظت تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ چیخنے کے لیے اپنی زبان اور حلق کو زحمت دیتی، رحمت نے جھپٹ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ پھر وہ صغریٰ کے کان کے پاس اپنا منہ لے کر پسپائی اختیار کرنے والے انداز میں بولا تھا۔

"شور مچانے کی کوشش نہ کرنا...... میں یہاں سے جارہا ہوں۔"

اور پھر وہ واقعی صغریٰ کے گھر سے نکل گیا تھا۔

صغریٰ نے اس واقعے کو مکمل کیا پھر میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولی۔ "اب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے میں رحمت علی سے اس قدر نفرت کیوں کرتی ہوں......؟"

دونوں فریقین نے اپنی اپنی جگہ خود کو بے قصور اور پاک دامن ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں اس بحث میں اپنا قیمتی وقت برباد نہیں کرنا چاہتا تھا کہ ان میں سے کون سچا اور کون جھوٹا اور متذکرہ بالا واقعہ موجودہ معاملے سے براہ راست کوئی تعلق بھی نہیں رکھتا تھا۔ میرے لیے یہی اطمینان کافی تھا کہ اس رات، اپنی اپنی جگہ ان دونوں کی عزت محفوظ رہی تھی لہٰذا صغریٰ کے استفسار کے جواب میں، میں نے بڑا رسان سے کہہ دیا۔

"بڑی اچھی طرح سمجھ گیا ہوں صغریٰ......!"

میرے جواب کی مخفی توانائی سے اسے مطمئن کردیا۔

٭٭٭

اگلے روز میں نے دو اہم کام کیے۔ میں نے ا تھانے کے عملے میں سے دو، دو افراد پر مشتمل دو ٹیمیں بنائیں۔ سادہ لباس ان ٹیموں کو میری ہدایات کی روشنی میں بڑی اہم معلومات اکٹھا کرنا تھیں۔ ایک ٹیم کو کمال پور جاکر امیر خان کی سرگرمیوں پر کڑی نگاہ رکھنا تھی۔ سلمیٰ کے لیے آنے والے جن تین رشتوں کو صاف انکار کردیا گیا تھا، ان میں سے ایک امیر خان بھی تھا۔ جان محمد اور کبریٰ کے بیان کے مطابق، ساجد علی، پرویز احمد اور ان کے گھر والے تو انکار سن کر خاموش ہو بیٹھے تھے تاہم امیر خان اور اس کے گھر والوں نے نہ صرف یہ کہ کافی شور مچایا تھا بلکہ انہوں نے ان لوگوں کا سوشل بائیکاٹ بھی کردیا تھا، اس تناظر میں امیر خان کے غصے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یعقوب ایک طرح سے اس کے نزدیک رقیب روسیاہ کا درجہ رکھتا تھا۔ امیر خان کے دل میں یعقوب کے لیے بے انتہا غم وغصہ بھرا ہوا تھا۔ اگر اسے ایسی کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تو پھر اس معاملے پر اس کے گھر والوں کی جانب سے شدید نوعیت کی برہمی اور نفرت کا اظہار دیکھنے کو کیوں ملتا...... اپنے بیٹے کے رشتے کے ٹھکرائے جانے پر امیر خان کے گھر والوں نے جان محمد کے گھر والوں کا سوشل بائیکاٹ کردیا تھا اور یہ سب کچھ یعقوب اور سلمیٰ کی منگنی کے طفیل ہی ہوا تھا۔

دوسری ٹیم کے ذمے میں نے ایک ایسا کام لگایا تھا جس کا تعلق ہمارے اپنے علاقے شرف آباد ہی سے تھا۔ میری ہدایت کے مطابق قصبے میں گھوم پھر کر اس بات کا پتا لگانا تھا کہ گزشتہ دو چار روز میں علاقے کی کوئی لڑکی تو غائب نہیں ہوئی۔ گم شدہ یعقوب کے تایا رحمت علی کے بیان کردہ اندیشے کو یکسر نظر انداز کردینا مناسب تھا اور نہ ہی معقول بات۔ عین ممکن تھا کہ یعقوب قصبے کی کسی لڑکی کو لے کر کہیں نکل گیا ہو اور گھوڑے کی المناک موت والا ڈراما اس نے اس لیے رچایا ہو کہ اس کی گمشدگی کے حوالے سے لوگوں کا دھیان راہ زنی کی کسی واردات کی طرف جائے اور اصل حقیقت سے واقف نہ ہوسکے۔ ویسے ایک بات میرے ذہن میں کھٹک رہی تھی اور وہ یہ کہ اگر شرف آباد سے کوئی لڑکی غائب ہوئی ہوتی تو یہ بات اب تک چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔

جب یہ دونوں ٹیمیں اپنے مشن پر روانہ ہوگئیں تو میں اپنے کمرے میں بیٹھ کر حالات وواقعات پر غور کرنے لگا۔ معاملہ خاصا الجھ کر رہ گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یعقوب کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا تھا۔ اس تمام تر سوچ بچار کے دوران میں بھی رحمت علی کو میں نے ایک لمحے کے لیے اپنے ذہن سے غائب نہیں ہونے دیا۔ اس بندے نے صغریٰ کی نفرت کے حوالے سے مجھے جو کہانی سنائی تھی، صغریٰ کا بیان اس کے انتہائی مخالف جاتا تھا۔ اگر رحمت علی کی کہانی کو درست تسلیم کرلیا جاتا تو پھر صغریٰ ایک عیار اور چالباز عورت کی شکل میں سامنے آتی تاہم اس کا یعقوب کی گمشدگی سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا تھا اور اگر صغریٰ کے بیان کو سچ مان لیا جاتا تو پھر کیس میں ایک سنسنی خیز موڑ کا امکان نظر آتا تھا لہٰذا رحمت علی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ اپنی بے عزتی اور ناآسودہ خواہشات کی عدم تکمیل کے بدلے میں صغریٰ کو ذہنی اذیت میں مبتلا کرنے اور اسے کوئی دلی صدمہ پہنچانے کی خاطر کوئی بھی الٹا سیدھا قدم اٹھا سکتا تھا اور انہی الٹے سیدھے قدموں میں ایک قدم یعقوب کو جانی نقصان پہنچانا بھی ہوسکتا تھا۔

رحمت علی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنے طور پر یعقوب کو تلاش کرنے کی حتی الامکان کوشش کرے گا اور میں نے اسے اس بات کی اجازت بھی دے دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک سادہ لباس اہلکار کو اس کی خفیہ نگرانی پر بھی مامور کردیا تاکہ اس کی حرکات وسکنات کی مجھے خبر ہوتی رہے۔ اگر وہ یعقوب کی گمشدگی میں کسی بھی طور ملوث تھا تو یہ بات زیادہ عرصے تک مجھ سے بھی چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ میں نے جس اہلکار کو اس کی نگرانی کا کام سونپا تھا، وہ نہایت مستعد اور بیدار مغز شخص تھا۔

صغریٰ نے گزشتہ روز مجھے گم شدہ یعقوب کے دو دوستوں نور شاہ اور حنیف خان کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ صغریٰ کے مطابق یعقوب کی زیادہ میل جول انہی دو بندوں کے ساتھ تھی۔ دوپہر کے بعد میں نے ایک بندہ بھیج کر ان دونوں کو اپنے پاس بلالیا۔ حنیف خان اور نور شاہ کا تعلق چونکہ شرف آباد ہی سے تھا لہٰذا انہیں ڈھونڈ کر تھانے پہنچانے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں انہیں اصل موضوع پر لے آیا۔ میں نے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لینے کے بعد سوال کیا۔ "کیا تم لوگ یہ نہیں چاہتے کہ تمہارا دوست جلد از جلد بازیاب ہوجائے؟"

"کیوں نہیں جناب!" نور شاہ جلدی سے بولا۔ "ہم بھلا ایسا کیوں نہیں چاہیں گے۔ ہم تو یعقوب کے لیے بہت زیادہ فکرمند ہیں۔"

"بہت زیادہ فکرمند ہیں۔" میں نے اسی کے الفاظ دہراتے ہوئے نور شاہ سے پوچھا۔ "صرف فکرمند ہی ہیں یا یہ بھی پتا چلانے کی کوشش کی ہے کہ وہ گیا کہاں؟"

"جی، ہم نے اپنے طور پر یعقوب کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی ہے مگر ہمیں کامیابی نہیں ہوئی۔" حنیف خان دکھی لہجے میں بولا۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آرہا، وہ کہاں غائب ہوگیا ہے۔"

"ہوں......!" میں گہری، ٹٹولنے والی نظر سے باری باری ان دونوں کو گھورنے لگا۔

صغریٰ بی بی کے مطابق حنیف خان اور نور شاہ سے یعقوب کی گہری دوستی تھی لہٰذا انہی کو سب سے زیادہ یعقوب کی خبر بھی ہونا چاہیے تھی۔ شرف آباد میں کسی سے یعقوب کا زیادہ ملنا جلنا نہیں تھا۔ یہ بات بھی میرے ذہن میں تھی کہ بعض اوقات قریبی دوست ہی کام دکھا جاتے ہیں۔

وہ دونوں زیادہ دیر تک میری نظر کی تاب نہ لاسکے اور حنیف خان جلدی سے بولا۔ "تھانے دار صاحب! انسان اسی حد تک جاسکتا ہے جہاں تک اس کی پہنچ ہوتی ہے۔ ہم نے یہاں یعقوب کی تلاش میں شرف آباد کا چپا چپا چھان مارا ہے۔ پچھلے دو تین دن میں ہم سے جو ہوسکتا تھا، وہ کرکے دیکھ لیا ہے لیکن یعقوب ہمیں کہیں نہیں ملا۔ اس کے بعد تو ہم مجبور ہیں۔"

"جب ہمیں پتا چلا کہ یعقوب کا گھوڑا ادھر کمال پور کے قریب جنگل میں مردہ پایا گیا ہے تو ہم نے اس کی تلاش میں جنگل کا رخ بھی کیا تھا۔" نور شاہ اپنی کارگزاری کو آگے

بڑھاتے ہوئے بولا۔ "لیکن ہمیں ہر جگہ ناکامی کا منہ ہی دیکھنا پڑا۔ تھک ہار کر ہم نے خاموشی اختیار کرلی لیکن ہمارے دل اپنے یار کے لیے بہت پریشان ہیں۔ ہم دن رات یعقوب کی بہ خیریت واپسی کے لیے دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔"

بعدازاں ان سے ہونے والی مزید گفتگو میں مجھے پتا چلا کہ وہ لوگ ہمارے واپس آنے کے بعد جنگل کی طرف گئے تھے۔ جب ہمیں آدھے پونے دن کی تلاش بسیار کے بعد جنگل میں یعقوب کا کوئی نام و نشان نہیں ملا تھا تو انہیں کوئی سراغ کیسے مل سکتا تھا۔

"دیکھو......" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اگر واقعی تم دونوں کی بھی خواہش ہے کہ میں جلد از جلد تمہارے دوست کو بازیاب کرنے میں کامیاب ہوجاؤں تو پھر تمہیں میرے ساتھ بھرپور تعاون کرنا ہوگا۔"

"آپ حکم کریں تھانے دار صاحب۔" نور شاہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہم ہر تعاون کے لیے تیار ہیں۔"

میں نے ان سے اس طرح سوالات کرنا شروع کیے کہ میرا مقصد بھی پورا ہوجائے اور انہیں بھی محسوس نہ ہو کہ میں ان سے کوئی شک بھری تفتیش کررہا ہوں۔

"کیا تم یہ بات جانتے تھے کہ یعقوب کمال پور جانے والا ہے؟"

"جی ہاں۔" نور شاہ نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "یعقوب نے کمال پور جانے والی بات خود ہمیں بتائی تھی۔"

"کب......!" میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ "اس نے یہ بات تم لوگوں کو کب بتائی تھی؟"

"کمال پور جانے سے ایک دن پہلے۔" حنیف خان نے بتایا۔ "رات کو ہماری ملاقات ہوئی تھی اور اگلی صبح وہ کمال پور روانہ ہوگیا تھا۔"

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پوچھا۔ "کیا اس نے تمہیں یہ بھی بتایا تھا کہ وہ کمال پور کیوں جارہا ہے؟"

"جی، اس نے بتایا تھا کہ کسی ضروری کام سے اسے کمال پور جانا ہے۔" حنیف خان گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "اس کا کہنا تھا کہ وہ رات تک واپس شرف آباد آجائے گا مگر......" لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک افسردہ سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ "مگر وہ ابھی تک واپس نہیں آیا......"

میں نے سردست اس کی افسردگی کو نظرانداز کرتے ہوئے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔ "کیا یعقوب نے "ضروری کام" کی وضاحت بھی کی تھی جس کی وجہ سے اسے کمال پور جانا پڑا تھا؟"

"جی ہاں!" اس بار نور شاہ نے جواب دیا۔ "ہمارے پوچھنے پر اس نے بتایا تھا کہ وہ اپنی خالہ سے رقم لینے کمال پور جارہا ہے۔"

میں اس کی بات سن کر اچھل پڑا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"جی تھانے دار صاحب۔" حنیف خان نے نور شاہ کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "اس نے ہمیں یہی بتایا تھا۔"

"یعنی کہ......اس نے بتایا تھا......وہ اپنی خالہ سے رقم لینے کمال پور جارہا ہے؟" میں نے باری باری تصدیق نظر سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"بالکل......" نور شاہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "آپ کو اگر ہماری بات کا یقین نہیں آرہا تو ہم قسم کھانے کو تیار ہیں۔"

"واقعی...... مجھے آپ لوگوں کی بات کا یقین نہیں آرہا۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "کیونکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔"

"اور وہ حقیقت کیا ہے تھانے دار صاحب......؟" حنیف خان سوچتی ہوئی نظر سے مجھے تکنے لگا۔

"حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی خالہ کو رقم دینے کمال پور گیا تھا۔" میں نے ٹھوس انداز میں بتایا۔

"کیا......!" اب ان کے چونکنے کی باری تھی۔ "پھر اس نے ہم سے جھوٹ کیوں بولا؟"

"یہ تو تم ہی بتاؤ گے۔" میں نے تولتی ہوئی نظر سے انہیں دیکھا۔ "ہوسکتا ہے، اسے تم لوگوں پر اعتبار نہ ہو......؟"

"بے اعتباری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" حنیف خان بڑے اعتماد سے بولا۔ "ہم تینوں دوست ایک دوسرے سے جھوٹ بولنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے اور آپ بتارہے ہیں، یعقوب نے ہم سے غلط بیانی کی تھی۔"

"میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ رہا ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ ساری باتیں مجھے یعقوب کی ماں صغریٰ بی بی نے بتائی ہیں۔" میں نے لمحاتی توقف کرکے باری باری سوالیہ نظر سے ان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"کیا اس سلسلے میں تم لوگوں کی صغریٰ بی بی سے کوئی

ہوئی ہے؟"

"نہیں جناب۔" نور شاہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ہم نے صغریٰ چاچی سے کچھ بھی پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں کی تھی۔ یعقوب نے ہمیں جو بھی بتایا، ہم نے اس پر یقین کرلیا تھا۔"

"پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یعقوب نے تم لوگوں سے غلط بیانی کیوں کی؟" میں اپنے پوائنٹ پر واپس آگیا۔ "میرا ذہن پچھلے آدھے گھنٹے میں اس کی صرف ایک ہی وجہ تلاش کرنے میں کامیاب ہوسکا ہے۔"

"کون سی وجہ؟" نور شاہ نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

"یہی کہ......اگر اس نے سچ بات بتادی تو اس رقم کی وجہ سے شرف آباد سے کمال پور کی طرف جاتے ہوئے اس کے ساتھ کوئی بھی حادثہ پیش آسکتا ہے۔" میں نے اپنی سوچ کی روشنی میں کہا۔ "اور اسے اس قسم کا خطرہ شرف آباد میں رہنے والے کسی شخص سے تھا اور......عین ممکن ہے کہ وہ شخص تم دونوں میں سے کوئی ہو......؟"

میں حالات و واقعات کی روشنی میں بالکل درست تجزیہ پیش کررہا تھا۔ یعقوب نے غلط بیانی کی اور وہ شرف آباد سے کمال پور تک صحیح سلامت پہنچ گیا تھا لیکن واپسی کے راستے میں اسے ایک اندوہناک سانحہ پیش آگیا تھا اور مجھے صد فیصد یقین تھا کہ یعقوب کے ساتھ جو بھی ہوا تھا وہ انہی بیس ہزار روپے کی وجہ سے ہوا تھا۔ اب مجھے یہ پتا چلانا تھا کہ رقم والی بات ان دونوں کے علاوہ اور کس کس کو معلوم تھی۔

وہ دونوں بڑی بڑی قسمیں کھا کر مجھے اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کرنے لگے۔ میں چند لمحات تک تو مختلف زاویوں سے، ان سے کڑے سوالات کرتا رہا پھر میرے پیشہ ورانہ تجربے نے بتایا کہ وہ کسی قسم کی دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہے لہٰذا میں نے بھی اپنے انداز میں نرمی بھرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تم لوگوں نے کسی اور سے بھی اس بات کا ذکر کیا تھا کہ یعقوب اپنی خالہ کبریٰ بی بی سے کوئی بھاری رقم لے کر آنے والا ہے؟"

"ہم نے تو کسی سے ذکر نہیں کیا مگر......"

حنیف خان کچھ کہتے کہتے اچانک رک گیا تو میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔ "مگر کیا حنیف خان؟"

"مگر یہ بات ہمارے علاوہ بھی کسی کو پتا تھی......" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

"کس کو...... اور کیسے......؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"وہ جناب، بات دراصل یہ ہے کہ......" نور شاہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "جب یعقوب ہمیں اپنے کمال پور جانے کے بارے میں بتارہا تھا تو اس وقت نواجا بھی ہمارے پاس ہی کھڑا تھا۔"

"کھڑا نہیں تھا بلکہ وہ اسی وقت آیا تھا جب یعقوب نے کمال پور جانے کی بات شروع کی تھی۔" حنیف خان نے نور شاہ کی بات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"جی...... جی ہاں۔" نور شاہ نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ "حنیف خان بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یعقوب نے کمال پور جانے کی بات شروع کی ہی تھی کہ نواجا وہاں آگیا تھا۔"

"تو اس کا مطلب ہے، یعقوب نے نواجا کو سنانے کے لیے وہ جھوٹ بولا تھا۔" میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہوسکتا ہے جی، یہی بات ہو۔" نور شاہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "نواجا ویسے بھی کوئی اچھا بندہ نہیں ہے۔"

"تم دو تین دن سے اتنی اہم بات اپنے دل میں دبائے بیٹھے تھے۔" میں نے خفگی آمیز نظر سے باری باری ان دونوں کو گھورا۔ "جلدی بتاؤ، یہ نواجا ہے کون اور کہاں ملے گا؟"

"نواجا کا اصل نام نواز تیلی ہے جی۔" نور شاہ نے بتایا۔ "وہ ادھر شرف آباد ہی میں رہتا ہے جناب۔ اس کے باپ سرفراز تیلی کا اپنا کولہو ہے جی۔"

ساری کہانی میری سمجھ میں آگئی تھی۔ نواجا کی آمد پر اگر یعقوب نے کمال پور جانے کے حوالے سے اپنے دوستوں سے غلط بیانی کی تھی تو اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ نواجا ہی سے اس بات کو چھپانا چاہتا تھا کہ وہ ایک بھاری رقم لے کر کمال پور جارہا ہے۔ یقیناً اسے نواجا کی طرف سے کوئی خطرہ لاحق تھا۔ ویسے ابھی تھوڑی دیر پہلے نور شاہ نے بھی یہی بتایا تھا کہ نواجا کوئی اچھا بندہ نہیں ہے۔ نواجا، یعقوب کی گمشدگی اور اس کے گھوڑے کے حسرت ناک انجام والے معاملے میں ملوث تھا یا نہیں اس امر کی تصدیق صرف دو افراد ہی کرسکتے تھے۔ نمبر ایک یعقوب اور نمبر دو نواجا۔ یعقوب تو پچھلے تین دن سے غائب تھا البتہ نواجا بہ آسانی مجھے دستیاب ہوسکتا تھا۔ نواجا کو ٹارگٹ بناتے ہوئے میں نے یعقوب کے دوستوں سے سوال کیا۔

"تم لوگوں نے آخری مرتبہ نواجا کو کب اور کہاں دیکھا تھا؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے جناب۔" حنیف خان نے جلدی سے کہا۔ "میں نے اسے کولہو پر دیکھا تھا۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ کام میں جتا ہوا تھا۔"

نواز تیلی عرف نواجا میری نظر میں مشکوک ہو گیا تھا لہٰذا میں فوراً سے پیشتر اسے اپنے سامنے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس سے کی جانے والی پوچھ تاچھ مجھے اس کیس کے منطقی انجام تک پہنچا سکتی تھی۔ میں نے دو کانسٹیبلوں کو اپنے ساتھ لیا اور حنیف خان اینڈ کمپنی کی معیت میں نواجا کی طرف روانہ ہو گیا۔ دس منٹ کے بعد ہم سرفراز تیلی کے کولہو سے سو قدم کی دوری پر تھے۔

نور شاہ نے کولہو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "تھانے دار صاحب! وہ دیکھیں، جس بندے نے کالا کرتہ پہنا ہوا ہے نا...... وہی نواجا ہے۔ اس کا باپ اس وقت کولہو پر نظر نہیں آرہا۔"

میں نے ویسے بھی اس کے باپ کا اچار نہیں ڈالنا تھا۔ میرا ٹارگٹ صرف اور صرف نواجا تھا اور وہ اس وقت میری نظر کے سامنے تھا۔ میں اپنے آدمیوں کے ساتھ تیزی سے کولہو کی طرف بڑھنے لگا۔

پتا نہیں، نواجا کی چھٹی حس تیز تھی یا بے خیالی میں اس نے گردن اٹھا کر ہماری جانب دیکھا تھا۔ ہم اس وقت یونیفارم میں تھے۔ تین باوردی پولیس والوں کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر وہ بری طرح چونک اٹھا پھر اس نے بدحواسی میں ایک ایسی حرکت کی جس نے اس کے مجرم ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔

ہم پر نگاہ پڑتے ہی وہ سب کام چھوڑ چھاڑ کر ایک جانب کھیتوں کی سمت بھاگ اٹھا تھا مگر میں کہاں اسے فرار ہونے کا موقع دینے والا تھا۔ دس منٹ کے اندر ہی میں نے اپنے آدمیوں کی مدد سے گھیر گھار کر نواجا کو ہتھکڑی لگا دی۔ اس "کارِ خیر" میں نور شاہ اور حنیف خان نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ ڈالا تھا۔

ٌٌٌ

نواز تیلی عرف نواجا ایک کچا مجرم تھا۔ وہ دس پندرہ منٹ سے زیادہ تفتیش کے مختلف مراحل کا "سامنا" نہ کر سکا اور اس نے زبان کھول دی۔ اپنی بزدلی اور ناپختہ پن کا مظاہرہ تو وہ کولہو پر ہمیں دیکھتے ہی کر چکا تھا جب پولیس پر نگاہ پڑتے ہی اس نے راہِ فرار اختیار کی تھی۔ ہمیں اس پر زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی اور اس نے یعقوب کے قتل کا اقرار کر لیا۔

واقعات کی تفصیل کے مطابق اس کے دل میں [illegible] آ گیا تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ یعقوب کمال پور سے بھاری رقم لے کر آنے والا ہے تو اس نے اپنے "پیٹی بھائی" سخی محمد کے ساتھ مل کر یعقوب کو لوٹنے کا منصوبہ بنا لیا۔ [illegible] بھی آوارہ اور بدقماش شخص تھا۔ دونوں تیز دھار کلہاڑوں سے لیس ہو کر جنگل کے اس حصے میں پہنچ گئے جہاں [illegible] یعقوب کو گزر کر شرف آباد کی طرف آنا تھا۔ انہوں نے اپنے چہروں کو ڈھاٹوں کے پیچھے چھپا رکھا تھا تاکہ یعقوب انہیں پہچان نہ سکے۔ انہوں نے واردات کے لیے جان بوجھ کر ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جو کمال پور کے نزدیک تھی تاکہ اس واقعے کے حوالے سے شرف آباد کے کسی آدمی پر شک [illegible] آئے مگر وہی بات کہ جب وقت ساتھ نہ دے تو بڑی بڑی پلاننگ خاک میں مل کر رہ جاتی ہے۔ نواجا اور اس کے شریک جرم سخی محمد کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ نواجا کی نشان دہی پر میں نے اسی رات سخی محمد کو بھی گرفتار کر لیا۔

جب میرے شکنجے میں آنے کے بعد انہوں نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں یعقوب کی لاش کا سراغ لگائے بغیر ان کی جان چھوڑ دیتا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ یعقوب سے "معرکے" کے دوران میں اس کا گھوڑا تو شدید زخمی ہوا ہی تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یعقوب بھی جان کی بازی ہار گیا تھا۔ لب دم زخمی گھوڑے کو انہوں نے جنگل ہی میں چھوڑ دیا اور یعقوب کی لاش کو نہر کے اندرونی حصے میں گڑھا کھود کر دفن کر دیا۔

یہ ان کی ایک سنگین غلطی تھی۔ اگر وہ یعقوب کی لاش بھی جنگل میں ہی چھوڑ دیتے تو شاید میری تفتیش شرف آباد کا رخ نہ کرتی۔ جب مردہ گھوڑے کے قریب یعقوب کی لاش پڑی ملتی تو یہ سمجھ کر صبر کر لیا جاتا کہ یعقوب راہ زنوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ انہوں نے اسے لوٹنے کے بعد قتل کیا یا قتل کرنے کے بعد لوٹا اور جائے وقوعہ سے فرار ہو گئے۔

کوئی کچا مجرم ہو یا پکا لیکن وہ کہیں نہ کہیں کوئی ایسی غلطی ضرور کرتا ہے جس سے اس کا یا اس کے جرم کا سراغ لگانے میں بہت مدد ملتی ہے۔ اس معاملے میں بھی یہی ہوا تھا انسان چاہے جتنی بھی مضبوط پلاننگ کر لے مگر اوپر بھی کوئی بیٹھا ہے۔ قدرت اپنے انداز میں مصروف عمل رہتی ہے!! سیدھی بات یہ کہ......

تدبیر کنند بندہ
تقدیر کنند خندہ

(تحریر: حسام بٹ)

چور کا بھائی

بابر نعیم

کسی کی زندگی میں جھانکنا جہاں اخلاقی جرم ہے وہیں کبھی کبھی اپنی ہی زندگی کے ہی پوشیدہ گوشے تہ و بالا ہو جاتے ہیں مگر... ضروری نہیں کہ یہ فارمولا آپ کو ہمیشہ درپیش رہے... اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ آئینے سے ملاقات ہو جاتی ہے اور انسان اپنا ہی عکس دیکھ کر یوں گھبرا جاتا ہے کہ جانا کہیں ہوتا ہے اور قدم کہیں پڑتا ہے... ایسے میں کوئی اپنی منزل تک کیسے پہنچ سکتا ہے۔

[illegible] والی پراسرار شخصیت کی ایک خوفناک جھلک

اسپتال سے رخصت کرتے وقت ڈاکٹر نے ہیکٹر کو گھر جا کر مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ چند روز پہلے اس پر دل کا دورہ پڑا تھا اور وہ نہایت نازک حالت میں اسپتال لایا گیا تھا۔

ڈاکٹر نے اسے گھر جانے اور آرام کرنے کا مشورہ تو دے دیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ کون سے گھر جائے۔ کیونکہ اس کا اپنا کوئی گھر نہیں تھا۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ شہر میں اس کی درجن بھر سابق بیویاں موجود تھیں، پر وہ ان میں سے کسی کے پاس جانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ اسپتال سے باہر نکلنے کے بعد اس

نے بچی کھچی رقم کا اندازہ لگایا۔ ریزگاری کے علاوہ اس کی جیب میں کل سات سو پچاسی ڈالر تھے۔ پس اس نے ایک سستا سا کمرا کرائے پر لے لیا تاکہ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق وہاں آرام کرسکے، آرام کے علاوہ اسے تحفظ کی بھی ضرورت تھی۔ وہ ان درجنوں بیوہ خواتین کی نظروں سے دور رہنا چاہتا تھا جنہیں اس نے شادی کا لالچ دے کر دھوکا دیا تھا۔ اس وقت وہ اس پرندے کے مانند تھا جس کے پر کاٹ دیے گئے ہوں۔ اس کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں تقریباً ناکارہ ہوچکی تھیں۔ کئی ہفتوں تک بستر پر پڑا وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتا رہا۔ اب وہ پستول یا چاقو اپنے ہاتھ میں پکڑ کر کسی کو دھمکانے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔ بڑا ڈاکا تو دور کی بات تھی اب وہ چھوٹی موٹی لوٹ مار بھی نہیں کرسکتا تھا کیونکہ اگر اس دوران میں اس پر دل کا دورہ پڑ گیا تو بچنا محال ہو جاتا۔ بسا اوقات وہ اپنے بھاری بھرکم اور مضبوط جسم کو ٹٹول کر سوچتا کہ گزشتہ پچاس سال سے جو جسم اس کا پورا پورا ساتھ دے رہا تھا۔ آج کیوں نہیں دے سکتا؟ وہ کیوں ناکارہ ہوگیا؟ وہ یہ بات تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا کہ وہ بیمار ہے لیکن جب وہ ہال سے گزر کر غسل خانے کی طرف جاتا تو کبھی کبھی سینے میں اٹھنے والا اچانک درد اسے یاد دلاتا کہ وہ واقعی بیمار ہے۔

زیادہ تر وہ سویا رہتا یا مطالعہ کرتا رہتا اور ذہن کو تفکرات سے آزاد رکھنے کی کوشش کرتا۔ کمرے کا کرایہ دس ڈالر فی ہفتہ تھا اور مزید گیارہ ڈالر فی ہفتہ کے عوض لینڈ لیڈی اسے دو وقت کا کھانا اور پڑھنے کے لیے رسالے اور اخبار مہیا کردیتی تھی۔ دراصل وہ ایسے خاموش طبیعت اور امن پسند کرائے دار سے بہت خوش تھی۔

ہیکٹر کے لیے فوری طور پر پیسوں کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ موجودہ رقم کم از کم چھ ماہ تک چل سکتی تھی لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟ نوکری کا تصور اس کے لیے موت سے زیادہ اذیت ناک تھا۔ دولت، شراب اور عورت اس کی زندگی کے محور تھے۔ ماضی میں اسے کبھی ان چیزوں کی کمی محسوس نہیں ہوئی لیکن اب صورت حال مختلف تھی، اس کی خود اعتمادی اور قوت عمل قصہ ماضی بن چکی تھی۔

شام کے وقت وہ اپنے کمرے کی اکلوتی کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر باہر کا نظارہ کرتا رہتا۔ گلی کی دوسری جانب ایک خوبصورت سی کئی منزلہ عمارت تھی جس کے ایک کونے پر ٹیلی فون بوتھ بنا ہوا تھا۔ گلی میں چلنے والے لوگوں کو دیکھ کر وہ سوچتا کہ ان کی جیبیں نوٹوں سے بھری ہوں گی اور سوچنے کی بات صرف یہ تھی کہ ان نوٹوں کو اپنی جیب میں کس طرح منتقل کیا جائے تاکہ اس کا گلشن بھی سرسبز و شاداب رہے۔ اب کسی ایسے منصوبے کی ضرورت تھی جس میں طاقت کے استعمال کی ضرورت نہ ہو۔ تک اس نے قوت بازو پر بھروسا کیا تھا۔ پر پیچ اور عیار منصوبے اس کی نظر میں بزدلی کی علامت تھے لیکن اب وہ قوت بازو کے بجائے دماغ استعمال کرنے پر مجبور تھا۔

ایک روز اس نے رسالے کے اندر ایک ایسے آلۂ سماعت کا اشتہار پڑھا جس کی مدد سے سوفٹ کے دائرے میں ہونے والی گفتگو سنی جاسکتی تھی۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس نے یہ آلہ خریدنے کا فیصلہ کرلیا اور اگلے روز بیس ڈالر اور ایک خط آلہ فروخت کرنے والی کمپنی کو بھیج دیا۔ ایک ہفتے بعد اسے ایک بڑا سا پیکٹ موصول ہوگیا۔ اس نے جلد جلدی پیکٹ کھولا۔

وہ ایک بیضوی سا پیالہ نما آلہ تھا جو تین ٹانگوں والے اسٹینڈ پر نصب تھا۔ بیضوی پیالے کے اندر ریڈیو کے والو سے ملتی جلتی کوئی چیز لگی ہوئی تھی۔ آلے کی پشت میں ایک لمبا سا تار تھا جس کے سرے پر اسٹیتھسکوپ سے مشابہ ایئر فون لگے ہوئے تھے۔ طریقۂ استعمال بہت سیدھا سادا تھا۔ ایئر فون کو کانوں سے لگا کر والو کا رخ مطلوبہ سمت میں کردیا جائے تو آواز آنی شروع ہوجائے گی۔

ہیکٹر نے آلۂ سماعت کو کھڑکی کے قریب رکھ دیا اور ایئر فون کو کانوں سے لگا کر والو کا رخ سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی دو خواتین کی طرف کردیا۔ ایک عورت کہہ رہی تھی۔

”صرف تین ڈالر۔ میں نے کیشئر سے کہا کہ ڈبے پر لکھی ہوئی قیمت بھول جاؤ۔ اس اشتہار میں اس کی قیمت ڈالر لکھی ہے۔ اس سے زیادہ ایک پینی......“

اس نے آلے کا رخ تین چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کی طرف کردیا۔

”آئی۔ جے۔ کے۔ ایل۔ این...... تم نے ایم چھوڑ دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موٹا ماروِن تمہارا بوائے فرینڈ ہے۔ آہا......“

ہیکٹر اس تجربے سے اس قدر خوش ہوا کہ دل تو کیا دل دھڑکن بھی بھول گیا۔ وہ کئی گھنٹوں تک مختلف لوگوں کی آواز سنتا رہا۔ چار بجے تک وہ خاصا تھک گیا تھا۔ اس نے آلۂ سماعت چھپا کر رکھ دیا اور سو گیا۔

شام کے چھ بجے لینڈ لیڈی نے اسے جگا دیا۔ سات بجے کھانا کھانے کے بعد وہ نصف گھنٹے تک ریڈیو سنتا رہا۔ جب سوا اندھیرا پھیل گیا اور سامنے کی عمارت کی کھڑکی میں روشنی نظر آنے لگی تو اس نے اپنے کمرے کی روشنی گل کردی اور آلۂ سماعت لے کر کھڑکی کے قریب بیٹھ گیا۔ ہر چند وہ ا...

...یاں کے اندر کسی شخص کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔

”ٹی وی کے پاس سے اٹھ جاؤ۔ کتنی مرتبہ سمجھایا ہے کہ اسکول کا کام ختم کرو پھر ٹی وی دیکھو۔ جلدی سے کام ختم کرو۔ اب دوبارہ کہنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔“

دوسری کھڑکی۔

”ڈارلنگ! تم نے غور سے اس کا چہرہ نہیں دیکھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ آئل پینٹ کروا کے آئی ہے۔ سچ کہتی ہوں اس کی عمر پچاس سال سے ایک دن بھی کم نہیں...... لیکن پندرہ سال کی چھوکری بننے کی کوشش کر......“

تیسری کھڑکی۔

”نہیں دکھا سکتا۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ کیا تم گھر میں بیٹھ کر تفریح نہیں کرسکتیں۔ ٹی وی ہے، ریڈیو ہے، تمہاری فرمائشیں تو مجھے پاگل کردیں گی......“

چوتھی کھڑکی سے ٹی وی پر چلنے والی فلم کے ڈائیلاگ سنائی دیے۔

”فیصلے کا دارومدار تمہاری مرضی پر ہے پارٹنر یا ایک ہوٹل، ایک گھوڑا اور سونا میرے حوالے کردو یا اس چاقو سے میں تمہارا نرخرہ کاٹ دوں گا۔ میں نیویارک سے کیلی فورنیا تک بے شمار لوگوں کو قبرستان میں آباد کرچکا ہوں۔ ایک اور سہی۔ میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ قانون میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

پانچویں کھڑکی۔

”ڈیڈی اگلے ہفتے میری سالگرہ ہے۔ اس مرتبہ میں کوئی اچھا سا تحفہ لوں گی اور کیک کے لیے آج ہی......“

چھٹی کھڑکی تیسری منزل پر واقع تھی۔ پہلے پہل ہیکٹر یہی سمجھا کہ وہ وہاں سے بھی کسی ٹی وی کے ڈائیلاگ سن رہا ہے۔

”پیسے دیکھ ہی لیے تم نے! ٹھیک ہے برتھا! چلو اچھا ہوا تمہیں خود بخود یہ راز معلوم ہوگیا۔ اب بتاؤ اس میں کیا برائی ہے؟“

”ہاں ہاں، تم اور کہہ بھی کیا سکتے ہو ان میں کیا برائی ہے۔ فرینک کیا تم پاگل تو نہیں ہوگئے؟ بیس ہزار ڈالر معمولی رقم نہیں۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اتنی بڑی رقم کی گمشدگی کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں ہوگا؟ ایسی صورت میں بینک اب تک دیوالیا ہوگیا ہوتا۔ یقیناً تم جیل چلے جاؤ گے۔“

”ٹھیک ہے، لیکن ہر شخص اتنا ذہین اور دلیر نہیں ہوتا۔ منصوبہ اتنا عمدہ ہے کہ بڑے سے بڑا آڈیٹر بھی پتا نہیں لگا سکتا۔ اگر تمہیں کبھی بھوکی چوہیا کی طرح ہر جگہ سونگھنے کی عادت نہ ہوتی تو تمہیں رقم کے بارے میں کبھی پتا نہ چلتا۔“

”ٹھیک ٹھیک بتاؤ فرینک! تم اتنی بڑی رقم کو کس طرح خرچ کرنا چاہتے ہو؟“

”فی الحال میں اس رقم کو خرچ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ پروگرام یہ ہے کہ ہر مہینے اپنے سیونگ اکاؤنٹ سے ایک ہزار ڈالرز نکالتا رہوں گا اور جب میرے پاس مجموعی طور پر پچاس ہزار ڈالرز ہوجائیں گے تو پھر یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اگر تم ساتھ جانا چاہو تو بڑی اچھی بات ہوگی ورنہ......“

”میں...... تمہارے ساتھ جاؤں، کہاں......؟ جیل کے اندر؟“

”برتھا، میں کبھی تم پر اصلیت ظاہر نہ کرتا...... میں تمہیں صرف یہ بتاتا کہ میری لاٹری نکل آئی ہے۔ میری بات سنو بے بی، کیا تم بتا سکتی ہو کہ ہمارے اندر کیا خامی یا خرابی ہے؟ ہماری زندگی کولہو کے بیل کی طرح ایک محور پر گھوم رہی ہے۔ کام کرنا، کھانا اور سو جانا۔ لعنت ہے ایسی زندگی پر جس میں کوئی خوشی، کوئی ولولہ اور کوئی رنگینی نہ ہو۔ ذرا سوچو، ہم دونوں نوکری کرتے ہیں۔ شام کو تھکے ہوئے گھر آتے ہیں اور کھانا کھا کر سو جاتے ہیں۔ ہمیں ازدواجی زندگی کی کوئی خوشی میسر نہیں۔ کیا تم یہ چاہتی ہو کہ ہم اسی طرح بوڑھے ہوجائیں؟ میں ایک خستہ حال بینک کیشئر کی حیثیت سے ریٹائر ہونا یا ساٹھ سال کی عمر میں کسی چھوٹی سی برانچ کا منیجر بننا ہرگز پسند نہیں کروں گا۔“

”لیکن فرینک، یہ تو کھلی چوری ہے۔“

”ایک لحاظ سے اسے چوری بھی کہا جاسکتا ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر بینک کے لاکھوں ڈالر کی حفاظت کی، میں نے اپنے پیٹ میں گولی کھائی اور ڈاکوؤں کی کوشش ناکام بنادی۔ بتاؤ اس کارنامے کے بدلے بینک نے مجھے کیا دیا؟ خوشنودی کا ایک خط!“

”انہوں نے تمہیں دو ماہ کی بیماری کی چھٹی دی اور اسپتال کا بل ادا کیا۔“

”یقیناً میری سات پشتوں پر احسان کیا۔ اگر اسپتال کا بل بھی ادا نہ کرتے تو کیا مجھے مرنے کے لیے چھوڑ دیتے؟ برتھا، تمہارے ساتھ بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں دس سال سے یورپ کی سیاحت کے خواب دیکھ رہا ہوں۔ وہاں میں مصوری کا شوق بھی پورا کرسکوں گا۔“

”فرینک، فرینک! خدا کے لیے سمجھنے کی کوشش کرو۔ اب بھی موقع ہے، رقم واپس رکھ دو ورنہ بعد میں پچھتانا پڑے گا۔“

”ڈارلنگ! اب میں رقم واپس نہیں رکھ سکتا۔ اس کا مطلب اعتراف جرم کے سوا کچھ نہیں ہوگا اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں ایسی حماقت کرنا ہی نہیں چاہتا۔ کیا تمہیں یہ بات سمجھ میں

نہیں آتی کہ خوشی حاصل کرنے کا ایسا کوئی اور موقع ہمیں میسر نہیں آئے گا۔ میں جوانی کے ان سنہری ایام کو مفلسی کے ہاتھوں برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارا مشورہ قبول نہیں کر سکتا۔"

"میرے مشورے کو رد کر کے تم اپنی جوانی کے سنہری ایام کو تباہی کی طرف دھکیل رہے ہو۔"

"ناممکن، قطعی ناممکن۔ تم نہیں سمجھ سکتیں۔ اچھا میں ذرا چہل قدمی کے لیے جا رہا ہوں۔"

ہیکٹر نے زور سے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ اس کے بعد گمبھیر خاموشی چھا گئی۔ چند منٹوں کے بعد ایک طویل القامت شخص عمارت سے باہر نکلتا دکھائی دیا۔ تاہم مدھم روشنی کی وجہ سے ہیکٹر واضح طور پر اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ پھر ایئرفون کے اندر اسے برتھا کی سسکیوں کی آواز کے درمیان ٹیلی فون ڈائل کرنے کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو ایڈی!...... میں برتھا بول رہی ہوں...... ہاں، میں نے اسے بتا دیا ہے کہ میں رقم کے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں...... نہیں، اس نے میرا مشورہ بالکل رد کر دیا ہے۔ رقم واپس رکھنے پر تیار نہیں۔ کہتا ہے کہ یہ بالکل ناممکن ہے...... اوہ ایڈی! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کروں؟...... میں؟ ہاں میں اسے چھوڑنے پر بالکل تیار ہوں لیکن معاملہ بالکل الجھ گیا ہے لیکن اس احمق کو کچھ احساس ہی نہیں۔"

کچھ لمحوں کے لیے خاموشی ہو گئی۔ ہیکٹر دوسری جانب سے کہی جانے والی بات نہیں سن سکتا تھا۔ برتھا نے مزید کہا۔

"اوہ یقیناً۔ میں پوری پوری طرح سے اپنے ارادے پر قائم ہوں لیکن یہ سب کچھ کسی خواب پریشاں کے مانند معلوم ہوتا ہے...... ہاں ٹھیک ہے، اچھا خدا حافظ پیارے۔"

فون بند ہونے کے بعد سسکیوں کی آواز دوبارہ سنائی دینے لگی۔ کچھ دیر کے بعد برتنوں کے کھنکنے کی آوازیں آنے لگیں...... ہیکٹر نے ایئرفون اتار کر رکھ دیا اور بتی جلا دی۔ پھر اس نے ایک کاغذ پر عمارت کا خاکہ بنایا اور تیسری منزل پر واقع چھٹی کھڑکی پر کراس لگا دیا۔ اس نے دوبارہ بتی بجھا دی اور ایئرفون لگا کر والو کا رخ چوتھی منزل کی اس کھڑکی کی طرف کر دیا جو فرینک کے اپارٹمنٹ کے عین اوپر تھی۔

"بڑی اچھی لڑکی ہے۔ گزشتہ ہفتے میں ان کے اسٹور سے سودا خریدنے گئی تو اتفاق سے کچھ پیسے کم پڑ گئے۔ کیشئر ادھار دینے پر آمادہ نہیں تھا۔ بے چاری نے اپنی جیب سے میری کمی پوری کر دی اور کیشئر سے بولی۔ "مسز پارکس ہماری پرانی گاہک ہیں، بہت اچھی خاتون ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ نام سے زیادہ وہ میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔"

ہیکٹر نے ایئرفون نکال کر میز پر رکھ دیا۔ بتی روشن اور چوتھی منزل کی اس کھڑکی پر "مسز پارکس" لکھ دیا۔ اس بعد اس نے دو گولیاں کھائیں اور نہایت سکون کے ساتھ سو گ

اگلے روز وہ علی الصباح بیدار ہو گیا۔ والو کا رخ فر کی کھڑکی کی جانب کر دیا اور ایئرفون کانوں پر لگا کر بیٹھ گ چاروں طرف ملگجا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ پورے سات ریڈیو موسیقی کی آواز سنائی دی۔ پھر کچھ وقفے کے بعد برتھ آواز سنائی دی۔

"فرینک اٹھ جاؤ۔"

کچھ دیر کے بعد غسل خانے سے پانی گرنے کی آ سنائی دی جو ریڈیو پر ہونے والی خبروں کے ساتھ ملی جلی دے رہی تھی۔ سات بج کر دس منٹ پر برتھا نے آواز لگائی۔

"فرینک تمہاری کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ جلدی کرو۔ انڈ کتنے کھاؤ گے؟"

"انڈے نہیں۔ صرف ٹوسٹ کھاؤں گا۔"

"فرینک کچھ عرصے سے تمہاری خوراک بہت کم ہو ہے۔ اس پیسے کی وجہ سے تمہاری صحت پر برا اثر پڑ رہا ہے، ا بھی وقت ہے۔"

"بس بس برتھا، پیسے کا کوئی ذکر نہیں۔ آج کے پیسے کا بالکل نام نہیں لو گی...... تمہارا کام صرف یہ سوچنا ہے کہ تم میرا ساتھ دینا پسند کرو گی یا......"

"لیکن یہ مرحلہ تو دو سال کے بعد آئے گا۔ اس دورا اگر بینک کو پتا چل گیا تو کیا ہوگا؟"

"میرا منصوبہ نہایت ٹیکنیکل قسم کا ہے۔ اگر بینک کو چل گیا تو میں اکیلا ہی جیل جاؤں گا۔ تمہارا اس معاملے سے کو تعلق نہیں ہوگا۔ بھول جاؤ کہ تم نے الماری کے خفیہ خانے میں رقم دیکھی تھی۔ میرے خیال میں چند سال کی جیل کے بدلے سودا مہنگا نہیں ہوگا۔ اب اس بات کو چھوڑو اور ذرا چینی دان ادھر بڑھا دو۔"

چند لمحوں کے بعد ہیکٹر نے دونوں کے باہر نکلنے ا دروازہ بند ہونے کی آوازیں سنیں۔ اسی وقت عمارت کے اند سے کئی جوڑے اپنے اپنے کاموں پر جانے کے لیے باہر نکل رہے تھے۔ اس لیے وہ یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ ان میں فرینک برتھا کون سے تھے اور یہ بات جاننے کی اسے کوئی خا ضرورت بھی نہیں تھی۔

آلۂ سماعت کو ایک طرف رکھنے کے بعد وہ دوبارہ گیا۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد لینڈ لیڈی ناشتا لیے ہوئے اس

کمرے میں داخل ہوئی۔ ہیکٹر آنکھیں ملتا ہوا اٹھ گیا۔ لینڈ لیڈی نے ناشتے کی ٹرے میز پر رکھ دی اور حیرانی کے ساتھ اس عجیب و غریب آلۂ سماعت کو دیکھنے لگی۔

"اچھا تو یہ وہ چیز ہے جس کا کل پارسل آیا تھا۔ یہ کیا چیز ہے مسٹر ہیکٹر؟"

"یہ نہایت حساس قسم کا ایریل ہے جو میں نے اپنے ریڈیو کے لیے منگوایا ہے، اس کی مدد سے دور دراز کے اسٹیشن بھی آسانی کے ساتھ سنے جاسکتے ہیں۔" پھر اس نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ "آج کا دن بڑا خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آج دھوپ میں تھوڑی سی چہل قدمی کروں گا۔"

"ہاں دن تو اچھا ہے لیکن ذرا احتیاط کرنا۔ تم ابھی پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئے۔"

گیارہ بجے تک وہ کمرے کے اندر ہی آرام کرتا رہا۔ پھر اس نے کپڑے تبدیل کیے اور ٹہلتا ہوا سامنے والی عمارت میں داخل ہوگیا۔ تیسری منزل کے اپارٹمنٹ نمبر 3.جی پر ایڈورڈ فرینک لکھا تھا اور چوتھی منزل کے اپارٹمنٹ نمبر 3.جی پر پارکس ریمنڈ لکھا تھا پھر وہ خراماں خراماں چلتا ہوا ٹیلی فون بوتھ میں داخل ہوگیا اور انکوائری سے ایڈورڈ فرینک کا فون نمبر دریافت کیا۔ اس کام سے فارغ ہوکر وہ اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ ہر چند وہ خاصا تھک گیا تھا تاہم اس کے چہرے پر خوشی کے آثار تھے۔ بالآخر اس نے اپنا پرانا دھندا شروع کردیا تھا۔

شام کے ساڑھے پانچ بجے اس نے آلۂ سماعت کا رخ فرینک کی کھڑکی کی طرف کر دیا۔ ٹھیک پونے چھ بجے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ ہیکٹر نے وقت نوٹ کرلیا۔ اس کے بیس منٹ بعد دوبارہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی برتھا کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو فرینک...... تم کہاں ہو؟"

"میں بیڈروم میں ہوں۔" فرینک نے جواب دیا۔ "کام کررہا ہوں۔"

"میں رات کا کھانا تیار کرنے جارہی ہوں۔"

ہیکٹر کئی گھنٹوں تک آلۂ سماعت لگائے بیٹھا رہا۔ رات کے کھانے کے دوران میں اس نے چند لمحوں کے لیے آلۂ سماعت بند کردیا...... فرینک اور برتھا کی گفتگو کے ساتھ ساتھ ٹی وی پر ہونے والے پروگرام کی آواز بھی اس کے کانوں میں آتی رہی۔ کچھ دیر کے بعد فرینک کی آواز آئی۔ "ذرا ٹی وی کی آواز ہلکی کردو، میرے مطالعے میں حرج ہورہا ہے۔"

اگلے روز ہیکٹر دن بھر آرام کرتا رہا۔ اس کا منصوبہ نہایت عمدہ تھا۔ اس نے زندگی بھر فرینک کی شکل نہیں دیکھی تھی اور نہ ہی فرینک نے اسے دیکھا تھا۔ لہٰذا منصوبہ ناکام ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ شام کے ساڑھے پانچ بجے وہ تیار ہوکر باہر نکلا اور ٹیلی فون بوتھ کے اندر جاکر فرینک کا نمبر گھمایا۔ کچھ دیر تک گھنٹی بجتی رہی پھر ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ ہیکٹر نے دوستانہ انداز میں کہا۔

"ہیلو فرینکی کیا حال چال ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ آپ کی تعریف؟"

"تمہارا ایک پرانا دوست۔" ہیکٹر نے جواب دیا۔

"کیا میں تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں؟" فرینک نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

"میاں، یہ تکلفات چھوڑو اور ذرا غور سے میری بات سنو۔" ہیکٹر نے کہا۔ "یقیناً تم یہ بات پسند نہیں کروگے کہ بینک والوں کو بیس ہزار ڈالرز کی بابت معلوم ہو، کیا سمجھے؟"

اچانک دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ قدرے توقف کے بعد فرینک نے کہا۔ "تم کون ہو؟"

"اس بات کی فکر نہیں کرو کہ میں کون ہوں۔" ہیکٹر نے کہا۔ "اور سنو، شہر چھوڑنے یا اسی قسم کی کوئی اور حرکت کرنے کی حماقت نہیں کرنا۔ میں فوراً بینک والوں کو خبر کردوں گا۔ تمہیں اپنی کھال بچانے کے لیے صرف پانچ ہزار ڈالرز......"

"پتا نہیں تم کیا فضول بکواس کررہے ہو......" فرینک نے کہا اور فون بند کردیا۔

چند منٹ توقف کے بعد ہیکٹر نے دوبارہ فرینک کا نمبر ملایا جیسے ہی دوسری طرف سے آواز آئی، ہیکٹر نے کہا۔ "میرے ریٹ میں ایک ہزار ڈالرز کا اضافہ ہوگیا ہے۔ اب تمہیں پانچ کے بجائے چھ ہزار ڈالرز دینے پڑیں گے۔ دوبارہ فون بند کرنے کی غلطی نہیں کرنا ورنہ میرا ریٹ اور بڑھ جائے گا۔ میری بات کو مذاق نہیں سمجھو۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ بیس ہزار کی رقم الماری کے خفیہ خانے میں رکھی ہے۔ فی الحال میں تمہیں سوچنے کی مہلت دیتا ہوں۔ دوبارہ فون کروں گا، خدا حافظ۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کردیا اور بوتھ سے باہر نکل کر گلی میں چلنے والے ہجوم میں شامل ہوگیا۔

اپنے کمرے میں آکر اس نے آلۂ سماعت کا رخ فرینک کی کھڑکی کی طرف کردیا اور ایئر فون لگا کر سننے لگا۔ برتھا تیز تیز آواز میں باتیں کررہی تھی۔ "میں اتنی پاگل نہیں ہوں فرینک۔ میں بھلا کسی کو پیسوں کے بارے میں کیوں بتانے لگی۔ میں تو پیسوں کے خیال سے ہی کانپنے لگتی ہوں۔ تم نے یہ سوال کیسے کیا؟"

"بس یونہی پوچھ لیا۔" فرینک نے کہا۔ "میں تاکید کرتا ہوں کہ اس بات کا ذکر کسی کے سامنے نہیں کرنا۔ گو تمہارے سوچنے کا انداز مختلف ہے لیکن میں جو کچھ بھی کررہا ہوں۔ اس میں تمہاری بھی بھلائی ہے۔"

"میں کہتی ہوں۔ مجھے ایسی بھلائی کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"اچھا اچھا۔ اب اس گفتگو کو ختم کردو۔"

ہیکٹر نے آلۂ سماعت بند کردیا اور کپڑے تبدیل کرکے بستر پر لیٹ گیا۔ رات کے کھانے کے بعد کچھ دیر تک وہ اخبار کا مطالعہ کرتا رہا پھر نہایت اطمینان کے ساتھ سوگیا۔ اگلے روز پونے چھ بجے اس نے دوبارہ فرینک کو فون کیا۔

"کیوں پیارے، رات کیسی گزری؟ اور سنو، برتھا پر غصہ نہیں نکالو۔ اس نے مجھے کوئی بات نہیں بتائی۔ میری معلومات کا ذریعہ کچھ اور ہے جو تمہارے گمان سے بھی بالاتر ہے۔"

"تت...... تم کون ہو؟" فرینک نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"میں؟...... مجھے تم گھر کا بھیدی کہہ سکتے ہو۔ میں تمہارے تمام منصوبوں سے آگاہ ہوں۔ کیا یہ سچ نہیں کہ تم اپنے سیونگ اکاؤنٹ سے ہر مہینے ایک ہزار ڈالرز نکالتے رہو گے اور جب تمہارے پاس مجموعی طور پر پچاس ہزار ڈالرز ہوجائیں گے تو تم یورپ کی سیاحت پر نکل جاؤ گے...... میرے عزیز مصور! صرف چھ ہزار ڈالرز میں تمہیں تخفظ مل رہا ہے۔ تمہیں بزرگوں کا یہ قول ضرور یاد ہوگا کہ سارا دھن جاتا دیکھیے تو آدھا دیجیے بانٹ۔ ورنہ دولت کے ساتھ ساتھ تمہارا مصوری اور سیاحت کا سہانا خواب بھی خاک میں مل جائے گا۔" دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ ہیکٹر نے دستی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اچھے بچوں کی طرح میری بات مان لو ورنہ ایک ہزار ڈالر کا مزید نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔"

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

"یار تم اتنے بھی بھولے نہیں ہو؟ میں صرف چھ ہزار ڈالر چاہتا ہوں۔ اس بات سے تم اندازہ کرسکتے ہو کہ میں ایک شریف آدمی ہوں اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں تمہیں دوبارہ پریشان نہیں کروں گا۔ ذرا سوچو تو آخر میرے بھی کچھ خواب ہیں اور محض اللہ کی مہربانی سے دو آدمیوں کے خواب ایک ساتھ پورے ہورہے ہیں۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم دوبارہ مجھے تنگ نہیں کروگے؟"

"میں کوئی ضمانت فراہم نہیں کرسکتا۔ تمہیں میری بات پر یقین کرنا پڑے گا۔ ویسے بھی ہم دونوں ایک ہی برادری سے تعلق رکھتے ہیں یعنی چور کا بھائی گرہ کٹ!"

"آں ہاں...... یہ تو ٹھیک ہے۔ ہماری ملاقات کب ہوگی؟"

"ابھی نہیں۔" ہیکٹر نے کہا۔ "وقت اور جگہ کے بارے میں بعد میں بتاؤں گا۔ شب بخیر فرینکی!"

کمرے میں واپس آنے کے بعد ہیکٹر نے فرینک کی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ ایک نوجوان شخص کھڑکی کے درمیان کھڑا جھانک رہا تھا، اس کے بال سرخ رنگ کے تھے۔

رات کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہیکٹر نے کمرے کی بتی بجھا دی اور آلۂ سماعت لے کر کھڑکی کے قریب بیٹھ گیا۔ والو کا رخ حسب معمول کھڑکی کی طرف تھا۔ سب سے پہلے اس کے کانوں میں برتھا کی آواز آئی۔ "کیا بات ہے، آج بہت خوش نظر آرہے ہو۔"

"کچھ نہیں بلکہ میں تو کچھ تھکاوٹ محسوس کررہا ہوں۔"

"ہفتے کے روز ممی کی سالگرہ ہے۔ کیا خیال ہے کیوں نہ ہفتہ اتوار ممی کے ہاں گزارا جائے۔ ویسے بھی تمہیں کچھ تبدیلی کی ضرورت ہے۔"

"تم اکیلی ہی چلی جاؤ برتھا۔ میں نے کئی ایک کام نمٹانے ہیں اور کچھ آرام بھی کرلوں گا۔"

"دیکھا...... دولت کی موجودگی نے تمہارے اندر کتنی زبردست تبدیلی پیدا کردی ہے۔ تم گھر اکیلا چھوڑ کر جاتے ہوئے گھبراتے ہو، میں خود بھی کسی بلی کی طرح خوف زدہ رہتی ہوں۔"

"پیسے کی کوئی بات نہیں میری جان۔ تم جانتی ہی ہو کہ میرے جانے سے وہاں کی صورت حال ناخوش گوار ہوجائے گی۔ ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ کیا فائدہ تمہاری ممی کی سالگرہ کا بیڑہ غرق ہوجائے گا۔ چپکے سے جمعے کے روز ٹرین پر بیٹھ کر چلی جاؤ اور اتوار کی شام واپس آجانا اور اب ذرا ٹی وی کھول دو، میرا پسندیدہ پروگرام شروع ہونے والا ہے۔"

اگلی شام ہیکٹر نے فرینک کو فون کرکے کہا۔

"ہیلو فرینک، تمہارا پرانا دوست بول رہا ہوں۔"

"میرا دوست؟"

"انجان بننے کی کوشش نہیں کرو بیٹا۔ اور سنو! ایک قیمتی مشورہ یاد رکھو، یورپ کے سفر پر روانہ ہوتے وقت اپنے بالوں کو رنگنے کی کوشش نہ کرنا۔ اگر سرکاری کتے تمہارے پیچھے لگ گئے تو وہ سب سے پہلے اس قسم کی امکانی تبدیلیوں کو ذہن میں رکھ کر تمہاری تلاش کریں گے۔"

"شکریہ! اب یہ بتاؤ کہ ہماری ملاقات کہاں ہوگی تا کہ اس معاملے کو ختم کیا جا سکے۔"

"فکر کیوں کرتے ہو فرینکی۔ اس کے لیے ابھی بہت وقت پڑا ہے۔"

"آئندہ ہفتے کی شام کیسی رہے گی؟"

"پیارے، مجھ پر حکم چلانے کی کوشش نہ کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ ہفتے کی شام کو برتھا گھر پر نہیں ہوگی۔ وہ جمعے کے روز اپنی ممی کی سالگرہ میں شریک ہونے جا رہی ہے۔ لو پیارے، ایک مزے دار لطیفہ سنو۔ تمہاری پیاری برتھا تمہیں ڈبل کراس کر رہی ہے۔ تم نے ایڈی کا نام سنا ہوگا۔ وہ......"

"ایڈی؟...... ایڈی تو اس کا...... کیوں بے پھندرا اس بات سے تمہارا مقصد کیا ہے؟"

"اگر تم نے اس قسم کی زبان استعمال کی تو مجھے رقم میں اضافہ کرنا پڑے گا۔ کیا سمجھے......؟ رقم تیار رکھنا۔ میں دوبارہ فون کروں گا۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا اور اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ اس رات فرینک خاصی دیر تک کھڑکی میں کھڑا نیچے گلی میں دیکھتا رہا۔ ہیکٹر بستر میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا کر صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔

اگلے روز علی الصباح ہیکٹر نے فرینک سے چھ ہزار ڈالر...... وصول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا اور قرب و جوار میں ہلکی ہلکی دھند چھائی ہوگی۔ ہیکٹر دھیرے دھیرے چلتا ہوا کونے کے ٹیلی فون بوتھ میں داخل ہو گیا۔ بوتھ تک پہنچتے پہنچتے اس کا سانس پھول گیا اور سینے میں ہلکا سا درد بھی ہونے لگا۔ اسے یاد آیا کہ ڈاکٹر نے اسے مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا۔ کچھ دیر تک وہ بوتھ میں بیٹھ کر سانس درست کرتا رہا پھر اس نے فرینک کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے فوراً ہی جواب دیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فرینک اس کے فون کا پہلے سے منتظر تھا۔ یہ بات اسے قدرے عجیب سی لگی۔ تاہم اس نے اپنے لہجے میں بے نیازی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "ہیلو فرینکی، تمہارا پرانا دوست بول رہا ہوں۔ رقم تیار ہے؟...... ایسا کرو کہ چھ ہزار ڈالرز کو اخبار میں لپیٹ کر تیار رکھو۔"

"ایک منٹ...... ذرا ہولڈ کرو۔"

"کوئی بات نہیں۔" ہیکٹر نے کہا۔ "سہولت سے کام کرو۔"

انتظار کرتے ہوئے ہیکٹر سوچنے لگا کہ شاید فرینک یہ دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے کہ میں کس ٹیلی فون بوتھ سے فون کر رہا ہوں۔ لیکن وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوگا۔ تقریباً نصف منٹ تک انتظار کرنے کے بعد ہیکٹر نے فون بند کر دیا اور ایک منٹ کے بعد دوبارہ نمبر ڈائل کیا لیکن رابطہ نہ مل سکا۔ غالباً فرینک نے ابھی تک ریسیور نیچے ہی رکھا ہوا تھا۔

اس نے ریسیور نیچے رکھ دیا اور بوتھ کا دروازہ تھوڑا کھول کر فرینک کی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ گو باہر پھیلی ہوئی دھند کی وجہ سے صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ تاہم فرینک کی کھڑکی میں دھات کی بنی ہوئی ایک چمکدار چیز نظر آ رہی تھی ہیکٹر نے اسے شناخت کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ وہ ایک آلۂ سماعت تھا جس کے لمبوترے والو کا رخ ٹیلی فون بوتھ کی طرف تھا۔ ہیکٹر کے جسم میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔

عین اسی وقت ہیکٹر کو عمارت کے صدر دروازے سے فرینک نکلتا دکھائی دیا۔ اس کا ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ٹیلی فون بوتھ کی طرف آ رہا تھا۔ معاملہ بالکل بگڑ گیا تھا۔ ہیکٹر نے جلدی سے بوتھ کا دروازہ کھولا اور تیزی سے ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ یہ بات اس کے ذہن سے بالکل ہی نکل گئی تھی کہ ڈاکٹر نے اسے مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا۔ چند قدم دوڑنے کے بعد وہ لڑکھڑایا اور منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔

❀❀❀

گشتی سپاہی نے ہیکٹر کی نوٹ بک سے نظریں ہٹا کر ارد گرد جمع ہو جانے والے ہجوم کی طرف دیکھا۔

"کسی شخص نے کہا تھا کہ اس پر دل کا دورہ پڑا تھا؟" اس نے ہیکٹر کے بے حرکت جسم کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"کیا یہ شخص مر چکا ہے؟" فرینک نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"ہاں۔ کیا تم نے اسے گرتے ہوئے دیکھا تھا؟"

"جی ہاں جناب۔" فرینک نے جواب دیا۔ "میں سامنے والی عمارت میں رہتا ہوں۔ تھوڑی دیر پہلے میں ڈبل روٹی اور انڈے لینے کے لیے اسٹور کی طرف جا رہا تھا تو اس شخص کو ٹیلی فون بوتھ سے نکل کر تیزی سے سڑک کی دوسری جانب جاتے دیکھا۔ غالباً یہ شخص یا تو بھاگ رہا تھا یا بہت تیز رفتاری کے ساتھ چل رہا تھا۔ درحقیقت میں نے اس کی طرف خاص توجہ نہیں دی لیکن جب یہ اچانک سڑک پر گر پڑا تو میں مدد کے لیے اس کی طرف بھاگا۔"

"اب یہ تمہاری مدد کا محتاج نہیں رہا۔" سپاہی نے پرتاسف لہجے میں کہا۔ "کیا تم اسے جانتے ہو یا پہلے کبھی اسے دیکھا ہے؟"

"نہیں جناب۔" فرینک نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "زندگی میں پہلی مرتبہ اسے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ نہ معلوم کون ہے بے چارہ۔"

جیسا تیسا

کاشف زبیر

مکروفریب کی اس دنیا میں کب کوئی کسی کو جان سکا ہے۔ بعض اوقات کوئی ہوشیاری میں بھی اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لیتا ہے اور کسی کی سادگی میں اتنے پیچ وخم ہوتے ہیں کہ شکار ہونے والے کی خوش گمانیاں اسے احساس نہیں ہونے دیتیں کہ وہ کس بلا میں گرفتار ہو چکا ہے... بس یہی خوبی اس کہانی کی انفرادیت ہے کہ جیسے کو تیسا ایسے ہی ملا کرتا ہے۔

زندگی کی راہ میں بھٹکنے والے ایک انسان دوست مجرم کی روداد

الارم نے شور مچایا تو ہیری کارٹر نے آنکھ کھول کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ صبح کے سات بج رہے تھے۔ اس کے کام پر جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ مگر کام پر تو جانا ہی تھا۔ ہیری تقریباً تیس برس کا خوبرو اور سو بر نظر آنے والا شخص تھا، اس کے ہلکے سرمئی بال نفاست سے تراشے ہوئے تھے۔ کسی قدر ورزشی جسم کی وجہ سے وہ اسمارٹ دکھائی دیتا تھا اور جلد ہی نوجوانوں کی طرح تر و تازہ تھی۔ اس نے اٹھ کر واش روم کا رخ کیا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر وہ باہر آیا۔ اس نے دراز سے سوٹ نکالا اور پھر اس کے ساتھ میچ کرتی ٹائی، شرٹ اور جوتے موزے نکال کر انہیں ترتیب سے رکھ دیا۔ وہ کچن میں آیا تو اس کی ماما کا تھا ناشتا لگا چکی تھی۔ اس نے ماں کو پیار کیا اور میز پر آ گیا۔ ناشتا بہت سادہ تھا۔ دو ابلے انڈوں، دو

عدد سلائس اور جوس کے ایک گلاس پر مشتمل۔

"ہیری۔۔۔ مجھے دو سو ڈالرز کی ضرورت ہے۔" اگا تھا نے کہا۔ "کچھ سامان لانا ہے۔"

اگا تھا ایک گارمنٹ اسٹور میں پارٹ ٹائم جاب کرتی تھی۔ وہ دس بجے جاتی اور شام چار بجے تک لوٹ آتی تھی۔ اس کی تنخواہ سے گھر چلتا تھا لیکن کسی مہینے اخراجات زیادہ ہو جاتے تو وہ ہیری سے بھی رقم لیتی تھی۔ اگا تھا کی عمر پچاس سے زیادہ نہیں تھی لیکن اس نے خود کو سنبھال کر رکھا تھا مگر ہیری کے باپ کے مرنے کے بعد اس نے دوسری شادی کا کبھی نہیں سوچا تھا، اس کی توجہ کا محور صرف ہیری تھا۔ ہیری دنیا میں کسی سے محبت کرتا تھا تو وہ اس کی ماں تھی۔ یہ گھر، ہیری کے باپ نے لیا تھا اور اس کے مرنے کے بعد یہ ہیری کو مل گیا تھا۔ ناشتا کر کے اس نے اپنے والٹ سے دو سو ڈالرز نکال کر ماں کو دیے اور تیار ہونے لگا۔ اب اس کے پاس زیادہ رقم نہیں رہی تھی لیکن اسے امید تھی کہ شام تک اسے رقم مل جائے گی۔

تیار ہو کر وہ باہر آیا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے کسی کمپنی کا کوئی بزنس ایگزیکٹو جاب پر جا رہا ہے۔ کمی صرف ایک بریف کیس کی تھی جو اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ یہ کمی اس نے ایک اخبار کے اسٹال سے بزنس ویکلی لے کر پوری کر لی۔ وہ اخبار کی سرخیاں دیکھتا ہوا نیو یارک سب وے کے ایک اسٹیشن پر آیا۔ اس نے ٹکٹ لیا اور دفتر جانے والوں کے ہجوم کے ساتھ ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے برابر ایک خوش پوش شخص کھڑا تھا۔ ہیری اسے دیکھ کر مسکرایا تو وہ بھی مسکرا دیا۔ ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہو کر رکی اور اس کے دروازے کھلے تو ہجوم اس کی طرف لپکا۔ ہیری کے ساتھ کھڑا شخص آگے بڑھا تو اس سے ٹکرانے سے ہیری کے ہاتھ سے اخبار گر گیا۔

اس نے معذرت کرتے ہوئے جھک کر ہیری کا اخبار اٹھایا اور اسے بالکل احساس تک نہ ہو سکا کہ اس دوران میں اس کی پتلون کی جیب سے والٹ نکل کر ہیری کے کوٹ کی جیب میں جا چکا ہے۔ اخبار اسے دے کر وہ شخص تیزی سے ٹرین میں داخل ہو گیا کیونکہ ٹرین صرف ایک منٹ کے لیے رکتی تھی اور اس کے بعد اسی روٹ کی ٹرین آدھے گھنٹے بعد آتی۔ وہ شخص یہ ٹرین مس نہیں کرنا چاہتا تھا اور اسے یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ ہیری اندر جانے کے بجائے ہجوم میں آہستہ سے پیچھے ہٹنے لگا تھا اور پھر ٹرین کا دروازہ بند ہو گیا۔

کچھ دیر بعد وہ ایک دفتری عمارت کے سامنے تھا۔ اس کثیر المنزلہ عمارت میں بے شمار دفاتر میں ہزاروں لوگ کام کرتے تھے۔ اس وقت بھی لوگوں کا ایک ہجوم اندر جا رہا تھا۔ ہیری بھی ان میں شامل ہو کر اندر پہنچ گیا۔ اس سے آگے ایک خوب صورت عورت چھوٹے سے آئینے میں اپنی لپ اسٹک چیک کرتی جا رہی تھی۔ اس نے آئینہ اپنے پرس میں رکھا تو ہیری نے اس میں چھوٹا والٹ دیکھ لیا۔ ساتھ ہی جدید آئی فون بھی موجود تھا۔ ہیری نے یہاں بھی اخبار والی تکنیک استعمال کی۔ وہ اس طرح عورت کے راستے میں آیا کہ بہ ظاہر عورت کی ٹکر سے اخبار گرا اور اس کے صفحے بکھر گئے۔ پہلے عورت نے غصے سے اس کی طرف دیکھا پھر ہیری کی دل کش شخصیت نے اسے مسحور کر دیا۔

"اوہ سوری۔۔۔" عورت نے بیٹھ کر جلدی سے اخبار سمیٹتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔" ہیری نے سحر انگیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ وہ اس کے بالکل پاس بیٹھ گیا تھا۔ "غلطی میری بھی تھی، مجھے اس ہجوم میں اخبار نہیں دیکھنا چاہیے تھا۔"

عورت نے اسے اخبار سمیٹ کر دیا اور اپنا بیگ شانے پر لٹکاتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ یہ حادثہ اس کے لیے خوشگوار تھا۔ اس سے ذرا آگے نکلتے ہی ہیری پلٹا اور باہر جانے لگا۔ اس کی جیب میں عورت کے منی والٹ اور اس کے آئی فون کا اضافہ ہو گیا تھا۔ عورت کا بیگ اس کے اور ہیری کے درمیان میں آ گیا تھا، اس لیے اس سمیت کسی نے نہیں دیکھا کہ ہیری نے بیگ کے ساتھ کیا، کیا ہے۔ کچھ دیر بعد ایک پارک میں بنچ پر بیٹھے ہوئے اس نے دونوں پرسوں کا معائنہ کیا۔ مرد کے پرس سے صرف ایک سو نوے ڈالرز اور اس کا کریڈٹ کارڈ نکلا تھا، ایک ڈیبٹ کارڈ بھی تھا لیکن وہ اس کے لیے بیکار تھا۔ اس نے صرف رقم اور کریڈٹ کارڈ رکھ کر پرس پیچھے جھاڑی میں پھینک دیا۔ عورت کے والٹ سے البتہ اچھی رقم نکلی تھی یہ کل سات سو چھپن ڈالرز تھے۔ اس کے پاس بھی کریڈٹ کارڈ تھا۔ آئی فون نیا تھا۔ اس نے باقی سامان جھاڑی میں پھینکا پھر مرد کے کریڈٹ کارڈ پر اس کے دستخط دیکھ کر ایک خالی پیڈ پر کچھ دیر ان کی مشق کرتا رہا۔

چند منٹ بعد وہ کچھ دور ایک جدید شاپنگ سینٹر میں تھا۔ اس نے پہلے پچاس ڈالرز کی خریداری کی اور کریڈٹ کارڈ پیش کر دیا۔ کاؤنٹر پر موجود لڑکی نے سلپ پر اس کے سائن غور سے دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس مرحلے میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اس نے اسٹور کے دوسرے

حصے میں خاصی شاپنگ کی، اس نے اپنے لیے کئی ڈریس، پینٹس، جوتے، پرفیومز اور اسی طرح کی کئی دوسری چیزیں لے لیں۔ ابھی تک کریڈٹ کارڈ کی چوری کی رپورٹ سسٹم میں نہیں آئی تھی مگر اب اس میں زیادہ دیر بھی نہیں تھی۔ اسٹور سے باہر آ کر اس نے کریڈٹ کارڈ ایک ڈسٹ بن میں پھینکنا چاہا لیکن پھر رک گیا اور اسے واپس جیب میں رکھ لیا۔ خریدا ہوا سارا سامان اس نے بس ٹرمنل کے ایک لاکر میں رکھوا دیا۔ یہ لاکر اس کے پاس رہتا تھا۔

شام تک اس نے مزید اسی طرح کے کام کیے۔ اس کے پاس کئی موبائل فون اور خاصا کیش جمع ہو گیا تھا۔ پانچ بجے اس نے سترھویں شاہراہ کا رخ کیا۔ اس نے دوپہر میں باقاعدہ کھانا نہیں کھایا، بس ایک برگر لے لیا تھا۔ ہاں خود کو تر و تازہ رکھنے کے لیے کافی لیتا رہا تھا۔ اس کا کام ایسا تھا جس میں چستی اور مہارت درکار تھی۔ کھانے کے بعد سستی طاری ہونے لگتی تھی۔ سارا دن گھوم پھر کر اسے بھوک لگ رہی تھی لیکن ابھی رات کے کھانے میں خاصا وقت تھا۔ سترھویں شاہراہ پر وہ اندرونی علاقے کی طرف گھوم گیا۔ مرکزی شاہراہ کی نسبت یہ ذرا کم تر درجے کا علاقہ تھا، یہاں گلیاں چوڑی تھیں مگر زیادہ صفائی نہیں تھی اور گلیوں میں لوگ بھی کم نظر آ رہے تھے۔ ہیری جانتا تھا کہ رات ہوتے ہی یہ علاقہ اجنبیوں کے لیے کتنا خطرناک ہو جاتا تھا۔ ہیری ایک عمارت کے نیچے رکا اور اس نے اوپر دیکھا تو اسے ہنگامی حالات میں استعمال ہونے والی سیڑھیوں پر روپرٹ جوڈو کی خیالی مشق کرتا نظر آیا۔

"ہے روپ۔۔۔!" ہیری نے اسے آواز دی لیکن وہ بدستور اپنی مشق میں لگا رہا۔ ہیری جانتا تھا، اس نے سن لیا ہے مگر جان کر انجان بنا ہوا ہے۔ چند منٹ کے انتظار کے بعد وہ جانے کے لیے مڑا تھا کہ کوئی چیز چھن سے اس کے پیچھے گری۔ یہ چابی تھی، ہیری نے چابی اٹھائی اور داخلی دروازے سے اندر آیا۔ تیسری منزل پر فلیٹ میں داخل ہوا تو روپرٹ اب سگار نوشی میں معروف تھا۔ جوڈو کی مشق کے علاوہ اس کے مشاغل میں سگار اور شراب بھی شامل تھے۔ کھردرے نقوش اور سرخ آنکھوں کی وجہ سے وہ جرائم پیشہ نظر آتا تھا۔ وہ ایک لیدر صوفے پر بیٹھا دھواں اڑا رہا تھا۔ ہیری نے تمام چیزیں مع رقم اس کے سامنے ڈال دیں لیکن یہاں آنے سے پہلے وہ کیش میں نصف کمی کر چکا تھا۔ یہ کیش اس وقت اس کی انڈر ویئر میں خاص طور سے بنی چھوٹی سی جیب میں تھا۔

"یہ تمہا کو تمہارے جوڈو کو کینسر کر دے گی۔" ہیری نے کہا اور فریج سے اپنے لیے بیئر کی بوتل نکالی۔ روپرٹ سامنے پڑی چیزوں کو گھور رہا تھا۔ اس نے ایک موبائل فون اٹھایا اور پھر اسے ایک طرف پھینک دیا۔ دوسرا اور تیسرا بھی اسی طرح پھینکا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر ہیری سے کہا۔ "یہ سب کیا کچرا ہے؟"

"لوگ آج کل یہی کچرا جیب میں لے کر گھوم رہے ہیں۔" ہیری نے اسے مطلع کیا۔

"ان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔" روپرٹ چلایا۔ "کوئی کوڑیوں کے مول بھی نہیں لیتا انہیں۔"

ہیری نے جدید آئی فون اٹھا کر اس کے سامنے کیا۔ "یہ نیا ایک ہزار ڈالرز کا ملتا ہے، کوئی بھی شوقین اس کے پانچ سو ڈالرز دیدے گا۔"

روپرٹ نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ لاک ہو جائے گا۔"

"صرف سو ڈالرز ادا کر کے اسے ان لاک کیا جا سکتا ہے۔"

"یہ صرف دو ڈھائی سو کی چیز ہے۔"

"تب میں کیا کروں، لوگ جو چیزیں گھر سے لے کر نکلیں گے میں وہی لا سکتا ہوں۔" ہیری نے شانے اچکائے۔

"سنو، مجھے قیمتی چیزیں چاہئیں، سیکڑوں نہیں ہزاروں ڈالرز والی چیزیں، مجھے قیمتی گھڑیاں لا کر دو، سچے موتی کے ہار اور ہیرے کی انگوٹھیاں چاہئیں، سنا تم نے۔۔۔"

"یہ بہت مشکل کام ہے۔ لوگ اپنی ان چیزوں کی طرف سے ہوشیار رہتے ہیں۔ گھڑی اور ہار جسم کا حصہ ہوتے ہیں اور ان کی گمشدگی کا فوراً پتا چل جاتا ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔" روپرٹ چلایا۔ "مجھے قیمتی چیزیں چاہئیں ورنہ یہاں آنے کی زحمت مت کرنا۔"

ہیری اسے گھورتا رہا پھر اس نے میز پر پڑے نوٹ اٹھانے کی کوشش کی لیکن روپرٹ نے پھرتی سے پہلے اٹھا لیے۔ اس نے انہیں گنا اور پھر ان میں سے کچھ نوٹ نکال کر اس کے سامنے ڈال دیے۔ یہ کل رقم کا چالیس فیصد تھے۔ ہیری نے انہیں جیب میں ڈال لیا۔ روپرٹ اب مضطرب انداز میں ٹہل رہا تھا، اس نے ہیری کا چہرہ تھاما اور آہستہ سے بولا۔ "سوری میں بہت پریشان ہوں تم خیال مت کرنا۔۔۔ اپنا کام کرو لیکن کوشش کرو کوئی قیمتی چیز ہاتھ لگے جس سے مجھے بھی فائدہ ہو اور تمہیں بھی۔ اگر تم کوئی قیمتی چیز لاؤ گے تو اس کی اصل مالیت کا تیس فیصد تمہارا ہوگا۔"

ہیری پہلی بار مسکرایا۔ "اب کی ہے نا تم نے کام کی بات۔"

وہ روپرٹ کے اپارٹمنٹ سے باہر آیا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا زنانہ والٹ نکالا۔ اس میں بہت کچھ تھا۔ یہ والٹ اس نے دو دن پہلے ایک خاتون کے پرس سے نکالا تھا۔ وہ سب وے میں اپنے برابر میں بیٹھی دوسری عورت سے گفتگو کر رہی تھی اور اس کا بیگ پیچھے رکھا تھا۔ اس نے ہیری کو نہیں دیکھا تھا۔ پرس میں معمولی سی رقم، ایک ڈیبٹ کارڈ اور دوسری ضروری چیزیں تھیں۔ یہ کام بیکار ثابت ہوا تھا اس لیے اب وہ دوسری طرح سے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کارڈ پر موجود نمبر پر رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے عورت نے فون ریسیو کیا اور چند منٹ میں وہ اس کے ساتھ ملاقات کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ ہیری نے اسے ایک اچھے ریستوران میں بلا لیا تھا۔ وہ اسے اس کا پرس واپس دینا چاہتا تھا جو بہ قول اس کے اسے ایک گلی میں پڑا ملا تھا۔ عورت اتنی نا سمجھ نہیں تھی کہ اس طرح ڈنر پر بلا کر پرس واپس کرنے کا مقصد نہ سمجھتی۔

☆☆☆

پولیس افسر جان ڈیکن کو اس کے باس نے طلب کر لیا تھا اور اسے معلوم تھا کہ یہ طلبی کیوں تھی۔ اس کے علاقے میں مسلسل چوری اور جیب تراشی کی وارداتیں ہو رہی تھیں اور اب تک اس سلسلے میں کسی شخص کی گرفتاری عمل میں نہیں آئی تھی۔ اس کا باس کیپٹن میگراتھ سخت گیر آدمی تھا اور اس کے ماتحت اس کے سامنے جاتے ہوئے ڈرتے تھے لیکن جان اس سے نہیں ڈرتا تھا۔ وہ اس کے دفتر میں داخل ہوا تو میگراتھ اخبار دیکھ رہا تھا، اس نے طنزیہ انداز میں جان کی طرف دیکھا۔ ”آؤ آفیسر... میں تمہاری کارکردگی دیکھ رہا تھا۔“ اس نے اخبار جان کی طرف پھینک دیا۔

”اخبار والے بکتے رہتے ہیں۔“ جان نے بے پروائی سے کہا۔

”برخوردار غور سے دیکھو۔“ کپتان نے اخبار پر ایک جگہ انگلی رکھی۔ ”اس میں ایک قابل فخر پولیس افسر کا ذکر ہے جو اپنے پرس سے ہاتھ دھو بیٹھا جس میں اس کا بیج بھی تھا۔“

جان کی بھویں تن گئیں۔ ”یہ خبر اخبار تک کیسے پہنچی؟“

میگراتھ نے شانے اچکائے۔ ”یہ تم اس رپورٹر سے پوچھ لینا، تمہیں بتائے گا۔ آج اس ڈھیٹ آدمی نے مزید کئی وارداتیں کی ہیں۔“

”میں دیکھ لوں گا۔“ جان نے بہ دستور بے پروائی سے کہا۔

”سنو جان مجھے میئر کو جواب دینا ہوتا ہے۔“ میگراتھ ذرا آگے جھک کر بولا اور پھر دہاڑا۔ ”مجھے ہر صورت یہ آدمی چاہیے۔“

جان اس کی دہاڑ سے متاثر نہیں ہوا تھا، وہ اطمینان سے بیٹھا رہا۔ میگراتھ کا غصے سے برا حال ہو گیا۔ ”اب تم دفع ہو سکتے ہو۔“

”شکریہ۔“ جان اٹھا اور مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ ہال میں آیا جہاں ایک مبینہ مجرم موجود تھا، اس کی ہتھکڑی ایک ہک سے بندھی تھی۔ جان نے اس کی ہتھکڑی کھولی تو اس نے بولنا شروع کر دیا۔

”دیکھو میں کچھ نہیں جانتا... تم بلا وجہ مجھے اس چکر میں ڈال رہے ہو۔“

”شٹ اپ ڈونی۔“ جان نے کہا اور اسے لاک والے حصے میں لایا۔ یہاں آخر میں ایک ڈبل لاک والا لاکر تھا جہاں انتہائی خطرناک ملزموں کو رکھا جاتا تھا۔ فی الحال یہاں کوئی نہیں تھا اور اسی لیے جان، ڈونی کو یہاں لایا تھا۔ اس نے اندر آ کر دروازہ بند کیا، اپنا کوٹ اتار کر دروازے کے شیشے والے حصے پر ٹانگ دیا اور ڈونی کی طرف دیکھا جو خوفزدہ نظر آ رہا تھا، اسے معلوم تھا کہ اب کیا ہوگا۔ جان نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”ہاں تو مسٹر ڈونی...“

”میں کچھ نہیں...“ ڈونی کی بات ادھوری رہ گئی تھی، اس کے پیٹ میں پڑنے والا گھونسا اتنا ہی شدید تھا۔

☆☆☆

ہیری اس حسین خاتون کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ دونوں ڈنر سے پہلے وائن لے رہے تھے، اس کا نام اینڈریا تھا مگر ہیری اسے اینڈی کہہ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ویٹر نے کھانا لگانا شروع کر دیا۔ اینڈی بہت شکر گزار تھی۔ رقم تو پرس میں نہ تھی لیکن کاغذات مل گئے جو بہت اہم تھے۔ جب بل ادا کرنے کا وقت آیا تو ہیری نے اینڈی کے اصرار کے باوجود بل خود اٹھا لیا اور ویٹر کو اسی شخص کا کریڈٹ کارڈ نکال کر دیا۔ ویٹر گیا اور جلد ہی لوٹ آیا، اس نے آہستہ سے کہا۔ ”سوری سر، سسٹم کارڈ کو مسترد کر رہا ہے۔“

”ادائیگی میں کر دیتی ہوں۔“ اینڈی بولی۔

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے کبھی کبھی سسٹم میں مسئلہ آ جاتا ہے۔“ ہیری نے کہا اور ویٹر کو لے کر ایک طرف آیا۔ ”مسئلہ کیا ہے؟“

”کارڈ قبول نہیں ہو رہا ہے۔“

”بعض اوقات ایسا ہوتا ہے۔“ ہیری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم مجھ سے سلپ پر سائن لے لو، بینک ادائیگی کر دے گا۔“

ویٹر نے سوچا اور پھر کہا۔ ”یہ کام منیجر کر سکتا ہے۔ ایک منٹ میں اسے بلاتا ہوں۔“

ایک طرف ویٹر گیا، دوسری طرف سے ہیری نے سادہ لباس میں پولیس والوں کو آتے دیکھا۔ وہ سادہ لباس میں بھی صاف پہچانے جا رہے تھے۔ ہیری گھبرائے بغیر آگے بڑھا اور پولیس والوں کے برابر سے ہوتا ہوا ریستوران سے باہر نکل گیا۔ اینڈی حیران پریشان اسے جاتے دیکھ رہی تھی۔ ایک منٹ سے پہلے پولیس والے اس کے سامنے تھے اور اس سے ہیری کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ اینڈی نے کہا۔ ”میں مسٹر سولومن کو نہیں جانتی، اس سے آج ہی ملی ہوں۔ دراصل میرا پرس چوری ہو گیا تھا جو اسے ملا تھا اور اس نے مجھے واپس دینے کے لیے...“

آنے والوں میں جان بھی شامل تھا، یہ اسی کا کیس تھا جیسے ہی اسے پتا چلا کہ مشکوک شخص باہر جا چکا ہے، وہ دروازے کی طرف لپکا لیکن وہ شاطر جاتے ہوئے ریستوران کے دروازے کو باہر سے ہتھکڑی ڈال کر بند کر گیا تھا۔ مجبوراً پولیس والوں کو شیشہ توڑ کر باہر آنا پڑا تھا۔ اتنی دیر میں ہیری غائب ہو چکا تھا۔ وہ ایک بس میں گھر کی طرف جا رہا تھا اور اپنی قسمت پر افسوس کر رہا تھا اگر پولیس مداخلت نہ کرتی تو شاید آج رات وہ اس حسین خاتون کے ساتھ گزارتا۔ پولیس نے یقیناً کریڈٹ کارڈ کی مدد سے اس کا سراغ لگایا تھا۔ اس نے خود کو کوسا کہ اسے اتنی کنجوسی کرنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ آج ہی اس نے آٹھ سو ڈالرز سے زیادہ کمائے تھے۔ اگر وہ دو ڈھائی سو کا بل ادا کر دیتا تو اسے یوں نہ بھاگنا پڑتا مگر معمولی سی رقم بچانے کے چکر میں یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ ذہنی طور پر وہ ایسے مواقعوں کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا اس لیے اس کی جیب میں ہتھکڑی بھی موجود تھی۔ اگر وہ دروازہ بند نہ کرتا تو پولیس بہت تیزی سے اس کے پیچھے آتی۔

وہ گھر پہنچا تو اگاتھا اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اسے کچھ بتانا چاہتی تھی لیکن وہ تھکن کا کہہ کر اپنے بیڈروم میں آ گیا اور ٹھٹک گیا وہاں ایک شخص پہلے سے موجود تھا جس کا سر بالوں سے تقریباً فارغ تھا اور اس نے موٹے شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی۔ خاص بات یہ تھی کہ وہ صرف گاؤن اور نیکر میں تھا۔ اگاتھا، ہیری کے پیچھے آئی تو ہیری نے برہمی سے اس سے پوچھا۔ ”مام، یہ شخص کون ہے؟“

”یہ فرینکی ہے۔“ اگاتھا نے نروس لہجے میں جواب دیا۔

”ٹھیک ہے لیکن یہ میرے بیڈروم اور اس حلیے میں کیا کر رہا ہے؟“

فرینکی آگے آیا اور اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”ہیلو ہیری! میں تمہاری مام کا فرینڈ ہوں۔“

”بوائے فرینڈ۔“ اگاتھا نے تصدیق کی تو ہیری نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

”یہ تمہارا بوائے فرینڈ ہے؟“

فرینکی اس کے پاس سے گزر کر فریج تک گیا، وہ ماں بیٹے کی بچ بچ سے بے نیاز لگ رہا تھا۔ اس نے ایک ٹن نکالا اور دیوار سے ٹک کر پینے لگا۔ اگاتھا ہیری کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ فرینکی بہت اچھا آدمی ہے اور اس سے محبت کرتا ہے لیکن ہیری سننے کے لیے تیار نہیں تھا، ایک موقع پر وہ بے قابو ہو کر فرینکی کی طرف لپکا بھی تھا۔

☆☆☆

ہیری، روپرٹ کے فلیٹ میں بیٹھا تھا اور اپنے سوجے منہ کی آئس بیگ سے ٹکور کر رہا تھا۔ اس کی دائیں آنکھ کے نیچے خاصی سوجن تھی اور بائیں کنپٹی پر بھی ورم تھا۔ روپرٹ اس کے برابر میں بیٹھا ٹی وی پر جیٹ لی کی فلم دیکھ رہا تھا جس میں جیٹ لی تن تنہا کئی افراد کی مرمت لگا رہا تھا۔ اس نے ہیری کی طرف دیکھے بغیر کہا... ”ایک عمر رسیدہ بوڑھے شخص نے تمہارا یہ حال کیا ہے؟“

”وہ خبیث کسی بھینسے کی طرح مضبوط ہے۔“ ہیری کراہا۔ ”اس نے صرف دو گھونسے مارے تھے اور مجھے ہوش نہیں رہا۔“

”تمہاری مام کیا کہتی ہے؟“

”وہ اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔“

”گویا دس سال بعد اسے شادی کا خیال آ گیا۔“ روپرٹ ہنسا۔ ”ویسے کیا وہ جانتی ہے کہ تم میرے لیے کام کرتے ہو؟“

”نہیں اسے اتنا معلوم ہے کہ میں کسی فرم میں ملازم ہوں اور مجھے زیادہ تنخواہ نہیں ملتی۔“

”حالانکہ تم اچھا خاصا کما رہے ہو۔“

”اچھا خاصا۔“ ہیری نے تلخی سے کہا۔ ”میں خود کو خطرے میں ڈال کر تمہارے لیے کماتا ہوں اور مجھے تیس چالیس فیصد سے زیادہ نہیں ملتا اب تک میں گرفتاری سے بچا ہوا ہوں، پولیس کے پاس میرا کوئی ریکارڈ نہیں ہے لیکن ایک بار میں پکڑا گیا تو وہ سب کھایا پیا اگلوا لیں گے۔“

روپرٹ نے پہلی بار اس کی طرف دیکھا۔ ”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“

"وہی جو تم سمجھ رہے ہو۔" ہیری نے اٹھ کر آئس بیگ فریج میں رکھ دیا اور اپنی جیکٹ پہنی۔ "میں یہ کام چھوڑ رہا ہوں۔"

"تم کام چھوڑ رہے ہو پھر تم کیا کرو گے؟"

"کچھ بھی کروں گا، میں نے کچھ رقم جمع کی ہے شاید کوئی چھوٹا موٹا بزنس کرلوں۔"

روپرٹ نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم کوئی اور کام نہیں کر سکتے کیونکہ تمہیں کام کرنے کی عادت ہی نہیں ہے۔"

"دیکھوں گا...... لیکن اب میں یہ کام نہیں کروں گا۔"

"ٹھیک ہے مجھے کوئی ایسی چیز لا دو جس کی مالیت پچاس ہزار ڈالرز ہو اور اس کے بعد تم جہنم میں جانے کے لیے بھی آزاد ہو۔"

ہیری نے اس کے الفاظ نظر انداز کیے پھر استہزائیہ نظروں سے اسے دیکھا اور دروازے کی طرف جانے لگا، عقب سے روپرٹ نے چلا کر کہا۔ "پچاس ہزار... یاد رکھنا۔"

برف کی ٹکور سے خاصا فرق پڑا تھا اور اس کا چہرہ تقریباً نارمل ہوگیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ روپرٹ اتنی آسانی سے اس کی جان نہیں چھوڑے گا۔ اسے یاد تھا، دس سال پہلے جب اس کا باپ ایک بینک ڈکیتی کے دوران ڈاکوؤں کو روکتے ہوئے مارا گیا تھا۔ اس کے چند دن بعد ہی روپرٹ کے کرگے اسے اٹھا کر لے گئے۔ انہوں نے اسے بری طرح سے مارا۔ جب وہ ادھ موا ہوگیا تو روپرٹ سامنے آیا اور اس نے ہیری کو بتایا کہ ان کا باپ اس کے لیے کام کرتا تھا وہ اسے اور اس کے آدمیوں کو تحفظ دیتا تھا۔ روپرٹ چوروں کا سرغنہ تھا، اس کے آدمی اس کے لیے چیزیں چوری کر کے لاتے تھے اور وہ چوری کے مال کو آگے فروخت کرتا تھا۔ ہیری کے لیے یہ انکشاف تھا کہ اس کا پولیس مین باپ اصل میں چوروں کا ساتھی تھا اور اس نے اس بات پر یقین نہیں کیا تھا مگر وہ روپرٹ کو انکار نہیں کرسکتا تھا۔ اس وقت وہ ایک بار میں کام کرتا تھا اور اسے صرف تیس ڈالرز روز ملتے تھے۔ ہائی اسکول کے بعد اس نے کالج میں داخلے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے بجائے وہ جلد از جلد کچھ کما کر زندگی کے مزے اڑانا چاہتا تھا۔

روپرٹ کے لیے کام کرنے کے عوض اسے اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی تھی لیکن یہ بات اس نے اپنی ماں سے چھپائی تھی۔ گھر سے باہر کھل کر عیاشی کرنے کے بعد بھی وہ اچھی خاصی رقم بچا لیتا تھا اور یہ رقم اس نے گھر میں ایک خفیہ جگہ چھپا رکھی تھی جس کا اگاتھا کو بھی علم نہیں تھا۔ اب یہ رقم تین لاکھ ڈالرز سے اوپر جا چکی تھی۔ ہیری کچھ عرصے سے سوچ رہا تھا کہ وہ اب یہ دھندا چھوڑ کر کوئی کام شروع کردے۔ اتنی رقم سے وہ کوئی گیس اسٹیشن یا ہائی وے پر چلتا ہوا ریستوران خرید سکتا تھا لیکن وہ شہر کا آدمی تھا اور شہر سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لیے اس نے کسی اچھے علاقے میں چلتا ہوا بار لینے کا فیصلہ کیا تھا جہاں جھگڑے فساد نہ ہوتے ہوں اور آنے والے بھاری جیب رکھتے ہوں۔

لیکن اس سے پہلے روپرٹ سے جان چھڑانا لازمی تھی۔ پچاس ہزار مالیت کی چیز کوئی قیمتی گھڑی ہوسکتی تھی یا کوئی بیش قیمت ہار۔ ان دونوں چیزوں کو سر عام چرانا نہایت خطرناک کام تھا اور اس میں پکڑے جانے کے امکانات بہت زیادہ تھے۔ ہیری صبح گھر واپس آگیا، اب وہ چہرہ بالکل ٹھیک ہونے تک باہر نہیں جا سکتا تھا۔ اگاتھا اس کے لیے پریشان تھی لیکن اس نے ماں سے بات چیت بند کر رکھی تھی۔ دو دن بعد اس کا چہرہ ٹھیک ہوگیا تو وہ تیار ہو کر اپنے مشن پر روانہ ہوگیا۔ وہ ایک دفتری عمارت میں داخل ہو جہاں زیادہ تر بینکوں اور مالیاتی اداروں کے دفاتر تھے یہاں ڈائریکٹرز لیول کے ملازمین آتے تھے اور ان میں سے اکثر نے بیش قیمت گھڑیاں پہن رکھی ہوتی تھیں، عورتوں کے پاس قیمتی زیورات تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ عمارت میں داخل ہوتا ایک لڑکی اس کے سامنے آگئی۔

"ہائے..."

لڑکی خاصی دلکش تھی، بہت نازک سے نقوش تھے اس کے۔ ہیری رک گیا اور پھر مسکرایا۔ "ہائے..."

"ہم تین مہینے پہلے ملے تھے۔" لڑکی نے یوں کہا جیسے ہیری نے بھی اسے پہچان لیا ہو۔ ہیری کے مسکرانے کا انداز ہی ایسا تھا۔

"اوہ... ہاں۔" وہ بولا، ویسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔

"مجھے تم سے اہم بات کرنی ہے۔"

ہیری اسے راستے سے ہٹا کر اوپر جانے والی سیڑھیوں کی سائڈ پر لے آیا۔ "ہاں کہو...؟"

"وہ میں..." لڑکی نروس ہو رہی تھی۔ "امید سے ہوں۔"

"امید سے..." ہیری نے اس کی بات دہرائی۔ "اوہ... اچھی بات ہے... کب سے ہو؟"

لڑکی براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی، اس نے جواب دیا۔ "تین مہینے سے۔"

ہیری کو جھٹکا سا لگا اور اس نے بوکھلا کر آس پاس دیکھا۔ پھر اس نے نزدیکی ستون کے گرد چکر لگایا اور دوبارہ لڑکی کے پاس آیا اور بولا۔ "میرا خیال ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" وہ یقین سے بولی۔ "میں نے دو بار ٹیسٹ کرایا ہے۔"

"میں اپنے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

اچانک لڑکی کی آنکھیں بجھ گئیں اور چہرہ سفید پڑ گیا۔ "تمہارا مطلب ہے تم مجھے پہچاننے سے انکار کررہے ہو؟"

"ہاں، میں نے تمہیں آج سے پہلے نہیں دیکھا۔"

"تم مجھ سے مڈ ویسٹ میں پارکر بار میں ملے تھے جہاں میں کام کرتی ہوں اور تم کہتے ہو تم نے مجھے دیکھا ہی نہیں ہے۔" لڑکی کا لہجہ تیز ہوگیا۔

"ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں اور جہاں تک اس بچے کا تعلق ہے تو..." ہیری کی بات مکمل ہونے سے پہلے منہ پر پڑنے والے تھپڑ نے اس کی زبان بند کردی اور لڑکی ایڑیاں بجاتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ آس پاس کے کچھ لوگوں نے اس کی بے عزتی کا یہ منظر دیکھا لیکن کسی نے دخل اندازی نہیں کی۔ ہیری کا موڈ خراب ہوگیا تھا، اس نے کام کا ارادہ ملتوی کردیا اور گھر کا رخ کیا۔ وہ گھر پہنچا تو اس نے اگاتھا کو پیکنگ کرتے پایا۔ "ماما یہ کیا ہے؟"

"میں نے اور فرینکی نے شادی کا فیصلہ کرلیا ہے اور میں اس کے گھر جا رہی ہوں۔"

"مجھے چھوڑ کر...؟" ہیری نے بے یقینی سے کہا۔

"ہاں کیونکہ فرینکی ایک اچھا آدمی ہے اور تم اب اپنی دیکھ بھال خود کرسکتے ہو۔ میں مزید اکیلے نہیں رہ سکتی۔"

"اکیلے... میرے ساتھ؟"

"تم یہ بات نہیں سمجھو گے۔" اگاتھا نے اس کی بات کاٹی۔ "عورت کو ایک مرد کا ساتھ چاہیے ہوتا ہے جو اس کے لیے ہو۔ مجھے یہ ساتھ فرینکی کی صورت میں مل گیا ہے۔ تم اور تمہاری زندگی میری نہیں ہے۔"

"گویا تم نے فیصلہ کرلیا ہے؟"

"ہاں، اور میں جا رہی ہوں۔ کیا تم اپنی ماں کو رخصت نہیں کرو گے؟"

ہیری بیڈ روم میں چلا گیا اور اس نے دروازہ دھڑ سے بند کردیا۔ کچھ دیر بعد بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور اگاتھا گھر سے چلی گئی۔ ہیری نے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر دیکھا۔ اگاتھا فرینکی کی بڑی سی کار میں سامان رکھوا رہی تھی اور پھر وہ نئے ہنی مون جوڑے کی طرح وہاں سے چلے گئے۔ ہیری دانت پیستا رہا گیا تھا آج اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ پہلے ایک لڑکی ملی جس کا دعویٰ تھا کہ وہ تین مہینے پہلے اس سے مل چکی ہے اور اس کے نتیجے میں وہ امید سے ہے۔ گھر آیا تو ماں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ رخصت ہوگئی تھی اور اب اس سے شادی کرنے جا رہی تھی۔ ماں کا مسئلہ اتنا اہم نہیں تھا لیکن اس لڑکی نے جو دعویٰ کیا تھا وہ پریشان کن تھا۔ ہیری اس بارے میں سوچتے ہوئے چونک گیا۔ تین مہینے پہلے ایک دن وہ رات بھر اور اگلے دن دوپہر تک گھر سے غائب رہا تھا، اگاتھا کا کہنا تھا کہ ایک ٹیکسی اسے گھر پہنچا گئی تھی اور وہ بینک اوور کا شکار ہو کر سو رہا تھا، بڑی مشکل سے اسے گھر تک پہنچایا گیا تھا۔ رات کو جب وہ سو کر اٹھا تو اسے کچھ نہیں یاد تھا سوائے اس کے کہ رات کے کھانے کے بعد اس نے نزدیکی کسی بار کا رخ کیا تھا۔ ہیری کو یاد تھا کہ کھانا اس نے مڈ ویسٹ کے ایک ریستوران میں کھایا تھا اور لڑکی نے بھی مڈ ویسٹ کا ہی ذکر کیا تھا۔

شام کو ہیری نے کپڑے بدلے اور گھر سے نکل آیا، اس نے مڈ ویسٹ کا رخ کیا۔ شام ہوتے ہی نیویارک کی رونق بڑھ گئی تھی۔ مڈ ویسٹ پر پارکر بار تلاش کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ یہ ایک درمیانے درجے کا بار تھا جہاں نزدیکی رہائشی علاقوں میں رہنے والے اور اس سڑک سے گزرنے والے پینے کے لیے چلے آتے تھے۔ ہیری نے اندر آ کر کاؤنٹر پر ایک لائٹ وہسکی طلب کی۔ اس کی نظریں اس لڑکی کو تلاش کر رہی تھیں۔ بارٹینڈر نے وہسکی کا گلاس اس کے سامنے رکھا اور سخت لہجے میں بولا۔ "اور کچھ؟"

"نہیں، بس یہی چاہیے۔" اس نے کہا اور ایک ہی سانس میں گلاس خالی کردیا۔ اسی لمحے اسے میزوں کے درمیان گھومتی لڑکی نظر آگئی۔ وہ آرڈر لے رہی تھی اور سرونگ کر رہی تھی۔ ہیری ایک سکہ کاؤنٹر پر رکھ کر اس کی طرف بڑھا۔ اس نے پاس جا کر اس لڑکی کا بازو پکڑا۔ "سنو، مجھے تم سے بات کرنی ہے۔"

لڑکی نے ایک جھٹکے سے اس سے بازو چھڑا لیا۔ "لیکن مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی ہے۔"

"پلیز... میری بات سنو..."

وہ اس سے آگے کچھ نہیں کہہ سکا تھا کیونکہ ایک تنومند آدمی نے آ کر اس کا بازو پکڑ لیا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا وہ اسے کھینچ کر بار کے عقبی دروازے تک لے آیا۔ ہیری اسے

سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ صرف لڑکی سے بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن اس نے ہیری کو اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ سامنے دیوار کے ساتھ رکھے لکڑی کے خالی ڈبوں پر جا گرا۔ عقب میں دروازہ بند ہو گیا تھا۔ ہیری کو کسی قدر چوٹ آئی تھی اس نے اٹھتے ہوئے آدمی کو ایک گالی دی اور پھر اس کے پرس کا معائنہ کیا۔ جب وہ اسے کھینچ رہا تھا تب ہیری نے ہاتھ کی صفائی دکھا دی تھی۔ مگر اس کے پرس میں سوائے دس ڈالرز کے چار نوٹوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ ہیری نے نوٹ نکال کر پرس کچرے کے ڈبے پر کھینچ مارا اسی لمحے عقب سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی، شاید آدمی کو پرس کی گم شدگی کا پتا چل گیا تھا۔

''لعنت ہو۔'' اس نے کہا۔

''اچھا لعنت ہو۔'' عقب سے لڑکی کی آواز آئی۔ وہ واپس جا رہی تھی ہیری بوکھلا کر اس کی طرف دوڑا۔

''ایک منٹ رکو میں نے تم کو نہیں کہا تھا۔''

لڑکی رک گئی۔ ''کیوں آئے ہو یہاں؟''

''میں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔'' ہیری نے کہا اور پھر جلدی جلدی کہنے لگا۔ ''دیکھو میں سچ کہتا ہوں مجھے اس رات بلکہ اگلے دن کی بات بھی یاد نہیں ہے۔ اس رات میں نے بہت زیادہ پی لی تھی لیکن میں تسلیم کرتا ہوں تم جو کہہ رہی ہو وہ بالکل ٹھیک ہے۔''

''تو پھر...؟'' لڑکی نے جارحانہ انداز میں کہا۔

''دیکھو میں... مجھے تمہارا نام بھی نہیں معلوم ہے۔''

''بیٹی کارل۔'' وہ بولی۔ ''کارل میرا خاندانی نام ہے۔''

''ہیری کارٹر۔'' جواباً اس نے اپنا نام بتایا۔

''ہاں تو ہیری تمہارے پاس اس مسئلے کا کیا حل ہے؟''

ہیری ٹہلنے لگا پھر اس نے کہا۔ ''میں تمہارے لیے ایک ڈاکٹر کا بندوبست کرتا ہوں اور اس کی فیس بھی میں ادا کروں گا۔''

''ڈاکٹر کیا کرے گا؟''

''وہ اس مسئلے کو سرے سے ختم کر دے گا۔'' ہیری نے ڈھکے چھپے انداز میں کہا۔

''کیا تم ایسے کسی ڈاکٹر کو جانتے ہو؟''

''نہیں لیکن میں تلاش کروں گا۔'' ہیری نے کہا۔ ''تم کہو، تم راضی ہو؟''

بیٹی نے سر ہلایا۔ ''میں یہاں اکیلی ہوں اور کوئی ذمے داری نہیں اٹھا سکتی۔''

''ٹھیک ہے اپنا سیل نمبر دو، میں ڈاکٹر کا بندوبست کرتے ہی تم سے رابطہ کروں گا۔''

بیٹی نے اسے اپنا سیل نمبر دیا اور ہیری نے اپنا سیل نمبر اسے بتایا۔ ''میں تم سے جلد رابطہ کروں گا۔''

ہیری کا خیال تھا کہ شاید یہ کام دس سے بیس ہزار ڈالرز میں نمٹ جائے گا کیونکہ کام غیر قانونی تھا اور اس کی فیس بھی اچھی خاصی ہوتی۔ اسے اس قسم کے کاموں کا کوئی تجربہ نہیں تھا اس لیے اس نے روبرٹ سے رابطہ کیا۔ ''مسٹر مجھے کسی ایسے ڈاکٹر کا پتا چاہیے جو خواتین کے مسائل حل کر سکتا ہو تم سمجھ رہے ہو نا میرا مطلب...؟''

''نہیں...'' روبرٹ نے انکار کیا۔ ''یہ ہاتھ کی صفائی دکھاتے دکھاتے تم نے اچانک دوسرا دھندا شروع کر دیا ہے۔''

''یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔'' ہیری نے رکھائی سے جواب دیا۔ ''اگر تم ایسے کسی ڈاکٹر کے بارے میں جانتے ہو تو...''

''ہاں ایک ڈاکٹر کے بارے میں جانتا ہوں لیکن میرے کام کا کیا ہوا؟''

''وہ بھی جاری ہے، میں اس مسئلے سے نمٹ لوں پھر تمہارا کام بھی کرتا ہوں۔'' ہیری نے بیزاری سے کہا۔ روبرٹ نے اسے ایک پتا لکھوا دیا۔

''لیکن میرا نام مت لینا۔''

''میں سمجھتا ہوں۔'' ہیری نے کہا۔

فون بند کر کے وہ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اکا تھا کے بغیر گھر اسے بڑا عجیب لگ رہا تھا پھر اس نے سوچا کہ اس نے فریخی کے بارے میں معلوم ہی نہیں کیا کہ وہ کون ہے اور کیا کرتا ہے۔ اس وقت اسے ہوش ہی نہیں تھا، وہ غصے میں اندھا ہو رہا تھا۔ بہرحال اس معاملے سے نمٹنے کے بعد وہ اس کا بھی پتا کر سکتا تھا۔ اگلے روز صبح اس نے اپنی جمع پونجی دیکھی۔ کچن میں لکڑی کے ریک اس نے خود بنائے تھے اور اس دوران میں اس نے ایک ایسا خفیہ خانہ بنایا تھا جس کا پتا اکا تھا کو بھی نہیں تھا۔ یہ فریج کے ساتھ کیبنٹ کے نیچے الگ ہو جانے والا حصہ تھا جو ایک کھٹکا ہٹانے پر کسی ٹرے کی طرح باہر آ جاتا تھا۔ اس میں اس نے رقم کے علاوہ وہ تمام چیزیں بھی رکھی تھیں جنہیں پھینکنے کو اس کا دل نہیں چاہا تھا۔ ان میں تصاویر بھی تھیں اور چین بھی۔ اور ایک عدد پولیس بیج بھی تھا۔ اس نے ایک بار غلطی سے ایک پولیس والے کی جیب پر ہاتھ صاف کر دیا تھا۔

رقم یورو کی صورت میں تھی۔ ڈالرز میں تین لاکھ ڈالرز

کی رقم اچھی خاصی جگہ گھیرتی تھی اس لیے اس نے رقم یورو میں تبدیل کرا لی تھی۔ یہ ڈھائی لاکھ یورو کی رقم تھی کیونکہ یورو میں ہزار کا نوٹ بھی ہوتا ہے اس لیے یہ رقم صرف ڈھائی گڈی میں آ گئی تھی۔ اسے رقم کی ضرورت تھی اور اس کے لیے اس نے چند ہزار ڈالرز کی رقم الگ سے رکھی تھی۔ اس نے اس میں سے کچھ رقم لی اور ٹرے کو بند کر دیا۔ وہ تیار ہو کر باہر آیا، اس کا ارادہ اس ڈاکٹر کے پاس جانے کا تھا جس کا پتا روبرٹ نے بتایا تھا لیکن جیسے ہی وہ عمارت سے باہر آیا، سامنے ایک کار رکی اور اس سے جان اور اس کا ساتھی پولیس آفیسر رینڈ بائل باہر آئے۔ جان نے ہیری سے پوچھا۔ ''تم ہیری کارٹر ہو؟''

''نہیں میرا نام جیمس کروب ہے۔'' اس نے گھبرائے بغیر کہا۔

''تم ہیری کارٹر کو جانتے ہو؟''

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا۔ اندر سے اسی کے فلور پر رہنے والی ایک عورت برآمد ہوئی، اس نے ہیری کو دیکھتے ہی کہا۔ ''ہیری تمہاری ماما کہاں گئی ہے...؟''

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ہیری اندر جا چکا تھا۔ اس نے دروازہ بند کر کے اسے لاک کر دیا اور پھر عمارت کے پچھلے حصے کی طرف بھاگا، جب تک جان اور رینڈ دروازہ کھول کر اس کے پیچھے آتے، وہ عقبی صحن میں پہنچ کر دیوار پھلانگ کر باہر آ گیا اور اس کے بعد نظر آنے والی پہلی ٹیکسی روک کر اس میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے پوچھا۔ ''کہاں جانا ہے؟''

''کہیں بھی چلو، یہاں سے نکلو۔'' اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ اسے خوف تھا کہ اگر پولیس والے اس کے پیچھے آ گئے اور اسے ٹیکسی میں دیکھ لیا تو وہ پکڑا جائے گا۔ اس لیے وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ ٹیکسی آگے بڑھی اور فوراً ہی دونوں پولیس والے دوڑتے ہوئے نمودار ہوئے، ہیری نے جوتے کے تسمے باندھنے کے بہانے سر نیچے کر لیا تھا۔ جب وہ سیدھا ہوا تو ٹیکسی خاصی آگے جا چکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پولیس والے اس کے گھر تک کیسے پہنچے اور کس سلسلے میں پہنچے تھے، اس نے بے شمار وارداتیں کی تھیں لیکن گزشتہ چند دن سے وہ بالکل خاموش تھا۔ پولیس اس کے گھر پہنچ گئی تھی اس کا مطلب تھا وہ گھر میں نہیں جا سکتا تھا، اس نے ٹیکسی والے کو روبرٹ کے علاقے کا کہا۔ اس کے پاس فی الحال یہی ایک پناہ گاہ تھی۔

مگر روبرٹ نے اسے دیکھ کر دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ اس نے زنجیر کی حد تک دروازہ کھولا اور غرا کر بولا۔ ''پولیس والے تمہارے بارے میں پوچھتے ہوئے

سنہری باتیں

☆ شیکسپیئر کی ماں نے اپنے بیٹے سے کہا۔ ''تم انگلش میں بہت کمزور ہو، اگر تم اس بار بھی انگلش میں فیل ہوئے تو میں تمہیں مزید تعلیم جاری رکھنے کی اجازت نہیں دوں گی۔'' شیکسپیئر ایم اے انگلش پاس نہ کر سکا۔ مگر اب کوئی بھی طالب علم شیکسپیئر کو پڑھے بغیر ایم اے انگلش نہیں کر سکتا۔

☆ تنقید کسی انسان کو انسان بنا بھی سکتی ہے اور کسی کو توڑ بھی سکتی ہے، چنانچہ کسی پر تنقید کرنے میں محتاط رہیے۔

☆ کسی کو سمجھنا پیار کرنے سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ ایسے بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو ہم سے پیار کرتے ہیں، مگر بہت کم ایسے ہیں جو ہمیں سمجھ پاتے ہیں۔

☆ دنیا آپ کو اس وقت تک... نہیں ہرا سکتی جب تک آپ خود سے نہ ہار جائیں۔ اگر سب کچھ کھو کر بھی کچھ کرنے کی ہمت باقی ہے تو سمجھیں آپ نے کچھ نہیں کھویا۔

☆ شیر آگے چھلانگ لگانے سے قبل ایک قدم پیچھے ہٹتا ہے، چنانچہ زندگی کی کوئی ناکامی آپ کو پیچھے کی طرف کھینچے تو پریشان نہ ہوں کیونکہ یہ آپ کی ایک عظیم فتح کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔

☆ جب کوئی دوست آپ کو اپنا راز دیتا ہے تو سمجھ لینا کہ وہ اپنی عزت آپ کو امانت کے طور پر دیتا ہے، اس لیے امانت میں خیانت نہ کرنا۔

مرسلہ: اختر شاہ عارف، جہلم

یہاں تک آچکے ہیں اور اب میں تمہاری صورت اپنے دروازے پر نہیں دیکھنا چاہتا۔ یہاں سے دفع ہوجاؤ۔“

”پلیز روبرٹ۔۔۔اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔“

”میں کچھ نہیں جانتا، یہاں سے چلے جاؤ۔“ وہ غرایا۔”ورنہ میں خود پولیس کو کال کردوں گا۔“

مجبوراً ہیری وہاں سے نکل آیا۔ روبرٹ ڈرا ہوا تھا اور اسی وجہ سے اسے اندر آنے کی اجازت بھی نہیں دے رہا تھا۔ ہیری نے پچھلا راستہ اختیار کیا تھا۔ واپس جاتے ہوئے بھی اس نے پچھلا راستہ چنا اسے یقین تھا کہ سامنے پولیس ہوگی اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ سامنے سے نہیں آیا ورنہ اس وقت گرفتار ہوکر پولیس کے ساتھ جارہا ہوتا۔ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہوئی تھی جس کی وجہ سے پولیس اس کی راہ پر لگی تھی ورنہ اس کا کوئی ریکارڈ نہیں تھا، وہ ہمیشہ ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرتا تھا۔ گھر جانا بھی ممکن نہیں تھا۔ اسے گھر کی پروا نہیں تھی لیکن وہاں اس کی جمع پونجی موجود تھی۔ وہ سڑکوں پر پھرتا رہا اور پھر رات کو ایک پارک میں بنچ پر لیٹ کر سوگیا۔

خوش قسمتی سے ستمبر کا آخر تھا ورنہ سرد موسم میں رات باہر گزارنا ناممکن ہوجاتا۔ صبح اس نے ایک ٹھیلے سے برگر اور شیک لے کر ناشتا کیا اور گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ عمارت کے پاس پہنچ کر اس نے احتیاط سے کونے سے جھانکا اور ایک کار کو دروازے کے عین سامنے پاکر ٹھنڈی سانس لی۔ پولیس والے نگرانی کررہے تھے۔ وہ کسی صورت خود سے اندر جاکر رقم نہیں نکال سکتا تھا، اسے معلوم تھا کہ پولیس والے عمارت کے پچھلے حصے کی نگرانی بھی کررہے ہوں گے۔ وہ عمارت میں نہیں جاسکتا تھا اور اندر جائے بغیر رقم حاصل نہیں کرسکتا تھا جبکہ رقم کے بغیر اس کے مسئلے حل نہیں ہوسکتے تھے۔

ہیری سوچ رہا تھا کہ رقم کس طرح حاصل کرے؟ اسے بینی کو بھی اس مشکل سے نجات دلانی تھی۔ بینی سے اسے خیال آیا کہ وہ کیوں نہ اس کی مدد حاصل کرے۔ یہ خیال آتے ہی وہ پارکر بار کی طرف روانہ ہوگیا لیکن وہاں پہنچ کر اسے مایوسی ہوئی۔ بار اس وقت بند تھا اور شام چار بجے کھلتا بینی بھی اسی وقت کام پر آتی تھی۔ بار چار سے بارہ بجے تک کھلا رہتا تھا۔ وہ بار کے سامنے انتظار کرتا رہا اور اس دوران میں صرف لنچ کے لیے وہاں سے گیا تھا۔ چار بجے بار کھلا تھا. اور اس کے کچھ دیر بعد ایک چھوٹی سی پرانی کار سے بینی اترتی دکھائی دی۔ ہیری اس کی طرف لپکا۔ وہ اسے اچانک سامنے دیکھ کر چونک گئی۔”تم نے ڈاکٹر تلاش کرلیا ہے؟“

”ہاں کرلیا ہے۔“ ہیری عجلت میں بولا۔”لیکن اس وقت میں تمہارے پاس ایک کام سے آیا ہوں کیا تم کام سے ایک دن کی چھٹی لے سکتی ہو؟“

”ہاں چھٹی لے سکتی ہوں لیکن کام کیا ہے؟“ بینی نے تجسس سے پوچھا۔

”پلیز پہلے تم چھٹی کا کہہ دو۔“

وہ بار کی طرف جانے کے بجائے کار میں بیٹھ گئی اور سیل فون پر باس سے رابطہ کرکے اپنی طبیعت خرابی کا بتانے لگی۔ اس نے کہہ دیا کہ آج وہ کام پر نہیں آئے گی۔ باس کی بک بک سنے بغیر اس نے سیل فون رکھ دیا۔ اس دوران میں ہیری اس کے برابر میں آبیٹھا تھا۔ بینی نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ ہیری نے دیکھا، ڈیش بورڈ کے نچلے خانے میں ایک قیمتی اور اعلیٰ درجے کا کیمرا رکھا ہوا تھا۔”تم فوٹو گرافی کا شوق رکھتی ہو؟“

”نہیں، میں کمرشل فوٹو گرافی کا کورس کررہی ہوں صبح کالج جاتی ہوں اور شام کو یہ ملازمت کرتی ہوں۔“ اس نے بتایا۔”تمہارا کیا مسئلہ ہے؟“

”میرے گھر میں ایک جگہ میری رقم رکھی ہے لیکن میں خود جاکر اسے حاصل نہیں کرسکتا، میں چاہتا ہوں تم جاکر وہاں سے رقم نکال لاؤ۔“

”تم کیوں نہیں جاسکتے؟“

”وہ دراصل باہر پولیس موجود ہے۔ وہ داخلی دروازے کی نگرانی کررہے ہیں۔“

بینی نے کار ایک طرف روک دی اور اس کی طرف مڑی۔”تم مجھے یہ بتانے کی کوشش کررہے ہو کہ پولیس تمہاری تلاش میں ہے اور تم اس سے بچتے پھر رہے ہو؟“

”یہی بات ہے۔“ ہیری نے اقرار کیا تو بینی نے سر پشت پر مارا۔

”میرے خدا! وہ شخص جو میرے پیٹ میں موجود بچے کا باپ ہے ایک مجرم ہے اور پولیس کو مطلوب ہے۔“

”یہ ایک غلط فہمی ہے۔“

”مجھے بے وقوف مت بناؤ۔“ بینی نے سیل فون نکالا۔ ”میں نے بلاوجہ آج کی چھٹی کی۔“

”پلیز میری بات سنو۔“ ہیری نے التجا کی۔”میں سچ کہہ رہا ہوں میں اس وقت بالکل خالی ہوں، میں نے رات ایک پارک کی بنچ پر گزاری ہے اور صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔“

بینی کا ہاتھ رک گیا مگر اس نے سیل فون رکھا نہیں۔”تم نے کچھ تو کیا ہوگا، پولیس ایسے ہی تو کسی کے پیچھے نہیں پڑتی ہے۔“

ہیری کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔”وہ دراصل۔۔۔ میرا اپنے ہونے والے سوتیلے باپ سے جھگڑا ہوگیا تھا اور کچھ مار پیٹ بھی ہوئی تھی شاید اس نے پولیس میں رپورٹ کردی ہو۔“

بینی کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے سیل فون رکھ دیا۔”مجھے تمہاری بات پر یقین نہیں آرہا ہے لیکن میں تمہاری مدد کروں گی کیونکہ تم قلاش ہوگے تو ڈاکٹر کی فیس کہاں سے ادا کروگے؟“

ہیری خوش ہوگیا۔”یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔“

اس نے کار عمارت سے کچھ دور رکوائی تھی۔ اس نے بینی کو چابی دی اور اس خفیہ جگہ کا سمجھایا جہاں رقم تھی۔ بینی کو ذرا بھی مشکل پیش نہیں آئی۔ وہ مزے سے ٹہلتی ہوئی گئی اور رقم نکال کر واپس آگئی۔ وہ حیران تھی جب اس نے لفافے میں لپٹی گڈیاں ہیری کو دیں جو اس نے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیں۔”میرے خدا! یہ تو تین لاکھ ڈالرز سے زیادہ کی رقم ہے۔“

”ہاں۔“ ہیری نے کہا اور اسے ڈاکٹر کے کلینک کا پتا سمجھایا۔

”تم کرتے کیا ہو؟“

ہیری نے اس سوال کا جواب گول کرکے کہا۔”میرا ارادہ ایک بار لینے کا ہے۔“

وہ چونکی۔”اگر بار لینے کا ارادہ ہے تو پارکر کا بار خرید لو وہ بیچ کر جارہا ہے۔“

”اچھا!“ ہیری نے دلچسپی سے کہا۔”کتنے مانگ رہا ہے؟“

”پانچ مانگ رہا ہے کیونکہ جگہ بھی اس کی ہے لیکن میرا خیال ہے اگر کوئی اسے چار لاکھ دے تو وہ بار بیچ دے گا۔“

”چار لاکھ!“ ہیری نے کسی قدر مایوسی سے کہا۔”خیر دیکھیں گے۔“

کلینک جاتے ہوئے ہیری کسی قدر نروس تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ کام کس طرح ہوگا۔ اس نے بینی سے کہا۔”میرا خیال ہے تمہیں ایک دو دن کلینک میں رہنا ہوگا۔“

”پتا نہیں۔“ وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولی۔”مجھے بھی اس کا تجربہ نہیں ہوا ہے۔“

کلینک کے سامنے کار روک کر وہ اندر جانے لگے ایک پریشان نظر آنے والا شخص سیڑھیاں اترتے ہوئے ہیری سے ٹکرایا اور پھر اس سے معذرت کرتے ہوئے چلا گیا۔ یہ میٹرنٹی ہوم تھا اور اندر جابجا ایسے جوڑے نظر آئے جو اپنے آنے والے بچے کی خاطر یہاں آئے ہوئے تھے، وہ خوش اور پرامید تھے۔ ہیری بینی کو لے کر کاؤنٹر کی طرف گیا اور اس نے وہاں موجود لڑکی سے آہستہ سے کہا۔”ہم مسئلہ حل کرانے آئے ہیں۔“

لڑکی کے لیے یہ بات نئی نہیں تھی، اس نے ایک فارم اس کے سامنے رکھ دیا اور دھیمے لہجے میں بولی۔”اسے دوسروں کی طرح فل کرو، ایک گھنٹے بعد میں تمہاری ملاقات ڈاکٹر فل مین سے کراتی ہوں۔“

بینی فارم لے کر ایک طرف آگئی۔ ہیری جو اس کے ساتھ ہی تھا اتفاق سے اس کا ہاتھ اپنی جیب کی جیکٹ پر گیا اور پھر وہیں رک گیا، رقم والا لفافہ غائب تھا اس نے بوکھلا کر جلدی سے تمام جیبیں دیکھیں۔ لیکن لفافہ کہیں نہیں تھا حالانکہ اس نے راستے میں خود جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھا تھا اس کے کہیں اور ہونے یا گرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اچانک اسے اس آدمی کا خیال آیا جو کلینک میں داخل ہوتے ہوئے اس سے ٹکرایا تھا، اس کا انداز بھی نپا تلا تھا ٹکرانے کے دوران میں اس نے نہایت صفائی سے ہیری کی جیکٹ سے لفافہ نکال لیا۔ یہ اپنا جوتا اپنے ہی سر پڑنے والی بات ہوگئی تھی۔ اس نے برسوں خطرات مول لے کر جو رقم بچائی تھی وہ ایک ہی بار میں اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی اور وہ خالی ہاتھ رہ گیا تھا۔

وہ صدمے کی کیفیت میں بیٹھا تھا اور بینی فارم فل کررہی تھی اچانک ہیری کو خیال آیا، اس کے پاس رقم تو تھی نہیں، وہ ڈاکٹر کی فیس کہاں سے ادا کرتا۔ اس نے بینی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو ہیری نے بوکھلا کر کہا۔”سنو، کیا تم اس بچے کو پیدا نہیں کرسکتیں؟“

بینی نے خفگی سے اسے دیکھا۔”تمہارا دماغ درست ہے میں کیوں اسے پیدا کروں اور پھر پالوں میرا تو سارا کیریئر ہی ختم ہوجائے گا۔“

”میرا مطلب ہے ہم دونوں مل کر اسے پیدا کرتے اور پالتے ہیں۔“

بینی نے شک سے کہا۔”کیا تم مجھے پرو پوز کررہے ہو؟“

”ہاں، میں چاہتا ہوں ہم شادی کرلیں۔“ ہیری نے اس کے ہاتھ سے فارم لے کر پھاڑ دیا۔”آؤ میں تمہیں اپنی ماں سے ملواتا ہوں۔“

”میری بات تو سنو۔۔۔“ بینی کہتی رہ گئی اور وہ اسے کھینچ کر باہر لے آیا۔ راستے میں اس نے اگا تھا کو ایس ایم ایس

کر کے اس سے فرینکی کے گھر کا پتا پوچھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بینی کو پتا چلے کہ وہ اپنی ماں کی رہائش سے لاعلم ہے۔ ایک منٹ بعد اگاتھا نے پتا ایس ایم ایس کر دیا۔ ہیری نے بینی کو پتا بتایا۔ فرینکی ایک اچھے علاقے میں اور ایک خوب صورت عمارت میں واقع خاصے بڑے فلیٹ میں رہتا تھا۔ دروازہ دو عدد ایک جیسے نقوش کے حامل بہت شوخ بچوں نے کھولا۔ فرینکی کا پوچھنے پر انہوں نے کہا۔

"پاپا نئی ماما کے ساتھ شاپنگ پر گئے ہیں۔"

"میں ہیری ہوں، تمہاری نئی ماما کا پرانا بیٹا۔"

بچے پرجوش ہو گئے۔ "ماما نے تمہارے بارے میں بتایا تھا، اندر آؤ۔"

بینی بھی اندر آئی۔ "یہ بینی ہے، میری گرل فرینڈ ہے۔ ہم جلد شادی کرنے والے ہیں۔"

فرینکی اور اگاتھا کچھ دیر بعد آئے اور انہوں نے ہیری اور بینی کو گرم جوشی سے گلے لگایا تھا۔ اگاتھا یہ سنتے ہی بینی پر واری قربان جانے لگی تھی کہ وہ ہیری کی ہونے والی بیوی تھی۔ "میں تو کب سے ترس رہی تھی کہ یہ لڑکا شادی کرے۔"

"یہ خوشی کا موقع ہے۔" فرینکی نے کہا۔ "میں کچھ اور سامان لے کر آتا ہوں۔"

"جب تک ہم ڈنر تیار کرتے ہیں۔" اگاتھا نے بینی کو کچن کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد ہیری ساری پریشانیاں بھول کر دونوں لڑکوں کو چکوں کا کھیل سکھا رہا تھا۔ وہ اب تک ویڈیو گیم اور اسی طرح کے کھیل کھیلتے آئے تھے۔ اس قسم کا کھیل انہوں نے پہلی بار کھیلا تھا۔ وہ بہت خوش ہو رہے تھے۔ فرینکی اس بار پیزا اور کیک لے کر آیا تھا۔ اس دوران میں بینی اور اگاتھا آپس میں بات کرتے ہوئے ڈنر کی میز تیار کر رہی تھیں اگاتھا بہت خوش تھی کیونکہ اس کا بیٹا پہلی بار اس کے گھر آیا تھا اور ہونے والی بہو کو بھی ساتھ لایا تھا۔ کھانا لگ گیا اور وہ سب میز پر آ گئے، دعا کے بعد کھانے کا آغاز ہوا اور ہیری کو پہلی بار پتا چلا کہ فرینکی کی ایک چھوٹی سی جیولری شاپ تھی۔ وہ ہیروں سے بنے ہوئے چھوٹے زیورات فروخت کرتا تھا۔ ہیری کو افسوس ہوا کہ اس نے اس شادی کی مخالفت کیوں کی تھی۔ فرینکی اچھا اور کھاتا پیتا آدمی تھا اس کے دونوں بچے بھی دوستانہ فطرت رکھتے تھے اور اگاتھا کے ساتھ ان کا رویہ بہت اچھا تھا۔

بینی کھانے کے دوران کچھ پریشان تھی۔ جس وقت ہیری کھانا ختم کر کے وائن سے شغل کرتے ہوئے فرینکی سے بات کر رہا تھا، اچانک بینی نے ابکائی لی اور پھر اٹھ کر واش روم کی طرف بھاگی۔ جب ہیری اور اگاتھا اس کے پیچھے آئے وہ کموڈ میں سارا کھایا پیا نکال چکی تھی۔ اگاتھا نے بے تابی سے پوچھا۔ "بینی کیا ہوا، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"وہ مام..... یہ امید سے ہے۔" ہیری نے بتایا۔

"تین مہینے سے۔" بینی ہانپتے ہوئے بولی اور بے ہوش ہو گئی۔

یہ سن کر اگاتھا کو بھی چکر آ گئے تھے لیکن وہ بے ہوش نہیں ہوئی تھی۔ فرینکی نے ایمبولینس کے لیے کال کر دی تھی آدھے گھنٹے بعد بینی کو اسپتال منتقل کر دیا گیا تھا جہاں اس کے ٹیسٹ ہو رہے تھے۔ ہیری یوں بے قرار تھا جیسے اس کی بینی سے شادی ہو گئی ہو اور وہ پہلی بار ماں بننے والی ہو۔ اگاتھا اور فرینکی اس اطلاع پر دم بخود رہ گئے تھے کیونکہ وہ سمجھ رہے تھے کہ ان کی ملاقات حال ہی میں ہوئی ہے۔ اگاتھا نے ہیری سے شکوہ بھی کیا کہ اس نے اسے بتایا نہیں۔ ہیری نے شرمندگی سے کہا۔ "مام بینی سے تعلق تو پہلے سے تھا لیکن شادی تک نوبت ابھی آئی ہے۔"

جب بینی کو کمرے میں شفٹ کیا گیا تو ہیری کو اس سے ملنے کی اجازت ملی تھی۔ ڈاکٹروں کے مطابق وہ خاصی کمزور تھی اور ابھی اس کے مزید کچھ ٹیسٹ ہونے تھے جس کے لیے اسے اسپتال میں دو دن اور رہنا تھا۔ ہیری اسے دیکھ مسکرایا۔ "اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟"

"ٹھیک ہوں۔" وہ بھی مسکرائی۔

ہیری نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ پھر ہم شادی کر لیں گے۔"

بینی کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ "بہت جلد...؟"

"نہیں..." ہیری نے سر کھجایا۔ "فوراً ممکن نہیں ہے ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔ جو رقم تم گھر سے نکال کر لائی تھیں وہ کسی نے میری جیکٹ سے نکال لی ہے۔"

بینی حیران رہ گئی تھی۔ اصل حیرت اسے ہیری کی ہمت پر تھی جو اتنا بڑا نقصان برداشت کر کے بھی نارمل تھا اور اس کے لیے فکرمند تھا۔ ہیری نے اسے تسلی دی۔ "تم فکر مت کرو، میں پھر کوشش کروں گا اور اتنی رقم جمع کر لوں گا۔"

"لیکن کیسے.....؟ اور تم نے مجھے بتایا نہیں کہ تم کیا کام کرتے ہو؟"

"یہ میں تمہیں یہاں سے نکلنے کے بعد بتاؤں گا۔" ہیری نے کہا۔

بینی نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔ "ہیری، کیا تم کوئی غیر قانونی کام کرتے ہو؟"

ہیری خاموش رہا۔ اس کی خاموشی ہی بینی کے سوال کا جواب تھی۔ بینی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ہیری بے بس ہو گیا، اس نے کہا۔ "ہاں، میں غیر قانونی کام کرتا تھا لیکن اب میں یہ سب کام چھوڑ چکا ہوں بس میں بار لینے کی بات کر رہا تھا۔"

"تم ماضی کو چھوڑ دو گے لیکن ماضی تو تمہیں نہیں چھوڑے گا۔" وہ تلخی سے بولی۔ "تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ پولیس کو بھی تمہاری تلاش ہے۔"

"بینی مجھ پر اعتماد کرو، میں سارے مسئلے حل کر لوں گا، پلیز....!"

بینی نے کوئی جواب نہیں دیا، اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔ ہیری جانتا تھا کہ وہ اسے اس وقت بھی دھوکا دے رہا تھا وہ بالکل کنگلا ہو گیا تھا اور اب اس کے پاس ایک ہی راستہ تھا جہاں سے اسے مدد مل سکتی تھی، یہ روبرٹ تھا مگر اس کی مدد اسے ایسے ہی نہیں مل سکتی تھی۔ وہ ایک بار پھر اس کی چنگل میں گرفتار ہو جاتا لیکن اس کے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ اسپتال سے نکلا تو خاصا مایوس تھا۔ اس نے زیر لب اپنی قسمت کو کوسا اور روبرٹ کے فلیٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ دروازہ اس کے چھوٹے بھائی کارڈی نے کھولا جسے ہیری نے ہمیشہ ویڈیو گیمز میں مگن دیکھا تھا، اسے کسی اور معاملے سے کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا۔ "روب نہیں ہے۔ اس نے منع کیا ہے، تم یہاں نہیں آسکتے۔"

ہیری اسے دھکا دے کر اندر داخل ہو گیا۔ "بکواس مت کرو، مجھے ہر صورت میں روبرٹ سے ملنا ہے۔"

اسی لمحے باہر کا دروازہ کھلا اور روبرٹ اپنے ایک آدمی چارلی کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ چارلی اس کی غنڈا فورس کا سرغنہ تھا۔ جب ہیری کو پہلی بار یہاں لایا گیا تھا تو اسی نے اس پر تشدد کیا تھا۔ روبرٹ نے پستول نکالا ہوا تھا۔ "ہیری... کتیا کے بچے... میں نے تم سے کہا تھا مجھ سے دور رہنا... پولیس تمہارے پیچھے ہے۔"

"مجھے معلوم ہے لیکن میں مجبوراً یہاں آیا ہوں۔ کسی سالے نے میری تمام رقم میری جیب سے نکال لی ہے۔"

"جیب سے نکال لی ہے۔" روبرٹ نے اس کی بات دہرائی پھر اس پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ "کسی نے تمہاری جیب کاٹ لی؟"

"ہاں۔" ہیری مشتعل ہو کر بولا۔ "میں اس وقت پریشان تھا اس لیے میرے ساتھ ایسا ہو گیا۔ اب میرے

مائنڈ سائنس

☆ غیر حقیقت پسندانہ سوچ اور ناقص منصوبہ بندی مایوسی اور فرسٹریشن کو جنم دیتی ہے۔

☆ ہماری کامیابی اور ناکامی میں مایوسی کا بہت دخل ہے۔

☆ اگر ہم کامیابیوں کے بارے میں سوچیں گے تو کامیابی حاصل ہوگی۔ اگر مایوسانہ طرز فکر اپنائیں گے تو ناکامی ملے گی۔

☆ جن لوگوں کے دلوں میں منفی خیالات، نفرت اور مایوسی پرورش پا رہی ہوتی ہے۔ وہ لوگ پرسکون شخصیت کے مالک نہیں ہوتے۔

❖❖❖

مسکراہٹ

افسردہ یا سنجیدہ چہرے کے مقابلے میں ایک مسکراتا ہوا چہرہ دوسروں کی توجہ اپنی طرف زیادہ آسانی سے مبذول کر لیتا ہے۔ ہر وقت مسکراتے رہیں لیکن زیادہ قہقہے ہرگز مت لگائیں ورنہ لوگ آپ کو لاابالی اور خالی دماغ سمجھنے لگیں گے۔ ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ طاری نہ کریں بلکہ یہ مسکراہٹ آپ کے اندر سے آنی چاہیے۔

❖❖❖
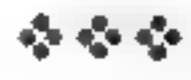
غصہ

☆ غصہ آنے پر غصے کا باعث بننے والی صورت حال، فرد یا ماحول سے دور چلے جائیں۔ غصہ کم ہو جائے گا۔

☆ غصہ آنے پر اس کے اظہار کو چند منٹ مؤخر کر دیں۔ غصہ دھیما ہو جائے گا۔

☆ جب آپ کو غصہ آئے تو متعلقہ بات کو نظر انداز کرنے کی کوشش کریں۔ اگر آپ غصے میں ہیں تو ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی لیں اور گہرے گہرے سانس لیں۔ اس عمل سے آپ بہتر محسوس کریں گے۔ اس کے علاوہ کسی اچھی سی کتاب کا مطالعہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

آزمائش شرط ہے۔

مرسلہ: محمد انور ندیم، حویلی لکھا (اوکاڑہ)

پاس کچھ نہیں ہے اور مجھے رقم کی ضرورت ہے۔"

"تمہارے لیے میرے پاس کوئی رقم نہیں ہے۔"

"اچھا تو مجھے کام ہی دو۔" ہیری چلایا۔

"میرے پاس تمہارے لیے ایک ہی کام ہے۔" روبرٹ نے سیل فون نکالتے ہوئے کہا۔ "تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں۔ ان لوگوں نے میرا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ تمہیں ان کے حوالے کر دوں گا تو میری جان بھی چھوٹ جائے گی۔"

ہیری فکر مند ہو گیا۔ "روبرٹ تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"میں ایسا ہی کرنے جا رہا ہوں۔" وہ بولا اور نمبر ملانے لگا۔

"ایک منٹ... ایک منٹ..." ہیری بولا۔ "سنو میرے ساتھ ایک ڈیل کر لو... تمہیں کوئی قیمتی چیز چاہیے نا... میں تمہیں قیمتی چیز دلوا سکتا ہوں۔"

روبرٹ نے سوچا اور سیل فون واپس جیب میں ڈال لیا۔ "کیا کر سکتے ہو تم؟"

ہیری اسے بتانے لگا کہ وہ کیا کر سکتا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ روبرٹ کے فلیٹ سے باہر تھا۔ فٹ پاتھ پر تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس نے فرینکی کا نمبر ملایا۔ "فرینکی میں ہیری بات کر رہا ہوں... مجھے تم سے ایک ضروری کام ہے۔"

"ٹھیک ہے، میری شاپ پر آجاؤ۔" فرینکی نے جواب دیا۔

☆☆☆

روبرٹ اس وقت خاصے معززانہ حلیے میں تھا۔ اس نے شارک اسکن تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے ہمہ وقت بکھرے رہنے والے لمبے بال اس وقت سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ مگر اس کے چہرے پر برستی خباثت برقرار تھی۔ اس کے ہاتھ میں زمرد کی قیمتی انگوٹھی اور پیروں میں مگرمچھ کی کھال کے بنے جوتے تھے اور اسی سے میچ کرتا ہوا چھوٹا سا بریف کیس بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ مجموعی طور پر وہ بہت دولت مند نظر آ رہا تھا۔ دیکھنے والے یہ سمجھ سکتے تھے کہ اس نے دولت غلط طریقے سے کمائی ہے۔ وہ نیویارک کے ایک پوش علاقے میں موجود تھا۔ اس نے فٹ پاتھ چھوڑ کر سڑک عبور کی اور دوسری طرف ایک جیولری شاپ میں قدم رکھا۔ یہ فرینکی جیولرز شاپ تھی۔

اندر فرینکی کاؤنٹر کے پیچھے موجود تھا۔ کاؤنٹر کا اوپری حصہ شیشے کا بنا تھا جبکہ نچلا حصہ نفیس فارمیکا سے بنایا گیا تھا۔ فرینکی نے سوالیہ نظروں سے روبرٹ کی طرف دیکھا۔ "میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں مسٹر...؟"

"روبرٹ روز برگ۔" روبرٹ نروس انداز میں بولا۔ "وہ میں... مسٹر فرینکی، دراصل مجھے ہیری نے..."

"اوہ اچھا تم ہیری کے دوست ہو۔ اس نے تمہارا ذکر کیا تھا اور تمہارا فیور کرنے کو بھی کہا تھا۔" فرینکی اس کی بات کاٹ کر بولا۔ اس کا لہجہ اور انداز بدل گیا تھا۔ "ہیری اچھا لڑکا ہے، اس کے دوست میرے بھی دوست ہیں۔"

"مجھے اپنی منگیتر کے لیے ایک ڈائمنڈ رنگ چاہیے۔" روبرٹ نے اداکاری جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اس کا ذوق بہت اعلیٰ ہے اور اسے کوئی چیز مشکل سے ہی پسند آتی ہے۔"

"تمہاری رینج کیا ہے؟"

"ایک لاکھ ڈالرز یا اس سے کچھ اوپر۔"

فرینکی کی آنکھیں کچھ دیر کے لیے پھیلی تھیں شاید اسے اندازہ نہیں تھا کہ روبرٹ اتنی مہنگی انگوٹھی کی فرمائش کر دے گا۔ اس نے کاؤنٹر کے نیچے لگا ایک بٹن دبا کر شاپ میں داخل ہونے والے دروازے کو لاک کر دیا۔ اب نہ کوئی اندر آ سکتا تھا اور نہ کوئی باہر جا سکتا تھا۔ پھر اس نے پیچھے چھوٹے سے آفس میں موجود تجوری کھولی اور اس میں سے انگوٹھیوں کا ایک سیٹ نکال لایا۔ سیٹ میں کل پانچ انگوٹھیاں تھیں۔ اس نے سیٹ روبرٹ کے سامنے رکھا اور بولا۔ "اس میں سے ہر انگوٹھی ایک لاکھ ڈالرز سے زیادہ مالیت کی ہے۔"

"بہت خوب صورت ہیں۔" روبرٹ انگوٹھیاں اٹھا کر دیکھنے لگا مگر ساتھ ہی اس کے انداز میں ہچکچاہٹ پائی جاتی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے اپنی پسند پر اعتبار نہ ہو یا اسے خوف ہو کہ وہ جو انگوٹھی پسند کر کے لے جائے گا، ممکن ہے وہ اس کی منگیتر کو پسند نہ آئے۔ فرینکی غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"کیا بات ہے روبرٹ، تمہیں کوئی انگوٹھی پسند نہیں آئی؟ میرے پاس اس سے زیادہ قیمت والی انگوٹھیاں نہیں ہیں۔ ویسے اس قیمت میں ایسی انگوٹھیاں تمہیں کہیں نہیں ملیں گی۔"

"یہ بات نہیں ہے، دراصل مجھے خوف ہے کہ کہیں میری منگیتر کو میری چوائس اچھی نہ لگے۔"

"تو تم اسے بدلوا سکتے ہو۔ میں ایک ہفتے کی منی بیک گارنٹی ویسے بھی دیتا ہوں۔"

روبرٹ نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں مصروف آدمی ہوں، بار بار نہیں آ سکتا۔"

"تب اس مسئلے کا کیا حل ہو سکتا ہے؟" فرینکی نے کہا۔ "ایسا کرو تم اپنی منگیتر کو یہاں لے آؤ وہ خود انگوٹھی پسند کر لے۔"

"وہ یہاں نہیں آئے گی۔" روبرٹ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ایک ترکیب ہو سکتی ہے، تم یہ سیٹ خود چل کر اسے دکھا دو۔"

"سوری دوست! میں اس طرح بزنس نہیں کرتا۔" فرینکی نے کہا اور سیٹ لے جا کر واپس تجوری میں رکھ دیے۔

"پلیز میری بات سنو۔" روبرٹ نے مضطرب لہجے میں کہا۔ "دیکھو میرے پاس یہ چار لاکھ ڈالرز ہیں۔" اس نے چھوٹا بریف کیس فرینکی کے سامنے رکھ دیا۔ "میں ایک بزنس ڈیل کے لیے نکلا تھا لیکن یہ کام پہلے کرنا ہے۔"

"میں اس طرح کام نہیں کرتا ہوں۔" فرینکی نے انکار کیا۔ "یہ بہت رسکی کام ہے۔"

"پلیز۔" اب کے روبرٹ نے بریف کیس کھول کر اس کے سامنے کر دیا جس میں تہ در تہ ڈالرز کی گڈیاں بھری تھیں۔ "میں نے ہیری سے بھی فیور چاہا تھا۔ اگر تم انکار کر دو گے تو مجھے کہیں اور جانا پڑے گا۔ یہ چار لاکھ کیش ہیں۔"

فرینکی کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے بریف کیس سے گڈیاں نکال کر چیک کیں یہ سارے اصلی اور پرانے نوٹ تھے۔ بالآخر اس نے سر ہلایا۔ "اوکے... میں نے آج تک اس طرح کا کام کیا نہیں ہے لیکن تم ہیری کے دوست ہو اس لیے..." وہ بریف کیس لے کر اندر گیا، اسے تجوری میں رکھا پھر اندر سے انگوٹھیوں کا کیس نکال کر لے آیا۔ اس نے روبرٹ کو کیس ایک بار پھر کھول کر دکھایا تاکہ اس کی تسلی ہو جائے۔ "یہی انگوٹھیاں دکھانی ہیں نا تمہاری ہونے والی منگیتر کو؟"

روبرٹ نے سر ہلایا، فرینکی اندر گیا اس نے ایک بریف کیس اٹھایا اور اس میں انگوٹھیوں والا کیس رکھا۔ روبرٹ دیکھ رہا تھا۔ فرینکی بریف کیس لے کر آیا اور ایک لمحے کے لیے روبرٹ کے سامنے رکا، اس نے بٹن دبا کر دروازے کا لاک کھولا۔ "میں شاپ سے زیادہ دیر کے لیے غیر حاضر نہیں ہو سکتا۔"

"میرا خیال ہے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔"

روبرٹ نے باہر نکل کر ایک ٹیکسی روکی۔ "تمہارے پاس گاڑی نہیں ہے؟"

روبرٹ نے کہا۔ "میری کار کا معمولی سا حادثہ ہو گیا تھا، وہ ورکشاپ گئی ہے۔"

ون، ٹو، تھری، فور... ٹیسٹنگ ٹیسٹنگ

فرینکی نے سر ہلایا۔ وہ کسی قدر پریشان لگ رہا تھا شاید پہلے وہ کبھی اتنی قیمتی ہیرے کی انگوٹھیاں لے کر شاپ سے باہر نہیں آیا تھا۔ اگر کوئی نقصان ہو جاتا تو انشورنس کمپنی اس کی تلافی کی پابند نہ ہوتی کیونکہ یہ انشورنس صرف دکان کی حد تک تھی۔ ٹیکسی میں وہ بریف کیس کو اپنی اکلوتی اولاد کی طرح سینے سے لگائے بیٹھا رہا۔ روبرٹ اسے ایک پوش رہائشی علاقے میں لایا جہاں لگژری قسم کے اپارٹمنٹس تھے۔ وہ ٹیکسی سے اترے اور ایک عمارت کی طرف بڑھے ہی تھے کہ فٹ پاتھ پر ایک تنومند جوان آدمی تیزی سے جھپٹا اس نے فرینکی سے بریف کیس چھیننے کی کوشش کی مگر اس نے اس کا ہینڈل بہت مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ اچکا پہلی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا مگر اس نے کوشش ترک نہیں کی اور فرینکی سے بریف کیس چھڑانے میں لگا رہا فرینکی چلا رہا تھا اور مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ روبرٹ ان دونوں کے آس پاس تھا لیکن اس نے فرینکی کی مدد کرنے یا اسے بچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"تم میری مدد کیوں نہیں کر رہے؟" فرینکی نے چلا کر کہا۔

"وہ... میں... لڑ نہیں سکتا۔" روبرٹ ہکلایا۔

بالآخر اچکا کامیاب رہا، اس نے فرینکی کو زوردار دھکا دیا اور بریف کیس چھین کر فرار ہونے میں کامیاب رہا۔ فرینکی اور روبرٹ کچھ دور اس کے پیچھے دوڑے لیکن وہ ایک بائیک پر بیٹھ کر بھاگ نکلا۔ فرینکی روہانسا ہو رہا تھا اس نے لرزتے ہاتھوں سے موبائل نکال کر پولیس کو کال کی اور چیخ چیخ کر بتانے لگا کہ اس کے ساتھ کیسی واردات ہو گئی ہے اور وہ لٹ گیا ہے۔ فون بند کر کے وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ روبرٹ اس

کے آس پاس ٹہل رہا تھا اور بولتا جا رہا تھا۔ ”تم فکر مت کرو... وہ پکڑا جائے گا... میرے خدا! یہ سب میرا قصور ہے... مجھے معاف کر دینا... میری وجہ سے تمہیں اتنا بڑا نقصان ہوا ہے۔“

”نقصان!“ فرینکی نے سر اٹھا کر کہا۔ ”میں تباہ ہو گیا ہوں، ان میں سے صرف دو انگوٹھیاں میری تھیں باقی دوسروں کی تھیں۔ میں کہاں سے ایک ملین ڈالرز کا نقصان بھروں گا۔“ وہ سسک سسک کر رونے لگا اور روبرٹ اس کے پاس بیٹھ کر اسے تسلیاں دینے لگا۔ اس کے چہرے سے قطعی نہیں لگ رہا تھا کہ اسے سچ مچ کوئی افسوس ہے۔ دس منٹ بعد پولیس کار وہاں آ گئی تھی اور فرینکی اپنے ساتھ ہونے والی واردات کا بتانے لگا۔ روبرٹ اس کے ساتھ تھا۔ اپنی باری پر اس نے اپنا بیان لکھوایا۔ اچکے کے بارے میں دونوں کا بیان یہی تھا کہ وہ ٹھیک سے اس کی صورت نہیں دیکھ سکے تھے کیونکہ اس نے سر پر پی کیپ اور آنکھوں پر بڑے سائز کا سن گلاس لگا رکھا تھا۔ پولیس والے رپورٹ لکھ کر فرینکی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ روبرٹ کو جانے کی اجازت مل گئی اور اس نے عجلت میں ایک ٹیکسی پکڑتے ہوئے اپنے فلیٹ کا رخ کیا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو اس کا آدمی چارلی پہلے ہی بریف کیس لے کر وہاں پہنچ گیا تھا۔ روبرٹ نے بریف کیس دیکھا اور پاگلوں کی طرح ہنس پڑا۔ اس نے چارلی سے کہا۔ ”تمہیں پتا ہے، اس میں ایک اعشاریہ دو ملین ڈالرز مالیت کی ہیرے کی انگوٹھیاں ہیں۔“

”ہاں لیکن ہیری کہاں ہے؟“ چارلی نے پوچھا۔

”اس پر لعنت بھیجو۔“ روبرٹ بریف کیس کونے میں رکھی میز تک لے گیا اور پھر اسے کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ لاک تھا۔ اس کے نمبر صرف فرینکی کو پتا تھے لیکن یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ روبرٹ نے ایک بڑا چاقو اٹھایا اور بریف کیس کھولنے کی کوشش شروع کر دی مگر یہ خاصا مضبوط قسم کا بریف کیس تھا اتنی آسانی سے کھلنے پر آمادہ نہیں تھا۔ روبرٹ مشتعل ہو گیا اور اس نے وحشیانہ انداز میں پے در پے وار کر کے بریف کیس کو چاک کر دیا۔ اس کے لاک جواب دے گئے اور وہ کھل گیا مگر جیسے ہی بریف کیس کھلا روبرٹ اچھل پڑا، اس میں انگوٹھیوں کا کیس نہیں تھا اس کی جگہ صرف ایک کاغذ رکھا تھا جس پر لکھا تھا۔ ”جیسے کو تیسا۔“

اس نے کاغذ اٹھایا اور پھر چونک گیا کاغذ کے نیچے بریف کیس پر ایک پولیس بیج چپکا ہوا تھا۔ ابھی روبرٹ کے منہ سے گالیوں کا طوفان برآمد ہوا تھا کہ ایک دھماکے سے فلیٹ کا داخلی دروازہ کھلا اور مسلح پولیس والے اندر گھس آ[ئے]۔ وہ چلا چلا کر سب کو ہاتھ اوپر کرنے کو کہہ رہے تھے۔ ان سب سے آگے جان تھا، اس نے آگے آ کر بریف کیس د[یکھا] اور اس میں چپکا اپنا بیج نکال لیا۔ پھر اس نے روبرٹ کو دیکھا تو وہ ہکلا کر بولا۔ ”یہ میرا کام نہیں ہے... سارا ہیر[ی کا] حرامی پن ہے۔“

”بکواس مت کرو۔“ جان نے اسے گھونسا رسید [کیا]۔ ”ہیری اچھا لڑکا ہے اور اپنے سوتیلے باپ کے ساتھ جیو[لری] شاپ چلاتا ہے۔ بدمعاش تم ہو۔“

روبرٹ نے جان کو بتانے کی کوشش کی کہ ہیری ا[ور] فرینکی نے مل کر اس کے ساتھ کیا کھیل کھیلا تھا لیکن اس [نے] ایک نہیں سنی اور کچھ دیر بعد وہ ہتھکڑیوں میں جکڑے ہو[ئے] پولیس ہیڈ کوارٹر کی طرف جا رہے تھے۔ جان نے روبرٹ [کو] بتایا کہ متعدد چوریوں اور فراڈ کی وارداتوں کے الزام میں [وہ] ساری عمر کے لیے جیل جائے گا اور اسے وہاں سے ز[ندہ] واپس آنا نصیب نہیں ہوگا۔ روبرٹ دل ہی دل میں ہیری [کو] گالیاں دے رہا تھا۔ اس نے جو ہیری کے ساتھ کیا تھا، [وہی] اس نے نہایت چالاکی سے اسے لوٹا دیا تھا صرف یہی نہیں [بلکہ] اس نے زیادہ وصول کر لیا تھا بلکہ اس نے ہمیشہ کے [لیے] روبرٹ اور اس کے ساتھیوں کو جیل پہنچانے کا انتظام بھی [کر] دیا تھا۔ اب روبرٹ کو اندازہ ہو رہا تھا کہ ہیری باقاعدہ منصوبے کے تحت اس کے پاس آیا تھا۔

روبرٹ نے ہی اپنے آدمی ہیری کے پیچھے لگا ر[کھے] تھے اور جب وہ بینی کو لے کر کلینک پہنچا تو انہوں نے اس کی جیب صاف کر دی تھی۔ اس وقت روبرٹ کو اندازہ نہیں [تھا] کہ وہ ہیری کی تمام جمع پونجی ہتھیا لے گا اس کا اندازہ تھا کہ وہ کلینک بڑی رقم لے کر آئے گا۔ اب ہیری بالکل کنگلا اور ا[س] کے لیے بے کار ہو چکا تھا۔ روبرٹ نے اسے پولیس کے سپ[رد] کرنے کا فیصلہ پہلے ہی کر لیا تھا۔ ایک مجرم ہاتھ میں آ جاتا تو پولیس بھی ٹھنڈی ہو کر بیٹھ جاتی اور روبرٹ آرام سے اپنا کا[م] جاری رکھ سکتا تھا۔ اس کے لیے کام کرنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ ہیری اس کے پاس آیا، اپنے سوتیلے باپ کی شا[پ] میں موجود قیمتی ہیروں کا لالچ دیا اور وہ اس لالچ میں آ[گیا]۔ اس نے ایک ملین ڈالرز کے ہیرے حاصل کرنے کے لیے اپنے چار لاکھ ڈالرز بھی داؤ پر لگا دیے اور وہ بھی ہار گیا تھا تو ہاتھ سے گئی تھی، اب اس کی آزادی بھی خطرے میں تھی۔

روبرٹ سمجھ گیا تھا کہ فرینکی نے اسے کس طرح بے وقوف بنایا تھا۔ جب وہ اس کا بریف کیس رکھنے گیا اور انگوٹھ[یوں کا] کیس نکال کر لایا۔ پھر اس نے روبرٹ کے سامنے ہی یہ بریف کیس میں رکھا۔ اصل ہاتھ کی صفائی اس نے وہاں [دکھ]ائی جب وہ ایک لمحے کے لیے کاؤنٹر پر اس کے سامنے رکا تھا [اس] کا بریف کیس والا ہاتھ نیچے اور روبرٹ کی نظروں سے [اوجھ]ل تھا۔ اس جگہ پہلے ہی دوسرا مگر بالکل ویسا ہی بریف کیس [پہ]لے ہی تیار رکھا ہوا تھا۔ عین ممکن ہے کاؤنٹر کے نیچے خود ہیری [چھپا] ہوا اور اسی نے فرینکی کو دوسرا بریف کیس تھما دیا ہو۔ فرینکی [اس] کے ساتھ شاپ سے نکل آیا۔ اس کے پاس بریف کیس میں کچھ نہیں تھا سوائے ایک کاغذ اور ایک پولیس بیج کے اور وہی [رو]برٹ کے گلے پڑ گیا تھا۔

☆☆☆

فرینکی اور ہیری ایک کافی شاپ میں بیٹھے تھے۔ [فر]ینکی نے کافی کی چسکی لی اور بولا۔ ”سب پلان کے مطابق ہوا۔ وہ احمق تمہارے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گیا۔“

”میری قسمت نے بھی ساتھ دیا ورنہ وہ نہایت چالاک آدمی ہے اور ایسے ہی اتنا بڑا گینگ نہیں چلا رہا ہے۔“

”وہ لالچ میں مارا گیا۔“ فرینکی نے سر ہلایا۔ [”]میں نے چار لاکھ ڈالرز ایک بینک اکاؤنٹ میں جمع کرا دیے [ہی]ں۔ یہ اس کی چیک بک اور سلپ ہے۔“ اس نے ایک لفافہ ہیری کی طرف بڑھا دیا۔ ”تم بار خریدنے کا سوچ رہے ہو، میرے ساتھ کیوں نہیں شامل ہو جاتے۔ میں تمہیں تربیت دوں گا اس میں نفع بھی زیادہ ہے۔“

ہیری کو یہ پیشکش اچھی لگی تھی۔ اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے پاپا، میں سوچ کر جواب دوں گا۔“

فرینکی مسکرایا۔ ”ٹھیک ہے اور وہ پیاری سی لڑکی کیسی ہے؟“

”اس دن کے بعد سے میں اس سے نہیں ملا ہوں۔“ ہیری نے بتایا۔ ”آج ملنے جاؤں گا، پتا نہیں وہ مجھے معاف کرتی ہے یا نہیں۔“

”عورت اپنے محبوب سے خفا ہو سکتی ہے لیکن اپنے ہونے والے بچے کے باپ سے خفا نہیں ہو سکتی۔“ فرینکی اٹھتے ہوئے بولا۔ ”ممکن ہے وہ تم سے خفگی ظاہر کرے لیکن بالآخر مان جائے گی۔ ہیری، میری ایک بات مانو... جیسے ہی وہ مانے فوراً اس سے شادی کر لینا۔ اتنی اچھی لڑکی قسمت سے ملتی ہے۔“

ہیری نے سر ہلایا۔ ”میں ایسا ہی کروں گا۔“

کافی شاپ سے نکل کر ہیری پارکر بار کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ سچ مچ فرینکی کا شکر گزار تھا کہ اس نے صرف اسے روبرٹ کے چنگل سے ہی نہیں نکالا تھا بلکہ اس نے پولیس افسر جان کو بھی راضی کیا تھا کہ وہ ہیری کو ایک موقع دے کہ وہ شریفانہ زندگی گزار سکے، اس کے بدلے وہ اسے روبرٹ جیسا پرانا مجرم مع ثبوت کے حوالے کرتے۔ جان ڈیکن اس شرط پر راضی ہو گیا۔ اس نے روبرٹ کو ثبوتوں کے ساتھ گرفتار کر لیا تھا اس کے فلیٹ سے متعدد سیل فون، پرس، کریڈٹ کارڈز اور چوری کا دوسرا سامان برآمد ہوا تھا۔ یہ سب چیزیں، خاص طور سے سیل فون اور کریڈٹ کارڈ اسے لمبے عرصے کے لیے جیل بھیجنے کو کافی تھے۔

ہیری پارکر بار پہنچا تو اس کا خیال تھا کہ بینی گرم جوشی سے اس کا استقبال کرے گی۔ وہ آج ہی اسپتال سے فارغ ہوئی تھی۔ وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھا تھا ”بینی...!“

بینی نے اسے دیکھا۔ ”تم پھر آ گئے... ہے پارکر...“ اس نے پکارا۔

جب وہی تنومند شخص ہیری کی طرف بڑھا اور تب اسے معلوم ہوا کہ وہ خود ہی بار کا مالک ہے۔ اس نے گدی سے ہیری کو پکڑا اور عقبی دروازے سے لے جا کر اسے باہر دھکیل دیا۔ ہیری اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ بینی سے ملنے آیا ہے جو اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے اور وہ دونوں عنقریب شادی کر لیں گے مگر پارکر نے اس کی ایک نہیں سنی۔ جب اس نے ہیری کو باہر دھکا دیا تو وہ چلا اٹھا۔ ”لعنت ہو تم پر... اب میں تمہارا بار ہرگز نہیں خریدوں گا۔“

پارکر نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے نہایت حقارت سے اسے دیکھا اور دروازہ بند کر کے اندر چلا گیا۔ ہیری نے کھڑے ہو کر ایک خالی پیٹی کو لات ماری۔ ”غصہ اتار رہے ہو؟“ بینی کی آواز آئی۔ اس نے چونک کر دیکھا، وہ دروازے پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ”مجھے بھی ایسے ہی غصہ آیا تھا اور میں نے پارکر کی مدد سے اتار دیا۔“

ہیری اس کی طرف بڑھا۔ ”یعنی اب تمہیں مجھ پر غصہ نہیں ہے؟“

”ہوتا تو میں یہاں کیوں آتی۔“ اس نے کہتے ہوئے سر ہیری کے شانے پر رکھ دیا۔ ”آج میں نے جلدی چھٹی لی ہے۔ ہم کہیں چلیں؟“

ہیری بھی مسکرانے لگا۔ ”کیوں نہیں؟“

وہ دونوں شانہ بشانہ تاریک گلی کے سرے کی طرف جانے لگے جہاں روشنی تھی۔

محفلِ شعر و سخن

❋ کمال انور......اورنگی ٹاؤن، کراچی
کبھی آنسو کبھی سجدے کبھی ہاتھوں کا اٹھ جانا
محبتیں ناکام ہو جائیں تو رب ہی یاد آتا ہے

❋ اختر شاہ عارف......جہلم
کفن بدوش ہم اپنے گھروں میں رہتے ہیں
بقید زیست ہیں اور مقبروں میں رہتے ہیں
جنہیں قریب سے سورج نظر نہیں آتا
وہ کم نگاہ بھی دیدہ وروں میں رہتے ہیں

❋ محمد لطیف ساحل......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
وفا کے نام پہ تم، کیوں سنبھل کے بیٹھ گئے
تمہاری بات نہیں بات ہے زمانے کی

❋ کنول زاہد......گلبرگ لاہور
کتنی بے فیض رہ جاتی ہے دل کی بستی
کتنے چپ چاپ چلے جاتے ہیں جانے والے

❋ سدرہ اسلم، ریحانہ اسلم......سندیلیانوالی
خوشبوؤں کے جزیروں سے ستاروں کی حدوں تک
اس شہر میں سب کچھ ہے بس تیری کمی ہے

❋ ابرار وارثی......ورآباد، سندیلیانوالی
ان کی زلفوں کی راہ گیر تو دیکھو
دل قید ہے جس میں وہ زنجیر تو دیکھو
پھر شوق سے کہنا دیوانہ مجھے لوگو
پہلے میرے محبوب کی تصویر تو دیکھو

❋ راجا افتخار علی افتی......چوآسیدن شاہ
ہم سے کھیلتی رہی دنیا تاش کے پتوں کی طرح دوست
جس نے جیتا اس نے بھی پھینکا جس نے ہارا اس نے بھی پھینکا

❋ ماہا ایمان......حافظ آباد
دل سے آغاز کیا، جاں کے زیاں تک کھیلے
بازیِ عشق کو ہم دیکھ، کہاں تک کھیلے
ہار اور جیت کے معیار بدلتے ہوں گے
ایک سے کھیل کو اب کوئی کہاں تک کھیلے

❋ ایم یوسف خان......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
آپ نے اندازِ محبت دیکھا ہے اندازِ وفا نہیں
پنجرہ کھول بھی دو تو کچھ پنچھی جایا نہیں کرتے

❋ زوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
تھک جائے گا تو مانگ کے ہم کو دعاؤں میں
تیرے خیال و خواب کا محور رہیں گے ہم

❋ سید محی الدین اشفاق......فتح پور (لیہ)
ان کے دل پہ اس طرح تحریر ہونا تھا مجھے
آئینہ وہ خود نہیں تصویر ہونا تھا مجھے
گردشوں کے بعد آخر آپ ہم مل ہی گئے
یہ بھی طے تھا آپ کی تقدیر ہونا تھا مجھے

❋ ذیشان حیدر بلوچ......کمالا تحصیل ساہیوال
ہواؤں نے توڑ دی ہیں درختوں کی ٹہنیاں
کیسے کٹے گی رات پرندے اداس ہیں

❋ ڈاکٹر وسیم خالق گھیاں......گجرات
بات بات پہ دیتے ہو پرندوں کی مثال
صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ ہمارا شہر چھوڑ دو

❋ عمران حیدر بلوچ......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
اور قفس جو کھلا آسمان بھول گئے
رہا ہوئے تو پرندے اڑان بھول گئے

❋ صوبیدار (ر) انوار بنگش......بلیر کینٹ
میرے زخم زخم یہ جسم و جاں، ہوں نفس نفس میں دھواں دھواں
مجھے اہلِ وطن سے کیا ملا، مجھے اہلِ وطن نے کیا دیا

❋ غلام اکبر ساقی نورنگہ......میانوالی
ہماری قسمت میں سب کچھ ہے پھولوں کے سوا
تم اگر پھول نہ ہوتے تو ہمارے ہوتے

❋ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر......نئی منڈی سکھیکی
کچھ انوکھے تجھے اندازِ ستم آتے ہیں
ہم تیری بزم سے بادیدۂ نم آتے ہیں
سچ تو ہے کہ کھلتی ہے وہ پھولوں کی طرح
جس جگہ آپ کے گلرنگ قدم آتے ہیں

❋ طاہرہ یاسمین......کشمیر ٹاؤن، سرگودھا
شام کی چپ کا اثر اس کی صدا سے ٹوٹا
خشک پتا تھا ذرا تیز ہوا سے ٹوٹا

❋ ابرار احمد......پاک کیمپ پنارو (سندھ)
جی تو چاہتا ہے کبھی آگ لگا کر دل کو
پھر کہیں دور کھڑے ہو کر تماشا دیکھوں

❋ نوید انجم بٹ گھیاں......گجرات
تم نے تو رو رو کے رکھا ہے وفا کا بھرم
ہم بھی رو دیتے گر پیار میں جھوٹے ہوتے

❋ انیلا رشید سیال......لقمان خیر پور میرس
نہیں محفوظ کوئی آج انسانوں کی بستی میں
ہمیں اونچے پہاڑوں پر بسیرے ڈھونڈنے ہوں گے

❋ ڈاکٹر ایچ اے لطیف......فقیروالی
بو کر زمینِ دل میں تیری آرزو کے بیج
بیٹھا ہوں میں غریب زمیندار کی طرح

❋ ادریس احمد خان......ناظم آباد، کراچی
فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

❋ مسز ضیا القمر سلطانہ......رتی ٹبی، ساہیوال
اور کتنی چوڑیاں ٹوٹیں گی اس دہلیز پر؟
اور کتنی دلہنیں آہیں بھریں گی دوستو؟
اسی طرح گر انگلیاں نوچیں گی شاخوں سے گلاب
تتلیاں پھر خار پر بیٹھا کریں گی دوستو

❋ ریاض بٹ......حسن ابدال
محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہو جا زہر یہ بھی پی لیا میں نے

❋ شوکت علی......گلبرگ، لاہور
لے جائے نہ چپ چاپ سمندر کو اٹھا کر
یہ شخص جو ساحل پہ کھڑا سوچ رہا ہے

❋ جنید احمد ملک......گلستان جوہر کراچی
موسم کے تغیر نے تقدیر سے پوچھا ہے
ان خانہ بدوشوں نے کیوں کوچ کی ٹھانی ہے

❋ ملک الطاف حسین کھلنگ......تحصیل جتوئی
پھر اِک شخص سے امیدِ وفا
اے دل تجھے عزت راس نہیں

❋ شبیر احمد جان......کاظم آباد، کراچی
خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

❋ محمد قدرت اللہ نیازی......حکیم ٹاؤن، خانیوال
بزمِ جہاں میں اپنی غریبی نہ پوچھیے
اک دردِ دل ہے! وہ بھی کسی کا دیا ہوا

❋ جعفر حسین......تحصیل بھوانہ، ضلع چنیوٹ
گلہ شکوہ ہی کر ڈالو کہ کچھ وقت کٹ جائے
لبوں پہ تمہارے یہ خاموشی اچھی نہیں لگتی

❋ محمد اشفاق سیال......شورکوٹ سٹی
بڑا منفرد کھیل ہے محبت، سارے کھیلوں میں
جو ہارا پھر نہ کھیلا وہ، جو جیتا اس نے بھی توبہ کی

❋ محمد یونس چوہدری......لاہور
اس بادشاہِ وقت سے کیسی توقعات
بیٹھا ہو جو تخت پہ عنایات بیچ کر

❋ رانا حبیب الرحمن......ٹوبہ ٹیک سنگھ
اتر تو گئے محبت کے ساغر میں لیکن اے جانِ جاناں
دور اس سمندر کے کنارے ہو گئے کبھی سوچا نہ تھا

محفلِ شعر و سخن

❋ محمد کامران خالد..... ضلع اٹک
قبروں میں نہیں ہم کو کتابوں میں اتارو
ہم لوگ محبت کی کہانی میں مرے ہیں

❋ پلوشہ..... پشاور
کبھی تو بھول جاتے ہیں، کبھی کانٹا سا چبھتا ہے
تمہارا ساتھ ادھورا تھا کہ اپنی ذات ادھوری ہے

❋ حسنین خان بلوچ..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
تشخیص بجا ہے کہ مجھے عشق ہوا ہے
نسخے میں لکھو ان سے ملاقات مسلسل

❋ خالد بشیر..... کہوٹہ
حاصلِ زندگی حسرتوں کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ کیا نہیں، وہ ہوا نہیں، یہ ملا نہیں وہ رہا نہیں

❋ رمضان پاشا..... گلشن اقبال، کراچی
جانے کیا ہوگیا ہے زمانے کو
سچی بات کہو تو دوڑتا ہے کھانے کو

❋ احمد حسن عرضی خان..... قبولہ شریف
کچھ اس طرح سے نظرانداز ہوگئے ہم
جیسے اضافی حرف تھے تیری زندگی کی کتاب میں

❋ مرزا طاہر الدین بیگ..... میرپور خاص
باندھ لیں ہاتھ پھر سینے پہ سجالیں تم کو
جی میں آتا ہے کہ تصویر بنالیں تم کو

❋ ماریہ علی بھٹو..... چندوڈیرو، ضلع شکارپور
اس کی نازک انگلیوں کو دیکھ کر اکثر عدم
ایک ہلکی سی صدائے ساز آتی ہے مجھے

❋ محمد بشارت..... کنگر دودرہ
کئی صدیاں گزر جائیں مگر آثار بولیں گے
حقیقت چھپ نہیں سکتی در و دیوار بولیں گے

❋ شکیل الرحمن..... کھاتاں
نام کیا نشان بھی کیا خواب و خیال ہوگئے
تیری مثال دے کے ہم تیری مثال ہوگئے

❋ اصغر علی..... گوجرانوالہ
کسی سے آشنا ایسا ہوا ہو
مجھے پہچانتا کوئی نہیں

❋ سید اشفاق..... کوئٹہ
تلخ لفظوں کو لبوں تک نہیں آنے دیتے
تیر چڑھتے ہیں کمانوں پہ تو چل جاتے ہیں

❋ افتخار احمد قادر..... کوٹ قادر بخش
یوں جدائی کو میرا نصیب نہ بناؤ دوست
کہ جب تم لوٹ کے آؤ تو میرے پاس زندگی نہ ہو

❋ اختر شاہ عارف..... ڈھوک جمعہ، جہلم شہر
میں غریب الدیار، میرا کیا
موج لے جائے یا ہوا لے جا

❋ محمد جاوید راؤ..... بہاولنگر
نہ سوالِ وصال نہ عرضِ غم نہ حکایتیں، نہ شکایتیں
ترے عہد میں دل زار کے سبھی اختیار چلے گئے

❋ جبران احمد ملک..... گلشن اقبال، کراچی
اپنے دیس کے لوگوں نے یوں رسوا کر دی
کھینچ کے چادر اِک بیٹی کی ہنستے رہے سر

❋ محمد اظہر..... ملیر، کراچی
ہر اک چہرہ پڑھتے جائیں، ہر اک دامن چاک کریں
ہر اک جوہر ڈھونڈ کے لائیں، خود کو نہ پہچانے لوگ

❋ یمنیٰ احمد..... کراچی
ناامیدی حد سے بڑھی تو ہمت نے یوں ساتھ دیا
تپتی دھوپ میں جیسے سایہ دیتا ہے آرام

❋ محمد امین..... کراچی
ہنر ہے ہم میں دریا کا نکل جاتے ہیں ہر جانب
کہ لہروں کی طرح ساحل سے ٹکرایا نہیں کرتے

❋ ذیشان منہاس..... گلشن اقبال، کراچی
جس کی رفاقت شام کے ڈھلتے سائے تک ہی ملتی ہو
مانا وہ خورشید ہے لیکن اس کی پوجا کیا کرتے

کوپن برائے شمارہ جولائی 2012
نام:......................................
پتا:......................................
....

خواب

تنویر ریاض

جب تک وہ خواب غفلت کا شکار رہا، تب تک دنیا کے فکر و آلام سے غافل رہا مگر جیسے ہی وہ اس کیفیت سے باہر آیا اسے ادراک ہوا کہ وہ کسی اور کی جگہ سولی پر چڑھ چکا ہے... اور پھر یہی احساس اسے زندگی سے اتنی دور لے آیا کہ جب اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کے تعاقب میں کوئی سایہ تک نہ تھا۔

[illegible]

سونی ٹیلر کے ہونٹ خشک ہو چکے تھے۔ لہٰذا اس نے ایک چیپ اسٹک اٹھائی اور کیش کاؤنٹر کی جانب بڑھ گیا۔ اس سے آگے ایک لڑکا ڈھیلی سی جیکٹ اور کیپ لگائے ... کی دھن پر تھرک رہا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور ... تے ہوئے بولا۔ "تو تم سانتا کلاز ہو؟"

سونی نے اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک ٹافی نکالی اور ... دیتے ہوئے بولا۔ "کرسمس مبارک ہو۔"

لڑکے نے سونی سے ٹافی لے لی اور سونی کی کمر تھپتھپانے لگا۔ ذہین آنکھوں اور خوب صورت مسکراہٹ والی کاؤنٹر کلرک نے سونی کی ٹیوب اٹھائی اور اس کا لیبل پڑھتے ہوئے بولی۔ "اسے لگانے سے تمہارے ہونٹ بالکل تر و تازہ ہو جائیں گے، سانتا۔" پھر اس نے لیبل پر لگی قیمت پڑھی اور کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے بولی۔ "ایک سو اکیاسی سینٹ۔"

"ایک سو نناوے۔" سونی نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔

"یہ رعایت یہاں کے ملازمین کے لیے ہے۔" لڑکی

بولی۔

"یہ بات مجھے معلوم نہیں تھی۔" سونی قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

"یہ میں اپنے حساب میں دے رہی ہوں۔"

"شکریہ۔" سونی اس کے گلے میں پڑے ہوئے کارڈ پر نام پڑھتے ہوئے بولا۔ "تمہارا نام اے پینا ہے۔"

"لوگ مجھے اسی کے نام سے پکارتے ہیں۔"

سونی نے اسے بھی ایک ٹافی پکڑا دی۔ شفٹ سپروائزر کاؤنٹر کے دوسرے سرے پر کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ چلّاتے ہوئے بولی۔ "کیا کوئی مسئلہ ہے؟"

"نہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" لڑکی نے جواب دیا۔

سپروائزر نے سونی کو گھورتے ہوئے کہا۔ "تمہیں ڈیوٹی کے دوران میں ذاتی اشیا کی خریداری نہیں کرنا چاہیے۔"

سونی نے وہ ٹیوب اٹھائی اور ہونٹوں پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔ "میرے ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔"

"اچھا، اچھا، ٹھیک ہے۔" وہ نخوت سے بولی، پھر کاؤنٹر کلرک کو دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو کہ جلدی جلدی لوگوں کو نمٹاؤ۔

⌘⌘⌘

سونی اسٹک کی پیکنگ کھولنے میں اتنا محو ہوا کہ چلتے چلتے اسٹور کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں الیکٹرونکس کا سامان رکھا ہوا تھا۔ جب وہ اسٹک کو اپنے ہونٹوں پر لگانے کے لیے رکا تو اس کی نظر بیٹریوں کے خانے پر چلی گئی جہاں ہر سائز اور برانڈ کی بیٹریاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک ڈبا اٹھایا جس میں آٹھ عدد بیٹری سیل رکھے ہوئے تھے۔ ان بیٹریوں کو دیکھ کر اس کے ذہن میں ماضی کی کئی یادیں ابھر آئیں۔ جب وہ اپنی پنسل ٹارچ، کھلونوں اور ریڈیو کے لیے بیٹری سیل استعمال کیا کرتا تھا۔ اس نے ڈبے پر نگاہ ڈالتے ہوئے سوچا کہ اسے ایک ٹرانزسٹر ریڈیو خرید لینا چاہیے تاکہ نیند نہ آنے کی صورت میں وہ اس سے دل بہلا سکے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا اور اس نے وہ ڈبا اپنے تھیلے میں ڈال لیا جو اس کے کندھے پر لٹکا ہوا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔

چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے اسٹور میں بہت رش تھا۔ وہ بچوں میں تحائف اور ٹافیاں تقسیم کرتا رہا اور آٹھ بجے جب شفٹ ختم ہوئی تو وہ بری طرح تھک چکا تھا اور اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ اس کے تھیلے میں بیٹری سیل پڑے ہوئے ہیں۔ اس نے ابھی تک سانتا کلاز والا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ اپنے کندھے پر تھیلا لٹکائے اسٹور کے عقبی دروازے سے باہر آیا اور اپنی پرانی کار کی جانب بڑھنے لگا تبھی ایک سکیورٹی گارڈ اس کے پاس آیا اور بولا۔

"اگر تم خیال نہ کرو تو میں تمہارا تھیلا دیکھ لوں۔"

سونی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور تھیلا اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس شخص نے تھیلے میں ہاتھ ڈالا اور سیل کا ڈبا نکالتے ہوئے بولا۔ "یہ بیٹریاں اس تھیلے میں کیسے آگئیں۔"

سکیورٹی گارڈ نے اس کا بازو مضبوطی سے پکڑا اسے لے کر عمارت کی جانب چل دیا۔ اس کا رخ اس کمرے کی جانب تھا جہاں ملازمین وقفہ کے دوران میں بیٹھا کرتے تھے۔ وہاں سکیورٹی انچارج اور شفٹ سپروائزر دونوں موجود تھے۔ گارڈ نے سیل کا ڈبا انچارج کے سامنے رکھ دیا اور مؤدبانہ انداز میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ شفٹ سپروائزر وہی عورت تھی جس سے اس کا سامنا کیش کاؤنٹر پر ہو چکا تھا۔ سونی نے اس کا نام پڑھا۔ "ڈارلا" اس کے علاوہ وہاں دو کلرک بطور گواہ بھی موجود تھے۔

سکیورٹی انچارج نے سونی کو ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اس کے مقابل دوسری کرسی پر بیٹھ گیا پھر اس نے میز کے وسط میں وہ بیٹری سیل رکھے اور دراز سے ایک پیڈ نکال لیا۔

"ضرور یہ کسی بچے کی شرارت ہے اسی نے یہ بیٹری سیل میرے تھیلے میں رکھے ہوں گے۔" سونی اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔

سکیورٹی گارڈ نے ٹرالی پر رکھے ہوئے ٹیلی ویژن ریموٹ آن کیا اور اسکرین پر اسٹور کا وہ حصہ نظر آنے لگا جہاں الیکٹرونک آئٹم رکھے ہوئے تھے۔ کیمرا کی آنکھ نے وہ منظر محفوظ کر لیا تھا جب سونی نے وہ بیٹری سیل اٹھا کر اپنے تھیلے میں رکھے تھے۔ سکیورٹی انچارج نے ریموٹ کا بٹن دبایا اور وہ منظر ساکت ہو گیا۔

"سونی!" سکیورٹی انچارج نے اسے مخاطب کیا۔ وہاں موجود سب لوگوں کی نظریں ٹی وی اسکرین پر جم کر رہ گئی تھیں۔ "تم نے کیا سوچ کر یہ حرکت کی تھی؟"

سونی نے کئی بار پلکیں جھپکائیں۔ وہ خود بھی ٹی وی اسکرین کی جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سوال کا کیا جواب دے پھر بات بناتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ میں ان کی ادائیگی کرنا بھول گیا تھا۔"

"یہ جھوٹ بول رہا ہے۔" شفٹ سپروائزر بولی۔ "ٹی وی کیمرا بتا رہا ہے کہ اس نے چوری کی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" سکیورٹی انچارج بولا اور پھر پیڈ پر کچھ لکھنے لگا۔ سونی نے اپنی جیب سے دس ڈالر کا نوٹ نکالا اور سکیورٹی انچارج کی طرف کھسکا دیا۔ سکیورٹی انچارج نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "یہ پیسے اپنے پاس ہی رکھو۔"

سونی نے کندھے اچکائے اور نوٹ اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔

"مجھے افسوس ہے کہ تم نے آٹھ بیٹری سیل کی خاطر اپنی نوکری گنوا دی۔" شفٹ سپروائزر نے کہا۔

⌘⌘⌘

سونی نے اس اسٹور میں ملازمت صرف اس لیے اختیار کی تھی کہ کچھ پیسے کما کر اپنا گزارہ کر سکے۔ صرف سات مہینے کی بات تھی۔ پھر وہ باسٹھ سال کا ہو جاتا اور اسے سوشل سکیورٹی سے گزارہ الاؤنس ملنے لگتا۔

سکیورٹی انچارج نے قلم میز پر رکھا اور بولا۔ "میں نے رپورٹ لکھ لی ہے۔ اسے پڑھ کر دستخط کر دو۔"

"یہ میرا اصلی نام نہیں ہے۔" سونی نے کاغذ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم اپنا اصلی نام لکھ کر ہی دستخط کر دو۔"

سونی اس کے بعد بھی تذبذب میں مبتلا رہا تو شفٹ سپروائزر بولی۔ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم اس کاغذ پر دستخط کرتے ہو یا نہیں۔ ہمارے پاس فوٹیج موجود ہے جس میں تم چوری کرتے ہوئے نظر آ رہے ہو۔"

سکیورٹی انچارج نے غصے سے شفٹ سپروائزر کو دیکھا اور سونی سے کاغذ واپس لے لیا۔

شفٹ سپروائزر چاہتی تھی کہ سونی کے ساتھ کسی شخص کو اس کے گھر بھیجا جائے جو اس سے سانتا کا سوٹ واپس لے کر آئے لیکن سکیورٹی انچارج نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور بولا۔ "سونی! تم جب چاہو یہ سوٹ واپس کر سکتے ہو۔"

⌘⌘⌘

سونی کو یہ فکر لاحق ہو گئی تھی کہ اگر اسٹور کی انتظامیہ نے اس واقعے کی رپورٹ درج کروا دی تو جرح کے دوران میں اس کے ماضی پر بھی بحث ہو گی اور اس سے پوچھا جائے گا کہ تین مہینے پہلے اس نے اپنی اصلی ملازمت کیوں چھوڑ دی تھی۔ وہ چالیس سال تک ہائی اسکول انگلش ٹیچر رہا تھا۔ اس اسکول میں اس نے کنڈرگارٹن سے بارہویں جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی اور یہی وہ اسکول تھا جہاں اس کے باپ نے بھی چالیس سال تک پڑھایا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد سونی کو اس کی جگہ ملازم رکھ لیا تھا۔ اس وقت وہ بائیس سال کا تھا۔ اس نے اپنی ساری زندگی اس اسکول کی نذر کر دی تھی لیکن اس کی ایک ذرا سی غلطی نے عمر بھر کی ریاضت پر پانی پھیر دیا۔

⌘⌘⌘

یہ اسکول میں اس کا آخری سال تھا۔ اگلے جون میں اس کی ریٹائرمنٹ تھی لہٰذا اس نے سوچا کہ وہ آہستہ آہستہ اپنا ذاتی سامان گھر منتقل کرنا شروع کر دے جو گزشتہ چالیس سالوں میں اچھی خاصی تعداد میں جمع ہو گیا تھا۔ لہٰذا اس نے اس مقصد کے لیے اسکول کا ٹرک مستعار لیا۔ گو کہ وہ ابھی ریٹائر ہونا نہیں چاہتا تھا لیکن نئے ہیڈ ماسٹر نے جو اس سے عمر میں بیس سال چھوٹا تھا۔ اس کی ملازمت میں توسیع کی درخواست مسترد کر دی۔ اس نے خود پہلے کبھی کسی اسکول میں کام نہیں کیا تھا۔ وہ ایک بزنس مین اور معاشیات کا ماہر تھا۔ اسی لیے اسکول کی انتظامیہ نے اس کی خدمات حاصل کی تھیں اور اسے یہ ذمے داری سونپی گئی تھی کہ وہ کم سے کم پیسوں میں لوگوں سے زیادہ کام لے۔ اس نے سونی کی درخواست مسترد کرتے ہوئے کہا۔ "بوڑھے لوگ ریٹائر ہوں گے تو جوانوں کو آگے آنے کا موقع ملے گا جو کم تنخواہ میں زیادہ اچھے نتائج دے سکتے ہیں۔"

"مجھے پڑھانے سے پیار ہے اور میں اب بھی اچھے نتائج دے رہا ہوں۔" سونی نے کہا۔

اس کا کہنا کسی حد تک صحیح تھا۔ اس کے شاگرد اچھے نمبروں سے امتحان میں کامیاب ہو رہے تھے۔ البتہ اب وہ گھٹنے کی تکلیف کی وجہ سے فٹ بال کی کوچنگ کے قابل نہیں رہا تھا اور نہ ہی وہ اسکول کی دوسری سرگرمیوں میں حصہ لیا کرتا تھا بلکہ کئی بار تو اسے میٹنگ کے دوران میں سوتا ہوا بھی پایا گیا۔

"ہم جو تنخواہ دے رہے ہیں۔ اس کے عوض نہ صرف ایک نیا ٹیچر بھرتی کیا جا سکتا ہے بلکہ باسکٹ بال ٹیم کے نئے یونیفارم اور ٹینس کورٹ کا نیا نیٹ بھی خریدا جا سکتا ہے۔ تم نے چالیس سال نوکری کر لی۔ جولائی میں باسٹھ سال کے ہو جاؤ گے پھر تمہیں سوشل سکیورٹی سے معقول پنشن ملنے لگے گی جس سے تمہارا گزارہ بآسانی ہو سکتا ہے۔"

سونی کے پاس مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔

⌘⌘⌘

سونی کی آخری امید بھی ختم ہو گئی تو اس نے اپنا ذاتی سامان گھر منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسکول کی انتظامیہ نے پیشکش کی کہ اگر وہ چاہے تو اسے اس کام میں مدد دینے کے لیے دو آدمی فراہم کیے جا سکتے ہیں تاکہ اسے بار بار چکر لگانا نہ

پڑیں لیکن سونی نے شکریے کے ساتھ یہ پیشکش مسترد کر دی اور کہا کہ وہ خود ہی یہ کام کرے گا۔ اس نے کتابوں اور کاغذات سے بھرے ہوئے نصف درجن باکس ٹرک میں رکھے اور پھر اسے ووڈ ورک شاپ کی طرف لے گیا۔ شاپ ٹیچر نے اس کے لیے فالتو لکڑی سے بھرے ہوئے تین تھیلے الگ کر دیے تھے تاکہ وہ اپنا آتش دان گرم رکھ سکے۔ اسے خیال آیا کہ ان کتابوں کے لیے اسے مزید بک شیلف کی ضرورت پڑے گی۔ لہٰذا اس نے صاف شدہ لکڑی کے اٹھارہ تختے اٹھائے اور انہیں ٹرک میں لاد دیا۔ اس کے علاوہ ایک عدد برقی آری، تارپین کا ڈبا اور کچھ برش بھی ٹرک میں رکھ لیے۔ پھر وہ ٹرک کو اس طرف لے گیا جہاں اسٹور کی نئی عمارت زیر تعمیر تھی اور وہاں سے اس نے اینٹیں اٹھا کر ٹرک میں رکھنا شروع کر دیں جو شیلف بنانے میں اس کے کام آسکتی تھیں۔

ہیڈ ماسٹر اسکول کی عمارت سے متصل ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ اس نے ووڈ ورک شاپ کی لائٹس روشن دیکھیں تو اپنی کار چلاتا ہوا سروس روڈ پر آگیا اور اس نے اپنی کار عین اس جگہ روکی جہاں سونی دونوں ہاتھوں میں اینٹیں اٹھائے ٹرک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے کار کا دروازہ کھولا اور دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھ کر سونی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

اسکول کی انتظامیہ نے مقدمہ بازی اور بدنامی سے بچنے کے لیے سونی کو مجبور کیا کہ وہ ملازمت سے فوری برطرفی قبول کر لے۔ ایسی صورت میں اسے پنشن، میڈیکل انشورنس، اس کے اعزاز میں ہونے والی الوداعی پارٹی سے محروم ہونا پڑے گا۔ بورڈ آف ٹرسٹی کے ایک ممبر نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنے دفاع میں کوئی وکیل کر سکتا ہے لیکن سونی جانتا تھا کہ وکیل کو فیس دینے میں اس کی تھوڑی بہت جمع پونجی بھی ختم ہو جائے گی۔ لہٰذا اس نے خاموشی سے سر جھکاتے ہوئے برطرفی کے خط پر دستخط کر دیے۔

اسے ڈر تھا کہ اگر اسٹور کی انتظامیہ نے پولیس میں رپورٹ درج کروا دی تو اس کے ماضی کو بھی کھنگالا جائے گا۔ وہ ہیڈ ماسٹر، بورڈ کے اراکین، اس کے ساتھی اساتذہ اور دیگر لوگوں سے معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ پھر اخباروں میں اس کی تصویر کے ساتھ خبر شائع ہوگی۔ اسے مقدمہ کا سامنا کرنا پڑے گا اور جرم ثابت ہونے پر وہ جیل بھیج دیا جائے گا۔

☐☐☐

"شام بخیر، پروفیسر ٹیلر!" مسز پٹیل نے اپنے مخصوص ہندوستانی لہجے میں کہا۔

اسکول کی ملازمت ختم ہو جانے کے بعد سونی کو اپنا وہ مکان چھوڑنا پڑا جہاں وہ گزشتہ تینتیس سال سے رہ رہا تھا کیونکہ اب وہ اس کا کرایہ ادا کرنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ ایک کمرے کے فلیٹ میں منتقل ہو چکا تھا جو ریور پارک میں واقع ایک عمارت کی تیسری منزل پر تھا۔ اس کمرے میں چونکہ سامان رکھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس لیے اس نے پرانے گھر کا سارا سامان صرف تیئیس سو ڈالرز میں فروخت کر دیا۔ اب اس کے پاس پہننے کے کپڑوں اور ذاتی استعمال کی اشیا کے سوا کچھ نہیں تھا جنہیں وہ ایک سوٹ کیس میں بھر کر اس ایک کمرے کے فلیٹ میں آگیا۔

"کیا تم میرے ساتھ چائے پینا پسند کرو گے؟" مسز پٹیل چہچہاتے ہوئے بولی۔

یہ روزانہ کا معمول تھا۔ وہ جب بھی شام کو گھر واپس آتا تو مکان کی مالکہ مسز پٹیل دروازے پر اس کا استقبال کرتی اور اسے اپنے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے اور باتیں کرنے کی دعوت دیتی۔

وہ اسے لیونگ روم میں بٹھا کر چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جس میں چائے کے ساتھ پکوڑے بھی رکھے ہوئے تھے۔ ورنہ عام طور پر چائے کے ساتھ ہندوستانی لوازمات ہی پیش کرتی تھی۔

"آج مجھے کچھ بنانے کے لیے وقت ہی نہیں مل سکا" وہ کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے بولی۔ "میرا بیٹا آیا ہے۔ ہم دن بھر شاپنگ کرتے رہے۔"

وہ ٹورنٹو میں رہتا تھا اور ہر دو تین مہینے بعد کاروباری دورے پر امریکا آیا کرتا تھا۔ اس کا قیام خواہ کسی بھی شہر میں ہو لیکن وہ کچھ وقت نکال کر اپنی ماں سے ملنے بفیلو ضرور آتا۔ پھر دونوں ماں بیٹا مل کر خوب شاپنگ کرتے، اچھے ہوٹلوں میں ڈنر کرتے اور جب تک وہ یہاں رہتا، مسز پٹیل کی مسرت بھی خاصی بڑھ جاتی۔

"یہ ٹی وی بہت خوب صورت ہے۔" سونی نے کمرے میں رکھے ہوئے نئے ٹیلی وژن سیٹ کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ اس کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آتے ہیں۔" مسز پٹیل ہنستے ہوئے بولی۔ "شاید مجھے جاننے کی ضرورت بھی نہیں۔ کیا یہ کافی نہیں کہ وہ میرا خیال رکھتا ہے؟"

سونی کو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ مسز پٹیل کا بیٹا کیا کام کرتا ہے، البتہ اسے کبھی کبھی شک گزرتا کہ اس کا بیٹا کسی قسم کی مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث ہے۔ آخر وہ ایسا کون سا کاروبار ہے جس کے لیے وہ ہر دو تین ماہ بعد امریکا کے مختلف شہروں کا چکر لگاتا ہے۔ موبائل، فیکس اور انٹرنیٹ کے ذریعے تمام کاروباری معاملات گھر بیٹھے طے کیے جا سکتے ہیں۔ وہ یہ سب کچھ مسز پٹیل سے نہیں کہہ سکا۔

سونی چائے کی پیالی ہاتھ میں پکڑے ہوئے بیٹھا تھا مگر اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ ایک چھوٹی سی حماقت کی اسے اتنی بڑی سزا ملی تھی۔ وہ ابھی تک ساتا کلاز کے سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس لباس میں اسے خاصی بے آرامی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ مسز پٹیل سے گپ شپ کرنے کے بجائے پہلے وہ گھر جا کر لباس تبدیل کرے کہ اچانک ہی مسز پٹیل کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"پلیز پروفیسر!" اس نے پلیٹ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ پکوڑے تو لو۔"

وہ شاید اسے کالج کا ریٹائرڈ پروفیسر سمجھتی تھی۔ سونی نے ایک پکوڑا اٹھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے سونی کہا کرو۔"

عام طور پر سونی اس سے موسم یا اس کے بنائے ہوئے کھانوں کے بارے میں گفتگو کیا کرتا تھا یا کبھی کبھی دوران ملازمت پیش آنے والا کوئی دلچسپ واقعہ سنا دیتا۔ لہٰذا اس کے بدلے ہوئے رویے کو محسوس کرتے ہوئے مسز پٹیل بولی۔

"کیا بات ہے؟ آج تم کچھ پریشان نظر آرہے ہو؟"

سونی نے چائے کا آخری گھونٹ لیا اور پیالی میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ "میری ملازمت ختم ہو گئی ہے۔"

"کوئی بات نہیں، دوسری مل جائے گی۔ ویسے بھی یہ کام تمہارے شایانِ شان نہ تھا۔"

اس نے ایک اور پکوڑا اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں یہ کام محض تفریح کے لیے کرتا تھا۔"

"ہاں، میں سمجھتی ہوں۔" مسز پٹیل بولی۔ "اور کھاؤ۔ تم نے ہاتھ کیوں روک لیا؟"

سونی کی نگاہ کمرے میں رکھے ہوئے دو عدد ہینڈ کیری بیگز اور کیسوں پر گئی تو وہ بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

"کیا تم کہیں جارہی ہو؟"

مسز پٹیل ہنستے ہوئے بولی۔ "نہیں۔ یہ میرے بیٹے کا سامان ہے۔ شاید اس بار تمہاری اس سے ملاقات ہو جائے تو اس سے یہ ضرور پوچھنا کہ وہ کیا کام کرتا ہے۔"

یہ بات وہ پہلے بھی کہہ چکی تھی کو کہ سونی اس کے بیٹے سے ایک دو مرتبہ مل چکا تھا لیکن مسز پٹیل نے کبھی اسے بیٹے کے ساتھ بیٹھ کر بات کرنے کی دعوت نہیں دی اور یہ ایک طرح سے سونی کے حق میں اچھا ہی تھا ورنہ وہ مشکل میں پڑ جاتا کہ وہ اس کے بیٹے سے یہ بات کس طرح معلوم کرے۔

اس نے دوسری پلیٹ میں رکھی ہوئی ایک چاکلیٹ اٹھائی اور گھڑی کی جانب دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ اب اسے اٹھ جانا چاہیے۔ مسز پٹیل کا بیٹا کسی وقت بھی آسکتا تھا اور اس وقت سونی کی ذہنی کیفیت ایسی نہ تھی کہ وہ اس سے بیٹھ کر باتیں کرتا۔

☐☐☐
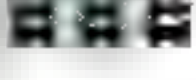
اس رات سونی دیر تک جاگتا رہا۔ گزرے ہوئے واقعات کسی فلم کے مانند اس کے ذہن کے پردے پر روشن ہوتے رہے۔ اس کی زندگی میں ابھی تک کچھ بھی اچھا نہ ہوا تھا۔ قدم قدم پر مصیبتیں اور پریشانیاں اس کا راستہ روکتیں لیکن وہ کسی نہ کسی طرح زندگی کی گاڑی کھینچتا آرہا تھا۔ اب ایک نیا خطرہ اس کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ اگر اسٹور کی انتظامیہ نے چوری کی رپورٹ درج کروا دی تو وہ ایک نئے عذاب میں مبتلا ہو جائے گا۔ اس سے پہلے اسے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔

دوسری صبح وہ اٹھا۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد لباس تبدیل کیا اور کھڑکی میں کھڑا ہو کر دیر تک پڑوسی کے گھر میں جھانکتا رہا پھر اسے خیال آیا کہ اب اسے نکل جانا چاہیے۔ کہیں مسز پٹیل اس کی خیریت معلوم کرنے نہ آجائے۔ رات بھی اس نے تھکن کا بہانہ کر کے بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑائی تھی، اس نے ساتا کلاز کا لباس بغل میں دبایا اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگا تاکہ مسز پٹیل اس کے قدموں کی چاپ نہ سن سکے لیکن وہ بلاوجہ ہی پریشان ہو رہا تھا کیونکہ مسز پٹیل جا چکی تھی۔ اس کے دروازے پر ایک کاغذ چسپاں تھا جس میں لکھا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ اوہیو جارہی ہے جہاں وہ اپنی بہن کے پاس چند روز قیام کرے گی۔ اس لیے اس کی غیر حاضری میں سونی کو شام کی چائے کا اہتمام خود ہی کرنا ہوگا۔ تمام سامان کچن میں موجود ہے۔ اسے صرف پانی ابال کر چائے بنانا ہوگی۔ کھانے پینے کا دیگر سامان بھی موجود ہے۔ اس لیے سونی کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اس نے آخر میں یہ بھی تاکید کی تھی کہ سونی اس کی غیر موجودگی میں گھر کا خیال رکھے۔

☐☐☐
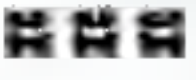
سونی اس غیر متوقع صورت حال سے تھوڑا سا بدحواس ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اگر وہ گزشتہ شب تھوڑی دیر اور اس کے پاس بیٹھا رہتا تو اس کے بیٹے سے ملاقات ہو سکتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ماں بیٹے نے یہ پروگرام رات میں کسی وقت بنایا ہوگا۔ اس لیے مسز پٹیل اسے آگاہ نہ کر سکی۔ اس نے سوچا کہ باہر نکلنے سے پہلے ایک چائے کی پیالی پی لے تاکہ دن کا آغاز

اچھا ہو۔ اس نے سنز چپل کے کچن میں جاکر چائے بنائی اور لیونگ روم میں آکر بیٹھ گیا۔ اس نے ٹی وی آن کیا تو وہاں کوئی انڈین فلم چل رہی تھی۔ اس نے ٹانگیں پھیلائیں اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر فلم دیکھنے لگا۔ گو کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا لیکن وہ فلم کے رومانی مناظر، رقص اور موسیقی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس دوران ٹیں بار بار اس کی آنکھ لگتی رہی۔ کئی بار وہ اٹھ کر ٹائلٹ گیا، بھوک لگی تو اس نے کچن کا رخ کیا اور رات کے بچے ہوئے پیزا سے اپنے پیٹ کی آگ بجھائی۔

سونے جاگنے کی کیفیت میں تین بج گئے۔ اس کی آنکھ مکمل طور پر اس وقت کھلی جب ٹی وی پر چلنے والی آخری فلم زوردار موسیقی کی آواز کے ساتھ ختم ہوئی۔ وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا اور سستی دور کرنے کے لیے چہل قدمی کرتا رہا۔ پھر وہ کچن میں آگیا اور وہاں سے ایک خالی تھیلا لے کر آیا۔ اس میں سانتا کلاز کا سوٹ رکھا اور وہاں سے چل دیا۔

☆☆☆

سونی کا خیال تھا کہ وہ خود جانے کے بجائے یہ سوٹ ڈاک سے بھیج دے لیکن اس طرح اس کا قصوروار ہونا ثابت ہو جاتا جبکہ وہ اپنی دانست میں خود کو بے قصور سمجھ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس نے وہ بیٹری سیل چوری نہیں کیے بلکہ بے دھیانی میں اٹھا کر اپنے تھیلے میں رکھ لیے۔ اس کے باوجود وہ ان کی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار تھا لیکن سخت گیر شفٹ سپروائزر نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے چوری کا مرتکب قرار دے دیا۔ لہٰذا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود یہ سوٹ واپس کرنے جائے گا تاکہ انہیں معلوم ہو سکے کہ اس کے دل میں چور نہیں ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اسٹور انتظامیہ اس غیر اہم معاملے کی رپورٹ پولیس میں نہیں کرے گی کیونکہ شفٹ سپروائزر نے خود ان بیٹری سیل کو معمولی قیمت کا بتایا تھا۔

چھٹی کی وجہ سے اسٹور سنسان پڑا ہوا تھا اور اِکّا دُکّا لوگ ہی وہاں نظر آرہے تھے۔ سونی نے جھجکتے ہوئے اندر قدم رکھا۔ اسے امید تھی کہ کسی نے اسے اندر داخل ہوتے نہیں دیکھا ہوگا۔ وہ اسٹور کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ ساتھ ساتھ اِدھر اُدھر بھی دیکھتا جارہا تھا کہ کہیں اس کا سامنا شفٹ سپروائزر سے نہ ہو جائے۔ اسٹور کے عقبی حصے میں پہنچ کر وہ نیم تاریک کوریڈور کی جانب بڑھ گیا جہاں ملازمین کے کمرے تھے۔ اس نے کوشش کی تھی کہ وہ ایسے وقت اسٹور پہنچے جب شفٹ تبدیل ہو رہی ہو اور وہ اس میں کامیاب رہا تھا۔ شفٹ سپروائزر ایک میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کی چست پتلون اور نارنجی رنگ کا پل اوور پہن رکھا تھا اس کا ایک ہاتھ میز پر ٹکا ہوا تھا دوسرے ہاتھ میں کسی مشروب کا گلاس تھا۔ اس کے علاوہ وہاں تین دوسرے کارکن بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک نے گزشتہ شب اس کے خلاف گواہی دی تھی۔

سونی نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بولنا شروع کر دیا جو کہ خلاف تہذیب تھا لہٰذا وہ لوگ جو پہلے سے باتوں میں مصروف تھے، خاموش ہو گئے۔ سونی نے بلا کسی تمہید شفٹ سپروائزر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”میں تم سے کچھ باتیں کرنے آیا ہوں مس ڈارلا۔“

شفٹ سپروائزر کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”تم مجھ سے بات کرنا چاہتے ہو؟“

یہ کہہ کر اس نے کمرے کا جائزہ لیا پھر سونی کی طرف دیکھا۔ دوسرے کارکن معذرت کر کے وہاں سے جانے لگے تو اس نے گواہی دینے والے کارکن سے کہا کہ وہ سیکیورٹی انچارج کو بلا کر لائے۔

”تم بھی اس کے ساتھ ہی آؤ گے۔“ وہ تاکید کرتے ہوئے بولی۔ ”کیونکہ تم سوتھ کے گواہ ہو۔“ پھر اس کا رخ سونی کی طرف ہو گیا۔ ”تم بھی اس وقت تک مجھ سے کوئی بات نہیں کرو گے جب تک یہ لوگ نہ آجائیں۔“

”میں یہ سوٹ واپس کرنے آیا تھا۔“ سونی نے تھیلا میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”تمہیں یہ سوٹ یہاں سے باہر لے کر نہیں جانا چاہیے تھا۔“ سپروائزر نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”ہاں۔“ سونی نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ”تم اس بارے میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔“

”تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔“

”میں تم سے اسی سلسلے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔“

”اگر تم چوری کے بارے میں کچھ کہنا چاہ رہے ہو تو اس پر کوئی بات نہیں ہوگی۔“

”اگر تم میری بات سنو تو......“

”میں تم سے پہلے کہہ چکی ہوں کہ جب تک یہاں کوئی گواہ موجود نہ ہو۔ میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گی۔“

سونی نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور بولا۔ ”دیکھو۔“

”کیا تم مجھے دھمکانے کی کوشش کر رہے ہو۔“ وہ بگڑتے ہوئے بولی۔ سونی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ جواب میں کیا کہے۔ عین اسی وقت سیکیورٹی انچارج کمرے

داخل ہوا۔ وہ کافی سنجیدہ اور سخت دکھائی دے رہا تھا۔

”سونی! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”یہی میں بھی اس سے پوچھ رہی تھی۔“ شفقت سپروائزر نے کہا۔ ”یہ شخص یہاں کیا کرنے آیا ہے۔ اصرار کر رہا ہے کہ میں اس کی بات سنوں۔ جبکہ اب سننے اور دیکھنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا۔ میں وہ فلم دیکھ چکی ہوں جس میں اسے بیٹریاں چراتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔“

سونی بولا۔ ”میں صرف یہ کہنا چاہ رہا تھا......“

شفقت سپروائزر نے اس کی بات کاٹ دی اور بولی۔ ”وہ گواہ کہاں ہے، میں اس کی غیر موجودگی میں اس کی کوئی بات سننا نہیں چاہتی۔“

سیکیورٹی انچارج نے کہا۔ ”یہ کچھ نہیں بولے گا۔“ پھر اس نے سونی کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ ”چلو، تمہیں یہاں رکنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”ایک منٹ ٹھہرو۔“ سونی گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ ”میں معافی مانگنا چاہتا ہوں۔“

”معافی تو تمہیں کل ہی مانگنی چاہیے تھی لیکن تم نے اس کے بجائے مجھے دھمکانے کی کوشش کی جبکہ میں کسی کی دھمکی میں نہیں آتی۔“ شفقت سپروائزر مشتعل ہوتے ہوئے بولی۔ ”مجھے کسی کی معافی سننے کی ضرورت نہیں۔“

سونی کو یوں لگا جیسے وہ کسی دلدل کے کنارے کھڑا ہے اور اسے وہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا۔ اس نے اپنے حواس مجتمع کیے اور بولا۔ ”میں اس قصے کو ختم کرنا چاہ رہا تھا۔“

شفقت سپروائزر نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔ ”اس کا ایک ہی انجام ہے۔ وہ جو سامنے دیوار پر لکھا ہے اسے غور سے پڑھو، چوری کرنے والے کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔“

”نہیں، پہلے میری بات سن لو۔ میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ وہ میز پر مکا مارتے ہوئے بولا۔

”یہ شخص مجھے دھمکی دے رہا ہے۔“ وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ”اس نے میز پر مکا مارا۔ تم الزامات کی فہرست میں اس دھمکی کا بھی اضافہ کر لو۔“

سونی کو یوں لگا جیسے وہ پاگل جانوروں کے ساتھ کسی پنجرے میں قید ہو گیا ہے۔ سیکیورٹی انچارج اسے دروازے کی طرف لے جانے لگا اور عورت نے اپنی جیب سے سیل فون نکال لیا۔

”سونی! کیا تم چاہتے ہو کہ تمہیں اس سے دور رہنے کا عدالتی حکم مل جائے؟“ سیکیورٹی انچارج بولا۔

”میرے پاس اپنی حفاظت کے اور بھی طریقے ہیں۔“ شفقت سپروائزر نے سیل فون نمبر ڈائل کرتے ہوئے بولی

”تم کسے فون کر رہی ہو؟“ سونی نے پوچھا۔

”تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔“

”تم حد سے آگے بڑھ رہی ہو۔“ سونی غصے سے بولا۔

سیکیورٹی انچارج نے اس کا بازو مضبوطی سے پکڑا اور اسے دروازے کی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔ ”سونی! خاموش ہو جاؤ۔“

باہر آنے کے بعد سونی نے کہا۔ ”کیا یہ عورت پاگل ہو گئی ہے، میں نے اسے کوئی دھمکی نہیں دی۔“

”گھر جاؤ۔ اس جگہ اور اس عورت سے دور رہنے کی کوشش کرو۔“

”میں نے کسی کو دھمکی نہیں دی۔ میں تو صرف بات کرنا چاہ رہا تھا۔ تم مجھے پولیس کے حوالے نہیں کر سکتے۔“

”میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ آئندہ دو ہفتوں تک کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔ تب تک یہ معاملہ ٹھنڈا ہو چکا ہوگا۔“

ایک لمحے کے لیے سونی نے سوچا کہ وہ سیکیورٹی انچارج کو اپنی پوری کہانی سنا دے اور یہ بھی بتائے کہ وہ اسٹور کی ملازمت کیوں کر رہا تھا۔ پے در پے غلط فہمیوں کی وجہ سے اس کی زندگی کس طرح تباہ ہوئی لیکن اس نے اپنا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے کہا۔ ”میں سانتا کا سوٹ واپس کرنے آیا تھا۔“

سیکیورٹی انچارج اس کے ساتھ چلتا ہوا کار تک آیا۔ سونی دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا پھر اس نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا اور تشکر آمیز نگاہوں سے سیکیورٹی انچارج کو دیکھنے لگا۔ جواب میں انچارج نے اس کی کار کی چھت کو ہلکے سے تھپتھپایا اور بولا۔ ”ہم رابطے میں رہیں گے۔“

❊ ❊ ❊

راستے میں ایک جگہ رک کر اس نے ایک اسٹور سے کھانے پینے کا سامان خریدا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ مسز پٹیل گھر پر نہیں ہوگی لہٰذا اسے شام کی چائے کے ساتھ کھانے کے لیے کچھ نہیں ملے گا۔ جب وہ گھر کے قریب پہنچا تو اس نے دو آدمیوں کو دروازے کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا پایا۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس لیے کار میں بیٹھے ہوئے سونی کی نظر ان پر نہیں گئی۔ جب وہ گاڑی پارک کر کے سیڑھیوں قریب پہنچا تو انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ ایسا علاقہ نہیں

جہاں لوگ گھروں کے باہر سیڑھیوں پر بیٹھتے ہوں۔ اس نے سوچا کہ شاید یہ لوگ مسز پٹیل سے ملنے آئے ہوں۔ شاید مزدور، سیلز مین یا گھروں پر سامان پہنچانے والے ہوں۔

اسے دیکھ کر وہ دونوں آدمی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سونی نے کہا۔ ”میں اس گھر کا مالک نہیں ہوں۔“ وہ بچے پورشن کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”مسز پٹیل شہر سے باہر گئی ہوئی ہے۔“

”ہم اس سے ملنے نہیں آئے۔“ ان میں سے چھوٹے قد والا بولا۔ ”ہمیں سانتا کلاز کی تلاش ہے۔“

”کیوں؟“

”تمہی سانتا کلاز ہو نا؟“

دوسرا آدمی براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”تم نے ہی ڈارلا ولسن کو دھمکی دی تھی۔“

سونی کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ان میں سے چھوٹے قد والے نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور پیچھے سے اس کی گردن پکڑی۔

سونی نے اپنی گردن چھڑاتے ہوئے کہا۔ ”تم غلط پتے پر آ گئے ہو۔“

ان دونوں نے بیک وقت نظریں اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا جیسے مکان کا نمبر چیک کر رہے ہوں پھر چھوٹے قد والا بولا۔ ”نہیں، ہم ٹھیک جگہ پر آئے ہیں۔“

دوسرے آدمی نے سونی کے ہاتھ سے چاکلیٹ کا لفافہ لے لیا اور بولا۔ ”اس میں کیا ہے؟“ پھر اس میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”اچھا تو سانتا کو میٹھی چیزیں پسند ہیں۔ میں بھی چاکلیٹ بڑے شوق سے کھاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے وہ لفافہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

چھوٹے قد کے آدمی نے سونی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ”ڈارلا ولسن کو تو جانتے ہو نا۔ اسی نے ہمیں بھیجا ہے تاکہ تمہارا دماغ ٹھکانے لگایا جائے۔“

”اس سے دور رہو۔“ دوسرا آدمی غراتے ہوئے بولا پھر اس نے سونی کی ٹھوڑی کے نیچے ایک زوردار چٹکی لی، درد کی ایک لہر اس کے پورے جسم میں ابھری اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا پھر اس شخص نے دوسرے ہاتھ سے سونی کا سر پکڑا اور اسے زور سے دھکا دے کر دروازے سے گرا دیا۔ اس ضرب سے سونی کا دماغ جھنجھنا اٹھا۔

”اب اگر اس کے آس پاس نظر آئے تو تمہارا انجام بھیانک ہوگا۔“

اس آدمی نے ایک بار پھر سونی کا گریبان پکڑا۔ اسے بائیں جانب گھمایا اور زور سے دھکا دے دیا۔ سونی لہراتا ہوا پیچھے کی جانب گیا اور پشت کے بل زمین پر گر گیا۔ وہ کچھ دیر یونہی بے حس و حرکت پڑا رہا۔ کچھ دیر بعد جب اس کے حواس قابو میں آئے تو اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن... وہ دونوں وہاں سے جا چکے تھے۔ سونی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اتنی جلدی کہاں غائب ہو گئے۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر تک زمین پر پڑا رہا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کی کمر میں بری طرح چوٹ آئی تھی اور ٹھوڑی کے نیچے بھی جلن ہو رہی تھی۔

❊ ❊ ❊

اس کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ لہٰذا وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے مسز پٹیل کے لیونگ روم میں رکھے ہوئے صوفے پر ہی ڈھیر ہو گیا۔ وہ اتنا تھکا ہوا تھا کہ اس نے ٹی وی کی جانب بھی توجہ نہیں دی اور نہ ہی اس کی نظر کسی اور جانب گئی۔ وہ کافی دیر تک صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے سستاتا رہا پھر اسے بھوک محسوس ہوئی، اس نے جیبیں ٹٹولیں تو مونگ پھلی کا پیکٹ ہاتھ میں آ گیا۔ سونی نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ ان دونوں آدمیوں کو صرف چاکلیٹ ہی پسند تھی ورنہ وہ اس مونگ پھلی کے پیکٹ سے بھی محروم ہو جاتا۔

عین اسی وقت اس کی نگاہ کونے میں رکھے ہوئے دو عدد سوٹ کیسوں پر گئی جو یقیناً مسز پٹیل کے بیٹے کے تھے۔ وہ ان سوٹ کیسوں کو اچھی طرح پہچانتا تھا کیونکہ جب بھی مسز پٹیل کا بیٹا اپنی ماں سے ملنے آتا تو یہ سوٹ اس کے ساتھ ہوتے سونی سوچ رہا تھا کہ وہ یہ سوٹ کیس یہاں کیوں چھوڑ گیا۔ اس کے دل میں بے ایمانی آ گئی۔ اس نے ایک سوٹ کیس اٹھایا اور اسے کافی ٹیبل پر رکھ کر کھولنے کی کوشش کرنے لگا لیکن سوٹ کیس میں تالا لگا ہوا تھا۔

اس نے میز کی دراز کھولی تو اسے وہاں پیپر کلپ کا پیکٹ رکھا ہوا نظر آیا۔ اس نے ایک کلپ نکال کر اسے سیدھا کیا اور اسے تالے کے سوراخ میں ڈال کر دو تین بار گھمایا۔ ذرا سی کوشش سے تالا کھل گیا۔ سوٹ کیس میں سب سے اوپر ایک نیلے رنگ کی ٹی شرٹ رکھی ہوئی تھی اور اس کے اطراف میں کئی چھوٹے چھوٹے تولیے ٹھونس دیے گئے تھے۔ سونی نے وہ تولیے ہٹائے تو اسے وہاں سو سو ڈالرز کے نوٹوں کی کئی گڈیاں دکھائی دیں۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ حیرت، خوف، پریشانی اور خوشی کی ملی جلی کیفیات اس پر طاری ہو گئیں۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ان گڈیوں کو گننا شروع کیا۔ وہ تعداد میں ڈیڑھ سو تھیں جبکہ ہر گڈی سو

ڈالرز کی تھی گویا وہ کل ملا کر پندرہ لاکھ ڈالرز تھے۔ سونی کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اس نے جلدی جلدی دوسرا سوٹ کیس کھولا۔ اس میں بھی اتنی ہی رقم تھی۔ سونی کے پاس سوچنے سمجھنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ اس کی ساری تھکاوٹ اور سستی دور ہو چکی تھی۔ اسے بھوک لگ رہی تھی اور نہ ہی پیاس۔ اس نے دونوں سوٹ کیس بند کیے اور انہیں لے کر باہر آ گیا۔

☗☗☗

اس کی کار کا رخ مغرب کی جانب تھا۔ وہ اس قصبے بلکہ ریاست سے جتنا دور نکل جائے، اتنا ہی اس کے حق میں بہتر ہے گو کہ مسز پٹیل کی واپسی ایک ہفتہ سے پہلے ممکن نہ تھی لیکن سونی کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ یہ تو وہ جانتا تھا کہ مسز پٹیل یا اس کا بیٹا اس رقم کی چوری کی رپورٹ درج نہیں کروا سکتے کیونکہ یہ ان کی جائز آمدنی نہیں تھی۔ کوئی بھی اتنی بڑی رقم سوٹ کیسوں میں لیے ہوئے نہیں پھرتا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ مسز پٹیل کا بیٹا ناجائز کاموں میں ملوث ہے اور اس کے تعلقات بے حد خطرناک لوگوں سے بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ اتنی بڑی رقم کے چوری ہو جانے پر خاموشی سے بیٹھنے والا نہیں تھا۔ چوری کا علم ہوتے ہی وہ اپنے آدمیوں کو اس کی تلاش پر مامور کر سکتا تھا۔ اسی لیے سونی کی کوشش تھی کہ وہ جتنی جلد ممکن ہو۔ یہاں سے دور چلا جائے اور اگر زیادہ خطرہ محسوس ہوا تو وہ یہ ملک ہی چھوڑ دے گا۔

گاڑی چلاتے وقت اس کا ذہن مسلسل حساب کتاب میں لگا رہا۔ تیس لاکھ ڈالرز میں اس کی بقیہ زندگی بڑے عیش و آرام سے گزر سکتی تھی۔ سب سے پہلے وہ ایک نئی کار خریدے گا۔ پھر بارڈر کے قریب کسی جنوبی قصبے میں ایک مکان کرائے پر لے کر وہاں رہائش اختیار کرے گا۔ ممکن ہے کہ وہ ان پیسوں سے ایک چھوٹا سا جہاز خرید سکے۔ اس طرح وہ وقفے وقفے سے اپنا ٹھکانا بدلتا رہے گا۔ خیالی پلاؤ پکاتے پکاتے اچانک اسے خیال آیا کہ راستے میں متعدد چوکیاں آتی ہیں اور اکثر جگہ سامان کی تلاشی بھی لی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں پکڑے جانے کا امکان بہت زیادہ ہے۔ اس کے لیے چوکی کے اہل کاروں کو رقم کے بارے میں مطمئن کرنا بہت مشکل ہوگا۔ اس نے سوچا کہ فی الحال ایک لاکر لے کر یہ سوٹ کیس وہاں رکھ دے اور راستے کی ضرورت کے لیے تھوڑے بہت ڈالرز اپنے پاس رکھ لے۔ ایک بار وہ ان سرحدی چوکیوں سے گزر جائے تو اسے اندازہ ہو جائے گا کہ وہاں کس قسم کی چیکنگ ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ وہاں ہر شخص اس کے انتظار میں بیٹھا ہو۔ آخر مسز پٹیل کا بیٹا بھی تو اس طرح کی ناجائز رقم لے کر مختلف ریاستوں میں گھومتا رہتا ہے، وہ تو کبھی نہیں پکڑا گیا۔

☗☗☗

سونی کی گاڑی میں گیس ختم ہو رہی تھی۔ اس نے کار کا رخ انگولا سروس پلازا کی جانب موڑ دیا۔ ویسے بھی وہ دو دن سے چاکلیٹوں پر ہی گزارہ کر رہا تھا لہٰذا اس نے سوچا کہ گیس بھروانے سے پہلے پیٹ میں کچھ ڈال لے۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی، رات کے دو بج رہے تھے۔ فوڈ شاپ سنسان پڑی تھی اور وہاں صرف ایک عورت اپنے بچے کے ساتھ انتظار گاہ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ سونی سمجھ گیا کہ وہ اپنے شوہر کا انتظار کر رہی ہوگی۔

سونی نے اپنے لیے برگر اور اورنج سوڈا کا آرڈر دیا۔ وہ پہلے ہی سوٹ کیس میں سے سو ڈالرز کا ایک پیکٹ نکال اپنی جیب میں رکھ چکا تھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پیکٹ میں سے ایک نوٹ نکالا اور اسے انگلیوں کے درمیان رکھ کر مسلنے لگا۔ یہ جاننے کے لیے کہ اس نے پیکٹ سے ایک ہی نوٹ نکالا ہے۔

کاؤنٹر کلرک نے نوٹ ہاتھ میں پکڑا اور اسے کاؤنٹر پر رکھے ہوئے آلہ پر رکھ دیا۔

”بقیہ پیسے تم رکھ لو۔ میری کرسمس!“ سونی نے شاہانہ انداز میں کہا اور خود ہی ہنسنے لگا۔

کلرک نے نوٹ کو دونوں انگلیوں سے مسلا اور بولا۔

”یہ تو جعلی ہے۔“

اس وقت وہاں کوئی دوسرا گاہک موجود نہ تھا۔ کلرک کی آواز کی گونج دور تک سنی گئی۔ برگر تیار کرنے والے لڑکے نے جالی سے جھانک کر دیکھا اور منیجر تیزی سے چلتا ہوا کاؤنٹر پر آیا۔

”کیا ہوا؟“

سونی کو اپنے عقب میں ایک آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہاں ایک پولیس والا کھڑا تھا، اس نے چبھتی ہوئی نظروں سے سونی کو دیکھا اور کلرک سے پوچھنے لگا۔

”کیا مسئلہ ہے؟“

کلرک نے نوٹ لہرایا اور چیخ چیخ کا سارا ماجرا بیان کر دیا۔ سونی کی ٹانگوں میں جان نہ رہی۔ وہ کاؤنٹر کا سہارا لے کر اپنی کار کی جانب دیکھنے لگا۔ جس کی ڈکی میں تیس لاکھ ڈالرز سے بھرے ہوئے دو سوٹ کیس رکھے ہوئے تھے اس کے خوابوں کا محل ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔

☗

کانچ کی چوڑی

رجنی پٹیل

مخصوص لب و لہجہ اور مانوس ماحول کی خالق ...... رجنی پٹیل ایک بار پھر

صنفِ نازک ہمیشہ سے بڑی بڑی داستانیں رقم کرتی چلی آرہی ہے۔ کہیں جھیل کے مانند گہرائی میں پیار چھپا کر رکھتی ہے تو کہیں زخمی ناری کی اگن بن کر انتقام کے شعلے بھڑکاتی ہے۔ کبھی وحشت زدہ ہوکر صحرا میں پناہ ڈھونڈتی ہے تو کبھی محفوظ پناہ گاہ سے نکلتے ہی بہک جاتی ہے مگر... ایک بے چینی، ایک انجان سی کسک ہمیشہ اس کے تعاقب میں رہتی ہے... ہزاروں رنگوں میں ڈھلنے کے باوجود ایک رنگ ایسا بھی آتا ہے جس پر اپنا تن من دھن وار دیتی ہے... جسے ٹوٹ کر چاہے اس کی خاطر ٹوٹ کر بکھر جاتی ہے اور مسکراتی ہے... محبت آسمانوں پر... بہت اونچے مکانوں پر حسیں اک گیت گاتی ہے۔ یہی ایک عورت کی کہانی ہے۔ کہیں الجھی ہوئی ریشم، کہیں سلجھی ہوئی ڈوری۔

ماں باپ نے اس کا نام ارجن کمار رکھا تھا پر گاؤں والے راجن کے نام سے پکارتے تھے پھر راجن سے وہ راجو کباڑیا کہلانے لگا۔ کارن یہ تھا کہ گاؤں کے بڑے گھنٹا گھر والے بازار میں اس کی کباڑی کی دکان تھی۔ اس کے پرکھوں کا یہ بیوپار برسوں سے چلا آرہا تھا۔

سات سال کی عمر سے اپنے باپو جیون لال کے ساتھ اسی دکان پر پلا بڑھا تھا۔ اٹھارہ انیس کے لپیٹے میں تھا کہ اس کے باپ کو ایک زہریلے سانپ نے ڈس لیا۔ اس سے پہلے

کہ دوا دارو ہوتا وہ منہ سے جھاگ اڑاتا، بھگوان کو پکارتا مر گیا۔ اس کے بعد سے بجّی کی دکان کو راجو ہی نے سنبھال لیا تھا، ایک بوڑھی ماں تھی جو گھر پر برتن مانجھتی اور کھانے پکانے میں مصروف رہتی تھی۔ بجّی کے مرنے کے بعد اس کے ہونٹوں پر بھی پپڑی سی جمنے لگی۔ بچھڑنے والے جنم جنم کے ساتھی کا روگ اسے اندر ہی اندر گھلا رہا تھا۔

کہنے کو تو راجو کباڑی ہی تھا لیکن گاؤں کے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں اس کی حیثیت کم نہیں تھی۔ صبح سے شام تک وہ پرانا سامان فروخت کرکے اتنا کما لیتا تھا جو دفتر میں کام کرنے والے کسی بابو کی دو تین دن کی پگار سے بھی زیادہ ہوتا تھا۔ اچھے مکان میں رہتا تھا، اچھا کھاتا پیتا اور پہنتا تھا لیکن جب گاؤں والے اسے راجو کباڑی کے نام سے آواز دیتے تو اسے یوں لگتا جیسے بھرے بازار میں اس کے اجلے کپڑوں پر کسی نے ہولی کی پچکاری مار دی ہو۔ وہ ایسے موقعوں پر زبردستی اپنے ہونٹوں پر ایک مسکان ضرور سجا لیتا تھا پرنتو اندر اندر ہی اپلے کی آگ کے انوسار بڑی دیر تک سلگتا رہتا۔ خاص طور پر جب گاؤں کی لڑکیاں اسے کباڑی کہتیں تو اس کا من کرتا کہ انہیں بھرے بازار میں چت کرکے ان کا کباڑا کردے۔ اس کا بھی ایک کارن تھا۔ گاؤں کے بہت سارے جوانوں کی طرح اس کی رال بھی کانتا کی ابھرتی جوانی پر ٹپکنا شروع ہوگئی تھی۔

کانتا رگھو گوالے کی اکلوتی لڑکی تھی، گھر کا خالص دودھ، دہی اور نکھرا ہوا مکھن کھا کھا کر اس پر ٹوٹ کر روپ آیا تھا۔ راجو نے کئی بار سوچا کہ کسی طرح رگھو تک اپنی پسند کا سندیسا بھیج کر کانتا کے گلے میں اپنے نام کی تختی لگوا دے لیکن بوڑھی ماں سے دل کی بات کہتے اسے جانے کیوں لاج سی آتی تھی۔ البتہ کبھی کبھی وہ دبی زبان میں تندو سے کانتا کے بارے میں دو چار باتیں ضرور کرلیتا تھا۔

تندو کا نام بھی پہلے اچھا بھلا سریندر ناتھ تھا لیکن اس کی دکان سے سائیکل کی پھٹی ٹیوب کا پنکچر لگوانے اور بھاڑے پر سائیکل لینے والوں نے اس کے اچھے بھلے سندر نام کو سریندر ناتھ سے تندو بنا دیا تھا۔ سریندر اور راجو کی دکانیں ساتھ ساتھ تھیں۔ دونوں لگ بھگ ایک ہی عمر کے تھے اس لیے ایک دوسرے کے دوست بھی بن گئے تھے۔

راجو کی طرح تندو نے بھی اپنے آپ کو سینت کر نہیں رکھا تھا۔ اچھا خاصا گبرو جوان تھا اس لیے دو چار اونی پونی لڑکیوں سے اس نے ناجائز سمبندھ قائم رکھا تھا۔ راجو نے کئی بار اسے اونچ نیچ سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ ایک کان سے سنتا اور دوسرے سے اڑا دیتا۔ ایک دن راجو نے اسے بن کر اجلی ڈگر پر لانے کی کوشش کی۔ ''دیکھ تندو...... یہ جوا جو ہے نا، یہ ایک بار جا کر واپس نہیں آتی، کسی ہرجائی ناری کی طرح روٹھ جائے تو اسے منانا بھی منش کے بس میں نہیں ہوتا۔ میری بات مان تو کسی ایک کو پسند کرکے اس سے رشتہ جوڑ لے۔ ادھر ادھر منہ مارنے سے بدنامی بھی ہوتی ہے۔ کسی دن رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تو بنی بنائی عجت بھی مٹی میں مل جائے گی۔ گاؤں کے سارے لوگ بھی تھو تھو کریں گے۔''

''میں تیری بات سمجھتا ہوں راجو...... بڑا لمبا سے بیت گیا۔'' تندو نے کسی ویس کے نیتا کی طرح مسکرا کر جواب دیا۔ ''من پسند کرسی ہاتھ سے نکل جائے تو ہارنے والا ہمیشہ ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے۔ الیکشن میں سلیکشن نہ ہو تو منش کے اندر کی تمام منو کامنائیں بھی ٹھنڈی پڑ جاتی ہیں چڑھتے ندی نالے ایک بار گھاٹ سے منہ موڑ لیں تو گھاٹ سدا سونا سونا ہی رہتا ہے۔''

''ایک بات بتا تندو؟'' راجو نے اسے غور سے تکتے ہوئے پوچھا۔ ''تو نے اتنی بڑی بڑی باتیں کہاں سے سیکھی ہیں؟''

''ان ہی ہرنیوں سے سیکھی ہیں جن سے تو دامن چھڑانے کا بھاشن دے رہا ہے۔'' تندو نے ایک آنکھ جھپکا کر کہا تو راجو دنگ رہ گیا۔ کچھ دیر اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھتا رہا پھر دبی زبان میں پوچھا۔

''تیرے من میں کون بسی تھی جو اب ہاتھ سے نکل گئی؟''

''پہلے وچن دے، تو یہ بات زبان سے نہیں نکالے گا۔'' تندو کا چہرہ ایک دم ہی مرجھا سا گیا۔

''سورگ باسی پتا کی سوگند...... تیری کہی بات میرے ساتھ ہی چتا کی آگ میں جل بھن کر راکھ ہوجائے گی۔ میری بات کا وشواس کر۔''

تندو کچھ دیر گم صم رہا، گونگا بنا آکاش کو تکتا رہا پھر کسمسا کر بولا۔

''وہ...... اس کا نام...... جیوتی تھا؟''

''تھا سے تیرا کیا مطلب ہے؟...... جیوتی تو اب بھی جیوتی ہے۔'' راجو نے پلکیں جھپکائیں۔ ''بچیوں کی طرح سہیلیوں کے ساتھ ادھر ادھر اچھلتی پھرتی ہے، صورت شکل میں بھی بہتوں سے بہتر ہے۔''

''ہے تو سہی لیکن اب اس میں وہ مزہ نہیں رہا جو کورے مٹکے میں ہوتا ہے۔''

''کھل کر بات کر...... تیری پہیلیاں اپنے پلے نہیں پڑ رہیں۔'' راجو نے چڑ کر کہا۔ ''پھر میرے تیرے بیچ کوئی پردہ بھی نہیں ہے۔ تو جانتا ہے کہ لچھے دار باتیں مجھے نہیں جچتیں۔''

''ساری بات اسی پردے کی ہے میرے بھولے بادشاہ۔'' تندو نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔ ''کھدڑی کے کپڑے کی چمک دمک کیول اس سے تک رہتی ہے جب تک اسے گھر پر دھیان سے دھویا جائے، ایک بار وہ کسی دھوبی کے گھاٹ کے پتھر پر سر سے اونچا ہوکر ''ہی ہا'' کی آواز سے پچھاڑ کھالے تو ساری چمک دمک......''

''یہ تو کیا بکواس کررہا ہے......؟'' راجو نے اس کی بات سمجھتے ہوئے چونک کر پوچھا۔ ''جیوتی کے لیے جو شبد تیری زبان سے نکل رہے ہیں۔ اگر اس کی ماں یا کسی اور کے کانوں تک پہنچ گئے تو وہ تجھے آسانی سے شما بھی نہیں کریں گے۔''

''اس کی ماتا نے سب لیپا پوتی پہلے ہی کردی ہے۔'' تندو نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے چباتے ہوئے کہا۔ ''گاؤں کی سب سے پرانی اور گھاگ دائی ہے، اپنی چھوری کا روگ جانتے ہی اس نے ایسی کوئی جڑی بوٹی اسے گھول کر پلادی ہے کہ اس کی کوکھ کبھی ہری نہیں ہوگی۔ اب جہاں چاہے...... بیچ لڑاتی پھرے سالی۔ خطرے کی گھنٹی دوبارہ نہیں بجے گی۔''

''تو سچ کہہ رہا ہے......؟''

''ہاں...... کچے کریلے کی طرح کڑوا سچ۔'' تندو کے ہونٹوں پر ایک ارمانوں بھری مسکان تڑپ کر ٹھنڈی ہوگئی۔

''پر...... تجھے اتنے اندر کی بات کی بھنک کیسے ملی؟''

''کوئی اور بات کر راجو......'' تندو نے جھنجلا کر کہا پھر بڑی رازداری سے بولا۔ ''میں تیرا متر ہوں راجو۔ تیرے اردے کے بھیتر جو پودا جڑیں مضبوط کررہا ہے میں نے اسے بھی تاڑ لیا ہے۔''

''کیا مطلب ہے تیرا......؟'' راجو ٹپٹا کر رہ گیا۔

''یاروں سے کیا چھپانا میری جان کے چوتھائی گھوے۔'' تندو نے راجو کے قریب کھسک کر مدھم آواز میں کہا۔ ''میرے سر پر ہاتھ دھر کر قسم اٹھا...... کیا تیرے من میں کانتا کو دیکھ کر گدگدی نہیں ہوتی......؟''

''ہوتی تو ہے پر...... پر رگھو شاید میرا رشتہ سویکار کرنے میں چوں چرا ضرور کرے گا۔''

''کیوں...... کیا کمی ہے تیرے اندر؟''

''بات کمی کی نہیں ہے لیکن جب جانے پہچانے لوگ مجھے کباڑیا کہتے ہیں تو خود مجھے بھی اچھا نہیں لگتا۔ رگھو تو پھر کانتا کا پتا ہے۔'' راجو نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''اس کے علاوہ میرا کوئی بڑا بھی نہیں جو رگھو سے بات چھیڑ کر اس کے من کا بھید بھاؤ جان سکے۔ ایک بار اس نے منہ کھول کر ''نا'' کہہ دی تو میرے سپنے بھی ٹوٹ جائیں گے۔''

''تو بنسی کاکا کے آگے زبان کھول کر انہیں بیچ میں ڈال کر دیکھ۔'' تندو نے رائے دی۔ ''بنسی کاکا تیرے پتا کے متر بھی تھے اور رگھو سے بھی ان کی گاڑھی چھنتی ہے۔''

''کہتا تو ٹھیک ہے لیکن بنسی کاکا کے سامنے میری زبان نہیں کھلے گی۔''

''ماسی تو بات چھیڑ سکتی ہے۔'' تندو نے چہک کر کہا پھر راجو کی کسمساہٹ دیکھ کر جلا گیا۔ ''سمجھ گیا...... تو نے شاید ابھی تک ماسی سے بھی من کا بھید چھپا رکھا ہے...... کیوں؟''

راجو نے اقرار کرلیا تو تندو نے ادھر ادھر دیکھ کر بڑی رازداری سے کہا۔

''میری بات دھیان سے سن لے راجو...... جو لوگ سیانے ہوتے ہیں وہ تاڑ کے پھل کے نیچے رات ہی سے ہانڈی باندھ کر اس میں ٹک لگا دیتے ہیں اور سویرے سویرے سورج نکلنے سے پہلے ہی ہانڈی میں جمع سارا رس ڈکار جاتے ہیں۔ اس رس کو نیرا کہتے ہیں۔ نیرا منش کو سدا جوان رکھتی ہے۔ پرنتو اگر اسی رس کو سورج مہاراج کی ایک کرن بھی چھو لے تو وہ تاڑی بن جاتی ہے اور تاڑی کا نشہ سب سے خراب ہوتا ہے۔ اچھا بھلا مرد چھچھوندر بن کر رہ جاتا ہے۔''

''تیرا بھاشن میرے پلے نہیں پڑا، یہ میرے اور کانتا کے رشتے کے بیچ نیرا اور تاڑی کہاں سے آگئی؟''

''سمجھنے کی کوشش کر میرے یار۔'' تندو نے سرد آہ بھری۔ ''اپنی جیوتی کو بھی سورج کی کرن چھو گئی تھی۔ جبھی تو اس کے قدم ڈگمگا گئے تھے۔''

''جب تیرے من سے اس کا دھیان نکل چکا ہے تو دل سے میل بھی نکال دے میرے یار۔'' راجو نے ہمدردی کا اظہار کیا تو تندو مسکرا کر بولا۔

''میل کی بھی تو نے بھلی کہی۔ میں نے گنگا بہتی دیکھی تو اپنے ہاتھ بھی دھو لیے۔''

''تجھے شرم نہیں آئی اس کے بدن کو ہاتھ لگاتے؟''

''جب اس کنواری کو کر لاج نہیں آئی تو میں کس بات کی شرم کرتا؟'' تندو نے ڈھٹائی سے جواب دیا پھر بولا۔ ''نرکھ میں ڈال جیوتی کو۔ تو کانتا سے رشتے کی بات کر...... ہمیں کوئی نہ کوئی اپائے تو کرنا ہوگا۔ اگر رگھو نے اس کا ناتا کہیں اور پکا کردیا تو پھر مجھے بھی دکھ ہوگا۔ تیری اور کانتا کی

جوڑی بن جائے تو مجھے خوشی ہوگی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن بنسی کاکا اور ماتا جی سے بات کون چھیڑے گا؟"

"سمجھ گیا راجو...... تو پکی پکائی کھانا چاہتا ہے۔" نندو ایک پرانے گاہک کو دکان پر کھڑا دیکھ کر کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ گیا۔ "چنتا نہ کر۔ اب میں ہی کوئی نہ کوئی چکر چلانے کی کوشش کروں گا۔"

نندو چلا گیا تو راجو گلّے کے ساتھ رکھی پرانی کرسی کے گدیلے سے ٹیک لگا کر کانتا کے سپنوں میں گم ہوگیا۔

⬩⬩⬩

ساون کے آتے ہی بڑے میدان میں نیم کے پرانے درخت پر جھولے پڑ گئے تھے، گاؤں کی لڑکیاں شام کے وقت ادھر ہی جمع ہو کر من بہلایا کرتی تھیں۔ اس کے جھولوں پر لڑکیاں پینگیں بڑھا بڑھا کر ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی دھن میں مگن تھیں۔ کچھ لڑکیاں تالیاں پیٹ پیٹ کر ان کو جوش دلا رہی تھیں، آپس میں ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ بھی جاری تھی۔ سہانی رت میں الہڑ لڑکیوں کے جوان قہقہوں نے موسم کو بھی نکھار دیا تھا۔ اس ہنگامے سے تھوڑی دور ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھی ماسٹر سیتا رام کی اکلوتی بیٹی بندیا اپنی سکھی جمنا سے کہہ رہی تھی۔

"کانتا کل بھی نہیں آئی تھی...... آج بھی نظر نہیں آ رہی۔ تو نے بھی کچھ سنا ہے اس کے بارے میں؟"

"کیوں...... تو نے ایسی کیا بات سن لی جو تیرے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہی ہے؟" جمنا نے بندیا کو حیرت سے گھورا۔

"بات ایسی ہی ہے کہ تو سنے گی تو تیرے من میں بھی ہوک اٹھے گی۔" جمنا نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ابھی اس کے جھاڑ میں کیریاں پک کر آم بھی نہیں ہوئیں اور پتھر آنے لگے اور ہم دونوں ابھی تک آس لگائے بیٹھے گزارا کر رہے ہیں۔"

بندیا کھل کھلا کر ہنس دی۔ "تو ماسٹر کی بیٹی ہے نا۔ اسی لیے تجھے ایسی چٹ پٹی باتیں کرنا بھی آگئی ہیں۔ ویسے کانتا کے گھر پتھر آنے والی بات تو نے کب اور کہاں سنی؟"

"سچ کیا ہے یہ تو کانتا ہی بتائے گی۔ پر میرے کان میں یہ بھنک پڑی ہے کہ بنسی کاکا اور رگھو بابا کے درمیان دو روز سے کچھ کھچڑی پک رہی ہے۔"

"پھر تو رمیش کے بھاگ ہی کھلنے کی بات ہوگی۔" جمنا نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے ہوا میں تیر چلایا۔ "تو بھی جانتی ہے کہ رمیش کی رال اپنی کانتا پر ٹپک رہی ہے۔ کانتا کا جھکاؤ بھی ادھر ہی لگتا ہے۔ دونوں کا آپس میں آنکھ مٹکا بھی چل رہا ہے۔"

"بات کانتا کے جھکاؤ کی نہیں...... بنسی کاکا کی ہے" بندیا نے سنجیدگی سے کہا۔ "اگر رمیش کا چکر ہوتا تو اس کا بھی رگھو بابا کے پاس جا سکتا تھا۔ بنسی کاکا کو بیچ میں ڈالنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"پھر تیرے خیال میں اور کون ہو سکتا ہے......؟"

"پورے وشواس سے کچھ نہیں کہہ سکتی پر تو ہو سکتا ہے کہ راجو کباڑیے کی قسمت جاگنے کی بات ہو۔"

"تیرے دھیان میں راجو کا نام کیسے آگیا؟ اپنی کانتا تو رمیش کو من میں بسانے کے سپنے دیکھ رہی ہے۔"

"سپنے کی بھی ایک کہی تو نے۔" بندیا نے مچل کر جواب دیا۔ "اگر ہم لڑکیوں کے سپنے پورے ہونے لگیں تو پھر رونا کس بات کا ہے......؟ ہم تو کھونٹے سے بندھی بھیڑ بکریوں کے انوسار ہوتے ہیں، ماتا پتا اپنا ادھیکار پورا کرتے ہیں تو ہم بے زبان جانوروں کی طرح ان کی مرضی پر ہانک دیے جاتے ہیں۔"

"لیکن راجو والی بات من کو نہیں جچتی۔"

"تو یہ کیوں بھول رہی ہے کہ بنسی کاکا نے مرتے سمے جیون چاچا کو وچن دیا تھا کہ وہ اس کی چتا جلنے کے بعد اس کے گھر والوں کا پورا پورا دھیان رکھے گا۔ راجو کی ماتا جی کے مرنے کا روگ لگائے کھٹیا سے لگی اپنے نمبر کا انتظار کر رہی ہے۔ راجو کے لیے اس نے ہی بنسی کاکا کو بیچ میں ڈالا ہوگا۔"

"بندیا......" جمنا نے بندیا کو گھورتے ہوئے اسے کھوجنے کی کوشش کی۔ "کیا اب تو مجھے بھی باتوں میں الجھانے کی کوشش کرے گی؟"

"یہ دھیان تیرے من میں کیسے آیا؟"

"جو بات تو کہہ رہی ہے تجھے بنسی کاکا نے تو نہیں بتائی......؟ سچ بتا، تیرے کان میں اس کی بھنک کیسے پڑی؟" اپنا جملہ پورا کرتے کرتے جمنا نے بندیا کے بھرے بھرے کولہے پر اس زور کی چٹکی بھری کہ بندیا تلملا کر رہ گئی۔

"دیکھ جمنا، میں تجھ سے پہلے بھی کئی بار......"

"سچ اگل دے ورنہ۔" بندیا کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی جمنا نے اس کے دوسرے کولہے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو بندیا نے جلدی سے ہتھیار ڈال دیے۔ کسمسا مدھم سروں میں بولی۔

"وہ...... وہ...... دراصل مجھے جیوتی نے بتایا تھا۔"

"اب سمجھی۔" جمنا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ماں طرح اب جیوتی نے بھی دوسروں کا پیٹ کھنگالنا شروع کیا ہے۔"

"تجھے میری سوگند جمنا......" بندیا نے ہاتھ باندھ لیے۔ "تو یہ بات کسی اور سے نہ کہنا۔"

پھر جمنا کوئی جواب دیتی، اس سے پہلے ہی کانتا دور سے آتی نظر آگئی۔ جمنا نے کانتا کو لہراتے، بل کھاتے چلتے دیکھا تو دبی زبان میں بندیا سے کہا۔ "کانتا رمیش سے من لگا کر آگ سے کھیل رہی ہے۔ تو بھی جانتی ہے کہ رمیش دیکھنے میں جتنا بھکاری نظر آتا ہے، اندر سے اتنا ہی راکشس بھی ہے، کئی دس نمبری پٹھو پال رکھے ہیں اس نے، اگر اس کی دال نہ گلی تو وہ راجو کی بیل بھی منڈھے نہیں چڑھنے دے گا۔ ناری کی عزت بھی کسی چم چم گاڑی کے انوسار ہوتی ہے۔ ایک واری غلط ہاتھوں چڑھ جائے تو پھر وہ پہلے ہی رگڑے میں اس کے سارے رنگ پسٹن ناکارہ کر دیتا ہے پھر...... وہ سارا جیون کسی کھٹارا گاڑی کی طرح دھواں دیتی رہتی ہے۔"

بندیا نے جمنا کی بات سن کر اسے حیرت سے گھورا لیکن کانتا کے قریب آنے کی وجہ سے اس کے دل میں رنگ پسٹن والی بات کا کھوج لگانے کا ارمان پورا نہ ہو سکا۔

"کہاں تھی میری رانی......؟" بندیا نے کانتا سے پوچھا۔ "کل بھی تیرے درشن نہیں ہوئے۔"

"کل بابو باڑے کی صفائی کر رہا تھا، میں بھی اس کا ہاتھ بٹانے میں لگی رہی۔"

"سنا ہے ادھر بنسی کاکا تیرے گھر کے کئی چکر لگا چکا ہے؟" جمنا نے ذرا رک کر پوچھا تو کانتا نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"پتا جی کا لنگوٹیا ہے اس لیے آتا جاتا رہتا ہے۔ تجھے اس سمے بنسی کاکا، کا دھیان کیسے آگیا؟"

"چل چھوڑ...... تو نہیں بتانا چاہتی تو جانے دے۔" جمنا نے ہونٹوں پر مسکان سجا کر چباتے ہوئے کہا۔ "آج جو ہانڈی میں ہے وہ کل ڈوئی میں بھی آجائے گا۔"

"کیا مطلب......؟" کانتا چونکی۔ "یہ تو نے ہانڈی اور ڈوئی والی بات کیوں کی؟"

"میں تیری پرانی سکھی ہوں میری جان اس لیے تجھے ٹٹول رہی تھی۔"

"پر ٹٹولنے کا کوئی کارن بھی تو ہوگا۔" کانتا اور سنجیدہ ہوئی تو جمنا نے بے پروائی سے کاندھے اچکا کر کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ پھر کسی دشمن نے بے پر کی اڑا دی ہو۔"

"لیکن کچھ پتا تو چلے کہ آخر بات کیا ہے؟"

کچھ کچھ

ایک پاکستانی، ایک روسی اور ایک امریکی اکٹھے سفر کر رہے تھے۔ تینوں ایک دوسرے کو اپنے اپنے ملک کی باتیں بتا رہے تھے۔ روسی بولا۔ "میرے ملک میں ہوائی جہاز آسمان سے لگ کر چلتے ہیں۔"

امریکی اور پاکستانی حیران ہوئے اور بولے "کیا بالکل آسمان سے لگ کر اڑتے ہیں؟"

روسی نے جواب دیا۔ "بھئی بالکل تو نہیں، البتہ آسمان سے تھوڑا سا نیچے۔"

امریکی فوراً بولا۔ "میرے ملک میں بحری جہاز سمندر کی تہ سے لگ کر چلتے ہیں۔"

یہ سن کر روسی اور پاکستانی دونوں بولے۔ "کیا بالکل سمندر کی تہ سے لگ کر چلتے ہیں؟"

"نہیں، تہ سے کچھ اوپر چلتے ہیں۔"

پاکستانی دونوں کی باتیں سن کر تپ گیا اور بولا۔ "بھئی تم دونوں نے کوئی ایسی خاص بات نہیں بتائی، میں تمہیں اپنے ملک کی ایک خاص بات بتاتا ہوں، میرے ملک میں لوگ ہاگ ناک سے کھانا کھاتے ہیں۔"

یہ سن کر امریکی اور روسی کو بڑی حیرت ہوئی اور دونوں نے یکدم کہا۔ "بھئی کمال ہے! کیا تمہارے لوگ بالکل ناک سے کھانا کھاتے ہیں؟"

پاکستانی نے جواب دیا۔ "ناک سے نہیں، ناک کچھ نیچے سے۔"

☆☆☆

ایک میاں بیوی میں اتنی ناچاقی بڑھی کہ طلاق کی نوبت آگئی۔ طلاق ملنے کے بعد عورت کی سہیلی نے پوچھا۔ "تمہارے دونوں لڑکوں کا کیا فیصلہ ہوا؟"

عورت نے جواب دیا۔ "ایک میرے پاس ہے اور ایک میرے شوہر کے پاس۔"

سہیلی نے دوسرا سوال کیا۔ "اور بینک بیلنس کا کیا ہوا؟"

عورت نے ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔ "آدھا میرے شوہر کے وکیل کے پاس اور آدھا میرے وکیل کے پاس۔"

مرسلہ: فاطمہ بنت نجم، میلسی

"میں بتاتی ہوں۔" بندیا نے ہاتھ تھام کر کانتا کو قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔ "سنا ہے کہ جنسی کاکا اور تیرے بابا کے بیچ، تیری اور راجو کی کھچڑی پک رہی ہے۔"

"دماغ چل گیا اس پاگل کا جس نے یہ خبر اڑائی ہے۔" کانتا چمک اٹھی۔ "میں اور اس کباڑیے کو منہ لگاؤں گی، کیا گاؤں کے باقی سارے جوان مر گئے ہیں؟"

"ناراض مت ہو رانی۔" جمنا نے اس کے قریب کھسک کر کہا۔ "ہوسکتا ہے کہ کسی نے جھوٹ گھڑ لیا ہو۔ ہم نے تو تیرے بھلے کے لیے ایک سنی سنائی بات تیرے کان میں ڈال دی۔"

"راجو کباڑیے کے ساتھ میری لگن کی بات ہو...... سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" کانتا نے سینہ تان کر اپنا فیصلہ سنا دیا۔ "مر جاؤں گی، پر اس کے ساتھ کبھی اگنی کے پھیرے نہیں لگاؤں گی۔"

"یہ مرنے مرانے کی بات رہنے دو میری رانی۔ ہم آنگن کی چڑیا ہوتے ہیں، کیول سپنے دیکھ سکتے ہیں، پر ہوتا وہی ہے جو ماتا پتا طے کر دیتے ہیں۔ سدا سے یہی ریت چلی آ رہی ہے۔"

دو تین سکھیاں اور قریب آنے لگیں تو بات ادھوری رہ گئی، کانتا بھی دل کی بھڑاس نہ نکال سکی لیکن اس کے تیور بتا رہے تھے جیسے راجو والی بات نے کسی زہریلے بچھو کی طرح اس کے شریر پر ڈنک مار دیا ہو۔

●●●●●

رگھو باڑا اٹھا کر چراغ جلنے کے بعد گھر پہنچا تو بیوی سامنے ہی تخت پر بیٹھی اس کی راہ تک رہی تھی۔ "آج بڑی دیر کر دی۔" اس نے پتی سے پوچھا۔

"تیرے پاس گھر میں نہ کوئی گھڑی ہے نہ گھنٹا پھر...... تجھے دیر سویر کی خبر کیسے ہو جاتی ہے؟" رگھو نے پتنی کو غور سے دیکھا جو عمر ڈھلنے کے باوجود اب بھی گاؤں کی ہم عمر عورتوں سے زیادہ سندر دکھائی دیتی تھی۔

"تجھے آج اس بات کا دھیان کیسے آ گیا؟" اس نے پتی کو شکایت بھری نظروں سے دیکھا۔ "میں تو ہمیشہ تیری راہ تکتی رہتی ہوں۔ جب تک تو نہ آ جائے مجھے چین نہیں آتا۔"

"سچ کہہ رہی ہے؟" رگھو کا لہجہ معنی خیز ہو گیا تو وہ نظریں مٹکا کر بولی۔

"چل...... بھوجن کر لے۔ اس عمر میں اب یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔"

"عمر کی بھی بھلی کہی تو نے۔" رگھو نے لپک کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ سرسراتے لہجے میں بولا۔ "میرے لیے تو تو اب بھی وہی ہے جو پہلی رات کو تھی۔ ایک بات اور بتا دوں۔ مرد اور گھوڑے کبھی بوڑھے نہیں ہوتے، چارہ ملتا رہے تو ہمیشہ جوان ہی رہتے ہیں۔"

"کیا بات ہے...... آج تو نے کہیں سرسوں کا کھیت تو نہیں دیکھ لیا؟"

"تیرے بغیر سرسوں کا کھیت بھی سونا ہی سونا لگے گا...... چل، اندر چل کر باتیں کرتے ہیں۔" اس نے پتنی کو لاڈ سے کمرے کی طرف چلنے کو کہا تو وہ شرما کر بولی۔

"پہلے چل کر بھوجن کر لے...... خالی پیٹ تو ڈانگر بھی دولتی نہیں جھاڑتے۔"

"چھوڑ بھوجن کو۔" رگھو نے پتنی کا جواب سنا تو موج میں آ کر بولا۔ "آج تجھے اس بات کا وشواس پھر دلا دوں کہ میں......"

"دماغ تو نہیں چل گیا تیرا۔" پتنی نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے شرما کر کہا۔ "گھر میں جوان چھوری بیٹھی ہے اور تو اپنا موج میلا کرنے کی راگنی الاپنے کی سوچ رہا ہے۔"

"اچھا... چل، اندر تو چل...... تجھ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔"

دونوں اندر آ گئے تو رگھو نے بستر پر کمر سیدھی کرتے ہوئے پوچھا۔

"اپنی کانتا کہاں ہے...؟"

"اپنے کمرے میں...... کیوں؟ تجھے اس سے کانتا کیسے یاد آ گئی؟" وہ رگھو کے ساتھ ہی سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"آج اپنا یار جنسی آیا تھا۔ میں نے باڑے میں بھوجن بھی اسی کے ساتھ کر لیا ہے۔"

"کوئی خاص بات؟"

"ہاں...... وہ اپنی کانتا کے لیے ایک رشتے کی بات کر رہا تھا۔"

"کون ہے......؟" وہ رگھو کے قریب ہو گئی۔

"نام جاننے سے پہلے ایک بات دھیان سے سن لے۔" رگھو نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔ "جنسی نے جس کی بات ڈالی ہے وہ مجھے بھی پسند ہے۔ اچھا کماتا کھاتا ہے۔ گاؤں کے دوسرے لڑکوں کے مقابلے میں نیک اور سیدھا سادا بھی ہے۔ شکل صورت کا بھی دسیوں سے بہتر ہے۔"

"نام بھی تو بتا...... یا کیول گن ہی گنواتا رہے گا۔"

"میں جیون لال کے پتر ارجن کی بات کر رہا ہوں۔"

"اوہ...... راجو کباڑیا......" اس نے شوہر کو حیرت سے گھورا۔

"کیوں؟...... تو راجو کا نام سن کر کس وچار میں گم ہو گئی؟" رگھو نے پتنی کے چہرے کے بھید بھاؤ کو گہری نظروں سے ٹٹولا۔

"لڑکا برا نہیں ہے پر تو... گاؤں کے سارے لوگ اسے کباڑیا ہی کہہ کر آواز دیتے ہیں۔ یہ بات کانوں کو بھلی نہیں لگتی۔"

"مجھے بھی بہت سارے سنگی ساتھی رگھو گوالا کہتے ہیں... میں نے تو کبھی برا نہیں منایا۔ گوالا ہونا کوئی گالی بھی نہیں ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن......"

"یہ لیکن ویکن چھوڑ بھاگوان...... یہ بتا کہ راجو تجھے کیسا لگتا ہے......؟ یہ بھی سوچ لے کہ بات میرے یار جنسی نے ڈالی ہے۔" رگھو نے الفاظ چبا چبا کر کہا۔ "راجو کے سر پر کسی بڑے کا ہاتھ بھی نہیں ہے، رگھو کی پتنی بھی کھٹیا سے لگی ہے، گھر یا کنبے میں کوئی بڑا بھی ایسا نہیں ہے جو روک ٹوک کرے۔ اپنی کانتا وہاں جا کر مہارانیوں کی طرح راج کرے گی۔"

رگھو کی پتنی نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا، کسی وچار میں گم ہو گئی۔ رگھو کی نظریں اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو تک رہی تھیں۔ کچھ دیر تک وہ پہلو بدلتی رہی پھر مدھم لہجے میں بولی۔

"میں کانتا سے بھی بات چھیڑ کر دیکھتی ہوں۔ اس کے من کا بھید لینا بھی ضروری ہے۔"

"اور اگر اس نے منڈیا ہلا کر ایک بار...... نا، کر دیا تو......؟" رگھو کے ماتھے پر بل پڑنے لگے۔

"پھر تو ہمیں کوئی بیچ کا راستہ نکالنا ہوگا۔"

"تو کھل کر بات کر۔" رگھو نے ذرا سنجیدگی سے پوچھا۔ "کیا کانتا کسی اور کو پسند کرتی ہے؟"

"اس نے اپنے من کا بھید کبھی میرے سامنے نہیں کھولا لیکن جوان لڑکی ہے۔ اس کی مرضی معلوم کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔"

رگھو نے ایک بار پھر پتنی کو اپنی تجربے کار نظروں سے دیکھا۔ اس نے دنیا دیکھ رکھی تھی، دن بھر بھانت بھانت کے الٹے سیدھے گاہکوں کو نمٹاتا رہتا تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ لڑکیاں باپ کے بجائے ماں کے زیادہ قریب ہوتی ہیں، ان کے جیون میں آنے والی ہر چھوٹی بات کی بھنک سب سے پہلے ماں کے کانوں تک پہنچتی ہے۔ اس سے بھی رگھو کچھ دیر اپنے من میں سوچ وچار کرتا رہا پھر دبی زبان میں بولا۔

"تو ماں ہے اس کی...... کچھ نہ کچھ تو اندازہ ہوگا تجھے؟"

"میں پورے وشواس سے نہیں کہہ سکتی لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ بالی عمر میں لڑکیاں سپنے بھی دیکھتی رہتی ہیں۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ ہر سپنا پورا نہیں ہوتا۔ بھوش میں جو لکھا ہو، وہی پورا ہوتا ہے۔" رگھو کی پتنی نے کسمسا کر کہا۔ "سچ کیا ہے یہ بھگوان ہی جانتا ہے لیکن ایک بار مجھے شبہ ہوا تھا کہ اپنی کانتا کا جھکاؤ کچھ کچھ رمیش کی طرف ہے۔"

رمیش کا نام پتنی کی زبان پر آیا تو جیسے رگھو کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پتنی کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

"دوبارہ اس کتے کا نام تیری زبان سے کبھی نہ نکلے۔ تو نہیں جانتی پر میں جانتا ہوں۔" رگھو منہ سے جھاگ اڑاتا رہا۔ "پچھلے دنوں میرے باڑے سے جو گائے چوری ہوئی تھی اس میں بھی اسی نیچ ذات اور اس کے لفنگے گرگوں کا ہاتھ تھا، مجھے کھوجیوں نے یہی خبر دی ہے۔ جس دن بھید کھل گیا اسی دن ہمارے باڑے میں چاکری کرنے والے سارے ہٹے کٹے سانڈ اصل چور اور اس کے سارے کنبے کی عورتوں کو گابھن کرنے میں دیر بھی نہیں کریں گے۔ ملی بھگت کرنے والوں کا بھی رام رام ست ہو جائے گا اور......" رگھو نے بل کھا کر کہا۔ "کانتا کو بھی یہ بتا دینا کہ میں جنم جنم کا گوالا ہوں، پرکھوں سے یہی کام ہوتا چلا آیا ہے۔ میں بڑی بڑی اڑیل گائے اور بھینسوں کو بھی قابو کرنا جانتا ہوں، اپنی کانتا تو ابھی بچھیا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے بھگوان نہ کرے، اس کی چتا کو آگ تو دکھا سکتا ہوں لیکن کسی...... کے ساتھ لگن منڈپ کی پوتر اگنی کے پھیرے لگانے کی اجازت کبھی نہیں دے سکتا۔"

"ایسی بری باتیں زبان سے کیوں نکال رہا ہے؟" رگھو کی پتنی نے اس کا متھا گرم ہوتے دیکھا تو بات کو سنبھالنے کے کارن بولی۔ "مجھے کیول ایک شبہ تھا جو زبان سے نکال دیا۔ سچ کیا ہے؟ اس کا پتا تو کانتا کو ٹٹولنے کے بعد ہی چلے گا۔"

"ٹٹولنے اور کھوجنے کی بات اب ذکر نا۔" رگھو نے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا۔ "میں نے جنسی سے ابھی پکی بات نہیں کی تھی، مذاق میں اتنا ضرور کہا تھا کہ لگن کی تاریخ کرنے سے ایک امرتسری بھینس راجو کو دینی پڑے گی لیکن اب تو نے ایک کنجر کا نام لیا ہے تو پھر میں جنسی کو کل ہی بلا کر راجو کے لیے زبان بھی دے دوں گا۔"

"جو تیرا من چاہے کر لیکن میرے اوپر گرمی کیوں کھا رہا ہے۔" چتی نے رگھو کی دکھتی رگ چھیڑنے کے کارن اٹھلاتے ہوئے کہا۔ "آج بہت دنوں بعد تیری واپسی کی راہ تک رہی تھی اور تو نے سارے کا سارا مزہ کرکرا کر دیا۔"

رگھو نے چتی کا جواب سنا تو ایک دم ہی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ لگاوٹ بھری آواز میں کہا۔ "تو نے نام ہی ایسا لے لیا تھا کہ میری کھوپڑی الٹ گئی۔ ورنہ سچ پوچھ تو باڑے سے چلتے ہوئے میرا من بھی آج جھنگ گھونٹنے کو کر رہا تھا۔"

"بس جانے دے..... منہ دیکھے کی باتیں کر رہا ہے۔" وہ رگھو کو جواب دے کر اٹھلاتی بل کھاتی بستر پر پھیل کر لیٹ گئی۔

دن بھر گاہکوں کو نمٹاتے نمٹاتے اس روز راجو کچھ زیادہ ہی تھک گیا تھا۔ رات کے آٹھ بجے تو اس نے گیس بتی کو دکان کے دروازے کی اوپری چوکھٹ سے لگے ہک سے اتار کر ایک طرف رکھا پھر دکان بڑھانے میں مصروف ہو گیا۔ آج اس کی بکری بھی اچھی خاصی ہوئی تھی۔ دکان کا سامان سمیٹ کر اس نے گیس بتی بجھا کر اندر رکھی، دروازہ بند کر کے اسے تالا لگایا پھر جانے کے لیے قدم تول رہا تھا کہ گھنشیام اس کے راستے میں آ گیا۔

گھنشیام کو دیکھ کر راجو کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ رمیش کا لنگوٹیا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد وہ بھی رمیش کی طرح کٹی پتنگ کے مانند آوارہ لڑکوں کے ساتھ دن بھر ادھر ادھر نظریں سینکتا پھرتا تھا۔ ماں اسپتال میں کام کرتی تھی اس لیے اسے ملازمت کی ضرورت بھی نہیں تھی، دن بھر آوارہ گردی کرتا، رات کو گھر جاتا تو ماں کی گالیوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑاتے ہوئے پیٹ کا تنور بے شرم بن کر بھرتا پھر آنگن میں پڑی کھاٹ پر پاؤں پسار کر سو جاتا۔ رمیش کا دست راست ہونے کی وجہ سے اس نے بھی گاؤں کے سیدھے سادے لوگوں پر دھاک رکھی تھی، کنواری کنیائیں تو اسے دور سے ہی دیکھ کر راستہ بدل دیتی تھیں۔ اس نے بھی لڑکیوں کے ساتھ زبردستی چھیڑ چھاڑ بھی نہیں کی تھی لیکن جس دن سے جیوتی اور اس کے بارے میں کانا پھوسی شروع ہوئی تھی سب ہی نے اس سے کنی کترانا شروع کر دیا تھا۔ جیوتی نے خود کو ستی ساوتری ثابت کرنے کے کارن ہی کتھا سنائی تھی کہ کھیت پر وہ سانجھ ڈھلے فارغ ہونے گئی تھی کہ گھنشیام جانے کہاں سے آ گیا۔ جیوتی نے اس کی ہٹ دھرمی سے بچنے کی خاطر شور مچانے کی دھمکی دی تو گھنشیام نے جھاڑن نما ایک کورا کپڑا اس کے منہ پر رکھ دیا جس میں نہ جانے کون سی تیز خوشبو تھی جو اس کی ناک سے دماغ تک پہنچی تو جیوتی کو کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔ جب ہوش آیا تو گھنشیام اس کے سامنے بیٹھا مسکرا رہا تھا، جیوتی بپھر کر جانے کے لیے اٹھی تو اسے اپنی بے لباسی کا احساس ہوا۔ وہ سمٹ سمٹا کر دوبارہ بیٹھ گئی۔ گھنشیام اس کے شریر کو تکتا رہا پھر اس کا لباس اس کی طرف اچھال کر بڑی ڈھٹائی سے بولا۔

"لے..... پہن لے اسے، پر اپنی زبان بند ہی رکھنا ورنہ میں بھی تجھے کسی کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑوں گا۔"

جیوتی کی اس کہانی پر اس کی سکھیوں کو وشواس نہیں آیا تھا اس لیے کہ اس کہانی سے پہلے وہ گھنشیام کو دیکھ کر جانے کیوں لمبی سانس بھرتی تھی..... اب بھی وہ گھنشیام کو دور سے آتا دیکھ کر اس طرح لجا کر نظریں جھکا لیتی جیسے وہ کوئی لٹیرا نہیں بلکہ اس کا نیا نیا گھر والا ہو۔ اس کے بعد بھی اکثر لڑکیوں کے بیچ جیوتی اور گھنشیام کے چھپ چھپ کر ملنے کی کہانیاں سنائی دینے لگیں۔ ایک دو بار گھنشیام کے ساتھ رمیش بھی موچھوں پر تاؤ دیتا نظر آیا۔ اس کے بعد سے لڑکیوں نے جیوتی سے کترانا شروع کر دیا تھا، سب جانتی تھیں کہ رمیش اچھے چال چلن والا نہیں ہے پھر یہ بھی مشہور ہو گیا کہ وہ اور گھنشیام نہ صرف لنگوٹیا ہیں بلکہ مل بانٹ کر کھانے کے عادی ہیں۔

بہرحال راجو نے گھنشیام کو سامنے کھڑا دیکھا تو بڑی رکھائی سے بولا۔ "میں دکان بڑھا چکا ہوں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو اب کل آنا۔"

"ہم ضرورت کی چیزوں کو مول بھاؤ کر کے خریدنے کے عادی نہیں ہیں۔" گھنشیام کے مقابلے میں راجو زیادہ ہاتھ پاؤں کا بھاری بھر کم تھا اس لیے گھنشیام نے ذرا ناپ تول کر کہا۔ "جو چیز پسند آتی ہے اسے دوسرے طریقوں سے بھی حاصل کر لیتے ہیں۔"

"کھل کر بات کر....." راجو نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھ کر کھرا انداز اختیار کیا۔ "تو جانتا ہے کہ میں کھرا کام کرنے کا عادی ہوں، زیادہ لوگوں سے گھلنا ملنا بھی پسند نہیں کرتا۔"

"لال پیلا کیوں ہو رہا ہے میری جان۔" گھنشیام نے راجو کے تیور دیکھ کر کینچلی بدلی۔ "میں تو تجھے بدھائی دینے کے کارن آیا تھا اور یہ بھی جانتا ہوں کہ کیول نندو کے ساتھ ہی تیری گاڑھی چھنتی ہے۔"

"بدھائی کس بات کی دے رہا ہے؟" راجو نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا۔

"گھر جائے گا تو تیرے من میں بھی لڈو پھوٹنے لگیں گے۔" گھنشیام نے ہونٹ چباتے ہوئے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ "رگھو مہاراج نے آج بنسی کاکا کو باڑے بلا کر تیری اور کانتا کی بات پکی کر دی ہے۔"

راجو اپنی سگائی کی بات طے ہونے کی خبر سن کر خوش تو ہوا لیکن اس نے بھانپ لیا تھا کہ گھنشیام کیا کہنا چاہتا ہے، اس لیے ذرا چبھتے انداز میں پوچھا۔ "کیا بدھائی والی بات تو اجلے من سے کہہ رہا ہے؟"

"کیوں.....؟ تجھے کس بات میں کھوٹ نظر آ رہی ہے؟"

"بات کھوٹ کی نہیں ہے گھنشیام۔" راجو نے کھل کر کہا۔ "تو بھی جانتا ہے کہ میں کباڑیا ہوں، ٹیڑھی میڑھی چیزوں کو سیدھا کرنے کا سارا داؤ پیچ آتا ہے مجھے....."

"آج نندو نے دکان جلدی بند کر دی شاید۔" گھنشیام نے ذرا گھما پھرا کر اپنا مقصد بیان کیا۔ "اس غریب کے ساتھ جو ہوا وہ بھی اچھا نہیں ہوا۔ اس کا اور جیوتی کا گھر بس جاتا تو....."

"جلیبی کی طرح گھما پھرا کر باتیں مت کر....." راجو کی آنکھوں میں خون اترنے لگا۔ "میں تیرے اس سمے آنے کا کارن سمجھ رہا ہوں لیکن ایک بات میری بھی گانٹھ سے باندھ لے۔ میں نندو نہیں، راجو کباڑیا ہوں۔ بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے بجائے میں اپنے دشمن کے خون سے اشنان کرنا زیادہ پسند کروں گا۔ یہی بات تو واپس جا کر اپنے ہوتے سوتوں کے کان میں بھی ڈال دینا۔ اب چل ہٹ راستے سے..... بڑا آیا بدھائی دینے والا۔"

راجو سینہ تان کر اسے گھورتا ہوا چلا گیا تو گھنشیام سیدھا رمیش کے پاس گیا جو آبادی سے دور ایک اجڑے مکان کے اندر بیٹھا اپنے گرگوں کے ساتھ تاڑی پینے میں مگن تھا۔

"تو کدھر چلا گیا تھا؟" ایک ساتھی نے پوچھا۔ "میں تجھے سارے میں کھوجنے کے بعد آیا ہوں۔"

"میں اپنے یار کے ایک ضروری کام سے گیا تھا۔" گھنشیام نے رمیش کے برابر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیا رہا؟"..... رمیش نے تاڑی کے ایک لمبے گھونٹ کے بعد بھری ہوئی سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے داری سے گھنشیام کی طرف دیکھا۔ "دے آیا تو اس..... کے یار کو سگائی کی سندیس۔"

"وہ پرانا کباڑیا ہے استاد..... بدھائی والی بات سنتے ہی وہ بات کی تہ تک اتر گیا۔ ایک دم اس طرح بھونکنے لگا جیسے کسی نے کتے کی دم پر سوتے میں پاؤں رکھ دیے ہوں۔"

"کیا کہہ رہا تھا.....؟" رمیش نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ جواب میں گھنشیام نے مرچ مسالا لگا کر راجو کی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا تو رمیش گلاس کی بچی کھچی تاڑی ایک ہی سانس میں ڈکار گیا۔ کسی زخمی ناگ کے مانند بل کھا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ خلا میں گھورتے ہوئے بڑے زہریلے لہجے میں بولا۔

"جیوتی اور نندو کی سگائی کی رام کہانی تو شہنائی گونجنے سے پہلے ہی ختم ہو گئی تھی پر..... کانتا اور راجو کباڑیے کی لگن منڈپ اوش سجے گی۔ پورا گئی کے چکر بھی کاٹے جائیں گے اور سہاگ رات کا ملن بھی ہو گا۔"

"تم..... یہ تم کیا کہہ رہے ہو استاد۔" گھنشیام نے بڑے اچنبھے سے کہا۔ "زیادہ تو نہیں چڑھ گئی؟"

"ہاں جانی..... تیری اور اس کباڑیے کی بات سن کر کچھ ایسا ہی لگا۔" رمیش نے چٹخارا لیتے ہوئے کہا۔

"گھنشیام تمہاری کانتا اور راجو کباڑیے کی سگائی کی بات کر رہا ہے استاد۔" ایک ساتھی نے رمیش کو دوبارہ یاد دلانے کی کوشش کی تو اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے آنکھ جھپکا کر سرسراتی آواز میں کہا۔

"ہاں پیارے..... میں اسی کانتا رانی کی بات کر رہا ہوں جس سے میں نے جیون میں پہلی بار پریم کیا تھا۔ وہ ہرنی بھی میرے ساتھ میل کرنے کے سپنے دیکھ رہی تھی پرنتو رگھو بھاڑو ہمیں ہمیشہ میلی نظروں سے دیکھتا رہا ہے، وہ پرانا گدھ بنسی کاکا بھی میرے اور کانتا کے بیچ دیوار بن گیا تو..... پھر مجبوری کے نام شکرے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟"

"یہ تم دل پھٹنے کی بات کیوں کر رہے ہو رمیش بھائی۔" ایک اور ساتھی نے رمیش کو بانس پر چڑھانے کے کارن کہا۔ "کانتا تمہارے سوا ہمارے ہوتے کسی اور کی ہو جائے..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"تم بس ایک اشارہ کر دو استاد۔" گھنشیام نے دوسرے ساتھی کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "ہم اس ڈالی ہی کو جڑ سے کاٹ دیں گے جس پر رگھو اپنی مینا پھدکانے کے سپنے دیکھ رہا ہے۔ پھر نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسریا۔"

"تو کس بات کی چنتا کر رہا ہے؟" رمیش نے سینہ ٹھونک کر کہا۔ "جیوتی والی رام کہانی ایک بار پھر دہرائی جائے گی۔ سارے جیون کا روگ کون پالے، میں نے کانتا سے کہا

تھا کہ میرے ساتھ بھاگ چلے پر وہ بھی اپنے پتا کی پگ نیچے کرنے کو تیار نہیں ہوئی سالی۔ میں نے بھی تیری طرح سارا سین پاٹ اپنی کھوپڑی میں تیار کرلیا ہے۔ منگل سوتر تو کانتا کے گلے میں راجو کباڑیا ہی ڈالے گا پر نتھ اس کی نتھ پہلے میں اتار دوں گا۔ اس کے بعد وہ بھی بھاڑے کی سائیکل کی طرح چلتی رہے گی۔ سب مل بانٹ کر کھاتے رہیں گے۔ تیری جیوتی کا کچھ بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا۔"

"یہ ہوئی نا بات۔" گھنشیام نے مسکرا کر کہا۔ "اس...... راجو کباڑیا کی نظریں بھی جھکی رہیں گی جو آج چھاتی ٹھونک کر مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔"

"اس کی چنتا بھی مت کر۔" رمیش بل کھا کر بولا۔ "کانتا کی نظریں نیچی ہو لینے دے پھر راجو کی مردانگی بھی دوسرے راستے سے نکال دیں گے۔ ساری ہیکڑی بھول جائے گا حرام کا جنا۔"

رمیش کے دو ایک ساتھی بھی کانتا کی اٹھتی جوانی دیکھ کر ہاتھ مل رہے تھے۔ رمیش کے چیلے تھے اس لیے انہوں نے بھی کانتا پر ہاتھ ڈالنے کی بھول بھی نہیں کی...... اب رمیش کا فیصلہ سن کر ان کے من میں بھی لڈو پھوٹنے لگے تھے۔

تندو اس روز دکان بند کر کے جانے کے لیے پر تول رہا تھا کہ راجو نے اسے روک کر پوچھا۔

"یہ آج تو نے اتنی جلدی دھندا کیوں بند کر دیا؟"

"ایک ضروری کام نمٹانا ہے۔"

"سچ کہہ رہا ہے؟" راجو نے اسے غور سے دیکھا تو تندو بھی ہنس دیا۔

"ایسی بات نہیں ہے یار...... میں سائیکل کا کاروبار کرتا ہوں اس لیے سلوشن بھی سوچ وچار کر کے خرچ کرتا ہوں۔ ٹیوب خالی ہو جائے تو جوڑ بھی فٹ نہیں بیٹھتا۔"

"اب بھی سنبھل جا تندو۔" راجو نے دوستانہ لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "جیوتی کے علاوہ گاؤں میں اور بھی بہت ساری لڑکیاں ہیں، کہیں دیکھ بھال کر اپنا گھر آباد کرلے۔ پرائی ہانڈیوں میں کب تک منہ مارتا پھرے گا۔"

"جب اوپر والے کو منظور ہوگا تو وہی چھپر پھاڑ کر کوئی رشتہ بھی بھیج دے گا۔" تندو نے بات ٹال کر پوچھا۔ "یہ بتا کہ تیری اور کانتا کی لگن کب ہو رہی ہے؟"

"جسی کا کا کل ماں سے کہہ رہے تھے کہ ایک دو دن میں وہ پنڈت جی سے مل کر مہورت نکلوا لیں گے۔"

"یہ پنڈت پجاری بھی بغیر دان پن کے جلدی کی مہورت نہیں نکالتے۔ ہاں، مٹھی گرم کر دو تو پھر یہ بگلا بھگت کوئی شبھ گھڑی بھی جلدی تلاش کر لیتے ہیں۔"

"چنتا مت کر۔" راجو نے مسکرا کر کہا۔ "جب رگھو نے ہاں کر دی ہے تو وہ اور جسی کا کا مل جل کر مہورت بھی نکلوا لیں گے۔"

دو چار بات کر کے تندو رام رام کر کے چلتا بنا لیکن اس کی جیب میں کاغذ کی وہ گولی اب بھی کھلبلی مچا رہی تھی جو ایک بچہ اس کی دکان پر پھینک گیا تھا۔ وہ جیوتی کا ایک سندیس تھا جس نے اسے اندھیرا پھیلتے ہی اپنے مکان کے پچھواڑے آنے کو لکھا تھا۔

یہ پہلا موقع تھا جب جیوتی نے اسے گھر کے آس پاس آنے کا اشارہ دیا تھا ورنہ ان کی ملاقاتیں آبادی سے دور ہی کسی ایسی جگہ ہوتی تھیں جہاں پکڑے جانے کا خطرہ نہ ہو...... جب سے تندو کو وہ گولی ملی تھی وہ اس پر بہت سوچ وچار کر چکا تھا۔ جیوتی کے بارے میں وہ اچھی طرح جان چکا تھا کہ گھنشیام کے زور زبردستی کرنے کے بعد اس کی ساری تن بدن بھی نکل گئی تھی۔ ماں نے دوا دارو کر کے آگے آنے والے خطرے بھی دور کر دیے تو وہ بھی ناگن بن کر سب کے شریر میں اپنا زہر اتارنے کی عادی ہو گئی۔ تندو یہ بھی جانتا تھا کہ گھنشیام کے بعد رمیش اور اس کے ایک دو سنگی ساتھی بھی بہتی ندی میں ڈبکی لگا چکے تھے خود تندو نے بھی اپنے ٹوٹے سپنوں کی ارتھی جیوتی کے شریر کی آگ سے ٹھنڈی کی تھی لیکن...... اسے یہ بھی کھٹکا تھا کہ جیوتی نے کہیں رمیش یا کسی اور کے اشارے پر تندو کو بڑی مچھلی کو قابو کرنے کے کارن چارا سمجھ کر نہ بلایا ہو؟ اس کے اور راجو کے درمیان جو یارانہ تھا وہ بھی سب جانتے تھے۔ کانتا کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد رمیش کے پیٹ میں مروڑ بھی ضرور ہوئی ہوگی۔ ہو سکتا ہے رمیش ہی نے جیوتی کو مجبور کر کے کوئی چال بننے کی کوشش کی ہو...... اور بھی بہت ساری بھول بھلیاں تندو کے اندر کھلبلی کر رہی تھیں۔ ایک بار اس نے سوچا بھی کہ جیوتی کی گولی کو گولی مار کر سیدھا گھر چلا جائے لیکن اس کے تن کی آگ بھی اسے قدم اٹھانے پر مجبور کرتی رہی۔

راستے میں رک کر اس نے ایک سرائے نما ہوٹل سے گرما گرم کڑک چائے کی ایک پیالی حلق کے نیچے اتاری پھر جیوتی کے مکان کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ جیوتی کے مکان کے پچھواڑے سوائے ایک پرانے مندر کے کوئی اور مکان نہیں تھا اس لیے وہ اسی مندر کی اوٹ میں جا کر رک گیا۔ کسی خطرے کو بھانپنے کے کارن بار بار دائیں بائیں بھی دیکھتا

اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جیوتی اس کے پہنچنے کے سات آٹھ منٹ بعد پچھلے دروازے سے نکل کر اس کے پاس آ گئی۔

"کسی نے تجھے ادھر آتے تو نہیں دیکھا؟" اس نے اس سے پہلا سوال کیا۔

"نہیں...... پر تو نے آج مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟" تندو نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ "اگر تیری ماں کو بھنک مل گئی تو......"

"اس کی چنتا مت کر۔" جیوتی نے سرسراتی آواز میں جواب دیا۔ "ماں ہری رام کی نئی لگائی کے گھر بچہ جنوانے کے کام سے گئی ہے، صبح سے پہلے واپس نہیں آئے گی۔"

"اوہ......" تندو نے اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج میدان صاف ہے۔"

"ہاں...... لیکن میں نے تجھے ایک اور کام سے بلایا ہے۔" جیوتی اس کا ہاتھ تھام کر مندر کی کچی پکی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ "مجھے یہ پتا ہے کہ کانتا تیرے متر کے ساتھ پورا اگنی کا پھیرا لگانے کو تیار نہیں ہے۔"

"پھر......؟" تندو نے اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھا۔ "میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"میری بات سمجھنے کی کوشش کر بدھو...... کانتا پتا کے سامنے زبان نہیں کھول سکتی۔ وہ جس کے سپنے دیکھ رہی ہے رگھو کا کا مر جائے گا لیکن اس کے ساتھ کانتا کا رشتہ کبھی نہیں کرے گا۔" جیوتی ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھ کر تندو کا ہاتھ دباتے ہوئے بولی۔ "رمیش نے کانتا کو ساتھ بھگانے کی پٹی بھی پڑھائی تھی لیکن اس نے کھرا جواب دے دیا۔ اب میں نے سنا ہے کہ رمیش کوئی دوسرا منتر پھونکنے کی تیاری کر رہا ہے۔"

"دوسرے منتر سے تیری کیا مراد ہے؟" تندو سنبھل کر بیٹھ گیا۔ "جب کانتا پتا کے آگے مجبور ہے اور یار کے ساتھ منتر ہونے کو بھی تیار نہیں ہے تو پھر رمیش کیا کر سکتا ہے؟"

"پہلے وچن دے کہ تو میرا نام کہیں بیچ میں نہیں لائے گا۔"

"ٹھیک ہے...... تیرا نام میری زبان پر نہیں آئے گا۔" تندو نے وچن دیا تو جیوتی نے بڑے دور کی بات کہی۔ "بھری ہوئی سگریٹ کو ایک بار ماچس کی جلتی تیلی دکھا دے تو پھر سب کو سٹا لگانے کا ادھیکار مل جاتا ہے۔"

"تو......" تندو نے اسے گہری نظروں سے گھورا۔ "یہ کانے والی بات زبان پر کیوں لا رہی ہے؟"

"اس لیے کہ میں بھی تیری نظروں کے سامنے بیٹھی ہوں۔" جیوتی نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔

"تیری بات اور ہے۔" تندو بات کی گہرائی بھانپ کر آہستہ سے بولا۔ "تیرا جھکاؤ زیادہ نہ سہی...... لیکن تھوڑا تھوڑا گھنشام کی طرف بھی تھا اس لیے تو ان...... کے جال میں پھنس گئی۔"

"پھر تو بھی تو دوسروں کی طرح پریمیوں کا چولا اتار کر میرے ساتھ نوچ کھسوٹ کرنے لگا۔" جیوتی نے بل کھا کر سچ بات کہی تو تندو کی موٹی عقل میں ساری بات آ گئی۔ اس نے جیوتی کو رام کرنے کے کارن اسے پیار سے بانہوں میں لے کر کہا۔

"تو سچ کہہ رہی ہے میری بلبل، لیکن کیا رمیش بھی......"

"میں پورے وشواس سے نہیں کہہ سکتی لیکن اتنا جانتی ہوں کہ اس نے ایک آخری بار کانتا سے بھی ملنے کی بنتی کی ہے۔"

"یہ بات تجھے کس نے بتائی؟"

"پیڑ گننے کی بات کیوں کر رہا ہے مورکھ......!" جیوتی تلملا کر بولی۔ "اگر رمیش نے ایک بار کانتا کی نظریں جھکا دیں تو اس کی ماں بھی بیٹی کا پیٹا ڈھانپنے کے کارن مجبور ہو جائے گی۔"

"اب پوری طرح سمجھ گیا۔" تندو نے سنبھل کر بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"تو راجو کے کان میں بھی یہ بات ڈال دے۔ ہو سکتا ہے کہ پھر وہ کوئی اپائے تلاش کر لے۔"

"نہیں...... یہ بات اگر راجو کو معلوم ہو گئی تو وہ کانتا کا دھیان ہی من سے نکال دے گا۔"

"پھر...... تیری کھوپڑی میں اور کیا سمایا ہے؟"

"جب کانتا اس کے ساتھ بھاگنے کو تیار نہیں ہوئی تو......" تندو کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ جیوتی کی طرف دیکھ کر بولا۔ "چنتا نہ کر تو نے ایک بات بتا دی ہے تو میں بھی کان کھڑے رکھوں گا۔"

"تیری مرضی......" جیوتی بل کھا کر جانے کے لیے اٹھنے لگی تو تندو نے اس کی بانہہ تھام کر پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ "کیا ساگر کنارے بلا کر مجھے پیاسا لوٹا دے گی؟"

"کل ملنا، اسی پرانی جگہ......" جیوتی نے ہاتھ چھڑا کر سنجیدگی سے کہا۔ "تیرے اور راجو کے کارن میں بھی کانتا کا دھیان رکھوں گی۔ پر بات وہی ہے کہ کانتا بھی کہیں میری طرح زور زبردستی میں کانچ کی چوڑی کی طرح ٹوٹ کر بکھر نہ

جائے۔"

جیوتی اپنی بات پوری کرکے چلی گئی تو شندو کی کھوپڑی میں بھی بڑی دیر تک کھد بد ہوتی رہی۔

٭٭٭

گھنشیام دو گھنٹوں سے کھیتوں کے قریب اس جھونپڑی نما کوٹھری میں دبکا بیٹھا تھا جہاں پہلے فصل کی رکھوالی کرنے والا رکھوالا اپنی لٹھ سمیت ہر وقت چوکنا رہتا تھا۔ بعد میں کھیت کو محفوظ رکھنے کے لیے اس کے چاروں طرف کانٹوں کی باڑھ لگا دی گئی تھی۔ ایک ہی لکڑی کا دروازہ تھا جس میں تالا لگا ہوا تھا۔ کھیت کے مالک کا لڑکا دیپک نیا نیا جوان ہو رہا تھا۔ رمیش نے پہلی فرصت میں اس سے دوستی گانٹھ لی تھی اس لیے دروازے کی ایک چابی رمیش کے پاس بھی رہنے لگی۔

اس وقت شام کا جھٹپٹا ہوتے ہی رمیش بھی دیپک کو ساتھ لے کر اس کچی دیواروں والے کمرے میں پہنچ گیا جہاں کھیت کا مالک ہفتے دس روز میں دیکھ بھال کرنے کی غرض سے آتا تو گھڑی دو گھڑی کمر سیدھی کر لیتا۔ اسی کے آرام کی وجہ سے وہاں مونجھ کی رسی سے بُنی ہوئی ایک چارپائی بھی موجود تھی جس پر ایک تکیے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

"اس سے تمہیں یہاں کیا کام آن پڑا ہے؟" دیپک نے رمیش سے پوچھا تو رمیش ہنس کر بولا۔

"تو نے کبھی جنگلی ہرنی کو کلیلیں کرتے دیکھا ہے؟"

"یہ گاؤں ہے۔ یہاں ہرنی کہاں سے آ گئی؟" دیپک نے تعجب سے کہا۔

"چار نہیں میری جان......" رمیش آنکھ مار کر بولا۔ "میں دو ٹانگ والی ہرنیوں کی بات کر رہا ہوں جو دن بھر ادھر ادھر کودتے ہے مٹکاتی پھرتی ہیں...... کبھی تو نے کسی ہرنی کو شکار کیا ہے......؟"

"باپو سے ڈر لگتا ہے۔" دیپک نے بڑے معصوم لہجے میں ٹھنڈی سانس بھری۔ "انہوں نے کئی وار چتاونی دے رکھی ہے کہ اگر میں نے کسی کی طرف میلی نظر ڈالی تو وہ کھال ادھیڑ کر بھوسا بھر دے گا۔"

"تو اس کی چنتا مت کر...... ایک بار میری شکار کی ہوئی ہرنی سے تو بھی پیٹ پوجا کر لے پھر تجھے ایسا سواد ملے گا کہ سارا جیون میرے نام کی مالا جپتا رہے گا۔"

"اس سے بھی کیا کوئی ہرنی ادھر آنے والی ہے؟" دیپک نے شرما کر سوال کیا۔

"ہاں......" رمیش نے استادوں والے انداز میں جواب دیا۔ "وہ ہرنی کے روپ میں ناگن بھی ہے اس لیے ابھی تو اس کے قریب بھی مت آنا۔ ایک دو بار میں اس کا زہر نکال لوں پھر تو بھی عیش کرنا۔"

وہ دونوں ابھی باتیں کر رہے تھے کہ گھنشیام لپکتا ہوا سامنے آ گیا۔ الٹی آنکھ جھپکا کر سرسراتے لہجے میں بولا۔

"استاد...... وہ آ رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تو جا کر باہر جھونپڑی میں دبک جا۔ ادھر ادھر نظر رکھنا۔"

گھنشیام الٹے قدموں باہر نکل گیا تو رمیش نے دیپک سے کہا۔ "تو بھی ادھر کہیں دائیں بائیں چھپ کر بیٹھ جا۔" دیپک کو ہدایت دینے کے بعد رمیش بھی نکل کر باہر آ گیا۔ اس نے بھی دور سے کانتا کو آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اس کی طرف آ رہی تھی۔ قریب آ گئی تو رمیش نے منہ لٹکا کر کہا۔

"میں تو نراش ہو کر اب واپس جانے کی سوچ رہا تھا۔"

"مجھے بھی تجھ سے یہ امید نہیں تھی کہ تو بیچ منجدھار میں مجھے اکیلا چھوڑ دے گا۔" کانتا نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ "تیرے بلانے پر میں اس سے آ تو گئی ہوں لیکن......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی تو رمیش نے اسے نظر بھر دیکھا، پیار سے بولا۔

"تو چپ کیوں ہو گئی میری رانی؟"

"خبردار جو تو نے پھر بھی مجھے رانی کہا۔" کانتا ایک دم ہی بکھر گئی۔ "رانی سمجھتا تو اتنی جلدی کسی کباڑیے کے مقابلے میں ڈر کر میدان بھی کبھی نہ چھوڑتا۔"

"پر تیرے پتا نے اس بوڑھے گدھ جیسی کاکا کو زبان جو دے رکھی ہے۔ اس کا کیا ہو سکتا ہے؟"

"رہنے دے گئی لپٹی کی باتیں۔" کانتا جل کر بولی۔ "راجو کا پتا صاف کر دیتا تو باپو بھی اس کو شمشان سے گھسیٹ کر دوبارہ نہیں لا سکتا تھا۔"

"اچھا...... یہ تو کیا کہہ رہی ہے......؟" رمیش نے اسے حیرت سے گھورا۔

"سچ کہہ رہی ہوں۔ تو نے جو اتنے سارے سانڈ پال رکھے ہیں وہ بھی سب مٹی کے مادھو ہیں۔" کانتا کسی زخمی ناگن کی طرح بل کھا کر بولی۔ "میرے پاس زیادہ سمے نہیں ہے۔ تو نے کیوں بلایا تھا؟"

"کیوں...... کیا اب مجھے اتنا ادھیکار بھی نہیں رہا کہ تجھے آخری بار دل بھر کر دیکھ سکوں۔"

"چکنی چپڑی باتوں سے دل بہلانے کی کوشش مت کر۔" کانتا نے کھل کر دل کی بات کہہ ڈالی۔ "تو اور تیرے ساتھی اگر اس کباڑیے کو جان سے مار دیتے تو اس کا، کانٹا بھی سے نکل جاتا۔"

"پگلی کہی تو نے......" رمیش نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ "میں اسے ٹھکانے لگا کر پھانسی چڑھ جاتا تو تیری لگن کسی اور کے ساتھ ہو جاتی۔ مجھے کیا ملتا؟"

"سودا کرنے کی بات کر رہا ہے......؟" کانتا نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ "اب بھی سمے ہے، بول...... تجھے کیا چاہیے؟"

"تو تو اگنی کے پھیرے لگانے سے پہلے میں تیرے ساتھ نہیں کھیل سکتا لیکن تو نے کبھی اتنا موقع بھی نہیں دیا کہ میں تجھے چھاتی سے لگا کر اپنے دل کی دھڑکنیں ہی سنا سکتا۔"

"تو آج دل بھر کر سنا لے اپنے من کا حال۔ لیکن وچن دے کہ تو میرے ساتھ دھوکا نہیں کرے گا۔ اور پہلی فرصت میں اس کانٹے کو بھی نکال پھینکے گا جو ہمارے پیار کے بیچ آ گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے...... تیرے کارن رمیش یہ بھی کر گزرے گا۔" رمیش نے بڑے دبنگ لہجے میں کہا پھر کانتا کو بہلا پھسلا کر اندر کوٹھری نما کمرے میں لے آیا۔

"یہاں کی چابی تجھے کہاں سے ملی؟" کانتا نے اندر آ کر حیرت کا اظہار کیا۔

"باہر کسی کی نظر ہم دونوں پر پڑتی تو بدنام بھی ہو سکتے تھے۔ اسی کارن میں نے آج باہر لگا تالا بھی توڑ دیا۔ دو گھڑی آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

"میرا اتنا خیال ہے تو پھر راستے کا پتھر بھی ہٹا دے۔" کانتا نے رمیش کو اکسانے کی کوشش کی۔

"چنتا مت کر میری رانی۔ آج کے بعد ساری دیواریں بھی سرک جائیں گی۔" رمیش نے اسے دل کی دھڑکنیں سنانے کے لیے سینے سے لگایا تو کانتا کی دھک دھک بھی اسے سنائی دینے لگی پھر کانتا نے خود کو سنبھالنے کی خاطر رمیش کی بانہوں سے دور ہو جانا چاہا لیکن رمیش کی گرفت اس کی کمر کے گرد اور تنگ ہوئی تو خود کانتا بھی اس طوفان کو نہ روک سکی جس نے اس کے اندر بھی ٹھاٹھیں مارنا شروع کر دیا تھا۔ موجوں کا بہاؤ تھم گیا تو کانتا نے آنکھیں چراتے ہوئے دل سے سسکتی آواز میں پوچھا۔

"یہ تو نے کیا کر دیا؟"

"مجھے شما کر دے میری رانی۔" رمیش نے مکاری سے

کہا۔ ”میں تیری عزت کا خیال رکھوں گا۔“
کانتا خود کو سمیٹ کر آہستہ سے اٹھی پھر نظریں چراتی لمبے لمبے قدم بڑھاتی واپس لوٹ گئی۔ اس کے جانے کے بعد دیپک نے سامنے آکر عجیب انداز میں کہا۔
”یہ چھوری تو رگھو گوالے کی پتری ہے۔“
”تو نے ٹھیک پہچانا......“ رمیش نے سینہ تان کر کہا۔ ”یہ اسی گوالے کی منہ زور بچھیا تھی جو کل تک کسی کو پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتی تھی لیکن اب یہ کبھی دولتی چلانے کی بھول نہیں کرے گی۔ دوسری بار ادھر آئے تو...... تو بھی اپنی بیٹھک کا بھاڑا دل بھر کر وصول کر لینا۔“
رمیش، دیپک کا ہاتھ تھامے باہر نکلا تو چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ گھنشیام جھونپڑی کے سامنے زمین پر پڑا۔ ”ہائے، ہائے“ کر رہا تھا، رمیش لپک کر اس کے قریب گیا۔
”تجھے کیا ہو گیا؟“
”ادھر کوئی پہلے سے چھپا کھڑا تھا استاد۔“ گھنشیام نے تلملا کر کہا۔ ”کوئی نامرد تھا حرام کا پلا۔ پیچھے سے سر پر کسی ٹھوس چیز سے وار کر کے نکل گیا۔“
”کون ہو سکتا ہے؟“ رمیش نے دہکتے لہجے میں سوال کیا۔
گھنشیام کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اس لیے وہ پھر سر تھام کر ”ہائے...... ہائے“ کرنے لگا۔

◆◆◆◆◆

راجو کے گھر کا وہ کمرا پھولوں سے مہک رہا تھا، بندیا اور جمنا نے دلہن بنی کانتا کا ہاتھ تھام کر اس اجلے بستر پر بٹھا دیا جس پر گلاب کی پتیاں بکھری نظر آ رہی تھیں۔ جاتے جاتے جمنا نے خاص طور سے کانتا کے کانوں میں دو چار ایسے جملے بھی کہے جس سے وہ شرما کر رہ گئی۔ بندیا اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گئی تو کانتا نے گھونگٹ کی اوٹ سے کمرے کو دیکھا پھر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔
وہ خود بھی اس وقت اوپر سے نیچے تک مہک رہی تھی۔ پنڈت کے مہورت نکالتے ہی جیوتی کی ماں نے اس کے شریر پر چندن اور صندل کی مالش شروع کر دی تھی۔ مالش کرتے سمے ایک دن اس کا ہاتھ کولہوں سے رپٹ کر پیٹ کی طرف جانے لگا تو کانتا لجا کر رہ گئی۔ جیوتی کی ماں نے ہنس کر کہا تھا۔
”بھلا دائی سے پیٹ کیا چھپانا۔ کل بھگوان کی کرپا سے تیرے پیر بھاری ہوئے تو میں ہی کام آؤں گی۔ اس سے کوئی شرم نہیں کرتی، سارا کھایا پیا کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔“
کانتا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اس کی تجربے کی باتیں سنتی رہی، جب شادی کو دو دن رہ گئے تو اس نے کانتا کی مالش کرتے ہوئے بڑی رازداری سے کہا تھا۔
”تجھے آج بڑے گر کی بات بتا رہی ہوں۔ بچی کو ڈھیل دینا ورنہ گڈی کٹنے میں ایک بار دیر ہو جائے تو پھر مرد ہمیشہ اسی کا عادی ہو جاتا ہے۔ سارے دکھ ناریوں کو جھیلنے پڑتے ہیں۔“
”یہ تو گڈی کٹنے والی کیا بات کر رہی ہے؟“ کانتا نے معصومیت سے پوچھا۔ ”وہ تو بسنت کے تہوار پر اڑائی جاتی ہیں۔“
بعد میں جب اس نے گڈی لڑانے والی بات کا مطلب ذرا کھل کر بتایا تو کانتا اٹھ کر بھاگ گئی لیکن آج وہ گڈی لڑانے والی بات اس کے ذہن میں رہ رہ کر کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل سے سوچ رہی تھی کہ اس نے تو رمیش کو اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر پہلے ہی ڈھیل دے دی تھی۔ اسی ڈھیل کے کارن اس کی گڈی بھی کٹ چکی تھی اور اب...... اب اگر یہ بات کسی طرح راجو کے کانوں تک پہنچ گئی تو کیا ہوگا؟ وہ ان ہی وچاروں میں گم تھی جب کوئی دبے قدموں آکر اس کے قریب بستر پر بیٹھ گیا۔ کانتا نے گھونگٹ کی اوٹ سے دیکھا تو اس کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہو گئیں۔
کل تک وہ راجو کو پسند کی نظروں سے نہیں دیکھتی تھی مگر آج...... آج وہ اسے اپنے جیون کی نیا کا کھیون ہار بن رہی تھی۔ اس نے ایک ہی نظر میں طے کر لیا تھا کہ راجو کو تن من سے اپنا لے گی...... راجو نے اس کو دل سے چاہا تھا۔ کبھی اس کا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی تھی، من میں بسا کر امیدوں اور آشاؤں کے سہارے اسے پوجتا رہا۔ کبھی قریب آکر کھوجنے کی کوشش نہیں کی...... اور رمیش!...... وہ دل لبھانے کی بات ضرور کرتا رہا، کبھی اس نے بھی کانتا کو چھونے کی بھول نہیں کی مگر...... راجو کے ساتھ لگن کا سن کر وہ اپنی اصلیت پر اتر آیا تھا۔ اس نے دھوکے سے کانتا کو آخری بار ملنے کو بلایا پھر اس کے وشواس کو ٹھوکر مار کر اس کے جیون میں ایسا زہر گھول دیا جس کا کوئی علاج نہیں تھا...... وہ بات اگر راجو کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تو پھر وہ کیا سوچے گا؟ اسے شما کر دے گا؟ یا پہلی ہی رات اس سے سارے رشتے ناتے توڑ کر گھر کی دہلیز سے باہر نکال دے گا؟...... راجو کے گھر سے نکل کر وہ کہاں جائے گی

ہوئی گڈی کی طرح ہوا میں ڈولتی رہے گی؟ کیا رگھو پتری سمجھ کر شما کر دے گا یا وہ بھی منہ پھیر کر اپنے گھر کا دوار بند کر لے گا...... کیا وہ بھی جیوتی بن کر جیون بھر میلی نظروں کا نشانہ بنتی رہے گی؟ کانچ کی چوڑی کے انوسار ٹوٹ کر بکھر جائے گی؟ وہ دل ہی دل میں اپنے بھوش کا انجام سوچ رہی تھی جب راجو نے پہلی بار اسے بڑے پیار سے مخاطب کیا۔
”تو نے دیکھا کانتا رانی...... جن کے پیار میں کھوٹ نہیں ہوتا...... جو من میں بسا کر کسی دیوی کی پوجا کرتے ہیں۔ وجے (جیت) ہمیشہ ان ہی کی ہوتی ہے...... پورا اگنی کے پھیرے کاٹ لینے کے بعد اب تو میرے جیون کا ایک حصہ بن گئی ہے۔ یہ پوتر سمبندھ بڑا اٹوٹ (پکا) ہوتا ہے۔ ہم دونوں مل کر اسے اور سندر بنا دیں گے، کیوں؟ ٹھیک ہے نا۔“
کانتا نے کوئی جواب نہیں دیا...... راجو کی باتوں میں امرت ہی امرت تھا۔ اسے خبر تھی کہ کانتا، رمیش کا سپنا دیکھ رہی تھی لیکن اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا...... کانتا کے ہاتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر جیون کو سندر بنانے کی بات کر رہا تھا اور دوسری طرف رمیش تھا جس نے اپنے پیار کو اپنے ہی ہاتھوں روند کر مٹی میں ملا دیا تھا۔
”من کے رشتے ناتے بھگوان آکاش پر بناتا ہے۔“ راجو نے اسے خاموش دیکھ کر دبی زبان میں کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تو نے کسی اور کو چاہا تھا...... ہو سکتا ہے کہ جسی کاکا کے کہنے پر تیرے پتا نے میرا تیرا لگن کر دیا ہو لیکن اگر اب بھی تو سویکار کرنے کو تیار نہیں ہے۔ تو میں زور زبردستی بھی نہیں کروں گا۔ ایک بات اور دھیان سے سن لے میری...... جو سچے پیار کرتے ہیں انہیں تن کی لوبھ (لالچ) بھی نہیں ہوتی۔ تو ایک بار کہہ کر دیکھ، میں خود تیرا ہاتھ تھام کر اس کے حوالے کر دوں گا جس کا نام......“
”چپ ہو جا راجو......“ کانتا نے تڑپ کر کہا پھر سنبھل کر بولی۔ ”جو سمبندھ بھگوان نے میرے بھاگیہ (قسمت) میں لکھ دیا ہے اب میں اسی کو پوجنا اپنا دھرم سمجھوں گی، تو اسے میرے دل کی آواز سمجھ لے۔“
کانتا کی بات سن کر راجو نے پہلی بار آگے کھسک کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا گھونگٹ اٹھا کر بڑی اپنایت سے بولا۔ ”ایک بات اور گرہ سے باندھ لے۔ جیوتی کے ساتھ جو کچھ ہوا اچھا نہیں ہوا لیکن اس نے ایک بھول کر دی۔ اگر وہ گدو کا ہاتھ اس کے بعد بھی تھام لیتی تو تندو اس کے سارے دکھوں کی دوا بن جاتا۔ مرد کے مقابلے میں ناریوں کا دل زیادہ نرم ہوتا ہے، وہ انجانے میں بھول چوک کر جاتی ہیں اور مرد وہ ہوتا ہے جو کسی کو اپنانے کے بعد ہر صورت میں اس کی رکھشا کرتا ہے۔ تو بھی اب کسی بات کی چنتا مت کرنا۔ اگر کوئی میلی نظر اب تیری طرف اٹھی تو تیرا راجو گندی نظروں کو باہر نکال کر پیروں تلے رگڑ دے گا۔ اس لیے کہ تو اب میری محبت ہے۔“
کانتا کا دل دھک سے رہ گیا، اس کے من میں چور تھا اس لیے اس نے نظریں اٹھا کر راجو کو بہت غور سے دیکھا، اسے ٹٹولنے کے کارن مدھر سروں میں بولی۔
”میں نے کہا نا کہ میں تجھے اپنا دیوتا سمجھ کر تیری پوجا کروں گی...... کیا تجھے وشواس نہیں آیا؟“
”وشواس نہ ہوتا تو میں جسی کاکا کو تیرا رشتہ مانگنے کے لیے درمیان میں لاتا۔“ راجو نے اور قریب ہو کر کانتا کے مہکتے جسم کو اپنی مضبوط بانہوں میں لے کر کہا۔ ”شادی کے پوتر بندھن میں بندھنے کے بعد پرش یا ناری کو کبھی پلٹ کر پیچھے کی اور (طرف) نہیں دیکھنا چاہیے۔ زیادہ کریدنے سے اچھی بھلی ہانڈی کا سواد بھی جاتا رہتا ہے۔“
”تو...... تو ٹھیک کہہ رہا ہے راجو۔“ کانتا نے راجو کی بانہوں میں سر چھپا کر جواب دیا۔ ”اب تو بھاگیہ سے مجھے مل گیا ہے تو بھی تیرے کسی وشواس کو ٹھیس لگانے کی بھول نہیں کروں گی۔“
”کتوں کے بھونکنے کی پروا بھی نہ کرنا۔ وہ بھونکنے کے سوا اور کچھ کر بھی نہیں سکتے۔“
کانتا کے من میں ایک بار پھر اس خوف نے سر ابھارا کہ کہیں رمیش اور اس کے درمیان بھول سے بیچ پڑ جانے والی بات کی بھنک راجو کو تو نہیں مل گئی لیکن اسے زیادہ سوچ وچار کرنے کا موقع نہیں ملا۔ راجو نے اٹھ کر کمرے کی تمام روشنیاں بجھا دیں پھر اس کے قریب آ گیا۔ اتنا قریب جس کا ادھیکار اسے دھرم اور سماج کے علاوہ ان کے پرکھوں نے بھی سوچ سمجھ کر دیا تھا۔
اس رات کانتا نے جیوتی کی ماں کی بتائی ہوئی تمام گر کی باتوں کو دھیان سے نکال کر اپنے آپ کو پوری طرح راجو کو سونپ دیا......
اگلی صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس سمے بھی اس نے خود کو راجو کی مضبوط بانہوں کی پناہ میں پایا۔ جو گہری نیند میں لمبے لمبے خراٹے لے رہا تھا۔

قسط نمبر: 4

مسافر

ناصر ملک

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زادِ سفر ہوتے ہیں... کسی کو انسانیت کے لبادے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں... اور کہیں آنکھوں میں اشک نہ ہونے کے باوجود ہر ادا، ہر چہرہ اشکبار ہونے کا احساس دلاتا ہے... وہ بھی ایک خانماں خراب، بے سپر اور آبلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کے چلن سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پھر بھی مائل بہ تغیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور ہونٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان ساکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لرزش مچلا کرتی ہے... خاموش فضاؤں میں طوفان چھپے ہوتے ہیں... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہا لے جاتی ہے... ایسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہوجاتی ہے مگر مسافر ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم کرکے آگے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں کہیں گم ہوجاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساسِ زیاں... سوختہ جذبات میں تلاطم برپا کردینے والے واقعات اور معاشرتی سرد رویّوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

گل و گلزار سے راہِ پرخار تک ایک مسافرِ بے نوا کی روداد حیات

کسی آن بھی خنجر والا ہاتھ نیچے آنے والا تھا۔ اُس پر میری باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ میں نے بے بسی سے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور زیرِ لب کلمہ طیبہ پڑھنے لگا۔ چند ساعتیں گزر گئیں۔ کمالے کا ہاتھ نیچے نہیں آیا تھا۔ میں آنکھیں کھولیں۔ اُس کا اُٹھا ہوا ہاتھ فضا میں ساکت تھا۔ وہ یک ٹک مجھے دیکھ رہا تھا۔ شاید غیبی مدد مجھ تک آن پہنچی!

آنکھوں میں تشکیک کی گہری پرچھائیاں لرز گئیں۔ اچانک اُس نے اپنا ارادہ بدل لیا اور میرے نچلے دھڑ کی طرف متوجہ ہوا۔ ایسے میں اُس کا ہاتھ بھی آہستگی سے نیچے آ گیا تھا۔

اچانک مجھے یوں لگا جیسے اُس نے خنجر کی نوک سے میری ران پر لکیر کھینچی ہو۔ کپڑا چرنے کی آواز سنائی دی۔ پھر گھٹنے سے کچھ نیچے، پھر دونوں ٹانگوں پر ان گنت لکیریں لگائیں۔ مجھے اُس کا آدھا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اچانک اُس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ اُس نے میری ایک ٹانگ کو ٹخنے سے پکڑ کر اوپر اُٹھایا، اچانک چھوڑ دیا۔ میرے کانوں میں 'دھپ' کی آواز پڑی۔ پھر اُس نے میرا بازو اُٹھایا۔ وہی سلوک کیا۔ اُس پر طاری وحشت کا جمود ٹوٹ گیا تھا۔ خنجر ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔

''کیا ہوا ہے تجھے؟ بولتا کیوں نہیں۔'' وہ غرایا۔

''کمر میں چوٹ لگ...... ہائے......''

میری بات ادھوری رہ گئی۔ خالدہ کا ہاتھ دکھائی دیا تھا۔ اُس نے چارپائی کے نیچے گھس کر کمالے کا گرا ہوا خنجر اُٹھا لیا تھا۔ جلدی سے باہر نکلی اور چیختی چلاتی کمرے سے نکل گئی۔ کمالے نے گردن موڑ کر اُسے دیکھا پھر میری طرف متوجہ ہو گیا۔ مجھے روتے ہوئے دیکھ کر اُس کے چہرے کے تاثرات عجیب سے ہو گئے تھے۔

اُس نے جلدی جلدی زخم والی جگہ پر چٹکیاں بھریں۔ کھڑے ہو کر دو تین ٹھنڈے سانس مارے پھر اچانک جھک کر مجھے اُٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ بڑی مشکل سے اُس نے مجھے گھسیٹ کر پیٹی اور چارپائی کے درمیان سے نکالا اور کھلی زمین پر چت لٹا دیا۔ اُسے معاملے کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔ بجلی کی سی تیزی سے اُس نے اپنے صافے سے میرا بازو کس کر باندھ دیا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کی قمیص خون سے تر ہو چکی تھی۔ اب مجھے اپنی رانوں اور پنڈلیوں پر چبھن ہونے لگی تھی۔ یوں جیسے چیونٹیاں کاٹ رہی ہوں۔ میں نے جلدی جلدی اُسے بتایا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ وہ الٹے پیروں دوڑتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

میں بری طرح ہانپنے لگا تھا۔ سمجھ میں آ رہا تھا کہ خطرہ وقتی طور پر ٹل گیا ہے۔ مجھے پیاس لگی تھی۔ حلق سوکھ گیا تھا۔ میں نے اونچی آواز میں چلا کر کسی کو بلانا چاہا مگر میری آواز میرے حلق میں ہی اٹک گئی۔ میری نظروں کے عین سامنے صافے کے لٹکتے ہوئے حصے سے خون کے قطرے فرش پر ٹپکنے لگا تھا۔ ایسے میں روشنی کے بڑے بڑے دائرے میری آنکھوں کے آگے ناچنے لگے۔ دُنیا گھومنے لگی۔ کمرے کا

منظر دھندلانے لگا۔ بہ مشکل ایک منٹ یا دو چار لمحا گزرے ہوں گے کہ اچانک میں پُرسکون ہونے لگا۔ یوں جیسے میٹھی نیند نے اپنا دامن مجھ پر ڈال دیا ہو۔

آنکھ کھلی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی حیرت کدے میں پڑا ہوں۔ ہر شے ناشناسا، ہر چہرہ اجنبی میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''میں کہاں ہوں؟''

کئی چہرے مجھ پر جھک گئے۔ اجنبیت کی دھند چھٹنے لگی۔ مجھ پر جھکا ہوا پہلا چہرہ جو میں نے پہچانا، وہ پروین کا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ آنکھیں متورم تھیں۔ چند منٹوں میں ہی مجھ پر صورتِ حال آشکار ہو گئی۔ کمرے کی چھت میری دیکھی بھالی تھی۔ میں یقیناً ڈاکٹر شاہ جی کے کمرے میں چارپائی پڑا ہوا تھا۔ میں نے تینوں اطراف میں نظر دوڑائی۔ چراغ اور بخشو لوہار سمیت سبھی موجود تھے۔ کمالا، پروین کے پیچھے کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے سے عجیب وحشت برس رہی تھی۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا، پھر میری نگاہ ہٹی نہیں۔ ایسے میں ڈاکٹر شاہ جی کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو ینگ مین! کیسا محسوس کر رہے ہو؟''

وہ میرے بائیں طرف، چارپائی پر ایک پاؤں ٹکا کھڑا تھا۔ میں نے اُسے دیکھا تو دل بھر آیا اور آنکھیں اختیار نم ہو گئیں۔ اُس نے مسکرا کر کہا۔ ''میں نے پوچھا ہے تمہاری طبیعت کیسی ہے؟''

مجھے اپنا بے حس ہونا یاد آ گیا۔ میں نے جلدی سے انگلیوں کو حرکت دینے کی کوشش کی۔ نہ جانے انگلیوں حرکت کی یا نہیں، مگر بازو میں درد کی شدید ٹیس اُٹھی۔ میں کراہ کر رہ گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی نے کہا۔ ''بازو کو مت ہلاؤ پیروں کو حرکت دینے کی کوشش کرو۔''

میں نے ہدایت پر عمل کیا۔ ڈاکٹر شاہ جی کے چہرے خوشی کی لہر دوڑ گئی، بولا۔ ''اللہ نے تم پر کرم کر دیا ہے شہزادے تم چند دنوں میں ہی ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

پروین سے کھڑا نہ رہا جا سکا اور وہ چارپائی پر ماتھا ٹکا کر زار و قطار رونے لگی۔ میں نے اُٹھنا چاہا تو ڈاکٹر نے منع کر دیا۔ بایاں بازو اُٹھانے کی کوشش کی تو یوں محسوس ہوا جیسے کئی من وزنی ہو گیا ہو لیکن دل مطمئن ہو گیا کہ میں نے ہاتھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ میرا جسم حرکت کر رہا تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی کہہ رہا تھا۔ ''تم لوگ جا کر تسلی سے سو جاؤ یہ اب ٹھیک ہے۔''

کوئی بھی جانے پر تیار نہیں تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی کا لہجہ ہو گیا۔ ''یہ ابھی دو چار دن یہیں رہے گا۔ مجھے کسی کی اعانت

نہیں ہے۔ ہاں البتہ اس کا کھانا وقت پر پہنچا دیا کرنا۔'' پھر پروین سے مخاطب ہوا۔ ''بیٹا! مجھ پر اعتماد رکھو۔ یہ بھائی ہے اور دوست بھی۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ تم وہی دوائی لا کر بھیجنا جو میں نے بتایا ہے۔ ٹھیک ہے ناں!''

اس نے سر ہلایا۔ ''میں کہیں نہیں جاؤں گی جب تک بھائی ٹھیک نہیں......''

وہ اپنی بات پوری نہیں کر پائی۔ گلا رندھ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایسے وقت میں ڈسپنسر کی شکل دکھائی دی۔ وہ ہلکے پیلے رنگ کی دوا سے بھری ہوئی سرنج میرے بازو میں انجیکٹ کر رہا تھا۔ نیڈل کے پرک ہونے کی مخصوص چبھن اب بھی مجھے محسوس ہوئی تھی۔ میں نے ایک شکوہ بھری نگاہ کمالے پر ڈالی اور آنکھیں بند کر لیں۔ سبھی باتیں کر رہے تھے۔ کمالے کو کوس رہے تھے جبکہ وہ لب بستہ، مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔

میں نے غیر ارادی طور پر دیوار گیر گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ اس کی سوئیاں بارہ کے ہندسے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ میں یہ سوچ کر پریشان ہو گیا کہ میں کم و بیش آٹھ گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھ پر پھر غنودگی طاری ہونے لگی۔ خود کو جاگتے رکھنے کی کوشش میں نہ جانے کس وقت ہار گیا اور گہری نیند سو گیا۔

صبح کے آٹھ بجے میری آنکھ کھلی۔ میں نے کمرے میں نظر دوڑائی۔ کوئی دکھائی نہیں دیا۔ میں شاہ جی کی چارپائی پر لیٹا تھا اور سرکاری کمبل میں لپٹا ہونے کے باوجود سردی محسوس کر رہا تھا۔ گزشتہ شام کے واقعات برقی کوندے کی طرح ذہن میں لپکنے لگے۔ کمالے کی وحشت بھری آنکھیں، اس کا آشام لہجہ اور ہاتھوں کی سفاک حرکت چشمِ تصور میں آئی تو میں جھرجھری لے کر رہ گیا۔ خدا نے میری مدد کی تھی، ورنہ اس کی ذہنی رو کو بدل دیا تھا ورنہ مجھے قتل کر دینے کے ارادے میں کوئی کمی نہیں رہی تھی۔ مجھ پر پہلی مرتبہ خالد محمود عرف کمالے اُستاد کی بربریت آمیز سرشت آشکار ہوئی تھی۔

میں نے اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ہونٹ اور زبان کھردرے محسوس ہوئے۔ اپنے بدن کی بے حسی یاد آئی۔ میں نے بہ طور احتیاط دائیں بازو کو حرکت نہیں دی۔ دائیں پیر کو اوپر اُٹھانے کی کوشش کی۔ ٹانگ میں تکلیف نہیں ہوئی، کمر میں ہلکی سی ٹیس اُٹھی۔ پیٹ میں بھی مروڑ اُٹھا۔ دل خوشی سے معمور ہو گیا جب میں نے اپنی ٹانگ کو مکمل طور پر اوپر اُٹھتے دیکھا۔ دوسرے پیر کو ہلایا جلایا۔ ایسا کرنے سے جہاں کمر میں تکلیف کا احساس جاگا وہاں دونوں رانوں کی جلد کھنچی کھنچی محسوس ہوئی۔ یاد آیا کہ کمالا میری بدنی بے حسی کو جانچنے کے لیے میری ٹانگوں پر چیرے لگاتا رہا تھا۔ بینڈیج کی وجہ سے ہی جسم کھنچا کھنچا محسوس ہو رہا تھا۔

میرے دونوں ہاتھ بھی کام کر رہے تھے۔ میں نے بائیں ہاتھ سے کمبل ہٹایا اور دائیں بازو کو دیکھا۔ کندھے سے نیچے قمیص کا کپڑا اُدھاڑ دیا گیا تھا۔ بازو کہنی سے کندھے تک پٹی میں لپٹا ہوا تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی یا ڈسپنسر نے بازو پر سے خون صاف کر دیا تھا۔ میں نے نہایت آہستگی سے انگلیوں کو ہلایا، تکلیف نہیں ہوئی۔ آہستہ سے کلائی کو موڑا، مڑ گئی مگر کندھے سے کچھ نیچے ٹیس اُٹھی۔ میں نے اپنا بایاں ہاتھ چارپائی کی بانہہ پر مضبوطی سے ٹکایا اور اُٹھنے کی کوشش کی۔ بہ دقت تمام ایک فٹ تک اوپر اُٹھ پایا۔ نچلی پسلیوں کے درمیان ریڑھ کی ہڈی میں برقی رو دوڑی۔ پیٹ میں شدید درد جاگا اور میں کرنے کے سے انداز میں پشت کے بل لیٹ گیا۔ کروٹ بدلنے کی کوشش میں بھی ناکامی ہوئی۔

میری بائیں جانب ڈرپ اسٹینڈ پر خالی بوتل لٹک رہی تھی جس کے نچلے سرے سے پائپ جھول رہا تھا۔ رات کو کسی وقت ڈاکٹر شاہ جی نے مجھے ڈرپ لگائی تھی کیونکہ جب میں نصف شب کو جاگا تھا تو میں نے اسٹینڈ دیکھا تھا، نہ میرے بازو میں سوئی پیوست تھی۔

دس پندرہ منٹ تک میں اپنی گنجلک سوچوں کی ادھیڑ بن میں کھویا رہا۔ ڈاکٹر شاہ جی کمرے میں داخل ہوا۔ مجھے جاگتا پا کر میرے پاس آ گیا۔ اپنے پیشہ ورانہ معمول کے مطابق میری نبض چیک کی۔ جسم کو ٹٹول کر دیکھا پھر دریافت کیا۔ ''تمہیں پیاس لگی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''جی!''

''سردی؟''

''لگ رہی ہے۔''

اُس نے کمبل درست کیا۔ پانی کا بھرا ہوا گلاس میرے سینے پر قدرے جھکایا اور اُس میں رکھا ہوا 'اسٹرا' میرے منہ میں ڈال دیا۔ میں نے چند گھونٹ پیا پھر اسٹرا نکال دیا۔ کچھ قرار آیا۔ میں نے کہا۔ ''مجھ سے اوپر اُٹھا نہیں گیا شاہ جی؟''

''ابھی اُٹھنے کی کوشش نہ کرو۔ تمہاری ریڑھ کی ہڈی کے ایک مہرے پر چوٹ لگی ہے۔ شکر ہے کہ مہرا ٹوٹنے سے بچ گیا ہے۔ بس نرو پر دباؤ آیا ہے۔ دو چار دنوں کی مالش سے ٹھیک ہو جائے گا۔'' اُس نے مجھے تفصیل سے بتایا پھر میرے استفسار پر اس نے بازو اور ٹانگوں کے زخموں کے بارے میں بتایا۔

"پروین کہاں ہے؟"

"وہ رات بھر تمہارے سرہانے بیٹھی جاگتی رہی ہے۔ اب تمہارے لیے ناشتا تیار کرنے گئی ہے۔ آتی ہی ہوگی۔"

"دوسرے لوگ؟"

"انہیں بہ مشکل میں نے یہاں سے بھگایا ہے۔"

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ پروین میرا پرہیزی ناشتا لے آئی۔ اُس کے عقب میں غزالہ، شاتو اور چاچا چراغ دکھائی دیے۔ پروین نے چنگیر اور برتن میز پر رکھے۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر فرطِ جذبات سے مجھ پر جھکی اور دیوانہ وار چومنے لگی۔ میرے بازو کے زخم کا بچاؤ کرتے ہوئے لپٹ گئی۔ وہ رو بھی رہی تھی، مسکرا بھی رہی تھی اور یقین کر رہی تھی کہ میں بالکل تندرست ہوں۔ ڈاکٹر شاہ جی کی ہدایات کے مطابق اُس نے مجھے ساگودانہ کھلایا، دودھ پلایا اور میرا منہ اپنے دوپٹے سے صاف کیا۔

ناشتے کے بعد ڈاکٹر شاہ جی نے مجھے دو انجکشن دیے۔ ٹمپریچر چیک کیا۔ سر میں شدید درد کی شکایت پر اُس نے غزالہ کو تیمارداری سونپی کہ وہ میرا سر دبائے۔ اُس نے ہدایت پر عمل کیا۔ روح تک مسیحائی کا اعجاز اُترنے لگا۔ میں خود پر جھکے ہوئے اُس کے چہرے کو یک ٹک دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب تک کسی نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میرے ساتھ ہوا کیا تھا۔ مجھ سے واقعے کی تفصیل جاننا تو دور کی بات، کسی نے اس موضوع پر آپس میں بھی بات نہیں کی تھی۔ میں نے غزالہ سے پوچھا۔ "کھالا نہیں آیا؟"

"رات تو یہیں تھا، اب دکھائی نہیں دیا۔" اُس نے منہ بنا کر کہا۔

میں نے پروین سے پوچھا تو اُس نے بتایا۔ "ماسی منو اور چاچا بخشو صبح آئے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ وہ تیز بخار میں پھنک رہا ہے۔"

"دوا دارو لیا اُس نے؟"

"تمہیں کیا، وہ دوائی لے یا زہر پھانکے؟" غزالہ نے تلخی سے کہا۔

میں خاموش ہوگیا۔

"تم کھالے کے گھر کیا لینے گئے تھے؟"

"کھالے سے ملنے گیا تھا۔"

وہ تشکیک آمیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں اُسے بتانا چاہتا تھا مگر اُس نے میرے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا، بولی۔ "ابھی نہیں...... ابھی تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے۔ جب ٹھیک ہو جاؤ گے تب پوچھوں گی۔"

وہ پہر تک کمرے میں میلا لگا رہا۔ نور پور کا ہر دوسرا شخص، میری عیادت کو آیا۔ تین بجے کے قریب ڈاکٹر شاہ نے میرے کمرے میں لوگوں کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا میرے پاس اُس کے علاوہ غزالہ اور چاچی رہ گئیں۔

غزالہ نے مجھے دلیا وغیرہ کھلایا، پانی پلایا اور چاچی کی نظریں بچا کر میری پیشانی کو ان گنت مرتبہ چوما۔ میں آنکھیں بند کیں تو اُس نے آنکھوں کو چوما، بولی۔ "میرا چاہتا ہے کہ میں اُس کمینے کا گلا گھونٹ دوں۔"

"کس کمینے کا؟" میں چونکا۔

"کھالے لوہار کا...... اور کس کا۔"

"اس کا قصور نہیں ہے، قصور میرا اپنا ہی تو تھا۔"

وہ دانت پیس کر خاموش ہوگئی۔ اُسے میری بات ا... نہیں لگی تھی۔

ڈاکٹر شاہ جی نے قریب آ کر پیشانی پر ہاتھ رکھا، مسکرایا اور بولا۔ "لگتا ہے کہ اب تمہاری دوائی بند بھی کرا... جائے تو تم دو چار گھنٹوں میں ہی فٹ فاٹ ہو جاؤ گے۔"

میں اُس کا کنایہ سمجھ گیا، جھینپ کر بولا۔ "ڈاکٹر جی! ا... ایسی بھی بات نہیں۔"

غزالہ شرمسار ہو کر مجھ پر مزید جھک گئی۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ ڈاکٹر شاہ جی ایسا ہی کوئی اور جملہ کہ کر غزالہ کو میرے اور قریب کر دے مگر وہ خاموش ہوگیا تھا۔ ایسے میں بخت خان کمرے میں داخل ہوا۔ غزالہ کے سر پر ہاتھ رکھنے کے بعد میری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "ڈاکٹر شاہ! آپ کی مطلوبہ میڈیسن آگئی ہیں۔"

اُس نے اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا لفافہ میرے پیروں کے قریب چارپائی پر رکھ دیا پھر میری عیادت میں رُجوع کیا۔ اُس کی آمد کو محض چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ کھالا اور مراد بخش دیوانہ بھی آ گئے۔ چاچی اور غزالہ اپنا سامان سمیٹ کر کمرے سے نکل گئیں۔ مجھے بعد میں پتا چلا تھا کہ وہ ساتھ والے کمرے میں جا بیٹھی تھیں۔

دونوں میری چارپائی کی پائنتی کے پاس آ کر رُ... گئے۔ بخت خان اور ڈاکٹر شاہ جی نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہا سنا اور چپ چاپ کمرے سے نکل گئے۔ عیاں تھا کہ انہوں نے ہمیں کھل کر گفتگو کرنے کا موقع دیا تھا۔

مراد بخش نے کہا۔ "شہرے خان! لگتا ہے کالی... حالت میں ہو...... ہے ناں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ مجرموں کی طرح

...ے کھالے کو بہ غور دیکھا۔ وہ کافی بدلا بدلا دکھائی ...شاید اس لیے کہ میں نے اُسے نہایت مختلف انداز میں ...پایا تھا۔ میں نے کہا۔ "کھالے! دور کیوں کھڑے ہو، ...آؤ ناں۔"

...لب بستہ کھڑا رہا۔ مراد بخش نے کہنی چبھوئی۔ وہ پھر ...س سے مس نہ ہوا۔ میں نے کہا۔ "میں اُٹھ نہیں سکتا، تم ...پھر سکتے ہو، اس لیے میرے قریب چلے آؤ۔ میں بہت ...باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میرا کوئی ...قصور نہیں تھا۔ میں نہ تو نمک حرام ہوں اور نہ ہی یار مار...... مگر ...نے مجھے صفائی کا موقع ہی نہیں دیا۔"

وہ بڑی آہستگی سے چارپائی پر ٹک گیا۔ میں نے کہا۔ ...یا کی کوئی عدالت بغیر صفائی طلب کیے سزا نہیں سناتی مگر ...نے سنا دی۔ میں بلو کو اپنی بہن سمجھتا ہوں، بالکل پروین کی ...ح۔ وہ بھی مجھے اپنا بھائی ہی سمجھتی تھی مگر نہ جانے کیا ہوا کہ ...بہک گئی۔ بچی ہے ناں ابھی...... مگر میں اُسے سمجھا لیتا، ...سے روک لیتا۔ مگر برا یہ ہوا کہ میری کمر میں چوٹ آگئی اور ...بدن شل ہو گیا جس کی وجہ سے وہ حد سے بڑھ گئی۔"

اُس نے میری بات خاموشی سے سنی۔ منہ سے کچھ نہیں ...بلکہ اچانک پلٹ کر میرے پیروں کو تھام کر چارپائی پر ...ٹک گیا۔ دیوانہ دوسری چارپائی پر براجمان ہو گیا تھا۔ چند ...لمحوں میں کھالے کی سسکیاں پورے کمرے میں گونجنے ...لگیں۔ مجھے اپنے پیروں پر نمی کا احساس ہوا۔ میں نے پکارا۔ "کھالے! یہ کیا کر رہے ہو؟ ادھر میرے پاس آؤ ناں!"

اُس پر میری پکار کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے دو چار ...اُسے باز رہنے کے لیے کہا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا تو ...خاموش ہو گیا۔ اُسے اپنے دل کا غبار نکالنے کا موقع دیا۔ ...دیر گزر گئی۔ اُس نے سر اُٹھایا۔ مجھے اُس کی حالت زار ...پر ترس آیا۔ وہ میرے کہنے پر میرے پہلو میں چارپائی کی ...پٹی پر آ کر ٹک گیا۔ اُس کا سر ہنوز جھکا ہوا تھا۔

...سر اُٹھا کر بولا۔ "شہرے خان! تم مجرم نہیں ہو، میں مجرم ہوں۔ جو چاہے سزا دے لو۔ میرا سر تمہارے ...آگے جھکا ہوا ہے۔"

میں نے اُسے معاف کر دیا۔ باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ ...اُس نے مجھے بتایا کہ وہ اور ڈاکٹر شاہ جی مجھے اٹھا کر اسپتال ...لائے تھے۔ اُس نے ڈاکٹر صاحب کو بغیر حیل و حجت تمام ...ماجرا من و عن کہہ سنایا تھا اور اپنی غلطی تسلیم کر لی تھی۔ خالدہ ...نے والدین کے سامنے غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے ...میری بے گناہی پر تصدیقی مہر ثبت کر دی تھی۔ اس جرم کی

پاداش میں اُسے اچھی خاصی مار کھانا پڑی تھی۔ کھالے کے بقول، وہ ابھی تک چارپائی پر پڑی کراہ رہی تھی۔ بعید نہیں تھا کہ چاچا چراغ اور بخت خان کھالے کو پولیس کے حوالے کر دیتے مگر کھالا اور اُس کے والدین اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے چاچی اور چاچا چراغ کے پیروں میں گر گئے تھے۔ قدموں میں گرے ہوئے معترف کو گلے سے لگانا ہماری علاقائی روایات کا حصہ تھا۔

بات پورے نور پور میں پھیل گئی تھی۔ زبانوں کی بیساکھیوں پر چلتی ہوئی لمبی مسافت طے کر گئی تھی۔ ہر کوئی اُسے اور خالدہ کو لعن طعن کر رہا تھا اور وہ اپنے آہنی کلیجے پر زبانوں کے زخم سنبھالے ندامت کی اتھاہ گہرائی میں گر کر سنبھلنے کی کوشش میں ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ پشیمانی اور پچھتاوے نے اُسے تیز بخار میں جھونک دیا۔ میں چونکہ اُس کے ردِعمل کو فطری سمجھتا تھا، یہ بھی سمجھتا تھا کہ اگر اُس کی جگہ میں ہوتا اور میری جگہ وہ ہوتا تو میں وہی کرتا جو کچھ اُس نے کیا تھا، اس لیے میں نے اُسے دل سے معاف کر دیا۔ وہ میرا مشکور تھا۔ اُسے شاید میرے اس ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔ اُس کی ندامت کو تحلیل کرنے میں مراد بخش کے ذومعانی فقروں نے بڑا کام دکھایا۔

بخت خان اور ڈاکٹر شاہ جی کو مراد بخش بلا لایا۔ محفل جم گئی۔ ایسے میں گزشتہ شب کا تذکرہ چھڑ گیا۔ بخت خان اور مراد بخش نے مزار کی نگرانی کی تھی۔ اس مرتبہ صرف ٹریلی تھری نمبروں والی کار دل جیت شاہ کے ہاں آئی تھی۔ اُسے ایک آدمی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اُس نے پون گھنٹا دل جیت شاہ کے خاص حجرے میں گزارا تھا۔

ڈاکٹر شاہ جی نے میری کمر اور گردن کے پیچھے مضبوطی سے ہاتھ جمائے اور سہارا دے کر بٹھا دیا۔ درد کی ایک کٹیلی لہر پورے بدن میں پھر گئی۔ ضبط کرنے کے باوجود منہ سے سسکاری نکل گئی۔

دیوانہ جھٹ سے بولا۔ "یار یہ کیا؟ ہر وقت سوانیوں (عورتوں) کی طرح چیختے رہتے ہو، کوئی ایک مردانہ ادا بھی اپنے پاس رکھ چھوڑو۔"

میں نے ہنسنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ چند ہی لمحوں میں میری پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ میں نے کراہ کر کہا۔ "ڈاکٹر جی! بیٹھا نہیں جاتا، لٹا دیں مجھے۔"

اُس نے میری درخواست پر توجہ نہیں دی، سمجھایا۔ "خود کو بٹھائے رکھنے کی پوری کوشش کرو۔"

میری چارپائی کے نیچے یورین بیگ دکھائی دیا۔ تب پتا

چلا کہ مجھے 'کیتھی ٹر' پاس کی گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ غیر معمولی طویل دورانیہ گزرنے پر بھی حاجت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ میں بہ مشکل تین یا چار منٹ بیٹھا رہ سکا پھر ہار گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی نے میرے چہرے پر نگاہ ڈالی اور مسکراتے ہوئے لٹا دیا۔ کمر تلے اُبھار کا احساس ہوا۔ پہلے نہیں ہوا تھا۔ شاید کپڑے کا کوئی گولا دباؤ دینے کے لیے میرے تلے رکھا گیا تھا۔

ایک محفل اُجڑ گئی، دوسری سج گئی۔ میرے اہلِ خانہ میرے اردگرد آن بیٹھے۔ مجھے پرہیزی غذا کھلانے کے بعد چائے پلائی گئی، دوائیں کھلائی گئیں اور مختلف ادویات کے انجکشن دیے گئے۔ غزالہ مجھ سے ناراض تھی کہ میں نے کھالے کو معاف کیوں کیا؟ اُس کی خواہش تھی کہ وہ دو چار مہینے جیل کی دال روٹی کھا آتا تو شاید انسان بن جاتا۔ وہ میری اور کھالے کی دوستی کو پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ وہ مخصوص 'ڈرائیورانہ' قماش کا آدمی ہے۔ اُس کے خیال میں وہ اعتماد کے لائق ہرگز نہیں تھا۔

میں اگلی صبح کھالے اور دیوانے کے سہارے کوٹھی کے صحن میں ہولے ہولے چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہر قدم پر دماغ میں دھمک پیدا ہوتی تھی۔ پورے جسم میں چیونٹیاں رینگتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ مراد بخش دیوانہ کہہ رہا تھا۔ "ہر کام میں خدا کی مصلحت ہوتی ہے۔ جو کرتا ہے، بھلا ہی کرتا ہے۔ فی الوقت انسان کو درست نہیں لگتا مگر جب اُس کے اثرات سامنے آتے ہیں تو واش اش کر اُٹھتا ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" کھالے نے گھورا۔

"میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ پنی کے کنڈے کی ضرب نے ہمیں ایک بہت بڑی مصیبت سے بچا لیا۔ اگر شہرا ٹھیک ٹھاک ہوتا تو تم اپنی بے غیرتی کی عظیم مثال قائم کر کے اپنا ہاتھ کبھی نہ روکتے اور اب تک شہرا بے چارہ..... چچ چچ..... روح بالائے بریں ہوتی، جسم زیرِ زمیں ہوتا اور تم سرکار کے راج محل میں تخت نشیں ہوتے....." مراد بخش نے اپنے ہاتھ سے چکی پیسنے کا مضحکہ خیز اشارہ کرتے ہوئے اس انداز سے کہا کہ میں اور کھالا اپنی ہنسی نہ روک پائے۔

کھالا بولا۔ "ایسی کی تیسی تیرے منحوس شاعری..... اپنی منظر کشی اپنے پاس رکھو۔ اللہ سوہنے نے ہم دونوں پر خاص کرم کیا ہے۔"

میں بڑی احتیاط سے قدم بڑھا رہا تھا مگر پھر بھی ہانپ گیا۔ رُک کر سانسیں ہموار کرتے ہوئے بولا۔ "مگر کھالے! ایک بات کی سمجھ نہیں آئی۔ میرے کانوں میں تمہاری ویگن کی نہ آواز پڑی تھی اور نہ ہی ہارن سنائی دیا تھا۔ شاید چوٹ نے میرے ذہن کو بھی متاثر کیا تھا۔"

وہ بولا۔ "نہیں، ویگن نہر والے پل پر ٹھہر گئی تھی۔ حرام زادی کا اگلا ٹائر پنکچر ہو گیا تھا۔ سیٹھی ابا کی دکان پڑی تھی۔ میں اور سبھی مسافر وہیں اُتر گئے تھے۔ ارادہ تھا میں اور رشید وہ سیٹھی لے کر پل پر جائیں گے اور ٹائر بدل ویگن کو اڈے پہ بر لے آئیں گے۔"

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ دل میں سوچا کہ جس وقت کو نہایت کم دورانیہ قرار دے رہا تھا، وہ اتنا کم نہیں تھا۔ میں خالدہ کے حصار میں کم و بیش نصف گھنٹے تھا۔ میں نے کسی کو بالخصوص مخاطب کیے بغیر پوچھا۔ "ا شاہ جی کیا کہتا ہے، کیا میں جلد ٹھیک ہو جاؤں گا؟"

مراد بخش بولا۔ "وہ کہتا ہے کہ تمہاری ہڈی پسلی بڑی جاندار ہے۔ یہ زاغ کچھ بگاڑیں گے کیا تیرا؟ کے معدا کھالا تو کیا، کھالے کا باپ بھی ہوتا تو اپنے دوسیری ہتھوڑ سے تمہاری ناک کی ہڈی تک نہ توڑ پاتا..... فکر نہ کرو، ا کہتا ہے کہ تم کل پرسوں تک تھارو بریڈ گھوڑے کی طر سے باتیں کرنے لگو گے۔"

کھالے نے بپھر کر کہا۔ "انسان کا بچہ بن ورنہ ا ہاتھ کی دوں گا اور دماغ ٹھکانے آ جائے گا۔ اپنے دل بجز اس سیدھے لفظوں میں نکالا کرتا کہ میری سمجھ میں آ جا کرتو کیا بکواس کرتا ہے؟"

میں خاصا سنبھل گیا تھا۔ رانوں اور پنڈلیوں کے زخ میں چبھن کم ہو گئی تھی۔ کمر اور بازو دُکھتا تھا۔ میں نے کھا سے فرمائش کی کہ مجھے کوٹھی سے باہر لے جائے۔ دونوں باہر لے آئے۔ ہم چلتے ہوئے اسپتال میں آ گئے۔ ڈاکٹر جی اپنے کمرے میں موجود تھا۔ مریض معائنہ اور معالجے کے لیے آ رہے تھے۔ وہ اس وقت خاصا مصر ہوا کرتا تھا۔

حیات خان نے عیادت کو آنے میں خاصی د کی تھی۔ پہلے تو مجھے اُس کے ہمدردانہ رویے میں منافقت ہوا مگر کچھ دیر کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ نہ صرف ا رکھے گئے رویے پر متاسف تھا بلکہ ایک بھیانک غلطی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی جان لیوا صورتِ حال پر بھی ا تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی نے اُس کی پیشکش پر کوئی توجہ نہیں دی۔

مجھے مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں چار دن گئے۔ جب میری ریڑھ کی ہڈی کا معائنہ کرنے کے بعد شاہ جی نے اطمینان بھرے انداز میں کہا 'اب تم مکمل فٹ ہو' تو میں نے گھر کا قصد کیا۔ اسپتال کی حدود میں

نے کی بدولت مجھے اس ماحول سے بوریت ہونے لگی۔ دو تین دنوں کے بعد میرے بازو کے زخموں کے ٹانکے جانے تھے۔ ران کے ایک جبکہ پنڈلی کے دو زخموں ی اسٹیچنگ کی گئی تھی۔ ڈاکٹر شاہ جی کے بہ قول خنجر کا پھل ن ہڈی کو چھو گیا تھا مگر دونوں زخموں میں کوئی بھی عصبی کٹا تھا اور نہ ہی کوئی بڑی شریان یا ورید زخمی ہوئی اس نے میرے زخموں کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے شہر سے بخت خان کے ذریعے مہنگی اینٹی بائیوٹک ات منگوائی تھیں۔ مجھے دوائی کی باقاعدگی کے اثرات پر بھی دیا اور یہ تنبیہہ کی کہ ٹانکے کھلنے تک میں کوئی بھاری ام نہیں کروں گا۔

اگلی شام کو کھالا میرے گھر پہنچ گیا۔ رسمی گفتگو کے بعد ل نے جیب میں سے ایک تہ کیا ہوا رقعہ نکالا اور میری ہتھیلی رکھ دیا۔ انگریزی میں لکھا ہوا ایک جملہ میری آنکھوں کے ے جھلملا گیا۔

"مجھے بدھ کی شام کو پانچ بجے چمن زار عسکری میں ملو۔"

میں نے استفہامیہ نظروں سے کھالے کو دیکھا۔ "اسما لکھا ہے؟" اُس نے فاخرانہ انداز میں سر ہلایا۔

میں سوچ میں غرق ہو گیا۔ اُس نے کھالے کو کیوں بلایا؟ وہ کھالے کو اتنی اہمیت کیوں دینے لگی تھی؟ یہ اور اس جیسے ل سوالات زہریلے کیڑوں کی طرح میرے ذہن میں گے۔

اُس نے میرے پہلو میں کہنی چبھوئی۔ "کیوں؟ اچھا لگا کیا؟"

میں نے جلدی سے کہا۔ "نہیں کھالے! ایسی بات نہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ تمہاری خان زادی تمہیں کس مصیبت لنے کا ارادہ رکھتی ہے۔"

"یعنی وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی بلکہ وہ مجھے بے وقوف ی ہے۔ تم یہی کہنا چاہتے ہو؟" کھالے نے شکوہ بار لہجے ہا۔ "تم یہ سوچتے ہو کہ لڑکیوں کو تم جیسے چٹی چمڑی والے ے لگتے ہیں؟ تم سمجھتے ہو کہ غریبوں کے لیے دنیا میں ل میں نرم گوشہ نہیں ہے؟ ہاں ہاں! شہرے خان! یہ ی سوچ ہے۔ مانا کہ کالے، کمین اور غریب شخص سے بت نہیں کرتا۔ وہ بھی نہیں کرتی مگر کھیلنا چاہتی ہے۔ ا بنا کر دل بہلانا چاہتی ہے۔ میرا کیا جائے گا، کیا ان ہوگا؟ نہیں..... وہ اپنے طور سے کھیلتی رہے، میں وں میں کھیلتا رہوں گا۔ جب اُس کا دل بھر جائے گا استہ بھی بدل جائے گا۔ اور تم تو یقیناً ڈرپوک شخص ہو۔ ڈرتے رہو گے مگر زندگی میں کچھ بھی نہیں کر پاؤ گے۔"

مجھے اُس کی سوچ پر حیرانی ہوئی۔ اُس نے آنے والے چند ہی لمحوں میں مجھے بُری طرح اُدھیڑ کر رکھ دیا۔ پھر مجھے خاموش پا کر اُس نے میرا کندھا ٹھوکا۔ "اوئے! تجھے سانپ سونگھ گیا یا زبان پر تالا لگ گیا، بولتا کیوں نہیں تُو؟"

میں نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔ "کھالے! تم ایک لڑکی کی خاطر اپنے ماں باپ اور بہنوں کی زندگیوں سے کھیل رہے ہو۔ کیا تمہیں کسی پر ترس نہیں آتا، ہیں.....؟"

وہ بھڑک گیا۔ "میں اسما کے لیے نہیں، کسی اور مشن کی تکمیل کے لیے جیل پر جانا چاہتا ہوں۔"

مجھے اچنبھا ہوا۔ "کیا مطلب؟ کیا مشن ہے تمہارا؟"

وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ "مجھے ملتان میں کسی اچھی سی نوکری کی تلاش ہے۔ ملاقات کے دوران اُس سے فرمائش کروں گا کہ وہ میرے لیے کوئی مناسب سی نوکری تلاش کرے تاکہ میں اُس کے قریب رہ سکوں۔ وہ پہلے بھی کئی مرتبہ مجھے ملتان میں بلا چکی ہے۔"

"بکواس نہ کرو، تم کہیں نہیں جاؤ گے اور اس غلط فہمی میں مت رہو کہ وہ تمہارے جیسے کن ٹٹے عاشق کے لیے نوکری تلاش کرے گی۔" میں نے مصنوعی بے پروائی سے اپنا فیصلہ سنایا۔ "تم نور پور میں رہو، ملتان چلے جاؤ یا کہیں بھی جا کر ایڈجسٹ ہو جاؤ، مجھے کوئی فرق نہیں پڑنے والا..... سمجھے تم!"

"اچھا!" وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔ "میرے دل کی دُنیا سوچ میں ہے، تم جاتو، نہ جاتو، مجھے فرق نہیں پڑتا۔ یہاں چوری چھپے اسما کا دیدار میسر آتا ہے، وہاں جب جی چاہے گا، مل لیا کروں گا۔ یہ کوئی معمولی بات ہے؟ ویسے بھی سیانے کہتے ہیں کہ ترقی کرنے کے لیے اپنا گھر بار چھوڑنا پڑتا ہے۔ میں نے بھی گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اماں ابا سے بات بھی کر لی ہے۔ جب میں اُنہیں تنخواہ کی رقم بھیجا کروں گا تو مارے خوشی کے اُن کی باچھیں کانوں سے جا لگیں گی۔ ایک تم ہو کہ میری خوشی دیکھ کر کالے مُواہ ہو گئے ہو۔ ہے ناں!"

کوئی جواب دیے بغیر، میں نے اُس کے چہرے پر خوشی کے ان گنت عکس، جوش اور ہیجان کی ملی جلی کیفیت دیکھ کر خاموشی کی چادر اوڑھ لی کہ اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ وہ اپنی مستی میں مست، اپنی محبت کی ترنگ کے بہاؤ میں رقصاں کافی دیر تک مسرت بھری بہکی بہکی باتیں کرتا رہا، خواب بنتا رہا اور میں 'ہاں، ہوں' میں جواب دیتا رہا۔ پھر یہ طے پایا کہ میں اُس کے ساتھ ملتان جاؤں گا جہاں وہ اسما سے چمن زار میں ملاقات کرے گا اور میں

خطرات کے پیشِ نظر اُس کی پہرے داری کروں گا۔ گاؤں میں اندھیرا پھیلنے کے ساتھ ہی ہماری محفل اُجڑ گئی۔

میں نے ڈاکٹر شاہ جی کی ہدایت کے مطابق کھوج لگانا شروع کر دیا تھا کہ میرے ماں باپ کے اندوہناک قتل کے فوری بعد نور پور سے کون رخصت ہوا تھا۔ چونکہ میں کسی کو بھی چونکانا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ میں اپنے والدین کے قاتل کی تلاش میں ہوں، اس لیے میں نے کچھ احتیاطیں بروئے کار رکھی تھیں۔

جس دن میرے والدین کے انتقال کو تین دن گزرے تھے، اُس دن سردار حیات خان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ میں نے اُس کے انتقال کو حوالہ بنا لیا تھا۔ اس طرح دو آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ ایک تو مقابل کے ذہن میں فوری طور پردہ دورانیہ اُبھر آتا تھا۔ دوسرا فائدہ یہ ہو رہا تھا کہ میرا اصل مطمحِ نظر پوشیدہ رہتا۔

میری جستجو کے نتیجے میں تین اشخاص سامنے آئے جو اس واقعے کے فوری بعد نور پور سے چلے گئے تھے۔ افسر علی، شریف چکی والا اور سردار یارن خان...... مجھے ایک طرح کی مایوسی ہوئی کیونکہ ان تینوں کا تعلق کسی بھی انداز سے میرے والدین کے قتل سے جوڑا نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر شاہ جی کو ان تینوں کے بارے میں بتایا تو اُس نے کہا۔ ”خود کو غیر جانب دار رکھ کر اپنا کام آگے بڑھاؤ۔ ان تینوں افراد سے ملو۔ اپنی ذہانت کو بروئے کار لاتے ہوئے غیر محسوس انداز میں انہیں ٹٹولو۔ بہ ظاہر غیر متعلق دکھائی دینے والا فرد بھی ہمارا ٹارگٹ ہو سکتا ہے۔“

میں نے افسر علی سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ افسر علی میری گلی میں مشرقی کنارے پر رہائش پذیر تھا۔ بے ضرر اور معصوم بندہ تھا۔ وہ یقیناً میرا مطلوبہ شخص نہیں تھا۔ اُس نے مجھے بتایا۔ ”میں اُن دنوں یارن خان کے مال ڈنگر چرایا کرتا تھا۔ ایک دن خان کی ایک گائے ریوڑ سے علیحدہ ہو کر کھو گئی۔ میں رات بھر اُسے تلاش کرتا رہا مگر وہ نہ ملی۔ صبح جب خان کو پتا چلا تو اُس نے مجھے بھانے والے بڑے کیکر پر اُلٹا لٹکا دیا۔ تین بندوں نے مل کر میری تونی لگائی (مارا پیٹا)۔ اس پر بھی خان کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تو اُس نے میری اکلوتی بھینس چھین لی اور مجھے نوکری سے نکال دیا۔“

میں اُس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کا بہ غور جائزہ لے رہا تھا۔ سچ جھوٹ کی پرچھائیوں میں امتیاز کر رہا تھا۔ اُس کے پل پل بدلتے تاثرات غماز تھے کہ وہ سچ بول رہا تھا۔

”شہرے خان! وہ بڑا ظالم انسان تھا۔ میں کافی دن تک گھر میں پڑا رہا۔ اُس کے کیوں نے مجھے اتنا مارا تھا میں کئی دن تک چارپائی سے اُتر نہیں سکا تھا۔ پھر میرا ایک یار میرا پتا کرنے آیا۔ اسلم بنوار بھیرے میں رہتا تھا اور مظفر گڑھ کی ایک دھاگے والی مل میں کام کرتا تھا۔ اُس نے جب یہ سنا تو مل میں نوکری کی پیش کش کی۔ اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں...... میں نے ہامی بھر لی۔ میں نے تیاری بھی کر لی مگر اُسی دن جس دن میں مظفر گڑھ جانا چاہتا تھا، تمہارے گھر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ہائے اللہ! وہ دن دوبارہ نہ دکھانا۔“

اُس کے دونوں ہاتھ کانوں سے چپک گئے۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ کچھ دیر یہی کیفیت رہی، پھر بولا۔ ”بس پھر تھا، نور پور سنج (ویران) ہو گیا۔ دوسرے دن حیات خان اسپتال سے میتیں اُٹھا کر لایا۔ ہم سبھی کفن دفن میں رُکے رہے۔ فارغ نہیں ہوئے تھے کہ بڑا خان فوت ہو گیا۔ مجھے پھر ایک آدھ دن رکنا پڑا۔ قل خوانی کے بعد میں اپنا بوریا بستر اُٹھا کر مظفر گڑھ چلا گیا۔ جا کر مل میں بھرتی ہو گیا۔“

میں نے پوچھا۔ ”تو پھر تم کب واپس آئے؟“

وہ بولا۔ ”شاید کبھی نہ آتا، اپنے گھر والوں کو وہیں بلا لیتا مگر مجھے چوٹ لگ گئی تھی جس کی وجہ سے واپس آ گیا۔“

”چوٹ؟“

”ہاں! میں وہاں رنگ کھاتے میں ڈافر بھرتی ہوا تھا پہیوں والی ٹرالی میں مال بھر کر دوسرے کھاتے میں لے جاتا تھا۔ ایسے میں میرا پاؤں پھسل گیا اور چوکنا (کولہا) نکل گیا۔ کوئی دو مہینے چارپائی پر پڑا رہا۔ ٹھیک ہونے پر جب مل گیا تو پتا چلا کہ میری شفٹ کا حساب ہو گیا تھا اور سارے ورکر سامان اُٹھا کر شیخوپورے کی کسی مل میں چلے گئے تھے۔“ اُس نے تفصیل بتائی۔

اُسے مزید کریدنے پر مجھے کوئی خاص بات معلوم ہوئی۔ وہ میرا مطلوبہ شخص نہیں تھا۔ میں شریف چکی والے سے ملا۔ باتوں ہی باتوں میں اُسے اپنی پٹڑی پر چڑھایا تو اُس کے پوپلے منہ کا ٹیپ پلیئر فر فر چلنے لگا۔ ”شہرے خان! بڑھی تھا۔ کہاں جاتا تھا میں نے، اُبھے (شمال) میں محمود کوٹ تک، لمنا (جنوب) میں شاہ جمال تک، ڈبھار (مشرق) نور کبیرا اور لا (مغرب) میں غازی گھاٹ تک رندا، آری اور تیشہ اُٹھائے گلی گلی پھر کر ہوکا لگایا کرتا تھا۔ تپی چارپائیاں اور پیڑھیاں بنایا کرتا تھا۔ مرمت بھی کرتا تھا۔ گھر سے نکلتا تو کبھی دو مہینے بعد لوٹتا، کبھی چار کے بعد۔ بڑے خان کا جنازہ پڑھ کر نکلا تھا، چار مہینے بعد واپسی ہوئی تھی۔ یہ تو اللہ بھلا کرے سردار یارن خان کا، اُس نے مجھے دُکان بنا دی

اور مجھے اس در بدری مزدوری سے نجات مل گئی۔“

میں نے پوچھا۔ ”یہ یارن خان کیسا آدمی تھا؟“

اُس نے یارن خان کی تعریفوں میں دیوانے کی طرح زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ چونکہ یارن خان یہاں موجود نہیں تھا اور میں اُس سے یوں بے تکلفی سے پوچھ گچھ نہیں کر سکتا تھا اس لیے شریف چکی والے کو اُس کے بارے میں کریدنے لگا۔ اُس کی معلومات کے مطابق حیات خان کے باپ کے مرنے کے ایک ہفتہ بعد اُس نے اچانک ہی لاہور کا قصد کیا تھا۔ وہاں جا کر شادی کر لی اور پھر وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ شریف چکی والا ایک مرتبہ یارن خان سے ملنے کے لیے لاہور جا چکا تھا مگر اُس کے گھر کا پتا سمجھانے سے قاصر تھا کیونکہ وہ ان پڑھ آدمی تھا، ایک وزٹنگ کارڈ ہاتھ میں تھامے پوچھتا پاچھتا یارن خان کی کوٹھی تک پہنچا تھا اور اُس کی گاڑی میں بیٹھ کر لاری اڈے گیا تھا۔

میں اس فضول کام سے خاصا دل برداشتہ اور مایوس ہوا تھا۔ یارن خان کا میرے والدین کے قتل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میرے برعکس ڈاکٹر شاہ جی پُرامید تھا اور مجھے اس کام کی تکمیل پر اُکساتا رہتا تھا۔

آج کھالے کی مراد بر آنے والی تھی۔ اپنے کاشتکارانہ امور سے فراغت پا کر طے شدہ پروگرام کے تحت میں اس کے انتظار میں بخشو لوہار کی دکان پر آ بیٹھا۔ کچھ ہی دیر میں شہر کی ویگن آتی ہوئی دکھائی دی۔ مخصوص وقت گزار کر ویگن کا دوسرا پھیرا لے کر میں اور کھالا چوک قریشی پہنچے۔ ویگن عزت خان ڈرائیور کے حوالے کی۔ وہ پہلے فرید آباد والے بیڈ فورڈ بس چلاتا تھا۔ اس کی بس چند دن قبل اُلٹ گئی تھی جس کی وجہ سے اُسے باڈی میکر کے ہاں ہفتہ بھر کے لیے کھڑا کرنا پڑا۔ ان دنوں فارغ تھا اور ویگن اڈے پر بیٹھ کر بندوں کی ’پھکیک‘ بھگتتا تھا۔ دیہاڑی بن جاتی تھی۔

ہم مظفر گڑھ کے لیے بس میں بیٹھے۔ مظفر گڑھ سے ملتان جانے کے لیے ڈیرا اڈا والی ویگن پر سوار ہو گئے۔ راستے میں کھالے نے مجھے چند سنہری ہدایات دیں۔ اُس نے درپیش آنے والی ہر ممکنہ صورتِ حال پر مجھے مفید ردِعمل سے آگاہ کیا۔ میں نے اُس کی باتیں ذہن نشین کر لیں۔ اس کی دنیا سے میں بے خبر تھا۔ اپنے دل کی جانتا تھا جو خوشی اور جوش میں تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

جب ہم چمن زار کے بڑے سے گیٹ کے سامنے ویگن سے اُترے، سوا چار بجے کا وقت تھا۔ دن مضمحل ہونے لگا تھا۔ میں چند لمحے رُکا رہا۔ جب کھالا گیٹ کے قریب ٹکٹ والے کیبن کی کھڑکی پر جھکا، میں بھی کیبن کی طرف چل پڑا۔ ٹکٹ لیتے ہوئے پارکنگ ایریا کا جائزہ لیا۔ تفریح کے لیے آنے والوں کا ہجوم تھا۔ کوئی فیملی کار میں بیٹھ رہی تھی، کوئی نکل کر کیبن کی طرف آ رہی تھی۔ اک جہانِ حیرت سجا ہوا تھا، بساطِ شوق بچھی ہوئی تھی اور میں کھالے کی پشت پر نظریں جمائے پھول پودوں میں گھری روش پر چل رہا تھا۔ یہ ملتان کا سب سے خوب صورت پارک تھا۔ زمانۂ طالب علمی میں اپنے کلاس فیلوز کے ہمراہ بارہا یہاں آیا تھا مگر آج سب کچھ نیا نیا محسوس ہو رہا تھا۔ یہاں بچوں، بڑوں اور خواتین کی دل بستگی کے لیے ان گنت اہتمام کیے گئے تھے۔ اگر کھالے نے خانزادوں اور اُن کے بچوں کو نہ دیکھ رکھا ہوتا تو یہاں دوڑتے کودتے بچوں اور چلتی پھرتی عورتوں کو دیکھ کر یقیناً انگشت بدنداں ہو جاتا۔

جھیل کے وسط میں ایک جزیرہ بنا ہوا تھا جس کے چاروں اطراف لوہے کی مضبوط ریلنگ لگی ہوئی تھی۔ ایک کمان دار چوبی پل جزیرے کو پارک سے ملاتا تھا۔ ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے جزیرے پر گئے۔ کافی دیر تک کارِ آوارگی جاری رکھا۔ کھالا جھیل کے کنارے پر ٹانگیں پسار کر بیٹھ گیا۔ اس نے جگہ کے انتخاب میں خاصی چالاکی سے کام لیا تھا۔ یہاں بیٹھ کر وہ گیٹ میں داخل ہونے والے ہر چہرے کا طواف کر سکتا تھا۔ میں اُس کے عقب میں، جھیل سے کچھ فاصلے پر، ایستادہ پنگھوڑے کے پاس جا کھڑا ہوا اور بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھنے لگا۔

اسما نے وقت کی پابندی کو ملحوظ رکھا تھا۔ عین مقررہ وقت پر گیٹ میں داخل ہوئی۔ شانِ بے نیازی سے چلتے ہوئے جھیل پر آئی۔ کھوجتی ہوئی نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ کھالے کو دیکھ کر جھیل کا چکر کاٹ کر اُس کے قریب پہنچ گئی۔ کھالا فرطِ محبت سے دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ جھک کر سلام کو ہوا۔ کہتے ہیں کہ محبت اندھی ہوتی ہے مگر کھالے کی محبت اندھی نہیں تھی، اسٹیٹس کے فرق کو دیکھ کر مؤدب ہو رہی تھی۔ دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی اور نہ ہی میں اُن کے لبوں کی حرکات سے موضوعِ سخن اخذ کر پایا تھا۔ کھالے نے اپنا صافہ پھیلا کر گھاس پر پھیلایا اور اُسے بٹھا دیا۔ خود چند قدموں کی دوری پر گھٹنوں کے بل گھاس پر بیٹھ گیا۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ”ابے اُلو کے پٹھے! نماز پڑھنے کا ارادہ ہے کیا؟“

وہ اکیلی آئی تھی۔ اگر ڈرائیور ساتھ آیا تھا تو وہ باہر پارکنگ میں ہی رُک گیا تھا۔ وہ ڈرنکس شاپ کی طرف متوجہ

تھی۔ ہاتھ لہرا کر دکاندار کو بلا رہی تھی۔ ایک لڑکا بھاگ کر دونوں کے قریب گیا۔ آرڈر لے کر پلٹ گیا۔ چند ہی لمحوں بعد میں نے دونوں کو آئس کریم کھاتے دیکھا۔ جی ہی جی میں کھالے کو مخاطب کیا۔ ”تمہارے برے دن آ گئے ہیں کھالے اُستاد! سردیوں میں قلفہ کھاؤ گے تو کئی دنوں تک کھانستے چھینکتے رہو گے۔“

مجھے کھالے کی قسمت پر رشک آیا اور میں غزالہ کو یہاں لا کر آئس کریم کھلانے کا منصوبہ ترتیب دینے لگا۔ وہ یقیناً اس دُنیا کو دیکھ کر پریشان ہو جائے گی۔ اُس نے ابھی تک محض نور پور کی دُنیا ہی دیکھ رکھی تھی۔ وہاں اور یہاں کے بیچ زمین و آسمان کا فرق حائل تھا۔ اسما اور کھالے کو دیکھ رہا تھا، اپنی محبت کی تصوراتی آبیاری کر رہا تھا کہ اچانک میں چونک پڑا۔ قیمتی پینٹ شرٹ میں ملبوس ایک بڑے بالوں والا ہیرو ٹائپ آدمی دونوں کے سروں پر جا کھڑا ہوا تھا۔ میں پنگھوڑے کے آہنی اسٹینڈ کے ساتھ کمر ٹکا کر کھڑا تھا۔ اُن کے قریب جانا چاہتا تھا مگر پھر کھالے کی ہدایت یاد آ گئی اور میں نے اپنے بڑھتے ہوئے قدم روک لیے۔

نووارد نے اسما کو مخاطب کیا پھر دونوں کے درمیان کچھ باتیں ہوئیں۔ مجھے اسما کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ پریشان اور برہم دکھائی دیتی تھی۔ کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی تبھی کھالا ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ اسما کو بھی اُٹھنا پڑا۔ کھالے نے کچھ کہتے ہوئے ہیرو ٹائپ لمبے تڑنگے شخص کی طرف اُنگلی اُٹھائی۔ یہ اُس کا دھمکی دینے کا مخصوص انداز تھا۔ ہیرو نے اُسے دونوں ہاتھ چھاتی پر رکھ کر پیچھے کی طرف دھکا دیا۔ ایسے ہی وقت میں اُس کی چیختی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا.....“

کھالا چند قدم پیچھے ہٹا پھر سنبھل کر آگے بڑھا اور اُس نے دائیں ہاتھ کا زوردار تھپڑ ہیرو کے منہ پر دے مارا۔ چٹاخ کی آواز سنائی دی۔ ہیرو چند لمحوں تک اپنا بایاں ہاتھ گال پر رکھے اُسے خون آشام نظروں سے گھورتا رہا پھر چیختے ہوئے حملہ آور ہو گیا۔ دونوں دیوانہ وار ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اینٹوں کی روش پر آ گیا۔ اب میں تینوں کے کافی قریب تھا۔ کئی لوگ متوجہ ہو گئے تھے اور میری طرح میدان جنگ کی طرف بڑھنے لگے تھے۔

اسما نے دونوں کو روکنے کی کوشش کی مگر پھر سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ کھالے نے ہیرو کے لانبے بالوں کو دونوں مٹھیوں میں جکڑا اور پیچھے کی طرف جھٹکا دیا۔ وہ کمان کی صورت خم کھا گیا۔ اُس نے کھالے کو لات مارنا چاہی مگر کھالے نے پہلے ہی اپنا داہنا گھٹنا اُس کے پیٹ کے نیچے مارا۔ وہ بلبلا اُٹھا۔ اُس نے گالیاں دیتے ہوئے کھالے پر مکوں کی بارش کر دی۔ کھالا اُس کے بالوں پر اپنی گرفت قائم نہ رکھ سکا اور اُسے چھوڑ کر بے اختیار سینے اور پیٹ پر ہاتھ رکھ کر ہٹ گیا۔ ہیرو کو موقع مل گیا۔ اُس نے بڑی پھرتی سے اپنی ٹانگ اُٹھا کر ایڑی کی ٹھوکر کھالے کی پشت پر ماری۔ وہ منہ کے بل گرا مگر اُس نے اُٹھنے میں غیر معمولی مستعدی دکھائی۔ اپنے میں ”دھپ“ کی زوردار آواز کے ساتھ ہیرو کا پنچ اُس کے جبڑے پر لگا۔ وار کارگر رہا تھا۔ کھالا ڈگمگایا اور ڈھلوان گھاس پر جھیل کے پانی تک لڑھکتا گیا۔ میرے دائیں بائیں کئی لوگ اکٹھے ہو گئے تھے اور ہر کوئی ایک دوسرے سے اس لڑائی کا پس منظر دریافت کر رہا تھا۔

اسما معاملے کی سنگینی کو بھانپ چکی تھی۔ اُس کی چیختی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”موبی! فار گاڈ سیک.....“

میدان کارزار گرم تھا۔ اُس کی آواز پر دونوں میں سے کسی نے کان نہ دھرے۔ مجھے ہیرو ٹائپ شخص کے نام کا پتا چل گیا۔ اُس کا نک نیم موبی تھا۔ پورا نام محبوب، محب یا کچھ ہو سکتا تھا۔

میں نے بے بس کھڑی اسما کی آنکھوں میں نمی تیرتی دیکھ لی تھی۔ وہ اچانک پلٹی اور تیز تیز قدموں سے بیرونی گیٹ کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ اُس کا یہاں رُکنا کسی بھی طور مناسب نہیں تھا۔

موبی کھالے کے سر پر پہنچ گیا تھا۔ اُس نے کھالے کو دھکیل کر جھیل میں پھینکنا چاہا مگر دھوکا کھا گیا۔ کھالے نے بڑا پھرتیلا دیہاتی داؤ کھیلا تھا۔ اُس نے موبی کی دونوں ٹانگوں کو پکڑا اور بغل میں سر دے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ دو تین چکر لیے اور اُسے گھما کر جھیل میں پھینک دیا۔ چھپاک کی زوردار آواز سے موبی پانی میں گرا، زیرِ آب گیا پھر سر جھٹکتا ہوا پانی کی سطح پر نمودار ہوا۔ اب صورتِ حال کافی بدل گئی تھی۔ وہ جھیل سے نکلنا چاہتا تھا مگر کھالے کی پے در پے ٹھوکریں اُسے واپس پانی میں دھکیل دیتی تھیں۔ چند ہی ٹھوکروں نے اُس کے چہرے کو خون سے رنگ دیا۔ ایسے میں لوگوں نے کھالے کو پکڑ لیا۔ وہ پانی سے نکلنے کی کوشش میں مصروف اجنبی کو نہ صرف گالیاں دے رہا تھا بلکہ لوگوں کی گرفت سے نکلنے کے لیے بری طرح مچل رہا تھا۔ موبی پانی سے باہر آیا تو اُس کی حالت بہت خراب تھی۔ لباس پانی میں بھیگ کر بدن سے چپک گیا تھا۔ بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا اور اُس کی تمام شان و شوکت ہوا

ہو گئی تھی۔ چہرے کی جلد کئی جگہوں سے پھٹ کر خون اگلنے لگی تھی جس کی وجہ سے شرٹ کا اگلا حصہ سرخ ہو گیا تھا۔ اُس نے کھالے کو گالیوں سے نوازا اور نمٹ لینے کی دھمکیاں دیتے ہوئے تیز چلتا ہوا دور ہو گیا۔ اُس کا رُخ بھی چمن زار کے گیٹ کی طرف تھا۔

لوگوں نے کھالے کو چھوڑ دیا۔ لوگ ماجرا پوچھ رہے تھے، ایسے میں ایک آدمی نے جلدی سے کہا۔ ”پولیس آ رہی ہے، بھاگو!“

تماشائی یہ دیکھے بغیر کہ پولیس کس طرف سے آ رہی ہے بھاگ اُٹھے۔ چند ہی لمحوں بعد میں اور کھالا اکیلے رہ گئے۔ میں نے گھبرائی ہوئی نظروں سے ارد گرد دیکھا۔ تین سپاہی تیز قدموں سے چلتے ہوئے گیٹ کی طرف سے جائے وقوعہ کی طرف آتے دکھائی دیے۔ میں نے کھالے کو آنکھ کے اشارے سے بھاگ جانے کا کہا۔ اُس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیں لرزی اور وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے درختوں والے احاطے کی طرف بھاگ نکلا۔ پولیس والوں نے اُسے فرار ہوتے ہوئے دیکھ لیا، وہیں سے سیدھ کی اور اُس کے پیچھے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اُن کی رفتار چغلی کھاتی تھی کہ وہ کھالے کی گرد کو بھی نہیں پہنچ پائیں گے۔ چھوٹی سی مصنوعی پہاڑی کے عقب میں جا کر فرض نبھانے والے تینوں سپاہی میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ میں سخت گھبرایا ہوا تھا مگر چونکہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا، اس لیے میں نے بھاگنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ کھالے کا صافہ ہنوز گھاس پر پڑا تھا۔ اُسے جھاڑ کر کندھے پر ڈالا اور وہیں گھاس پر بیٹھ گیا۔

کافی دیر گزر گئی۔ اچانک میرے کانوں میں بوٹوں کی آواز گونجی۔ گردن موڑ کر دیکھا۔ تینوں سپاہی کھڑے ہانپ رہے تھے۔ ایک بولا۔ ”اوئے جوان! یہاں لڑنے والے کون تھے؟“

میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔ ”ایک شخص نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ لمبے بال اور لمبا قد تھا اُس کا..... دوسرا.....“

میں نے کھالے کا حلیہ بھی بیان کر دیا۔ وہ منہ بنا کر بولا۔ ”انہیں جانتے نہیں ہو کیا؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

اسی اثنا میں بھاگ جانے والے تماشائیوں نے پھر حلقہ بنا لیا۔ پولیس والوں نے بالخصوص کسی کو مخاطب کیے بغیر پوچھا۔ ”تم میں سے کوئی جانتا ہے اُن لونڈوں کو؟“

ایک دس گیارہ سالہ بچے نے مسکرا کر کہا۔ ”میں بتاؤں انکل؟“

سپاہی متوجہ ہوا۔ خوش ہو کر بولا۔ ”تم جانتے ہو؟“

”جی انکل!“ بچہ شرارت آمیز معصومیت سے بولا۔ ”ایک شان مائیکل تھا، دوسرا انڈر ٹیکر..... سچ انکل! مزہ آ گیا دونوں کا ایکشن دیکھ کر۔“

اس کے ایک ہم عمر ساتھی نے کہا۔ ”آج انڈر ٹیکر دُم دبا کر بھاگ نکلا۔ شان مائیکل از دا گریٹ ریسلر!“

لوگوں کی بے ساختہ مسکراہٹوں پر سپاہی کھسیا گیا۔ تفریح کی غرض سے آنے والے کسی کو نہیں جانتے، اپنی موج مستی میں گم ہوتے ہیں۔ سبھی نے انکار کیا۔ ایک سپاہی بولا۔ ”چلو شریف علی! دونوں ہمیں دیکھ کر بھاگ گئے ہیں۔ ان بے چاروں کو کیا علم کہ وہ کون تھے۔ چلو بھئی مجمع ختم کرو..... چلو شاباش..... اگر اُن دونوں میں سے کوئی دکھائی دے تو فوراً ہمیں گیٹ پر مطلع کرنا۔ ٹھیک ہے ناں!“

اُس نے ڈنڈا لہرا کر تماشائیوں کو تتر بتر کیا اور وہ گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔ میری جان میں جان آئی۔ میں پہاڑی کے پاس ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر تاکا جھانکی کرنے لگا۔ کھالا دکھائی نہیں دیا۔ کہیں چھپ گیا تھا یا چمن زار سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مجھے وہ ہیرو ٹائپ شخص بھی کہیں نظر نہ آیا۔ وہ اپنے ڈیل ڈول سے ہار ماننے والا نہیں لگتا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو بلانے کے لیے بھاگ نکلا تھا یا کھالے سے نمٹنے کے لیے کوئی اسلحہ لینے گیا تھا۔

میرا خیال ٹھیک نکلا۔ لمبے بالوں والا موبی دو ساتھیوں سمیت آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ چڑیا گھر والی سمت سے برآمد ہوا تھا۔ اُس نے شرٹ نہیں اُتار پھینکی تھی اور اب بائی ٹیک بنیان پہن رکھی تھی۔ بال سوکھ چکے تھے جبکہ پینٹ ابھی گیلی تھی۔ تینوں نے جائے وقوعہ پر کھڑے ہو کر اطراف میں نظریں دوڑائیں۔ کھالا وہاں ہوتا تو دکھائی دیتا۔ موبی کولہوں پر ہاتھ رکھے وہیں رُک گیا جبکہ اُس کے دونوں ساتھی پارک میں اِدھر اُدھر گھومنے لگے۔ مجھے اُن کی حماقت پر ہنسی آئی۔ جس نے کھالے کو دیکھ رکھا تھا، وہ وہیں کھڑا تھا جبکہ وہ جو اُس کی شکل سے ناآشنا تھے، اُسے تلاش کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے۔

موبی مضطربانہ انداز میں ٹہلتے ہوئے میرے قریب آیا۔ دونوں ہاتھوں کی اُنگلیوں سے بالوں کو پیشانی سے ہٹاتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”زندہ نہیں چھوڑوں گا حرامزادے کو۔“

میں نے پوچھا۔ ”آپ کس کو تلاش کر رہے ہیں؟“

اُس نے غصہ بھری نگاہ مجھ پر ڈالی اور ہنکارا بھر کر رہ

گیا۔ میں نے کہا۔ ”ابھی پولیس والے آپ کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔“

”پولیس والوں کی تو.....“ اُس نے نہایت واہیات لہجے میں کہا، پھر ٹھٹک گیا، بولا۔ ”تم کتنی دیر سے یہاں ہو؟“

میں نے کہا۔ ”جب آپ کی لڑائی ہو رہی تھی، تب یہاں آیا تھا۔“

اُس نے مجھ میں دلچسپی لی۔ بولا۔ ”میرے ساتھ لڑنے والا کدھر گیا؟“

اصولاً اُسے پوچھنا چاہیے تھا کہ اُسے مار مار کر ادھ موا کرنے والا کہاں گیا مگر وہ مار کھانے والی بات کو سرے سے گول کر گیا تھا۔ ایسا اعتراف کرنے سے انا پر چوٹ پڑتی تھی۔

میں نے مخالف سمت میں ہاتھ کا اشارہ کیا۔ ”ادھر بھاگ گیا۔ پولیس والے اُس کے پیچھے لگے تھے مگر وہ کون تھا؟“

وہ بولا۔ ”میں اُس حرامزادے کو نہیں جانتا۔“

”پھر لڑائی کیوں ہوئی تھی؟“

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ خاصا خوب رُو انسان تھا مگر کھالے کی ٹھوکروں نے اُس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ ایسے میں اُس کے ساتھی بے نیل مرام لوٹ آئے۔ اُن کی باہمی گفتگو کو سن کر مجھے علم ہوا کہ اُس ہیرو ٹائپ شخص کا پورا نام محبوب الحسن تھا۔ تینوں کھالے کو غائبانہ گالیاں دیتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

کھالے نے کسی طرف سے بھی سر نہیں نکالا تھا۔ غالب خیال یہی تھا کہ وہ اپنا کام کر کے رخصت ہو گیا تھا۔ میں نے بھی چمن زار سے نکلنے کا ارادہ کر لیا۔ اُس کا انتظار فضول تھا۔ پارکنگ ایریا میں موبی اور اُس کے دونوں ساتھی ایک کار میں بیٹھے دکھائی دیے۔ وہ اب بھی کھوجتی نظروں سے گیٹ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ناگاہ پارکنگ میں کھڑی ایک فور ویل جیپ کے بونٹ کے پار سے جھانکتا ہوا کھالے کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ موبی کی کار سے کچھ ہی فاصلے پر چھپا کھڑا تھا۔ چونکہ موبی اور اُس کے ساتھی میری طرف متوجہ تھے، اس لیے میں اُسے کوئی اشارہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میرا دماغ بڑی تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ یقیناً کھالا موبی کی کار کو نہیں پہچانتا تھا اس لیے وہ ادھر اُدھر دیکھ کر جیپ کے عقب سے نکل کر میری جانب بڑھنے لگا۔

ایسے ہی وقت میں موبی کی نگاہ اُس پر پڑ گئی۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے کار سے اُترا اور کھالے کی طرف دوڑ پڑا۔ میں بری طرح گھبرا گیا۔ اُس کے داہنے ہاتھ میں بڑا سا خوف ناک پستول دبا ہوا تھا جسے وہ دوڑتے ہوئے لہراتا جاتا تھا۔

میں بے اختیار حلق کے بل چیخا۔ ”کھالے! ذرا سنبھل کے.....“

ساتھ ہی میں نے کھالے کو ہاتھ کے اشارے سے [illegible] کہ موبی اس پر بائیں سمت سے حملہ آور ہونے والا ہے۔ کھالے نے موبی کو دیکھا تو اچانک ٹھہر گیا جبکہ موبی کا ایک ساتھی موبی کے تعاقب میں جبکہ دوسرا میری طرف دوڑ پڑا۔ میرے اعصاب تن گئے۔ ابھی تک میرا اور کھالے کا تعلق چھپا ہوا تھا، خیر تھی۔ اب طشت از بام ہو گیا تھا لہٰذا خیر رہی تھی۔ موبی کا ساتھی کاروں کے بیچ زگ زیگ کے انداز میں دوڑتا ہوا خطرناک ارادے کے ساتھ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اچانک فائر کی خوف ناک آواز فضا میں گونجی۔ غیر ارادی طور پر میں نے کھالے کو دیکھا تو میرا سانس سینے میں ہی کہیں گھٹ کر رہ گئی۔

میری نظروں کے سامنے کھالا فائر کی آواز کے ساتھ اُچھل کر زمین پر اوندھے منہ گر گیا جبکہ موبی اُس کے سر پر کھڑا پستول ہاتھ میں لہرا کر چیخ رہا تھا۔ میرے کانوں تک اُس کی بے ہنگم چیخ و پکار پڑ رہی تھی مگر سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پارکنگ ایریا میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ لوگ چلاتے ہوئے وہاں سے دور بھاگ رہے تھے۔

اسی اثنا میں موبی کا ساتھی میرے قریب پہنچ گیا۔ میں چونکہ کھالے کی طرف متوجہ تھا جو یقینی طور پر گولی کھا کر زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا اس لیے موبی کے ساتھی کے پہلے وار سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکا اور رُخسار پر زوردار مُکا لگتے ہی پیٹ کے بل لڑھک گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے رقصاں ہو گئے۔ میں جب تک سنبھل کر اُٹھتا، حملہ آور مجھ پر دوسرا حملہ کر چکا تھا۔ وہ مجھے رگیدتا ہوا جھیل کی آہنی ریلنگ لے گیا اور گردن سے پکڑ کر زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ اُس کے اس مسلسل عمل سے میری کمر بار بار ریلنگ کی اُبھری ہوئی نوکوں سے ٹکرا رہی تھی اور شدید تکلیف کا احساس میرے وجود میں اترتا جاتا تھا۔

[illegible] وقت میں نے اُسے پیچھے دھکیلا۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹا پھر پوری قوت سے ٹکر مارنے کی غرض سے میری سمت بڑھا۔ میں بجلی کی سی مستعدی سے ایک جانب ہٹ گیا۔ وہ اپنی جھونک میں ریلنگ سے ٹکرایا اور دوہرا ہو گیا۔ اُس کے پیٹ میں ریلنگ کے نوکیلے راڈ چبھ گئے تھے۔ میں نے اُسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر پوری قوت سے اُسے لات ماری۔ وہ [illegible] کر سیدھا ہوا، پلٹا پھر میرا طوفانی مکا چہرے پر وصول کر کے زمین پر بیٹھ گیا۔

میں نے اُچھل کر اپنی کہنی پوری قوت سے اُس کے سر [illegible] دی۔ وہ ”ہائے“ کی دردناک آواز حلق سے خارج کرتا ہوا [illegible] ہوں ہو گیا۔ ایسے ہی وقت میں پھر فائر کا ہولناک دھماکا [illegible] گونجا جس کے ساتھ ہی ایک سماعت شکن انسانی چیخ [illegible] گونجی۔ میرا دل دہل گیا اور میں اپنی کہنی کو مسلتے ہوئے [illegible] کر کھالے کی طرف دوڑا۔ پارکنگ کا وسیع ایریا اس [illegible] انسانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ لوگوں نے، جو وہاں [illegible] ہوئے تھے، اپنی اپنی گاڑیاں وہاں سے نکال لی تھیں اور اب [illegible] رویہ سڑک پر تماشائی بنے کھڑے تھے۔ میں آدمیوں کے بیچ میں سے نکل کر جونہی اُس جگہ پر پہنچا جہاں کچھ لمحے قبل کھالا زمین پر گرا ہوا تھا تو دیکھا کہ کایا پلٹ چکی تھی۔ کھالے کی جگہ پر موبی زمین پر گرا خون میں لت پت تڑپ رہا تھا۔ کھالا چند قدموں کی دوری پر مجھے دو کاروں کے بیچ میں [illegible] ہوا دکھائی دیا۔ اُس کے عقب میں دو پولیس والے دوڑ رہے تھے۔ کاروں سے آگے نکل کر وہ رُکا، پلٹا اور فضا میں پستول لہرانے لگا۔

اپنے تعاقب کاروں کو خوفزدہ کر کے خود سے دور رکھنے کے لیے اُس نے ایک ہوائی فائر کیا اور حلق کے بل چیخا۔ ”خبردار! جو بھی میرے قریب آیا، زندہ نہیں بچے گا۔“

اُس کے پیچھے بھاگنے والے جہاں کے تہاں رُک گئے۔ وہ سڑک کے کنارے بنے ہوئے فٹ پاتھ پر دوڑنے لگا۔

ایسے ہی وقت میں مجھے اپنے داہنی جانب ایک سپاہی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ چونکہ یہ وقت معاملہ فہمی کا نہیں تھا اس لیے میں نے لمبی جست بھری اور کھالے کی مخالف سمت میں، مظفر گڑھ جانے والی سڑک پر دوڑ لگا دی۔ یہ میرا بے ساختہ اقدام تھا جو میرے حق میں بہتر ثابت ہوا کیونکہ [illegible] خالی تھا اور گیٹ پر تعینات پولیس اہلکار اس وقت [illegible] میں ہنگامی صورت حال سے نبرد آزما تھے۔ میرے [illegible] میں بوٹوں کی خوفناک دھمک اور ”وہ گیا، پکڑو“، جانے نہ [illegible] جیسی ملی جلی آوازوں کا شور بپا تھا جس نے میری رفتار کو [illegible] مہمیز کر دیا تھا۔ چند ہی منٹوں میں، میں اپنے پیچھے [illegible] والوں سے کافی مہلت حاصل کرنے میں کامیاب [illegible] تقریباً دو کلومیٹر کا فاصلہ دوڑتے ہوئے طے کرنے کے [illegible] اُس پوش علاقے سے نکل کر پُرہجوم آبادی میں داخل [illegible] جہاں میرے لیے چھپنا قدرے آسان تھا۔ میں [illegible] کر اپنے تعاقب کنندگان کا جائزہ لیا۔ وہ خاصے فاصلے [illegible] دیے۔

[illegible] دھوکا دینے کی غرض سے ایک تنگ اور معروف بازار میں گھس گیا۔ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کافی دور تک نکل گیا۔ سمت کا دھیان رکھتے ہوئے چکر کاٹ کر دوسرے بازار میں سے گزرتا ہوا دوبارہ سڑک پر آ گیا۔ ایک ہی وقت میں مجھے نیلے رنگ کی پولیس وین اور سٹی بس دکھائی دیں۔ میں نے فی الفور بس میں گھس کر خود کو پولیس والوں کی متلاشی نظروں سے اوجھل کر لیا۔ بس مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ میں بہ مشکل اپنی جگہ بنا پایا تھا کہ بس روانہ ہو گئی۔ بس شیر شاہ بائی پاس سے آ رہی تھی۔ ملتان کے وسطی بس اسٹاپ ڈیرا اڈا کی طرف جا رہی تھی۔ یعنی میں پھر پارک کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے سوا میرے پاس چارہ کار نہیں تھا۔ میں نے پارک کے داخلی گیٹ کا جائزہ لینے کی کوشش کی مگر رش کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ بس وہاں پر مسافروں کو اُتار کر آگے بڑھ گئی تو میرے دم میں دم آیا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد میں ڈیرا اڈا کے چوک میں اُتر گیا۔

عین سامنے ایک ہوٹل دکھائی دیا۔ محفوظ ہونے کا احساس پاتے ہی بھوک ستانے لگی۔ دوپہر میں کھایا ہوا کھانا اچھل کود اور سفر کی دھکم پیل میں ہضم ہو گیا تھا۔ ہوٹل میں گھس کر ایک خالی میز پر بیٹھ گیا۔ کھانے کا آرڈر دیا اور کھالے کے بارے میں سوچنے بیٹھ گیا۔

نہیں معلوم تھا کہ وہ کس حال میں تھا۔ پہلے فائر کی آواز سنتے ہی میں نے اُسے فرش پر لیٹے دیکھا تھا۔ دوسرے فائر کی آواز پر موبی کو خون میں لت پت تڑپتے دیکھا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی نکلتا تھا کہ موبی کا نشانہ چوک گیا تھا۔ وہ بدو لڑائی میں وہ کھالے سے ہزیمت اُٹھانے کے بعد اپنے پستول سے بھی دستبردار ہو گیا تھا اور کھالے نے، جب کوئی بات بنتی نہیں دیکھی، اُسے گولی مار دی ہوگی۔ اگلا منظر جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ وہ پستول لہراتا ہوا وہاں سے بھاگ رہا تھا۔ اُس کے متعاقب اس کی دھمکی سن کر رُک گئے تھے۔ پھر خدا جانے وہ پولیس والوں کی گرفت میں آ گیا تھا یا بھاگ نکلا تھا۔ اُس کی پھرتی اور دلیری کو مدنظر رکھتے ہوئے اغلب اُمید تھی کہ وہ جُل دے کر اب تک تور پور پہنچ چکا ہوگا۔ موبی زندہ تھا یا مر گیا تھا؟ اس بارے میں کچھ کہنا محض قیاس تھا۔

کھانا کھانے کے دوران بھی میرے ذہن میں گزشتہ واقعات کی فلم اپنی تمام تر ہولناکیوں سمیت چلتی رہی۔ تیز پتی والی چائے پیتے ہوئے پہلو میں ایک نئی کسک جاگ گئی۔ اگر کھالا ہاتھ نہیں لگا تھا تو اب تک پولیس میری اور کھالے کی تلاش میں تور پور پہنچ چکی ہوگی۔ موبی کی موت واقع ہونے کی صورت میں موبی کے ساتھیوں نے اسا کی نشاندہی کر دینا تھی

جو کھالے کے بارے میں معلومات فراہم کرسکتی تھی۔ اگر موبی مرنے سے بچ گیا تھا تو بذاتِ خود اسما کا نام پولیس کو دے دیتا۔ یعنی دونوں صورتوں میں ہم قانون کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے۔ ہاں! تیسری صورت یہ نکلتی تھی کہ اسما کھالے کے بارے میں لب کشائی نہ کرتی مگر یہ ممکن دکھائی نہیں دیتا تھا۔

شکم سیرابی نے ذہن کی آبیاری کردی تھی۔ سوچنے کی صلاحیتیں عود کر آئیں۔ سجھائی دینے لگا تھا کہ مجھے منہ اُٹھائے نور پور نہیں جانا چاہیے۔ کسی محفوظ جگہ پر پہنچ کر نور پور کے حالات کا جائزہ لینا چاہیے یا اسما اور کھالے کو ڈھونڈنا چاہیے۔ دونوں میں سے کوئی بھی مل جاتا تو حالات سے آگہی ہو جاتی۔ ایک نئی پریشانی جاگ پڑی، میرے پاس اسما سے رابطے کی کوئی سبیل نہیں تھی۔ نور پور میں سیلولر کنکشنز نہ ہونے کی وجہ سے کسی کے پاس موبائل فون نہیں تھا۔ ابھی تک نور پور اور اطراف میں کسی جگہ پر بھی کوئی سیلولر ٹاور نصب نہیں ہوا تھا۔ دل کو ایک ذرا تسلی ہوئی کہ خانزادوں کے پاس کارڈ لیس فونز کی سہولت موجود تھی۔ میں امیر نواز اور بخت خان سے رابطہ کرکے نور پور کے حالات کے بارے میں دریافت کرسکتا تھا۔

ہوٹل سے نکل کر یو شکل کی مارکیٹ کے کارنر میں واقع ایک 'پی سی او' پر پہنچا۔ امیر نواز کا نمبر ایک چٹ پر لکھ کر دکاندار کو دیا۔ اُس نے بہتیری کوشش کی مگر رابطہ نہ ہو پایا۔ پھر میں نے بخت خان کا نمبر دیا۔ میری بدقسمتی شاید پورے جوبن پر تھی کیونکہ بخت خان کا نمبر بھی نہیں لگا۔ دکاندار نے کہا۔ "نہیں بھائی صاحب! شاید متعلقہ ایکس چینج بند ہے یا لائن میں گڑبڑ ہے۔"

میں مایوس ہوکر پھر سڑک پر آن کھڑا ہوا۔ نور پور کے خانزادوں کے لینڈ لائن نمبر چوک قریشی میں تھے جہاں پر اُنہوں نے کارڈلیس فون کے اونچے ایریل نصب کر رکھے تھے۔ چوک قریشی والی ایکس چینج آئے روز فنی خرابیوں کا شکار ہوتی رہتی تھی جس کا واویلا امیر نواز بہ کثرت کرتا رہتا تھا۔

رات خاصی گہری ہونے لگی تھی۔ دُکانیں بند ہونے لگیں۔ زیادہ دیر تک یہاں ٹھہرنا میرے لیے کسی نئی پریشانی کا پیش خیمہ بن سکتا تھا۔ اتنے بڑے شہر میں سے کھالے کو ڈھونڈ نکالنا ممکن تھا نہ ہی اُس کے اتفاقاً مل جانے کی اُمید پر تکیہ کرتے ہوئے شب کی آوارگی میں گزاری جاسکتی تھی۔ ڈیرا اڈا سے روانہ ہونے والی ویگنیں چمن زار والے راستے سے مظفر گڑھ جاتی تھیں۔ مجھے پکڑ لیے جانے کا خوف لاحق تھا اس لیے میں جنرل بس اسٹینڈ پر سے بس یا ویگن پکڑ لے ارادے سے کسی رکشے کو دیکھ رہا تھا۔

ایسے ہی وقت میں میرے قریب سے ایک ڈارک کار نہایت کم رفتار سے گزری۔ چند قدم آگے جا کر بریک لگ گئے۔ میں اُسے نہایت سرسری انداز میں د رکشے کا انتظار کرنے لگا۔ میں سمجھا تھا کہ کار والے مار سے کچھ خریدنے کے ارادے سے رُکے تھے مگر تب طرح چونکا جب کار ریورس ہو کر عین میرے سامنے گئی۔ کار کے دونوں دروازے یکبارگی کھلے اور دو افراد معمولی تیزی سے اُتر کر میری جانب بڑھے۔ میری چھٹی نے خطرے کا الارم بجا دیا۔ جب اگلے گیٹ سے نکل کر تک پہنچنے والے شخص کا چہرہ دکھائی دیا تو میرا دل دھک رہ گیا۔ وہ موبی کا ساتھی تھا جسے میں نے پارک کی ریلنگ پاس پہلوانوں کے سے انداز میں خوب ٹھونکا بجایا اور پچھاڑ کے رکھ دیا تھا۔

ناساعد اور کبیدہ خاطر صورتِ حال کی سنگینی کو سمجھنے مجھے بہت دیر ہوچکی تھی۔ دونوں میرے سر پر پہنچ تھے۔ میرے بارگزیدہ نے سیاہ رنگ کا لیدر کوٹ پہن رکھا جبکہ اُس کے ساتھی نے ہلکے رنگ کی نفیس سی جرسی پہن تھی۔ اسے میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ سیاہ کوٹ میرے مقابل ٹھہر کر خشونت بھری نظروں سے مجھے گھو لگا۔ میں نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا اور پیچھے ہٹ کر کہا۔ "کیا بات ہے؟ کون ہو تم لوگ اور اس مجھے کیوں گھور رہے ہو؟"

جرسی والا اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر بولا۔ "زور کیا تم نے پہچاننے میں کوئی غلطی تو نہیں کی؟"

"نہیں......" زور آور نے کڑی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی کوٹ کی پاکٹ سے اپنا ہاتھ نکال لیا۔ میرے جسم کا خون میری آنکھوں میں کھنچ آیا۔ اُس کے ہاتھ میں ننھا سا پستول دبا ہوا تھا جس کی نال میرے سینے کی طرف اُٹھی ہوئی تھی۔ "کوئی بھی حرکت کرو گے تو ڈھیر کردوں گا۔ چلو...... گاڑی کی طرف چلو!"

اُس کے سنگین اور تحکمانہ لہجے نے اُس کے عزائم آناً فاناً آشکار کردیے۔ وہ مجھے اغوا کرکے کہیں لے جا رہا تھا۔ کہیں مار پھینکنے کا ارادہ رکھتا تھا یا مجھے پولیس کی تحویل میں دینے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ ابتدائی خوف اور کیفیت سے میں اتنی دیر میں چھٹکارا حاصل کرچکا تھا تہیّہ کرچکا تھا کہ میں اُن کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔

میں نے کہا۔ "مگر تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟ میں تمہیں نہیں جانتا اور نہ ہی تم سے کبھی ملا ہوں۔ کوئی غلط فہمی......"

اُس نے غرا کر کہا۔ "جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو ورنہ......"

میں نے ایک نظر پستول کی نال کو دیکھا، اُس کی آنکھوں میں پھیلی بربریت کو پرکھا اور اُسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر پستول پر ہاتھ ڈال دیا۔ اُسے شاید مجھ سے ایسی پھرتی کی توقع نہیں تھی، اس لیے دھوکا کھا گیا۔ پستول پر اُس کی گرفت مضبوط تھی مگر اب وہ مجھ پر فائر نہیں کرسکتا تھا کیونکہ ہم دونوں کے ہاتھوں میں دبے ہوئے پستول کی نال کا رُخ آسمان کی طرف تھا۔ میں نے دایاں گھٹنا پوری قوت سے اُس کی ٹانگوں کی بیچ دے مارا۔ وہ 'اوغ' کی آواز نکال کر گھٹنوں کے بل فٹ پاتھ پر ڈھے گیا۔ میرا دوسرا وار اُس کے سینے پر پڑا۔ پستول پر اُس کی گرفت دم توڑ گئی اور وہ کمر کے بل سڑک پر جا گرا۔ میں پستول کو ہاتھ میں سیدھا کر ہی رہا تھا کہ اُس کے ساتھی نے، جسے میں جلد بازی میں بھلا بیٹھا تھا، پوری قوت سے میری گردن کے عقبی حصے پر مکا دے مارا۔ اُس نے شاید اپنے بدن کی پوری طاقت مکے پر صرف کردی تھی کیونکہ میں زمین پر چت گرے ہوئے زور آور پر دھڑام سے گر گیا۔ پستول میرے ہاتھ سے نکل کر فٹ پاتھ پر دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ زور آور کے حلق سے دبی دبی چیخ برآمد ہوئی اور اُس نے مجھے بانہوں کے حصار میں جکڑ کر بھینچ لیا جبکہ اس کے ساتھی نے مجھ پر ٹھڈوں کی بارش کردی۔

میں بہ یک وقت دو محاذوں پر نبرد آزما تھا۔ زور آور صرف نام کا زور آور نہیں تھا بلکہ اُس کی آہنی گرفت کے سبب میری سانس رُکنے لگی تھی جبکہ اُس کے ساتھی کی پے در پے لگنے والی ٹھوکروں نے مجھے دن میں تارے دکھا دیے تھے۔ میں نے سانس روک کر، دونوں ٹانگیں اُٹھا کر پوری قوت سے گدھے کی طرح جھاڑیں۔ مجھے جرسی والے کی پوزیشن کا علم نہیں تھا مگر میرا 'تکا' کام کر گیا۔ میری دولتی اُس کے سینے یا کندھوں پر پوری قوت سے لگی تھی اور اُس کا سر دکان کی دیوار سے جا ٹکرایا تھا۔ اُس کے حلق سے نکلنے والی چیخ سن کر زور آور نے دانت پیستے ہوئے اپنی بانہوں کی جکڑن میں خطرناک حد تک اضافہ کردیا۔ میں نے خود کو چھڑانے کے لیے اپنی پوری قوت صرف کر ڈالی مگر اُس کی بانہوں کا حلقہ نہ ٹوٹا۔ اور کچھ نہ سوجھا تو میں نے اُس کے ماتھے پر زوردار ٹکر رسید کی۔ اُس کی گرفت پل بھر کو کمزور ہوئی۔ میں نے پے در پے تین چار ٹکریں رسید کیں تو اُس کے ہاتھ کھل گئے۔ ماتھے کی جلد پھٹ گئی اور خون رسنے لگا۔ اُس نے دو تین مرتبہ سر کو دائیں بائیں جھٹک کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر میں نے اُسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور پھیپھڑوں میں لمبی سانس اُتارتے ہوئے مکوں اور گھونسوں کی بارش کردی۔ بائیں رخسار کی جلد بھی پھٹ گئی۔

زور آور کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ میرا یہاں سے فی الفور بھاگ نکلنا ضروری تھا۔ میں اُچھل کر کھڑا ہوا۔ عین اسی وقت مجھے زور کا دھکا لگا اور میں زور آور کے اوپر سے ہوتا ہوا سڑک پر جا گرا۔ میرا سر کار کے پچھلے ٹائر سے ٹکرایا۔ ذہن بھک سے خالی ہوگیا۔ سر جھٹکا لیکن اپنے اوسان ٹھکانے پر لانے میں کئی قیمتی لمحے میرے ہاتھ سے نکل گئے۔ زور آور کے ساتھی نے جس کا سر دیوار سے ٹکرایا تھا، مجھے بالوں سے پکڑ کر اُٹھا لیا۔ تکلیف سے میرے دانت بھنچ گئے۔ جونہی اُس نے میرے منہ پر تھپڑ مارا، میں نے نیچے جھک کر اُس کی ٹانگوں میں ہاتھ ڈالا اور اس کے تنومند جسم کو اوپر اُٹھا کر پوری قوت سے سڑک پر پٹخ دیا۔ اُس نے اُٹھنے میں دیر نہیں کی مگر کمر پر ہاتھ رکھ کر پھر ڈھے سا گیا۔ میں نے فٹ بال کو کک مارنے کے انداز میں دایاں پیر اُس کے منہ پر دے مارا۔ وہ چوٹ کھا کر پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ میں نے دیوار کی جانب چھلانگ لگائی اور پیروں کے فٹ پاتھ پر ٹکتے ہی مارکیٹ کی مخالف سمت میں دوڑ لگادی۔

اپنے عقب میں اچانک بلند ہونے والے شور نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ ہماری لڑائی کو دیکھنے کے لیے بہت سے تماشائی وہاں جمع ہوگئے تھے۔ میں ایک ذرا ٹھہرا، پلٹا اور دیکھا۔ میدان صاف تھا۔ کار میں بیٹھا ہوا ڈرائیور کار کا دروازہ کھولے کھڑا چیخ رہا تھا۔ اُس کی چیخ اچانک ہی پولیس سائرن میں دب گئی۔ تیز ہوٹر کی ہولناک آواز سن کر میرا دل دھک سے رہ گیا اور میں اُچھل کر فٹ پاتھ پر ایک طرف کو دوڑ پڑا۔ مارکیٹ ختم ہوگئی۔ کوٹھیوں کا دراز سلسلہ شروع ہوگیا۔ میں فٹ پاتھ سے اُتر کر سفید رنگ کی ایک جدید طرز کی کوٹھی کی دیوار اور سڑک کے بیچ بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی کیاریوں اور پودوں کو پھلانگتا ہوا زیادہ دور تک نہیں پہنچ پایا تھا کہ دو موٹر سائیکلوں پر سوار سیاہ وردی پوش میرے سر پر پہنچ گئے۔ ایک نے مجھ سے آگے نکل کر تیزی سے ٹرن لیا اور کوٹھی کے گیٹ کے سامنے بنے ہوئے پارکنگ وے پر موٹر سائیکل روک لی۔ دوسرے نے مجھے دائیں پہلو سے آن گھیرا۔ میں نے سراسیمہ نگاہوں سے اُنہیں، پھر پیچھے کی سمت دیکھا۔ پولیس وین کو بالکل قریب پا کر ناچار مجھے رُکنا پڑا۔ پارکنگ وے پر ٹھہرے ہوئے پولیس اہلکار نے اپنا ہیلمٹ اُتارا،

ہولسٹر سے ریوالور نکالا اور مجھ پر تان لیا۔ میرے پہلو میں کھڑے ہوئے لمبے تڑنگے سپاہی نے بھی ایسا ہی کیا۔ جونہی میری نگاہ وین کی روف وِنڈو میں کھڑے ہوئے سپاہی کے ہاتھ میں دبی شارٹ گن پر پڑی، میرے اوسان خطا ہوگئے اور رہے سہے مزاحمانہ ارادے بھی دم توڑ گئے۔

میرے سامنے کھڑے سپاہی نے للکارا۔ ''تم میرے نشانے پر ہو۔ جتنا بھاگنا تھا، بھاگ لیا۔ ہاتھ اپنے سر پر رکھ لو۔ چلو شاباش!''

میں نے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے۔ سڑک پر کھڑا ہوا موٹر سائیکل سوار اُتر کر میرے عقب میں آیا۔ کمر پر ریوالور کی نال کا احساس بڑا تکلیف دہ تھا۔ اس دوران پولیس کی موبائل وین سے دو تین سپاہی اُتر کر اس ملائم گھاس والے چھوٹے سے لان میں آگئے۔ اُن میں سے ایک، جس کے شناختی بیج پر ملک ارشد لکھا ہوا تھا، نے مجھے سرتا پا کریدتی نظروں سے گھورا اور استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ''بڑی پھرتی دکھائی تم نے؟''

میں بُری طرح پھنس گیا تھا۔ میرے پاس سوائے خاموش رہنے کے کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ ملک ارشد نے اپنے ساتھیوں کو میری جامہ تلاشی لینے کا حکم دیا۔ بڑے ماہرانہ انداز میں میری تلاشی لی گئی۔ قدرے بھاری تن و توش والے نے میری جیب میں موجود تمام رقم نکالی اور گنے بغیر اپنی جیب میں ڈال لی۔ اسی اثنا میں زورآور کی ڈارک بلو کار بریکوں کی تیز چرچراہٹ کے ساتھ پولیس وین کے متوازی آن رُکی۔ چند ہی لمحوں میں زورآور اور اُس کا ساتھی میرے سامنے کھڑے خشمگیں نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔

''تمہارا ساتھی کہاں ہے؟'' زورآور نے آگے بڑھ کر میرا گریبان پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔

میں نے اطراف میں کھڑے پولیس والوں کو دیکھا۔ اگر وہ موجود نہ ہوتے تو میں زورآور کو اُس کی گستاخی کا مزہ چکھا دیتا۔ کوشش کے باوجود اپنے لہجے کی تلخی پر قابو نہیں پاسکا اور جھنجلا کر بولا۔ ''میرا کوئی ساتھی ہوتا تو وہ میرے ساتھ ہوتا۔''

اُس کا جارحانہ رویہ دیکھ کر میرے اعصاب تن گئے۔ شکر ہوا کہ وہ دانت پیس کر، میرا گریبان چھوڑ کر ملک ارشد کی طرف گھوم گیا۔ پاٹ دار آواز میں بولا۔ ''ملک! اسے اریسٹ کرلو۔ یہ موتی کے قاتل کا ساتھی ہے۔''

''فکر نہ کر زورآور!'' ملک ارشد نے کہا۔ ''اس کے فرشتے بھی چیخ چیخ کر بتائیں گے کہ وہ نامراد کہاں روپوش ہوا ہے۔''

زورآور کے الفاظ میں پنہاں سنگینی میرا دل دہلا گئی۔ موتی مرچکا تھا۔ کمالے قاتل اور میں قاتل کا معاون قرار پاچکے تھے۔ میں نے اپنے دفاع میں کہا۔ ''یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ میں اکیلا ہوں اور اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔''

ایک گن بردار زور سے ہنسا۔ ''اُلو کے پٹھے! یہ دوڑا دوڑی ماں کی وصیت پر کررہے تھے کیا؟''

اُس کا لہجہ بڑا کٹیلا تھا۔ اُس نے میرا جواب سنے بغیر اپنے بوٹ کی ٹھوکر میرے گھٹنے کے عقبی حصے میں ماری۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور گھٹنوں کے بل گھاس والی زمین پر گر گیا۔ ملک ارشد نے میرے پیٹ میں ٹھوکر رسید کی۔ شاید یک طرفہ اعلانِ جنگ ہوگیا تھا کیونکہ سبھی اہلکاروں نے مجھ پر یلغار کردی تھی۔ کچھ دیر تک تو میں نے اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ پیر مارے، منت سماجت کی اور اپنی بے گناہی کا رونا رویا، پھر تھک گیا اور اپنا چہرہ بانہوں میں لے کر گٹھڑی بن کر ادھر اُدھر لڑھکنے لگا۔

جب مجھے پیٹنے والے تھک گئے، تب ایک بھاری بھرکم آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''اوئے ملک! تین سو دو لگوانے کا ارادہ ہے کیا؟ بس کر۔ بہت ہوگئی۔ اسے ویگن میں ڈال اور لاک اپ میں ڈال آ۔''

نہایت تکلیف دہ ٹھوکروں کی برستی ہوئی بارش رُک گئی۔ میں گھاس پر پڑا تھا اور میرے حلق سے متواتر کراہیں پھوٹ رہی تھیں۔ اُنہوں نے چند ہی منٹوں میں میرا منہ سر ایک کردیا تھا۔ جسم کا شاید ہی کوئی ایسا عضو تھا جس پر ٹھوکریں نہیں لگی تھیں۔ کرخت آواز پھر کانوں میں پڑی۔ ''اوئے نامراد! اب اُٹھ کھڑا ہو...... زیادہ مکر نہ کر ورنہ......''

میں نے کھڑا ہونے میں اپنی تمام تر قوتیں مجتمع کردیں مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ بہ مشکل ایک ثانیے کو کھڑا رہ پایا، پھر لہرا کر پہلو کے بل گر گیا۔ ملک ارشد کی ٹھوکر پسلیوں پر لگی۔ میں بلبلا کر رہ گیا۔ بھاری آواز والے نے آگے بڑھ کر میری بغل میں ہاتھ ڈالا اور کھینچ کر کھڑا کردیا۔ میری سانس پھولی ہوئی تھی اور حلق سے کراہیں خارج ہورہی تھیں۔ جب میں کوشش کے باوجود بھی اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ پایا تو اُس نے مجھے دھکا دے کر زمیں بوس کرتے ہوئے کہا۔ ''کھوتے دا پتر نہ ہو تو! سرکاری تواضع کی ہمت نہیں تھی تو محنت مزدوری کرتا، کوئی کام دام سیکھ لیتا۔ اوئے جوان! اسے کھینچ کر ویگن میں ڈال دے۔ چل، جلدی کر۔ ابھی وی آئی پی موومنٹ کے لیے روڈ کلیئر کرنا ہے۔ ہری اپ......''

میرا ایک بازو ملک ارشد نے پکڑا، دوسرا بازو ایک

بھاری مونچھ بردار سپاہی نے سختی سے پکڑا اور مجھے بے رحمی سے گھسیٹتے ہوئے ویگن تک لائے۔ باریک بجری والی سڑک پر گھسٹنے کی وجہ سے میرے جسم کا پچھلا حصہ بری طرح چھل گیا تھا۔ میں چیخ رہا تھا اور بے ربط انداز میں اُنھیں بتا رہا تھا کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا مگر وہ ماننے پر آمادہ نہیں تھے۔

میرے ساتھ پولیس والوں کا رویہ ایسا تھا جیسے ان کے ہاتھ کوئی اشتہاری مجرم لگ گیا تھا جس کی نوک پلک سنوارنا اُن کے فرائضِ منصبی میں شامل ہو۔ سرِعام انجام پذیر ہونے والے تماشے کو دیکھنے کے لیے بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے جنھیں ایک سپاہی کی دہاڑ، 'چلو بھئی، مجمع ختم کرو اور ٹریفک بلاک نہ کرو' نے منتشر کر دیا تھا۔

مجھے ویگن کے عقبی حصے تک لا کر وہ مجھے چھوڑ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگے۔ ملک ارشد اور بڑی مونچھوں والے نے مجھے گھسیٹ کر ویگن میں ڈال دیا۔ میرے جسم کا زیریں حصہ پہلے سڑک اور مابعد ویگن کے ڈالے سے رگڑ کھا کر بری طرح چھل گیا۔ ویگن کے فرش پر پھینک کر وہ آمنے سامنے سیٹوں پر براجمان ہو گئے۔ اُنھوں نے نخوت بھرے انداز میں مجھ پر اپنے پاؤں رکھ دیے۔ حوالدار نے موٹر سائیکل سواروں کو ہدایات دیں، ڈرائیور کو تھانے چلنے کا حکم دیا اور خود ویگن کے کیبن میں اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ ویگن اسٹارٹ ہوئی اور ان دیکھی منزل کی طرف رواں دواں ہو گئی۔

ہچکولوں کے بل پر جونہی میرا جسم فرش پر ہلتا جلتا، درد کی شدید ٹیسیں اُٹھتیں۔ منہ سے چیخ بھی نکل جاتی۔ ملک ارشد نے دایاں پیر اُٹھا کر زور سے میری پسلیوں پر مارا۔ "منہ بند رکھو ورنہ ہمیشہ کے لیے خاموش کرا دوں گا۔"

میں نے دانت بھینچ لیے۔ آج تک ایسی تذلیل اور مار پیٹ سے واسطہ نہیں پڑا تھا مگر یوں لگ رہا تھا جیسے میں ہمیشہ حالات کی زد پر ایسی ٹھوکریں کھاتا چلا آ رہا تھا۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش میں ریخت خوردہ بدن کی تکلیف کو برداشت کرنے کی کوشش کی تو یوں لگا جیسے میرا بدن کسی بڑے ٹرالر کے ان گنت پہیوں تلے آ کر کچلا گیا ہو اور اس کے درست ہونے کا امکان تک نہ رہا ہو۔ مجھ پر لمحہ لمحہ گراں گزر رہا تھا جبکہ ملک ارشد اور مونچھ بردار سپاہی جس کا نام فرید علی تھا، آپس میں کسی وفاقی منسٹر کی آمد پر رائے زنی کر رہے تھے۔ اچانک فرید کو میرا خیال آ گیا، بولا۔ "اس حرامی چڑے کا کیا کرنا ہے؟"

"جا کے حوالات میں ڈال کر روزنامچے میں درج کر دیتے ہیں۔ پھر سب انسپکٹر جانے اور اُس کا کام۔ ہمیں کیا؟"

فرید علی نے میرے پیٹ پر پاؤں کا زور بڑھاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "وہ اس کھوتے کو چڑی کا بچہ کہہ رہا تھا۔ میرا جی چاہا کہ اُسے کہوں کہ اس چڑی کے بچے کو اُٹھا کر ویگن میں ڈال دے۔ چپ رہا کیونکہ وہ تھانیدار صاحب کے سامنے بال کی کھال نکالنے بیٹھ جاتا ہے۔"

چھوٹے تھانیدار کے چھوٹے پن پر ملک ارشد بھی شکوہ کناں ہو گیا۔ بولا۔ "نیچے سے ترقی کر کے اوپر جانے والا افسر اور کمین سے خان یا چودھری بننے والا شخص ہمیشہ نیچ اور گری ہوئی حرکتیں ہی کرتا ہے۔"

"اگر ایسا نہ ہو تو پہچانا کیسے جائے؟"

"ہاں یار! تم سچ کہتے ہو۔ اس چڑے کی پاکٹ سے جو ملا، اُس کے چیلے نے اپنے پاس رکھ لیا اور گٹھلی ہماری جھولی میں ڈال دی ہے کم بختوں نے!"

تھانیدار کے سامنے 'جی، جی' کرنے والے اُس کی عدم موجودگی میں غبار دل نکال رہے تھے۔ وہ ویگن کے اگلے حصے میں بیٹھا تھا۔ کہیں دور چلا گیا ہوتا تو وہ غلیظ گالیوں سے سرفراز کرنے میں بھی لیت و لال سے کام نہ لیتے۔

اچانک ملک ارشد نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "سوبی کو تم لوگوں نے کیوں گولی ماری؟"

میں کراہا۔ "میں سوبی کو جانتا تک نہیں جی!"

"اچھا! پھر تو تم زور آور کو بھی نہیں جانتے ہو گے؟" اُس کے لہجے میں طنز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

جواباً نفی میں سر ہلا کر ملتجیانہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

وہ بولا۔ "تمہارا تعلق کس گینگ سے ہے؟ چھیکے مجھل کے لونڈے ہو؟"

یہ نام میرے لیے قطعاً اجنبی تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ فرید علی نے ڈانٹ کر کہا۔ "پانچ سیر کا سر ہلاتے ہو، ایک چھٹانک کی زبان نہیں ہلا سکتے۔ سیدھی طرح بات کرو ورنہ تمہیں لمبا لیٹ کر دوں گا۔"

میں نے تھوک نگلا۔ بولنا چاہا مگر زبان تالو سے چپک کر رہ گئی۔ اُس نے مجھے لمبا لیٹ کرنے کی دھمکی دی تھی جبکہ میں پہلے ہی اُن کے پیروں تلے چت پڑا تھا۔ ملک ارشد نے اوپر تلے دو چار نام اور گنوائے۔ میں کسی کو بھی نہیں جانتا تھا۔ ناموں کی ساخت ایسی تھی کہ میں سمجھ گیا کہ وہ مختلف جرائم پیشہ لوگوں کے گروہوں میں سے کسی جتھے کے ساتھ میرا تعلق کریدنا چاہتا تھا اور جاننا چاہتا تھا کہ میں کس گینگ کا رکن تھا۔ اُس کے اندازِ استفسار سے معلوم پڑتا تھا کہ زور آور اور

...ل سوبی کا تعلق کسی کریمنل گینگ سے تھا اور وہ اپنی تفتیش ...انداز اسی نقطہ نظر سے کر رہا تھا۔

فرید تفہیمی انداز میں سر ہلا کر بولا۔ "یہ یہاں کا واردات...ی لگتا۔ یا تو نیا نیا کسی گینگ میں شامل ہوا ہے یا کسی اور شہر ...ے آیا ہے۔ کیوں بے بھولے بدمعاش! کہاں سے آئے ...والا ہو رہے؟"

مجھے اپنی آواز بھی اجنبی سی لگی۔ "میں مظفر گڑھ سے آیا ہوں۔"

"وہاں بھی یہی کام کرتے تھے؟"

میں نے بے دھیانی میں پوچھ لیا۔ "کون سا کام؟"

اُس نے اپنی داہنی ہتھیلی کو گردن کے متوازی حرکت دیتے ہوئے مخصوص اشارہ کیا۔ "یہی..... کرائے پر خون ...رانے والا دھندا!"

میں نے جبڑے بھینچ لیے، بولا۔ "میں ایسا نہیں ہوں۔"

اُس نے مصنوعی ہمدردی سے 'چچ، چچ' کی اور پچکارنے ...کے سے انداز میں کہا۔ "تم تو واقعی ایسے نہیں ہو۔ تم تو بس ذرا 'واک شاک' کرنے گھر سے نکلے تھے اور ہم نے تمہارے ساتھ زیادتی کی کہ پکڑ کر ذرا 'پیار شیار' کر دیا۔ ہے ناں؟"

میں نے بے بسی سے آنکھیں موند لیں۔ ایسے میں ...یگن اوپر تلے تین چار موڑ کاٹ کر ایک جھٹکے کے ساتھ رُک گئی۔ فرید اور ملک ارشد اُترنے سے پہلے مجھ پر اپنے پلے ...ے جسموں کا پورا وزن ڈال گئے۔ فرید کا ایک پیر میرے ...ے پر چند ثانیوں کے لیے تھما تھا۔ تب میں نے بڑی مشکل حلق تک آئی کڑوی قے کو باہر آنے سے روکا تھا۔

...سب انسپکٹر دکھائی دیا۔ مجھ پر ایک نگاہ تنفر ڈال کر ...لات کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے اوجھل ہو گیا۔ ...ارشد نے مجھے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ چونکہ اُن کی ظالمانہ ...وں نے حکم کی بے چوں چراں تعمیل کا سبق مجھے ازبر ...ا دیا تھا، اس لیے دونوں ہاتھ سیٹوں پر ٹکا کر اُٹھنے کے لیے ...م کی تمام تر توانائی خرچ کر دی۔ عضو عضو سے صدائے ...ج بلند ہوئی مگر میں اُٹھ کر بیٹھنے اور پھر ویگن کے ڈالے کا ...ے کر اینٹوں کے فرش پر اُترنے میں کامیاب ہو گیا۔ ...وں تک ویگن سے ٹیک لگا کر ہانپتا رہا اور اطراف کا ...لیتا رہا۔ میں قدیم دور کی سالخوردہ عمارت پر مشتمل ...کی حدود میں کھڑا تھا۔ میرے اردگرد ملک ارشد اور ...ل کے علاوہ ان گنت وردی پوش موجود تھے۔ سپاہی ...ے کر سب انسپکٹر تک ہر عہدہ متحرک تھا۔

...مھری سراسیمہ، منت آمیز اور وحشت انگیز نگاہوں کے

جواب میں دونوں طنزیہ نظروں سے مجھے گھورتے رہے۔ فرید علی بولا۔ "اب کیا یہاں ہی کھڑے رہنے کا ارادہ ہے برخوردار؟"

میں نے التجا کی۔ "سر جی! میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔"

ملک ارشد نے ڈپٹ کر کہا۔ "نہیں کیا تو اب کر لو..... کون روکتا ہے تمہیں؟..... اب بک بک بند کرو اور گاڑی اڈے پر لگاؤ۔"

میرے احتجاج کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے فرید نے مجھے تھانے کی حوالات کی طرف دھکیلا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ حوالات کا منہ دیکھنے جا رہا تھا۔ آج تک لوگوں کی زبانی اس سرکاری مہمان خانے کے بارے میں جو کچھ سنا تھا اور کچھ دیر قبل پولیس والوں کا جو رویہ مجھے دیکھنے کو ملا تھا، اُسے مدنظر رکھتے ہوئے میں خاصا دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ ٹریلر اتنا ڈراؤنا تھا، فلم کیسی ہو گی؟ یہ سوچ کر دل لرز رہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں حوالات کا سلاخوں والا دروازہ کھول کر مجھے دھکا دے دیا گیا۔

میں ٹوٹے پھوٹے پلستر والے فرش پر گرا۔ نڈھال انداز میں اُٹھا۔ سامان سے یکسر عاری عام طول و عرض کے کمرے کا یک نظری جائزہ لیا۔ دیوار سے ٹیک لگائے دس بارہ افراد دکھائی دیے جن کے چہروں پر لکھی ہوئی عبارتیں بادی النظر میں ایک جیسی تھیں۔ ایک تیز چبھتی ہوئی آواز کانوں میں پڑی۔

"جیوندا رہ باچھا (بادشاہ)! وسدا رہ سدا رہ بھائی....."

مجھے علم نہ ہو سکا کہ بیٹھے ہوؤں میں سے کس نے مجھے اس تضحیک آمیز انداز میں خوش آمدید کہا تھا۔ ایک مریل مرنجاں، سیاہ ہونٹوں اور غیر معمولی حد تک بڑھے ہوئے بالوں والے نے مجھ پر طنزیہ نظر اُچھالی۔ "اڑے غنچے! ایسی غصے بھری نجر سے نہ دیکھ..... ماڑا قصور نہ ہووت، نہ ہم نے تجھے دعوت دے کر یہاں بلایا ہووے ہے....."

میں نے اُسے گہری نظروں سے گھورا۔ وہ ہتھیلیوں کے بل اُٹھا اور پاس آ کر مجھے سہارا دے کر اُٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ چھوٹے قد کا دبلا پتلا شخص تھا۔ مجھے اُٹھا نہ پایا تو ہانپتے ہوئے بولا۔ "اڑے او جالمو! ماڑا ساتھ دیو ناں، ماڑے سے نہ اُٹھایا جاوت اے۔ جالم (ظالم) پلے پو سے سانڈ کے ماتق بھاری ہے۔"

اس کی اعانت کے لیے ایک قدرے جسیم شخص پاس آ گیا۔ دونوں نے مل کر مجھے کھڑا کیا۔ قدم قدم چلاتے ہوئے دیوار تک لائے۔ بوسیدہ روئی والے گدے پر بٹھاتے ہوئے جسیم شخص نے پوچھا۔ "پولیس والے تمہیں کیوں پکڑ کر لائے ہیں؟"

"اڑے جا رے نامراد! نجر نہیں آوے کیا؟ موتیا آنکھوں پہ اُتر آیا یا کمرے پڑ گئے تیری نجر (نظر) کو...... غنچہ ہے ابھی بے چارہ۔ کھل کر مسکراوے گا تو پتا چلے گا ناں!"

میرا بدن ٹھنڈا ہونے لگا تھا۔ رو میں رو میں سے درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ شدید پیاس لگی تھی۔ اردگرد نظر دوڑائی۔ حوالاتی کمرے کے ایک کونے میں گھڑا دیکھ کر بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ "پ...... پانی......"

گھڑے کے قریب بیٹھا ہوا شخص پانی بھر لایا۔ جستی کٹورا خاصا میل آلود اور پچکا ہوا تھا۔ کراہت کا احساس ہوا۔ کراہت کو آنکھیں بند کر کے بھگایا جاسکتا تھا۔ پیاس سے جان نہیں چھڑائی جاسکتی تھی اس لیے میں نے کٹورا تھام کر آنکھیں بند کرلیں۔ پانی حلق سے اُترا تو کچھ سکون کا احساس ہوا۔

میرے پہلو سے جڑ کر بیٹھے ہوئے مہین شخص نے مجھ سے پوچھا۔ "کہاں سے آوت ہے لاڈے میاں...... اڑے غنچے! کیا جرم تیرے کھاتے میں پاوت ہے ان خبیثوں نے؟"

میں نے اُسے بہ غور دیکھا۔ اس کی عمر چوتھی دہائی میں داخل ہوچکی تھی۔ بے تحاشا پان خوری کی عادت نے اُس کے دانتوں کو چاٹ لیا تھا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ہمدردی کا غالب عنصر دکھائی دیا۔ مجھے خاموش پاکر حوالات کی نکڑ میں بیٹھے ہوئے قریبی مائل شخص نے جھومتے ہوئے کہا۔ "قانون کے رکھوالے چراغ لے کر رُخِ زیبا ڈھونڈنے نکلتے ہیں۔ کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹتے۔ کبھی رُخِ زیبا تو کبھی رُخِ نامراد اُٹھا لاتے ہیں۔ ہفتہ بھر سے یہی تماشا دیکھ رہے ہیں یہاں پر۔"

اُس کا لڑکھڑاتا لہجہ اور متورم چہرہ بتاتا تھا کہ وہ شراب پیے ہوئے تھا۔ میں نے دیوار کے ساتھ پشت ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ کچھ دیر کو خاموشی چاہتا تھا۔ جب سے ملتان کی حدود میں قدم رکھا تھا، پے در پے مصیبتوں سے دوچار ہو رہا تھا۔ مجھ سے جڑ کر بیٹھے ہوئے نے مجھے جھنجوڑ کر دریافت کیا۔ "اڑے بابا! جیالوں نے کیا مالش والش بھی کری ہے؟"

میں نے جھٹ سے آنکھیں کھولیں اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

"درد ہووے ہے کیا؟ بول ناں......"

میں نے آہستگی سے کہا۔ "پورا جسم دکھ رہا ہے۔"

اُس نے اپنے پہلو کی جیب میں سے بروفن کی گولیوں کا بولسٹر پیک نکالا۔ ایک ٹیبلٹ نکال کر تھماتے ہوئے اونچی آواز میں بولا۔ "او جانِ من! اک جرا (ذرا) پانی کا کٹورا بانکے کے لیے بھرت ناں!"

اُس کی آواز خاصی باریک تھی۔ لہجہ بھی بڑا عجیب سا تھا۔ اگر عام حالات میں وہ مجھ سے ملا ہوتا تو میں اُس کی شخصیت سے خاصا لطف اندوز ہوتا۔ اس وقت مجھے چونکہ کوئی شے اچھی نہیں لگ رہی تھی، اس لیے اُس کا اندازِ گفتگو بھی ناگوار گزر رہا تھا۔

"اڑے جبان پر رکھ ناں گولی کو۔ یہ چٹکی بجاتے میں درداں پیڑاں چھین لیوے ہے۔ ایک دم فسٹ کلاس کر کے گھوڑا بنا دیوے ہے۔ لو بابا!"

میں نے پانی کی مدد سے گولی حلق میں اُتاری اور کٹورا فرش پر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

میرے دونوں اطراف میں قطار باندھے بیٹھے ہوؤں نے میری شخصیت پر، شکل سے جھلکتے بھولپن پر اور جسم کے عریاں حصوں پر دکھائی دینے والے نیلوں پر رائے زنی شروع کردی۔ ایسے میں کمرے کے کونے میں چھیل کر لیٹے ہوئے شرابی نے سلاخوں والے جنگلے کے باہر کھڑے سپاہی کو مخاطب کیا۔ "اوئے کالے گھوڑے...... ہم سے بھی لائن مار ناں یار۔ ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔"

وہ شاید اُس کا کوئی جاننے والا تھا کیونکہ اُس کی آواز سن کر ہنستا ہوا قریب آیا اور سلاخیں تھام کر مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"اس خطرناک اشتہاری مجرم کو کہاں سے پکڑ لائے ہو؟"

"میں نہیں جانتا۔ پکڑ کر لانے والے لوٹیں گے تو پتا چلے گا کہ اس نے کیا واردات کی ہے۔" پولیس والے نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا اب ایسے لونڈے بھی بدمعاشیاں کرنے لگے ہیں یا قانون کی آنکھیں پھوٹ گئی ہیں؟"

اُس نے کندھے اُچکائے۔ "ایس ایچ او صاحب کچھ ہی دیر میں آنے والے ہیں۔ اُن سے پوچھ لینا۔"

وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ "اُس سے کیا پوچھوں گا؟ وہ تو نرا ہومیو پیتھک تھانیدار ہے۔"

میرے پہلو سے میرے بہی خواہ کی آواز پھوٹی۔ "اڑے واہ جی! کیا بات کرت ہے۔ ہومیو پیتھک تھانیدار...... انگریجی دواؤں سی گرمی ناں ہووت، دیسی دارا سی ٹھنڈک ناں ہووت...... ایک دم فسٹ کلاس بول بچن مارے ہے تم نے ابھی ڈاکٹر صاحب!"

"ابے تو چپ رہ چلے!" ڈاکٹر کہلائے جانے والے نے اُسے ڈانٹا اور پھر سپاہی سے محوِ کلام ہوگیا۔

گولی نے کافی افاقہ دیا۔ جسم کی تکلیف کم ہوئی تو سر میں

پن کا احساس بتدریج بڑھنے لگا۔ سر کے مخصوص درد اور ...ن کی از حد گرمی نے مجھے باور کرا دیا کہ میرا جسم ہولے ...بخار پکڑنے لگا تھا۔ میں متفکر ہوگیا۔ اس حالت میں، ...میرے پاس دوا دارو کی سہولت میسر نہیں تھی، بخار کا ہونا ...خطرناک تھا۔ میں نے اپنے ساتھ جڑ کر بیٹھے ہوئے فقرہ ...شخص سے مانگ کر بروفن کی ایک اور گولی معدے میں اُتاری۔ ڈاکٹر منور شاہ کی طویل رفاقت کے باعث مجھے علم تھا یہ دوا درد اور تکلیف میں آرام پہنچانے کے ساتھ ساتھ بخار کے زور کو بھی توڑنے کی زبردست اہلیت رکھتی تھی۔

حوالات کی مسافر خانے جیسی عجیب دُنیا کو اپنی آنکھوں سے پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ جتنے اشخاص وہاں موجود تھے، فضا میں اُتنی ہی بولیاں رچی ہوئی تھیں۔ کئی زبانیں، کئی لہجے اور ...کئی خیالات یکجا تھے۔ شام تک میرے بخار نے خاصی شدت اختیار کرلی۔ دبلے پتلے شخص، جس کا نام امیر شاہ معلوم ہوا تھا، نے تھانے کے قریبی چھپر ہوٹل سے چائے اور کیک رس منگوائے۔ پیراسیٹامول کی گولیوں کا پورا پتا منگوایا۔ پانی کے ساتھ دو گولیاں مجھے کھلا کر زبردستی کیک رس کھلائے اور چائے پلائی۔ باوجود اس کے کہ وہ میرا کچھ نہیں تھا، ہمارے ...مابین دوستی تو کجا، شناسائی کا رشتہ بھی موجود نہیں تھا، پھر بھی اُس ...کا ہمدردی آمیز رویہ دیدنی تھا۔ معدے میں کچھ پڑا تو جان میں جان آگئی۔

امیر شاہ کہہ رہا تھا۔ "اڑے یہ ڈاکٹر ہے سالا، ہومیو پیتھک ڈاکٹر! بیٹھا دارو پیوت پر کسی مجلوم (مظلوم) کو صلح ...لم نہ مارے ہے...... ادھر اپنے ہومیو پیتھک دارو خانے میں بھی سارا دن مجے (مزے) لوٹے، ادھر بھی مجے لوٹے ہے۔"

ڈاکٹر ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ "اوئے چلے! ابے جناب شیخ کا ...منہ بھی عجیب سارے جہان سے، جو یہاں پیو تو شراب ہے ...وہاں پیو تو ثواب ہے......"

اس کا لہجہ لڑکھڑا رہا تھا۔ "ایک لقمہ منہ میں ڈال کر سارا ...ن بکریوں کی طرح منہ چلانے والے دانڈو کی شان کو کیا ...جانیں۔ ہومیو پیتھک کی یہی ایک دوائی دُنیا کی ہر دوائی پر بھاری ہے۔"

وہ بات کرتے کرتے ایک طرف لڑھک گیا۔ پھر سنبھل بیٹھ گیا، بولا۔ "ہاں بھاری ہے! جس طرف بھی جاتی ہے، ...آگ لگاتی جاتی ہے۔ برف پگھلا دیتی ہے۔ بھلے سینے پر ...تیلی رکھ کر چائے پکا لو یا اصیل مرغ کو تڑکا لگا لو...... ہاں ...کی ہے۔ ہائے! شیخ بولی بہ صد انداز یہ دیوانے سے پر تم کیا جانو...... جگالی کرنے والے میمنے!"

اپنے لہجے سے وہ خاصا پڑھا لکھا انسان معلوم ہوتا تھا مگر بہت زیادہ پینے کی عادت نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اپنی رو میں بولے جا رہا تھا۔ اُسے یہ دھیان بھی نہ رہا کہ اُس کی بے ربط اور لایعنی باتوں پر کوئی توجہ دے رہا تھا یا نہیں۔ امیر شاہ نے ایک طنزیہ نظر اُس پر ڈالی، میری پسلی میں آہستگی سے کہنی چبھوئی، بولا۔ "سینے پر چاہ پکے یا ناں پکے۔ لاڈلے ڈاکٹر کے منہ کی کیتلی اُبلنے لگت ہے۔ سالا کہیں کا...... جرور کسی دن گٹر کی میر بھی کرے گا...... آہ! ماڑے کو جگالی کرنے والا آکھت ہے۔"

اچانک تھانے کی چہل پہل میں اضافہ ہوگیا تھا مگر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے حوالات کا بیرونی دُنیا سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ کسی نے بھی ادھر آنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ حوالاتیوں کے لیے چھپر ہوٹل کا لڑکا کھانے کا آرڈر لینے کے لیے آگیا۔ ہوٹل پر صرف دال اور گوشت پکا ہوا تھا۔ چونکہ میرے پاس پیسے موجود نہیں تھے، اس لیے میں خاموشی سے بیٹھا رہا۔ روٹیاں اور سلور کی کٹوریاں جب سلاخوں سے گزر کر حوالات کے سالخوردہ فرش پر پہنچیں، سبھی اُٹھ کر ایک بڑا سا دائرہ بنا بیٹھے۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔

امیر شاہ نے استفہامیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ "اڑے بانکے! کیا دوجخ (دوزخ) میں کچھ نہیں ڈالے ہے؟"

میری خاموشی کو اقرار جان کر وہ اپنی پلیٹ اور روٹیاں اُٹھا کر میرے پاس آبیٹھا۔ کھانا کھانے کے بعد سب کے لیے کڑک چائے آگئی۔ عام حالات میں شاید میں ایسی چائے کبھی نہ پیتا مگر اُس وقت وہ کڑوی کسیلی اور بے دودھ کی چائے بھی دودھ پتی محسوس ہوئی۔ بخار کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ تکلیف اور اینٹھن میں کچھ کمی واقع ہوگئی تھی۔ میں امیر شاہ کے کہنے پر کھڑا ہوا۔ قوتِ ارادی کو بروئے کار لاتے ہوئے محدود جگہ میں چہل قدمی کرنے لگا۔ دس پندرہ منٹ میں، میں کافی حد تک سنبھل گیا۔ میں اور امیر شاہ دوسرے حوالاتیوں سے قدرے الگ ہوکر بیٹھے ہی تھے کہ مجھے سلاخوں میں سے وہی ویگن صحن میں آکر رُکتی دکھائی دی جس پر مجھے تھانے میں لایا گیا تھا۔ سب انسپکٹر، ملک ارشد اور فرید علی کی تھکی تھکی صورتیں دکھائی دیں۔ وہ حوالات کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گئے۔ امیر شاہ میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا بہ غور مشاہدہ کر رہا تھا، پوچھنے لگا۔ "انہی جالموں نے تجھے دبوچا تھا کیا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ "ہاں! کیا اب پھر یہ لوگ مجھے ماریں گے؟"

"نہیں لاڈے بابا! یہ سور کے بچے تھک کر آوے ہیں۔ اپنے ہومیو پیتھک باپو جی کے چرنوں میں حرام کا مال ڈالیں گے اور جا کر سرداروں کی طرح سو جاویں گے...... یہ خرشی مارے کتے کے ماتق لوگ ہوویں، نہ ہڈی چھوڑیں نہ آنتیں چھوڑنے سے باج (باز) آویں۔ آخ تھوہ!"

اُس نے سلاخوں کے پار زمین پر زور سے تھوک دیا۔ کچھ دیر تک آنکھوں سے آگ برساتے ہوئے چلتے پھرتے سپاہیوں کو دیکھتا رہا پھر چونک کر بولا۔ "اڑے بابا! تم سے کیا برآمدگی کرت ان خبیثوں نے؟"

میں اس کے سوال کو سمجھ نہیں پایا تو اُس نے وضاحت کی۔ میں نے بتایا کہ میرے پاس سوائے پیسوں کے کچھ بھی نہیں تھا جو اُنہوں نے نکال کر اپنے پاس رکھ چھوڑے ہیں۔ وہ بڑا متاسف ہوا۔ بولا۔ "اُن سالوں کو موئی بدجبی (بدہضمی) بھی نہیں ہووت ہے۔ دیکھ تو جرا (ذرا) ان کے بڑے بڑے پیٹوں کو...... لکڑ ہجم، لوہا ہجم......"

پھر امیر شاہ کے خلوص بھرے استفسار نے مجھے زبان کھولنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اپنا فرضی نام بتایا۔ خود پر بیتی ہوئی کہانی کو بلا کم و کاست بیان کر دیا۔ وہ پورے انہماک سے سنتا رہا۔ بارہا اُس کی پیشانی پر فکر و تردد کی غماز لکیروں کا جال بنا، پھر جلد میں تحلیل ہو گیا۔ میری داستان کے تسلسل میں اُس نے کہیں بھی رکاوٹ پیدا نہیں کی۔ خاموش ہوا تو وہ لمبی سانس سینے میں اُتار کر، جیب میں سے پان کا پیک نکال کر منہ میں ڈال کر، دھیمی آواز میں بولا۔ "اڑے لاڈے! تو ان جالموں میں برا پھنسا ہووت...... بچ بچ...... مگر شکر کرت بابا کہ اِس جوراور (زورآور) کی گولی سے بچ نکلت ہو۔ سالا ہومیو پیتھک تھانیدار جوراور کا لے پالک کتا ہووت ہے۔ اس کے کہنے پر تمہاری چمڑی ادھیڑ دیوت۔ ہائے غنچے! تو برا پھنسے ہے۔"

میں نے بے بسی سے کہا۔ "اب کیا ہوگا؟"

"جو بھی ہووت، جرا (ذرا) اچھا نہ ہووت......" اُس نے تشویش آمیز انداز میں کہا۔ "تم جانت ہو کہ موبی کا خونی کدھر ہووت ہے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں۔"

وہ کچھ دیر تک خوش بیٹھا رہا پھر اُس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا، اپنا منحنی سا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا اور کہا۔ "تم فکر نہ کرت ہے لاڈلے میاں! ماڑے کو سب ٹھیک کرنا آوے ہے۔ ہومیو پیتھک تھانیدار جو بھی آکھت، تو زبان نہ کھولت...... غنچے! یہ دل پر لکھت کہ تم نہ جانے کسی خونی کو، تم نہ جانت جوراور یا موبی کو...... گونگا ہووت تو...... سمجھا؟"

دیکھنے میں وہ اُستاد آدمی لگتا تھا۔ نہ میں نے اُس سے دریافت کیا تھا کہ وہ کس جرم کی پاداش میں حوالات میں بند تھا اور نہ ہی اُس نے بتانے کی زحمت کی تھی۔ میں حالات کے ایسے گرداب میں آن پھنسا تھا کہ میرا شعور مکمل طور پر میرا ساتھ نہیں دے پا رہا تھا۔ مجھے رہ رہ کر اپنے گھر والوں اور بالخصوص پروین کی پریشانی کا خیال آتا تھا۔ کمالا یاد آنے لگتا تھا۔ پولیس والوں کی متوقع مار پیٹ کا خیال بھی دل کو ہولائے دے رہا تھا۔ گھبراہٹ اور اضطراب کے عالم میں امیر شاہ پر بھی خاطر خواہ توجہ نہیں دے پا رہا تھا مگر اُس نے میری بے رُخی کے باوجود مجھے بڑی ڈھارس بندھائی تھی۔ اُس نے اپنے مخصوص انداز میں مجھے یہ تسلی بھی دی تھی کہ وہ تھانیدار کے سامنے میری بے گناہی کی بات کرے گا۔ اگر تھانیدار پھر بھی نہیں مانے گا تو وہ اپنی 'میڈم' سے کہہ کر مجھے حوالات سے نکلوا دے گا۔ میرے استفسار پر اُس نے میڈم کا نام 'میڈم شکیلہ' بتایا اور مزید بتایا کہ وہ ایسی عورت ہے کہ جس کے نام پر شہر کے سبھی تھانوں کے گیٹ آن واحد میں کھل جاتے ہیں۔

رات دس بجے کے قریب سبھی اشغال ہو گئے۔ امیر شاہ بھی نیند کے گہرے استغراق میں چلا گیا مگر نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں اُس کے کمبل میں گھسا ہوا، دیوار سے پشت لگا کر سامنے والی دیوار کے اکھڑے ہوئے پلستر کو دیکھ رہا تھا۔ باری باری کئی شباہتیں آنکھوں میں ابھرتیں، اپنا اپنا مقدمہ پیش کر کے اوجھل ہو جاتیں۔ چاچی، فرزانہ، شانو، پروین اور غزالہ کی بے چینیوں پر دل کڑھ کر رہ گیا۔ چونکہ کمالا مہینے میں ایک آدھ مرتبہ ایسا غوطہ لگا لیا کرتا تھا اس لیے اُس کے گھر والوں کے لیے اس کا غیاب کوئی نئی بات نہیں تھی مگر میرے گھر والوں کے لیے میرا نور پور سے اس طرح جانا نئی بات تھی۔

میں خوامخواہ کمالے کی یاری کی آبیاری کرنے کے ارادے سے ملتان چلا آیا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اس اجنبی شہر میں ایسے خطرناک لمحات میری تاک میں تھے۔ مسلسل بھاگ دوڑ، غیر متوقع وحشیانہ مار پیٹ اور گرفتاری نے مجھے بدحال اور نڈھال کر دیا تھا۔ مجھے جو آیات اور دعائیں یاد تھیں، دل ہی دل میں تمام پڑھ ڈالیں۔ خدا سے مدد مانگی۔ اپنے آپ سے عہد کیا کہ یہاں سے نکلتے ہی کمالے کی سنگت کا خیال دل سے نکال کر سیدھا نور پور چلا جاؤں گا اور آئندہ اس غلطی کا اعادہ نہیں کروں گا۔

حوالات کی بدبودار فضا میں کئی اقسام کے خراٹے گونج

رہے تھے۔ ہومیو پیتھک ڈاکٹر کے بڑے بڑے پھیپھڑوں سے پھوٹنے والے خراٹے خاصے ڈراؤنے تھے۔ جونہی گھومتی ہوئی نیلی بتی والی ویگن تھانے کی حدود میں داخل ہوئی، میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ شاید تھانیدار گشت سے لوٹا تھا۔ کچھ ہی دیر کے بعد سلاخوں کے باہر بوٹوں کی دھمک گونجی۔ ایک لمبا تڑنگا شخص پانچ سات اہلکاروں کے جلوس میں چلتا ہوا حوالات کے دروازے پر آ کر تھم گیا۔ اُس کی آن بان کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ تھانیدار تھا، اس تھانے کا بے تاج بادشاہ۔

اُس کی ٹٹولتی ہوئی نظروں نے فوراً مجھے تاڑ لیا۔ ساکت کھڑا مجھے گھورنے لگا۔ اُس کے چہرے پر سیاہ اور سفید بالوں والی داڑھی بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ اُس کی قد آور شخصیت بڑی بارعب تھی۔ اُس نے اپنے دائیں ہاتھ کھڑے سپاہی سے میرے بارے میں پوچھا تو اُس نے بتایا کہ مجھے موبی کے قتل کے سلسلے میں سب انسپکٹر حوالات میں ڈال گیا ہے اور خصوصی نگرانی کی تاکید کر گیا ہے۔

میں نے ہمت کرتے ہوئے کہا۔ "سر جی! مجھے بے گناہ پکڑ کر مارا پیٹا گیا ہے اور یہاں لا پھینکا گیا ہے۔"

وہ چونکا۔ میرا اندازہ تھا کہ اُسے میرا مؤدبانہ اور پڑھا لکھا لہجہ عجیب لگا تھا۔ مجھے بہ غور دیکھنے لگا۔ میں نے اپنی بات کو دہرایا تو وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کوئی تو وجہ رہی ہوگی تم پر شک کرنے اور تمہیں گرفتار کرنے کی؟"

میں نے جلدی سے کہا۔ "میں خان مارکیٹ میں داخل ہونے لگا تھا کہ ایک ڈارک بلو کار میرے قریب آن رکی۔ اُس میں سے دو آدمی اُترے۔ وہ مجھے کسی غلط فہمی کی بنا پر زبردستی کہیں لے جانا چاہتے تھے جبکہ میں جانے پر تیار نہیں تھا۔ وہیں ہماری لڑائی ہوگئی۔ پولیس والے آ گئے اور انہوں نے مجھے پکڑ کر مارنا شروع کر دیا۔ پھر ڈالے میں ڈال کر یہاں لے آئے۔" میں نے اپنی پوری کوشش کی تھی کہ میرا لہجہ بے حد معصوم اور شائستہ رہے اور میں اپنی کوشش میں کامیاب رہا تھا۔

"تمہیں اغوا کرنے والے کون تھے؟ کیا تم اُنہیں جانتے ہو؟"

میں نے جلدی سے کہا۔ "میں نے دونوں کو زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا ہے جی۔ ایک کا نام زورآور ہے اور دوسرے کے نام کا مجھے علم نہیں۔"

"زورآور......" اُس کے ہونٹ سیٹی بجانے کے سے انداز میں سکڑ گئے۔ "زورآور کو کیا غلط فہمی تھی؟"

"وہ کہہ رہا تھا کہ میرا ساتھی اُس کے کسی موبی نامی دوست کو گولی مار کر بھاگ گیا ہے۔ میں نہ تو کسی موبی کو جانتا ہوں، نہ زورآور کو اور نہ ہی میرا کوئی ساتھی ہے۔ سر جی! میں تو ایک سیدھا سادا کسان ہوں۔ زمینوں پر ہل چلاتا ہوں۔ زمینوں کا اُگلا ہوا اناج کھا کر سو جاتا ہوں۔"

اُس کی نظریں مجھے اپنے بدن کے آر پار ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اُس نے برآمدے میں کھڑے ہوئے اہلکار کو ہاتھ کے اشارے سے پاس بلایا، پوچھا۔ "اسے کون لاک اپ میں ڈال گیا ہے؟"

وہ مؤدبانہ لہجے میں بولا۔ "اسے سب انسپکٹر صاحب کہیں سے پکڑ کر لائے تھے۔ اُن کے ساتھ ملک ارشد اور فرید علی تھے سر!"

"زورآور بھی آیا تھا؟"

"جی سر! بہت غصے میں تھا۔"

"کیا کہتا تھا؟"

"کہہ رہا تھا کہ اسے اُلٹا لٹکا کر پوچھا جائے کہ اس کا ساتھی کہاں چھپا ہوا ہے۔"

"اُن تینوں میں سے کوئی یہاں موجود ہے؟" اُس کا اشارہ سب انسپکٹر، فرید اور ملک ارشد کی طرف تھا۔

"نہیں سر...... وی آئی پی موومنٹ کی کوریج کے لیے گئے تھے۔ لوٹے تو خاصے تھکے ہوئے تھے، گھروں کو چلے گئے۔"

تھانیدار نے سر کو ہولے سے حرکت دی، پھر میری طرف متوجہ ہوا۔ "تمہیں کہاں سے گرفتار کیا گیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "خان مارکیٹ کے باہر سے، سر!"

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"مظفر گڑھ سے پرے ایک بستی میں رہتا ہوں جی!"

میرے عقب میں امیر شاہ کے قہقہے کی تیز آواز گونجی۔ تھانیدار نے اُسے ڈانٹا۔ وہ بہ مشکل اپنی ہنسی روک کر بولا۔ "اڑے باپھا! ماڑا گیا، ماڑا کھات تو جرموں سے بھرا پڑا ہووت پر ان کرموں مارے دیہاتیوں پر تو رحم کرد تاں بابا...... ماں بہن کی چوڑیاں گجرے خریدنے دو تاں...... اپنے وجیر (وزیر) سے فون پر پوچھ لیو، اس پر کون سی دفعہ لاگو ہووت ہے صاحب؟"

اُس کے طنز پر تھانیدار یک بارگی تلملا اُٹھا۔ اُسے ڈانٹ کر خاموش رہنے کا حکم دیا اور مجھ پر ایک سرد نگاہ ڈال کر وہ اپنے کروفر کو سنبھالتے ہوئے سلاخوں سے پرے ہٹ گیا۔ سرکاری وردیوں کی سیاہ دھند سلاخوں سے چھٹ گئی۔ چند لمحوں کے بعد ایک سپاہی سلاخوں کے سامنے دکھائی دیا۔ اُس نے ہاتھ میں چابیوں کا گچھا پکڑا ہوا تھا۔ تالے میں چابی

گھماتے ہوئے اُس نے ذو معنی مسکراہٹ اُچھالتے ہوئے کہا۔ ”میروشاہ! لگتا ہے تمہاری سفارش پھر آن پہنچی ہے۔ چلو! باہر آؤ۔ صاحب نے تمہیں بھی بلوایا ہے۔“

میرا دل مٹھی میں آگیا۔ میرا غم گسار رہائی پانے والا تھا۔ اک آس لگی تھی، وہ بھی بجھنے لگی۔ میروشاہ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، ایک آنکھ دبائی اور کہا۔ ”فکر نہ کرت اڑے لاڈے! تیرے پر آنچ نہ آنے دیوت ہے میروشاہ......“

وہ گیٹ سے باہر نکلا تو میں نے سلاخیں تھام لیں۔ اُسے تھانیدار کے کمرے میں جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر ماتھا سلاخوں پر ٹکا کر ساکت ہوگیا۔ میں نے نادانی میں اوکھلی میں سر دیا تھا، موسلوں نے میری جان مٹھی میں بھر لی تھی۔ کافی دیر گزر گئی۔ ادھر میروشاہ ایس ایچ او کے دفتر سے نکلا، اُدھر زور آور اپنے تین چار ساتھیوں سمیت تھانے کے بیرونی دروازے میں دکھائی دیا۔ وہ تیر کی طرح ایس ایچ او کے کمرے کی طرف گیا جبکہ میروشاہ نے مجھے دیکھ کر انگلیوں سے وکٹری کا نشان بنایا اور پھر وہ دایاں ہاتھ لہرا کر ’بائی بائی‘ کرتے ہوئے تھانے کا گیٹ عبور کر گیا۔

وہ چلا گیا تھا، مایوسی کی بات تھی۔ زور آور تھانے تک آن پہنچا تھا، خطرے کی بات تھی۔ حوالات میں موجود بھی اپنے اپنے انداز سے میروشاہ پر محو گفتگو تھے۔ کسی کو میری ذات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور مجھے چشم تصور میں پولیس کے بدنام زمانہ ٹارچر روم میں اُلٹا لٹکا ہوا ’شہریار‘ دکھائی دے رہا تھا جس سے کھالے کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا۔

کوئی نصف گھنٹے کے بعد دو سپاہیوں نے مجھے حوالات سے نکالا، میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنائی اور ایس ایچ او کے سامنے پیش کر دیا۔ کشادہ اور سرکاری آرائش کے حامل دفتر میں ایس ایچ او کے سامنے والی کرسی پر زور آور براجمان تھا جبکہ دیوار کے ساتھ قطار میں رکھی گئی کرسیوں پر اُس کے ساتھی براجمان تھے۔ میرے ہاتھ پشت پر ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے جبکہ میرے عقب میں دونوں سپاہی یوں چوکنا کھڑے تھے جیسے اُنہیں میرے بھاگ جانے کا خطرہ ہو۔ تھانیدار اور زور آور کی تیز چبھتی ہوئی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ تھانیدار نے کہا۔ ”اگر تم کچھ چھپائے بغیر اپنے ساتھی کا نام بتا دو، یہ بتا دو کہ وہ اس وقت کہاں ہے تو تمہارے ساتھ رعایت برتی جاسکتی ہے، ورنہ تمہارا انجام بہت برا ہوگا۔“

اُس کی نظریں مجھے اپنے بدن سے پار ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میرا اندازہ یکسر غلط نکلا تھا۔ اُس نے میری معصومیت پر ذرا بھر یقین نہیں کیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”سر جی! میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا ہے۔ میری نہ تو کسی سے دشمنی ہے اور نہ دوستی...... ان لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”یعنی تم تعاون پر آمادہ نہیں ہو؟“

میرے پاس اُس کے سفاک سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

”قتل...... ایک شہری کا قتل...... اس سے بڑا جرم کیا ہوسکتا ہے، کوئی بھی نہیں۔“ تھانیدار کے لہجے کی سنگینی میں درشتی شامل ہوگئی۔ ”ایک شہری قتل ہوگیا ہے۔ تمہیں قاتل کے ساتھ نہ صرف دیکھا گیا ہے بلکہ تم نے اُسے کور دینے کی پوری کوشش کی ہے۔ زور آور کو مارا پیٹا بھی ہے، کیا میرے پاس کوئی گنجائش رہتی ہے تمہاری بات کا یقین کرنے کی؟“

زور آور کچھ کہنا چاہتا تھا مگر تھانیدار نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے چپ کرا دیا اور میرے عقب میں کھڑے ہوؤں کو مخاطب کر کے کہا۔ ”اسے اسپیشل روم میں لے جاؤ۔ ہاں! فرید اور ملک ارشد سے کہو کہ یہ مجھے صبح فرفر بولتا ہوا ملے۔ اوکے؟“

اُنہوں نے بہ یک زبان ”جی سر!“ کہا اور مجھے پیچھے کی طرف کھینچا۔ میں بے اختیار قدرے بلند آواز میں بولا۔ ”سر! آپ میری بات کا یقین......“

میری بات پوری ہونے سے قبل ہی میری گردن پر زور کا ہاتھ پڑا اور آنکھوں کے سامنے تارے ناچ اُٹھے۔ کم بخت سپاہی کا ہاتھ خاصا بھاری تھا۔ ایسے ہی وقت میں جب میں حواس باختہ پلٹ رہا تھا، میرے کانوں میں میروشاہ کی آواز گونجی۔ ”اڑے واہ باچھا کے سنتریو! غنچے پر ہاتھ جھاڑ رہو...... ایک جرا (ذرا) سی دیر کو رُکت ناں بابا!“

دروازے کے عین بیچوں بیچ میروشاہ کھڑا دکھائی دیا۔ اُس نے مجھے کھینچ کر باہر لے جانے والے سپاہیوں کا راستہ روک رکھا تھا۔ فاتحانہ نظروں سے تھانیدار کی طرف دیکھا، ہاتھ سے کمرے کے باہر کسی کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔

”اڑے باچھا جی! دیکھو تو کون ملنے آوت ہے تم سے؟“

نہ صرف میرے بلکہ تھانیدار اور زور آور کے نزدیک بھی میروشاہ کی ڈرامائی آمد تعجب خیز تھی۔ وہ دونوں ایک جھٹکے سے کھڑے ہوئے۔ تھانیدار نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

”میروشاہ! اب یہ نیا ڈراما کیا ہے؟“

میروشاہ نے باہر گیلری میں دیکھا اور پھر کیا یک دروازہ چھوڑ کر ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ ایک دراز قامت لڑکی ایک شان استغنا سے چلتی ہوئی دفتر میں داخل ہوئی اور عین میرے مل آکر تھم گئی۔ اُس کی تاب و تمکنت اور پُر وقار شخصیت نے مجھ پر آن واحد میں سکتہ سا طاری کر دیا تھا۔ میروشاہ پلٹ کر دونوں سپاہیوں کے بیچ کھڑا ہوا اور بولا۔ ”میڈم! یہ ہے ماڑا غنچہ...... اس کو جالموں نے خوامخواہ قتل کے الزام میں ملوث کیا ہے۔“

وہ چند لمحوں تک مجھے گھورتی رہی، پھر ایک ادا سے چلتی ہوئی تھانیدار کی میز تک گئی اور دونوں ہاتھ شیشے پر ٹکا کر کھڑی ہوگئی۔ اُس کی شخصیت کا اثر تھا یا اُس کے رسوخ کا دبدبہ...... دفتر میں موجود بھی افراد بالکل خاموش تھے۔ اُس نے زور آور کو بہ غور دیکھا، پھر تھانیدار سے مخاطب ہوئی۔ ”اظہر صاحب! میں اس جوان کو لینے آئی ہوں۔“

تھانیدار نے ایک طویل سانس حلق میں اُتاری اور شائستگی سے بولا۔ ”یہ موبی کے قتل میں ملوث ہے۔“

”موبی ہماری سوسائٹی کا ’بریو‘ تھا، قتل ہوگیا۔ اب اُس کی جگہ زور آور ’بریو‘ ہے۔ چاہے تو اپنے باس کے خون کا بدلہ لے، چاہے تو ملنے والی کمانڈ کے مزے لوٹے۔ کیوں زور آور؟“ اُس کی آواز بڑی جاندار اور خوب صورت تھی، الفاظ میں لہجہ پر بریت مشاقانہ تھی۔

زور آور نے کہا۔ ”آپ کو اس مسئلے میں دخل نہیں دینا چاہیے میڈم! موبی ہمارا ساتھی تھا اور قتل کا بدلہ لینا ہمارا حق ہے۔“

”اور پولیس کی مدد لینا کیا ہماری سوسائٹی کے لیے مناسب ہے؟“ میڈم کی آواز میں زبردست کاٹ تھی۔ ”اظہر صاحب! میں اسے اپنے ساتھ لے کر جا رہی ہوں۔ فکر نہ کیجیے، کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں سنبھال لوں گی، آپ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی اور...... میں اس کی بھرپور قیمت چکاؤں گی۔“ پھر ایک ادا سے زور آور کی طرف مڑی۔ ”اور زور آور! موبی زندہ دل جوان تھا۔ اُس کی موت کا مجھے رنج ہے۔ تم اُس کے قاتل کی تلاش جاری رکھو۔ اگر یہ جوان واقعتا ملوث ہوا، یا اسے اس کے بارے میں علم ہوا تو میں تمہاری مدد کروں گی اسے پوائنٹ آؤٹ کروں گی۔ ٹھیک کیرا؟“

میں ہونقوں کی طرح سبھی کے چہروں کا طواف کر رہا تھا۔ دیکھ رہا تھا کہ میڈم کہلانے والی جوان العمر لڑکی کے سامنے تھانیدار، تھانیدار نہیں رہا تھا اور زور آور کے طمطراق کی ہوا بھی نکل چکی تھی۔ اُس کے جبڑوں کے اعصاب مسلسل کس رہے تھے اور آنکھوں سے میرے لیے وحشت اور لپک رہی تھی مگر مجھ پر ہاتھ اُٹھانے اور رہا ہونے سے روکنے کی قدرت نہیں رکھتا تھا۔ تھانیدار نے زور آور کی طرف

دیکھا، کچھ سوچا، پھر اپنے سپاہیوں کو میری رہائی کا حکم صادر کر دیا۔ چند ہی لمحوں میں کھٹاک کی مخصوص آواز کے ساتھ میری ہتھکڑیاں کھول دی گئیں۔

مجھے چند ثانیے تو یقین نہ آیا کہ میں قتل کے الزام میں گرفتار ہونے کے بعد اتنی مختصر اور قلیل مدت میں رہائی پا چکا ہوں، جب ایک شان بے نیازی سے میڈم دفتر سے نکلی اور میروشاہ نے مجھے بازو سے پکڑ کر باہر کی طرف کھینچا تو میں چونک گیا۔ بے اختیار اُس کے ساتھ گھسٹتا ہوا گیلری میں آیا۔ میڈم صحن میں سے گزر رہی تھی اور تھانے میں موجود اہلکار پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ وہ حسن کا اتنا کامل شاہکار تھی کہ نظر ہٹانے سے نہیں ہٹتی تھی۔ تمکنت کا یہ عالم تھا کہ دیکھتے رہنا بھی محال تھا۔

میروشاہ نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا، ہنس کر بولا۔ ”اڑے بابا! کیا دیکھت ہے؟ یہ ماڑی میڈم شکیلہ ہووت ہے۔ جہاں ہاتھ ڈالت، سانس کھینچ لیوت ہے۔ تم آجاد (آزاد) ہے، جاوے۔ جندگی (زندگی) میں دُعا کرنا ماڑے لیے...... ماڑے کرم اچھے ہو جاویں گے ناں!“

میں نے متشکرانہ انداز میں اُسے دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ میڈم کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے ہم تھانے سے باہر آئے۔ وہ سیاہ رنگ کی چمکدار پراڈو جیپ میں بیٹھ گئی۔ شیشہ تھوڑا سا کھلا۔ میڈم نے ہاتھ کے اشارے سے میروشاہ کو اپنے پاس بلایا، کچھ کہا اور شیشہ چڑھا دیا۔ جیپ روانہ ہو گئی تو میروشاہ نے پلٹ کر نشئیوں کے سے انداز میں میرا ہاتھ تھاما، چوما اور عجیب سے انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔ ”یہ جالم جمانہ! (ظالم زمانہ) بڑے رُوپ دکھاوت ہے، بہروپ دکھاوت ہے۔ ماڑا چہرا بھی جھوٹ ماتق، تم بھی جھوٹ ماتق...... سالا جمانہ جھوٹا، بہروپیا...... جاؤ، اپنی چودہ اگست مناؤ ناں جی۔ وہ دیکھو، سالا جورآور خرشی کتے کی طرح تڑپ تڑپ جاوت ہے۔“

اچانک اُس کی نظر تھانے کے کھلے مین گیٹ میں سے گزر کر حوالات کے سلاخوں والے دروازے پر پڑی۔ ماتھے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”اوہ جالم ہومیو پیتھک ڈاکٹر...... ماڑے کو بھول ہی گیا کہ تم بھی اِدھر پڑے ہووت ہو۔“

وہ مجھے وہیں ٹھہرنے کا حکم صادر کرتے ہوئے تھانے میں گھس کر حوالات کی طرف بڑھ گیا۔ سلاخیں تھامیں اور شرابی ڈاکٹر کو آوازیں دے کر جگانے کی کوشش کرنے لگا۔ سونے والا شاید اپنی زندگی کی تمام تر جمع پونجی بیچ کر اتنا غفیل ہوا تھا۔ امیر شاہ کی کوششیں بارآور ثابت نہیں ہوئیں تو وہ بہ آوازِ بلند گالیاں دیتا ہوا میرے پاس آ گیا، بڑبڑایا۔

”سالا! مُردوں کے ماتق سووے ہے۔ قبرستان میں کھڑا ہو کر کسی کو اتنی اونچی آواجیں (آوازیں) دیویں تو کئی مردے کانوں پر ہاتھ رکھے آ جاویں۔ وہ مُردار ناں جاگے ہے۔“

میں میروشاہ کی تقلید میں قدم بڑھاتا، دل ہی دل میں اُسے دعائیں دیتا ہوا چل رہا تھا اور جلد از جلد تھانے سے دور ہو جانا چاہتا تھا۔ مجھے اندیشہ لاحق تھا کہ پھر مجھے پکڑ نہ لیا جائے اور مار مار کر رہی سہی کسر نہ نکال دی جائے۔

اندھیرے کی دبیز چادر شہر نے اپنے اوپر لپیٹ لی تھی۔ تھانے کے باہر کی دُنیا خوابیدگی کے مزے لوٹ رہی تھی۔ اکا دُکا دکانیں اور سگریٹ پان کے کھوکھے کھلے ہوئے تھے۔ امیر شاہ نے ایک کھوکھے پر رُک کر دو تین پان پیک کرائے، سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس خریدی۔ سگریٹ سلگائی اور فضا میں منہ کھول کر دھواں چھوڑتے ہوئے خاصی بلند آواز میں بولا۔ ”ماڑے کو سال چھ ماہ میں ایک نہ ایک چکر تھانے کا جرور (ضرور) لگ جاوے۔ قسمت میں ہیر پھیر ہے۔“

آدھے کلومیٹر کی مسافت طے کر کے ہم ایک بارونق چوک میں پہنچے۔ چوک کی ایک نکڑ مرغ کی یخنی اور انڈے بیچنے والوں نے اپنے تصرف میں لے رکھی تھی۔ ریڑیوں پر پہلوان نما بے بال و پر مرغ لٹک رہے تھے اور فضا میں بھنی بھنی مہک رچی ہوئی تھی۔ دو تین ہوٹل، ایک کال سینٹر اور چند شبانہ نوعیت کی دکانیں کھلی تھیں۔

ہم ایک یخنی فروش کے چوبی تختے پر بیٹھ گئے۔ اُسے اُبلے ہوئے انڈوں اور یخنی کا آرڈر دے کر رنگ برنگے برقی قمقموں کی روشنی میں محوِ کلام ہو گئے۔ میں بے دھیانی کے عالم میں ”ہوں، ہاں“ کرتا ہوا متحرک لوگوں کو دیکھتا رہا۔ انڈے اور تیز مصالحے دار یخنی نے جسم میں کچھ حرارت پیدا کر دی۔ ایسے میں زورآور کی ڈارک بلو کار ہمارے قریب آن رُکی۔ شیشہ اُترا اور زورآور کا چہرہ دکھائی دیا۔ اُس کی سفاک آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”سی یو اگین مسٹر...... انتظار کرنا زورآور کا!“

میرے بولنے سے پہلے میروشاہ نے ہاتھ لہرا کر کہا۔ ”ماڑے کو نہ چھیڑ جورآور...... یہ چھیڑ چھاڑ جرا بھی اچھی نہ ہووت ہے۔“

زورآور نے دانت کچکچائے اور شیشہ چڑھا لیا۔ کار آگے بڑھ گئی۔ میروشاہ نے میرے کندھے پر عادتاً ہاتھ مارا، بولا۔ ”اڑے او غنچے! فکر کاہے کا ہووے تیرے کو ہم اِدھر ہی ہووت ہے۔ یہ سالا تیرے کو ہاتھ بھی نہ لگا پاوے گا۔ یہ نگری میروشاہ کی میڈم کی ہووت ہے۔“

میں زورآور سے ڈرا نہیں تھا اور نہ ہی میں اتنا ناتواں تھا کہ اس سے چت ہو جاتا۔ ڈر قانون کے ہرکاروں کا اور اپنی حالتِ زار تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور لاری اڈے کی سمت جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اُسے یہ بھی بتایا کہ میرے پاس کرایہ وغیرہ کے پیسے نہیں ہیں۔ وہ قہقہہ لگا کر بولا۔ ”اڑے لاڑے میاں! فکر نہ کرے ہے۔ اگلے چوک پر تانگے کھڑے ہو دیں۔ جالم رکشے والے تو چمڑی کھینچ لیوت ہیں۔ تیرے کو اس وقت کہاں جانا ہووے۔ بھلے غنچے! میڈم کا شکریہ تو ادا کرے جاوت، جندگی (زندگی) میں پھر کبھی جرورت (ضرورت) آن پڑت ہے بندے پر۔ ہیں؟“

اُس نے بڑی معقول بات کی تھی۔ مجھے اپنی محسنہ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا ورنہ میرا ملتان سے بھاگ نکلنا بدتہذیبی میں شمار کیا جاتا۔ میں نے کہا۔ ”ہاں! مجھے واقعی میڈم شکیلہ کے پاس جانا چاہیے۔“

وہ خوش ہو گیا۔ لاری اڈے جانے کا ارادہ بدلا تو اُس نے ہاتھ کے اشارے سے ایک نیم خوابیدہ رکشا والے کو بلا لیا۔ رکشے کی ’ٹریں ٹریں‘ فضا میں گونج اٹھی اور مجھ پر ایک مرتبہ پھر پریشان کن سوچوں کی یلغار ہو گئی۔ کھالے کا کوئی پتا نہیں تھا۔ وہ کس حال میں تھا۔ یہ بھی بعید نہیں تھا کہ وہ کسی اور تھانے کی حوالات میں پڑا ہو۔ میں نے میروشاہ سے کہا۔ ”کیا میرے یار کھالے کو تلاش کیا جا سکتا ہے؟“

میروشاہ منہ میرے قریب کر کے بولا۔ ”ہومیو پیتھک ڈاکٹر کہوے تھا کہ دُنیا لاڑے خانوں سے بھری ہووت ہے۔ وہ سچ کہوے تھا۔ تم بھی لاڑے خان ہووے، غنچے ہووے۔ کہہ جو دیا کہ فکر مت کیجیو ماڑی بات پہ یقین ناں ہووے ہے۔ ہے ناں؟“

میں نے کہا۔ ”قتل کا معاملہ ہے میروشاہ! میں کیسے بے فکر ہو سکتا ہوں۔ میرے نصیب ہار گئے ہیں شاید۔ اِدھر میں ملتان میں آ کر مصیبت میں پھنس گیا ہوں جبکہ میرے گھر والے میری وجہ سے پریشانی میں مبتلا ہوں گے۔“

”یار! ایک بات تو بتاوے ناں!“ وہ میری طرف قدرے جھک کر بولا۔ ”کوئی اندا جا (اندازہ) ہے کہ تیرا ڈاتیرا یار کہاں ہووے ہے اِس سمے؟“

میں نے مایوسی سے کندھے اُچکائے۔ ”میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“

”کہنا جروری ناں ہووے، سوچنا لاجم (لازم) ہے یار لاڑے!“ وہ دانش مندانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ ”وہ اگر دھر لیا جاوے گا تو پولیس تیرے کو بھی دبوچ لیوے گی۔ ہاں!“

چائے پینے تک خاموشی چھائی رہی۔ اُس نے ایک اور پان منہ میں ٹھونسا۔ ساتھ ہی ایک سگریٹ سلگا لیا۔ قدرے دھیمی آواز میں بولا۔ ”اب تم کہاں جاوت ہے؟“

میں نے اُسے خالی نظروں سے گھورا۔

”میرا پوچھنے کا مطلب ہووے کہ تم اپنی بستی میں اب جاوے تو پکڑا جاوت ہے۔ اِدھر بھی وہ غنڈے ماتق جورآور (زورآور) تمہارے پیچھے کتوں کی طرح لگا ہووے ہے۔“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”مگر میں نے اپنے گاؤں کے بارے میں تو کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ حتیٰ کہ تمہیں بھی علم نہیں ہے۔ پھر وہ کیسے وہاں تک پہنچے گا۔“

وہ بولا۔ ”تیرا ساتھی تیرے گھر کا پتا جانت ہے ناں؟“

”ہاں!“ میں نے سر ہلایا، اس کے ساتھ ہی گھبرا گیا۔ مجھ تک کھالے کے ذریعے بہ آسانی پہنچا جا سکتا تھا۔

”اگر وہ پکڑا جاوت ہے تو کالے خاکی بھوتوں کو اُدھر کی راہ دکھا دیوے ہے۔“ وہ اپنا سر اور چھاتی ایک تال سے ہلاتے ہوئے بولا۔ ”تین سو دو میں تو جالم وردی پوش بجلی کے ماتق پھرتیاں دکھاوے ہیں۔“

میری خاموشی پر وہ نتیجہ خیز انداز میں بولا۔ ”تم ماڑا یار ہووے ہے اور یار کے لیے تو دل کی کھولی بھی ہر دم کھلی ہووے ہے۔ تمہارے کو اِدھر میڈم کی کوٹھی پہ ایک آدھ دن رہنا ہووت ہے۔ پھر گھر کی راہ لیوت ہے۔ ٹھیک ہے ناں؟“

میں نے اُسے اچنبھے سے دیکھا۔ اُس کے کھنچے اعصاب والے چہرے پر سنجیدگی ثبت تھی۔ آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیں لرز رہی تھی۔ کوئی منٹ بھر کا دورانیہ یوں ہی گزر گیا۔ پھر مجھ پر نظریں ساکت کر کے بولا۔ ”تم ابھی غنچے ہو۔ تم دُنیا کو نہیں جانتے ہو۔ یہ موئی دُنیا بڑی جالم ہے۔ چٹکی میں پکڑ کر کھینچ لیوے ہے اور پھول نہ بننے دیوے ہے۔ اوپر باج (باز) نیچے جالم شکاری...... تم ایسے پھنسے ہووت لاڑے!“

وہ سچ کہہ رہا تھا۔ مجھ پر شدید مایوسی کا غلبہ ہوا جو چہرے سے بھی عیاں ہو گیا اور میں رکشے سے جھانک کر پیچھے کی سمت دوڑتی بند دکانوں کی بتیاں دیکھنے لگا۔ سڑکوں کا لامتناہی سلسلہ...... رکشے کی ناگوار آواز اور سوتے ہوئے محل کی طرح خوابیدہ شہر کی خوبصورت کوٹھیاں...... کوئی نصف گھنٹے کے بعد رکشا ایک محل نما کوٹھی کے جہازی سائز کے گیٹ پر آن رکا۔ امیر شاہ نے ڈرائیور کو فارغ کیا اور میرا بازو تھام کر گیٹ کی طرف بڑھا۔ گیٹ بند تھا۔ اُس نے گیٹ کے ستون پر لگی ہوئی کال بیل کا بٹن دبایا۔ دور کہیں مترنم گھنٹی بجی۔ کال بیل

کے بڑے سے بٹن میں نصب انٹرکام میں سے بھاری آواز برآمد ہوئی ''کون؟''

''ظاہر خان! میں امیر شاہ ہوں۔ گیٹ کھولو۔''

''اوئے چڑی مار کا بچہ! تم کو نیند کیوں نہیں آتا!'' بولنے والے کا لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ وہ پٹھان تھا۔

''بکواس نہ کر، درواجا (دروازہ) کھول۔ بڑے جروری کام سے آوت ہوں۔'' امیر شاہ کے لہجے سے ہلکا سا تحکمانہ تاثر جھلکتا تھا۔

ہلکی سی 'کٹاک' کی آواز کے ساتھ ہی انٹرکام خاموش ہوگیا۔ چند لمحوں کے بعد گیٹ کا بغلی دروازہ تھوڑا سا کھلا۔ ایک چہرے نے جھانک کر ہمارا جائزہ لیا۔ کم روشنی کی وجہ سے اُس کے خدوخال دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ امیر شاہ نے قدرے تیز آواز میں کہا۔ ''ماڑے کو ایکس رے مشین پر بٹھاوت ہے کیا؟''

جھانکنے والا شرمسار ہو کر غائب ہوگیا۔ پھر دروازہ کھل گیا۔ ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے کوٹھی میں داخل ہو گئے۔ ظاہر شاہ نامی طویل قامت پٹھان اپنے کندھے پر کلاشن کوف جیسی گن لٹکائے گیٹ لاک کر کے ہمارے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ کوٹھی کے بڑے دروازے کو عبور کر کے ہم ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں آگئے جس کے تینوں اطراف میں گیلریاں دکھائی دے رہی تھیں۔ امیر شاہ نے پوچھا۔

''اپنی میڈم سووت ہیں کیا؟''

ظاہر شاہ نے آنکھیں دکھائیں ''انسان کا بچہ بن امیر شاہ! تھوڑا دیر پہلے میڈم صاب آیا تھا، اب سونے کا نہیں تو کیا غلیل سے چڑیوں کا شکار کرے گا۔ تم اُدھر مہمان خانے میں جا کر سو جاؤ۔ اپنے یار کو بھی اِدھر ہی لے جاؤ۔ جب میڈم صاب جاگے گا تو اُس کو ام بتا دے گا۔ چلو، اپنا چڑی مار کہ شکل گم کرو۔''

دونوں کے درمیان کچھ دیر نوک جھوک چلتی رہی۔ امیر شاہ فوری طور پر میڈم سے ملنا چاہتا تھا جبکہ ظاہر شاہ اُسے دائیں ہاتھ والی گیلری میں دھکیل کر بولا ''چلو اُدھر کمرے میں۔ ام تمہارے لیے سبز قہوہ بنا کر لاتا ہے۔ عقل ٹھکانے لگے گا تو سمجھ آئے گا کہ یہ کسی سے ملنے کا ٹیم نہیں ہے۔''

امیر شاہ میرا ہاتھ تھام کر، ظاہر شاہ پر غصہ بھری نگاہ ڈال کر بادل ناخواستہ خوبصورت فرشی ٹائیلوں والی گیلری میں داخل ہوگیا اور آخری کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ میں جو اُس کی تقلید کر رہا تھا، کمرے کی آرائش دیکھ کر انگشت بدنداں تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک جہازی سائز کا خوب صورت بیڈ پڑا تھا۔ کمرے کے انتہائی کونے میں باتھ روم کا دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ کمرا خاصا کشادہ اور 'وال ٹو وال' کارپٹڈ تھا جو کوٹھی میں رہنے والی میڈم شکیلہ نامی عورت کی امارت کا منہ بولتا مظہر تھا۔

میں بیڈ پر بیٹھنے سے ہچکچا رہا تھا کیونکہ میرا لباس بہت میلا کچیلا تھا۔ امیر شاہ نے میرے تامل کو تاڑ لیا۔ بازو سے پکڑ کر بیڈ پر کھینچ لیا۔ بولا ''تم ماڑے یار ہو۔ ماڑی نجر (نظر) تن پر نہیں ہووے، سونے جیسے من پر ہووت ہے۔''

میٹرس بڑا آرام دہ تھا۔ بیٹھتے ہی آدھا دھنس گیا۔ کچھ ہی دیر میں ظاہر شاہ قہوے کے تین پیالے ٹرے میں رکھے آن وارد ہوا۔ ہم نے قہوہ پیا، کچھ باتیں کیں اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہی امیر شاہ کے خراٹے کمرے میں گونجنے لگے جب کہ میں اپنی کبیدہ خاطر حالت پر کڑھنے لگا۔ صاف ظاہر تھا کہ میرے حالات میری دسترس سے نکل گئے تھے۔ اپنی زندگی کے بارے میں، میں نے جو لائحہ عمل مرتب کر رکھا تھا، وہ نظروں کی حد سے بھی کہیں پرے ہوگیا تھا۔ نہ جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی اور نیند کی پُرفریب وادی میں اُتر گیا۔

آنکھ کھلی تو دیوار گیر کلاک میں نو بج رہے تھے۔ میں اُچھل کر بیڈ سے اُترا۔ اپنے دائیں طرف لیٹے ہوئے امیر شاہ کو دیکھا تو اُسے ندارد پایا۔ وہ میرے جاگنے سے پیشتر اُٹھ کر کہیں چلا گیا تھا۔ سر بھاری بھاری سا تھا۔ جسم درد میں لپٹ کر خاصا بوجھل محسوس ہو رہا تھا۔ گزشتہ دن کی تمام سرگرمیاں ٹیسوں کی شکل میں مجھ میں سمائی ہوئی تھیں۔ میں نے پردہ ہٹا کر کھڑکی کے باہر دیکھا۔ اُجلی دھوپ میں ہر شے چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میں دیر تک سونے کا عادی نہیں تھا مگر بھاگ دوڑ کے طویل دورانیے نے میرے معمول میں ریخت بھر دی تھی۔

میں باتھ روم جانے کا سوچ رہا تھا جب دروازہ کھلا اور امیر شاہ کی شکل دکھائی دی۔ اُس نے ہینگر میں لٹکا ہوا گرے کلر کا سوٹ اور جوتے وغیرہ اُٹھا رکھے تھے۔ میں نے اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا، وہ بولا ''ماڑے کو معلوم تھا کہ تم گدھے کے ماتق جرورت سے جیادہ (زیادہ) انا غنیم ہووت ہے، اس لیے میڈم کو جا کر تمہارے بارے میں سب باتیں کر دیوت ہیں۔ ماڑی میڈم بڑے کھلے دل کی مالک ہووے ہے۔ اُس نے بجار (بازار) سے کپڑے منگوائے ہیں۔ نہا کر سوٹ پہن لیوے اور پھر بابو بن کے میڈم سے ملاقات کرے ہے۔''

میں کپڑے اُٹھائے باتھ روم میں گھس گیا۔ نفیس سنک کے سفید رنگ کے ریک پر شیونگ کا سامان قرینے سے رکھا ہوا تھا۔ میں نے ڈاکٹر شاہ جی کی رفاقت میں اپنی شیو بنانی سیکھ رکھی تھی۔ وہ تجربہ کام آ گیا۔ جدید طرز کا پُرآسائش باتھ روم میری آنکھیں کھول رہا تھا، میں کھلی آنکھوں اس حیرت کدے کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ پہلے امیر شاہ اور پھر میڈم شکیلہ نامی امیرزادی مجھ پر اتنی مہربان کیوں ہو گئی ہے۔ میں خاص آدمی نہیں تھا۔ یہ دنیا میرے جیسے عمومی حیثیت کے لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی ہے۔ ایسے میں خود کو ملنے والی غیر معمولی توجہ میری چھٹی حس کو جگا رہی تھی۔

میں جب باتھ روم سے برآمد ہوا تو میری جون ہی بدلی ہوئی تھی۔ کہیں دیہاتی اور گنوار شخص دکھائی دے رہا تھا۔ 'باس' کی گرے کلر کی لٹھے کی قیمتی سوٹنگ، سیم کلر کا ویسٹ کوٹ، چمکدار سیاہ جوتے...... مجھے اپنا آپ ہلکا پھلکا، خوب صورت اور خوشگوار لگنے لگا۔

امیر شاہ نے غسل اور چینج کی زحمت نہیں اُٹھائی تھی۔ اُس نے مجھے دیکھ کر آنکھیں نچائیں ''اڑے واہ لاڈے یار! اب تو تم نرے غنچے نظر آوت ہو۔ ماڑی میڈم کو ہی نہ لے اُڑت کہیں!''

اُس کی آنکھوں میں رچی ہوئی شوخی اور چست کیے گئے فقرے کے سبب میں جھینپ گیا۔ ایک باوردی ملازم نے بلوریں روم ٹیبل پر ناشتے کے لوازمات چن دیے۔ میں نے اور امیر شاہ نے بے حد آرام دہ صوفے پر بیٹھ کر پیٹ کی طلب کو شانت کیا۔ اس دوران مجھے امیر شاہ اپنے مخصوص انداز میں میڈم سے ملنے اور اُس کے ساتھ گفتگو کرنے کے آداب سمجھاتا رہا۔

اُس کی ہدایات کا خلاصہ یہی تھا کہ وہ بہت تیز نظر اور مردم شناس عورت تھی۔ اپنے سامنے بولے گئے جھوٹ کو کونے سے پکڑ کر ذہن تک رسائی حاصل کر لیتی تھی۔ جتنی مہربان تھی، اُس سے کہیں زیادہ منتقم مزاج تھی۔ امیر شاہ نے مجھے سمجھایا کہ اگر میں اُسے اپنی شخصیت اور زورِ بیاں سے مطمئن کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو وہ چٹکی بجانے کی سی دیر میں میرے تمام مسائل حل کر دے گی۔ خوش ہو کر میرے روم روم میں دولت کی خوشبو بھر دے گی، وغیرہ وغیرہ۔

مجھے دولت کی ایسی طلب لاحق نہیں تھی کہ میں اُسے خوش کرنے چل پڑتا۔ مجھے اس مصیبت سے نجات درکار تھی جو بنا بلائے میری زندگی کی دہلیز تک چلی آئی تھی۔ میڈم شکیلہ کی عمارت کی تھوڑی سی نمائش اور رسوخ کا مظہر دیکھ چکا تھا۔ اگر وہ میرے کام آنے کا ارادہ کر لیتی تو کام آ سکتی تھی۔ میں نے اُس کے نام پر جھکڑیوں کے کھلتے ہوئے قفل کو دیکھ لیا تھا۔ تھانیدار اور زور آور کی بجھی ہوئی شکلوں کو دیکھ کر سمجھ لیا تھا۔ امیر شاہ مضبوط، امیر اور بھاری بھرکم شخصیت کا مالک نہیں تھا کہ وہ تھانیدار پر کوئی پھبتی کسنے کی جرأت کرتا مگر وہ اپنے مخصوص انداز میں آوازے کستا تھا۔ ظاہر تھا کہ اُس کے منہ میں میڈم کی زبان حرکت کر رہی تھی جس پر قانون کا رکھوالا قفل نہیں لگا سکتا تھا۔

تجسس اور ہیجان کی ملی جلی کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ گیارہ کے لگ بھگ ملازم نے آ کر بتایا کہ میڈم ہم دونوں کو اپنے کمرے میں بلا رہی ہے۔ امیر شاہ نے میڈم کے کمرے کے دروازے تک کے مختصر سفر میں اپنی ہدایات کا اعادہ کیا اور مطمئن ہو کر مجھے میڈم کے سامنے پیش کر دیا۔ وہ اپنے آراستہ و پیراستہ کمرے میں صوفے پر بیٹھی دکھائی دی۔ اگر میں نے اُس کے شباب کی لپک اور حسن کی تاب کو پہلے دیکھ نہ رکھا ہوتا تو میری آنکھیں فرطِ حیرت سے پھٹ جاتیں۔ نازک اندام، سرخ و سپید جلد اور تیکھے نقوش والی لڑکی پر 'میڈم' کا لفظ کسی بھی طور جچتا نہیں تھا۔ اُس کا لباس جاذبِ نظر، مسکراہٹ بے حد جاندار اور بڑی بڑی شفاف آنکھوں میں ثبت عجیب سی سرد مہری......

میں نے امیر شاہ کی تقلید کرتے ہوئے مؤدبانہ انداز میں اُسے سلام کیا اور کھڑا ہوگیا۔ اُس نے سلام کا جواب دینے کے بجائے بڑی گہری اور سرد نظروں سے میرا جائزہ لیا۔ سر سے پاؤں تک کریدا۔ پھر امیر شاہ سے مخاطب ہوئی۔ ''میرو شاہ! اس کے باوجود کہ تم نے مجھے اس جوان کی کہانی بڑی تفصیل سے بیان کر دی ہے، میں چاہوں گی کہ اس کے منہ سے سنوں۔ کیا خیال ہے؟''

وہ بولا ''ماڑے کو اعتراج (اعتراض) نہیں ہووے میڈم! تمہاری مرجی (مرضی) ہووے تو اس کڑوے پیاج (پیاز) کو چھیل کر دیکھت ہے۔ ماڑے کو تو یہی پتا ہووے ہے کہ تم اس غنچے کی مدد کرے ہو۔ بس!''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ تم اس طرح کرو کہ گاڑی لے کر مظفر آباد چلے جاؤ۔ مخدوم جی کے ٹھکانے سے مال وصول کر کے جگت پور کے سائیں مراد قریشی تک پہنچا آؤ۔ دیکھنا، سائیں بڑا نامراد آدمی ہے۔ میٹھے منہ زہر کی پھانک کھلاتا ہے۔ رقم کی تسلی وہیں بیٹھ کر کر لینا۔ پچھلی مرتبہ کی طرح دھوکے میں نہ آ جانا۔ اُسے خان بازو خیل ہر ماہ نوٹوں کی سپلائی دیتا ہے، دھیان رکھنا۔''

اُس نے سینے پر ہاتھ رکھا، جھکا اور سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ اُس کی تعظیم کرنے کا انداز بڑا مضحکہ خیز اور مسخرانہ تھا۔ مجھے عجیب لگا مگر میڈم نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ وہ عادی ہو چکی تھی۔

وہ پلٹا ہی تھا کہ میڈم نے کہا۔ ''اور ہاں! وہ انسپکٹر اظہر کو بھی راضی کر دینا۔ بہت عزت کرتا ہے۔''

میرو شاہ نے دوبارہ سرِ تسلیم خم کیا اور پلٹ گیا۔ اُس کے جانے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''ہاں! تمہارا نام کیا ہے؟''

اُسے بڑی دلچسپی آمیز نظروں سے دیکھتے پایا تو میں قدرے گڑبڑا گیا مگر میں نے سنبھلنے میں دیر نہیں کی۔ ایک طویل سانس خارج کی اور مستحکم لہجے میں کہا۔ ''میڈم! میرا نام شہریار ہے۔''

''ویری گڈ!'' اُس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ''یہ ہوئی نا بات۔ شہریار بڑا کیوٹ نام ہے۔ تمہاری آپ بیتی بھی بڑی کیوٹ ہو گی۔ کچھ چھپاؤ گے تو گڑبڑ ہو جائے گی۔ مجھے اچھا سامع جان کر شروع ہو جاؤ۔ تم یہاں کیوں ہو؟ مجھے اس سوال کا تفصیلی جواب درکار ہے۔''

میری بات طویل تھی۔ خود اعتمادی بھی لوٹ رہی تھی۔ اس لیے میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟''

اُس نے ایک ادا سے سر کو دائیں بائیں حرکت دی۔ ''نہیں۔ ابھی یہ طے نہیں ہوا کہ تم قابلِ اعتماد ہو۔ جب تم نے خود کو سچا اور مخلص ثابت کر دیا، تمہیں اپنے سامنے بٹھاؤں گی۔''

اُس کے ہاں لفظوں کی ادائیگی بڑی رواں اور کامل تھی جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ خاصی پڑھی لکھی تھی۔ بڑی بڑی شفاف آنکھوں سے پھوٹتی نادیدہ شعاعیں ذہن تک اترتی محسوس ہوتی تھیں۔ میں نے نور پور سے اپنی کہانی کا آغاز کیا۔ بغیر کوئی آمیزش کیے، جھوٹ بولے، اُسے تمام ماجرا کہہ سنایا۔ وہ شیشے کے ایک نفیس گلاس کو گاہے بہ گاہے لبوں سے لگا کر پانی کا گھونٹ بھرتی، پھر میری طرف متوجہ ہو جاتی۔ وہ تب مسکرا دیتی جب میں اُسے دیکھنے کے بعد چند لمحوں کے لیے اپنی روانی کھو بیٹھتا تھا۔ ایسے میں میری توجہ اُس کے خدوخال کی ندرت اور شخصی نکھار پر مرکوز ہو جاتی تھی۔

جب میری کہانی میں عشرت عرف عاشی اور جیت شاہ کا کردار داخل ہوا، وہ بری طرح چونکی۔ صوفے کی ٹیک چھوڑ کر بولی۔ ''اوہ..... وہ والا نور پور۔ اچھا، ٹھیک ہے، تم اپنی کتھا جاری رکھو۔''

مجھے اُس کے اچانک بدلنے والے تاثرات پر حیرت ہوئی مگر میں نے زیادہ توجہ نہیں دی اور بولتا رہا۔

وہ اسما کے تذکرے پر بھی چونکی اور اپنے غیر معمولی سرخ ہونٹ سکیڑ کر بولی۔ ''کیا سردار حیدر خان کی بیٹی کی بات کرتے ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور سلسلۂ کلام جوڑ لیا۔ میرے بیان کے بیچ میں وہ گاہے بہ گاہے کوئی سوال کر دیتی، کچھ پوچھ لیتی، میں جواب دے کر مطمئن کر دیتا۔ جونہی میری کہانی ختم ہوئی، وہ بولی۔ ''شہریار! تمہاری بیان کردہ کہانی کے اکثر کرداروں کو میں جانتی ہوں۔ تم نے کہیں جھوٹ بولا ہے تو اُس کی تصحیح کر لو کیونکہ میں ویری فی کیشن کروں گی۔''

میں نے کہا۔ ''میڈم! آپ جس طرح چاہیں، پرکھ لیں۔ میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔''

وہ عجیب مزاج رکھتی تھی۔ کافی دیر تک مجھے یک ٹک دیکھتی رہی، پھر بولی۔ ''ہاں! اب تم اُدھر صوفے پر بیٹھ جاؤ۔ بتاؤ، تم کیا چاہتے ہو؟''

میں نے بیٹھ کر کہا۔ ''میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔''

اُس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

''ہو سکتا ہے، زور آور نے کسی اور تھانے میں موبی کے قتل کا مقدمہ درج کروایا ہو، قاتل تک پہنچنے کے لیے مجھے دھر لیا جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میرا دوست کھالا گرفتار ہو جائے اور اُسے مار پیٹ کر میرا نام پتا پوچھ لیا گیا ہو۔ جونہی نور پور پہنچوں، گرفتار کر لیا جاؤں اور موبی کے قتل کے مقدمے میں ڈال کر چالان کر دیا جاؤں۔''

وہ بولی۔ ''ہاں! اگرچہ تم نے قتل نہیں کیا مگر اعانتِ جرم کے الزام میں ہی تمہارا کباڑا ہو جائے گا۔'' کچھ دیر کے سکوت کے بعد اس نے کہا۔ ''پھر؟''

''تم کھالے کی موجودہ پوزیشن سے بھی لاعلم ہو، ہے نا؟'' کچھ دیر کچھ سوچنے کے بعد اس نے کہا۔

''جی میڈم!'' میں نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ ''میں نہیں جانتا کہ وہ کس حال میں ہے۔''

''اسما سے اُس کے تعلقات کی نوعیت کے بارے میں ایک مرتبہ پھر بتاؤ۔ اسما کس حد تک اُس کی ذات میں انوالو ہے؟''

میں نے، جو کچھ میں جانتا تھا، دہرایا۔ وہ لمبی 'ہوں' کر کے خاموش ہو گئی۔ ایسے میں اُس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ صوفے پر نیم دراز تھی۔ میں نے اُسے بہ غور دیکھا۔ وہ

بلاشبہ بہت خوب صورت تھی۔ پیرٹ کلر کی کڑھائی دار قمیص، گہرے سبز رنگ کی شلوار اور اسی رنگ کا میچنگ دوپٹا اُس کی شخصیت کے گرد زبردست مقناطیسی حصار کھینچ رہا تھا۔ وہ گھریلو، سادہ اور کیوٹ دکھائی دیتی تھی مگر میروشاہ نے اُس کی طاقت اور سوچ کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، وہ بیان کرتا تھا کہ وہ بہت پہنچی ہوئی، زیرک اور زمانہ ساز عورت ہے۔

"تم نور پور میں رہتے ہو، نور پور کے معاملات سے بخوبی واقف ہوگے؟"

"میں سمجھا نہیں میڈم؟"

"وہاں ایک نہیں، کئی بڑے رہتے ہیں۔ یارن خان، وریام خان، حیات خان اور ان سب سے بڑا کردار دل جیت شاہ...... یہ لوگ دونوں ہاتھوں سے دولت لٹاتے ہیں مگر دولت ہے کہ دن بہ دن ان کے پاس جمع ہوتی جاتی ہے۔ آخر ایسا کیا ہنر ہے ان لوگوں کے پاس؟" اُس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا، کہا "میڈم! میں انہیں جانتا تو ہوں، ان میں اُٹھتا بیٹھتا بھی ہوں مگر ان کے کسی ہنر سے آگاہ نہیں ہوں۔ میرے لیے تو یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ آپ ان سب لوگوں کو جانتی ہیں۔"

"نور پور میں کسی کو بھی ان کے کرتوتوں کا علم نہیں ہے؟" اُس کے لہجے سے حیرت مترشح تھی۔

"کون سے کرتوت؟"

وہ مجھے بہ غور دیکھ رہی تھی۔ منہ سے کچھ نہ بولی، تفہیمی انداز میں سر ہلانے لگی اور پھر اُس نے اپنی آنکھیں موند کر اپنا سر صوفے کی پشت پر رکھ دیا۔ کوئی پانچ منٹ کا دورانیہ اسی حالت میں تمام ہوا۔ پھر اچانک اُس نے آنکھیں کھول کر مجھ پر گاڑ دیں۔ بولی "شمیر یار! تم مستقبل میں کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

میرے جی میں آئی کہ میں اُس پر اپنا وہ دکھ بھی آشکار کردوں جس نے آج تک مجھے چین نہیں لینے دیا تھا اور اُس سے مدد طلب کروں مگر جھجک آڑے آئی اور کچھ نہ کہہ پایا۔

وہ بولی "تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "نو میڈم! میں اندھیرے میں ہوں۔"

"جس نے تمہاری زندگی میں یہ اندھیرا طاری کیا ہے، اُسے جلا دو۔ تاریکی چھٹ جائے گی۔"

یہی تو میری مشکل تھی۔ میں اُس شخص کی تلاش میں ناکام ثابت ہوا تھا۔ مجھے اُدھیڑ بن میں مبتلا پا کر اُس نے موضوعِ گفتگو بدلا۔ "اچھا چھوڑو اس بات کو، یہ بتاؤ، تم میرے لیے کچھ کر گزرنے کا حوصلہ رکھتے ہو؟"

دُنیا کا نظام "کچھ لو اور کچھ دو" پر چلتا ہے۔ اس نے مدد کی تھی، اُسے حق حاصل تھا کہ اپنی اعانت کی کچھ قیمت طلب کرتی۔ میں نے کبیدہ دلی سے کہا "میڈم! میں تو غریب آدمی ہوں۔ میرے پاس دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔"

وہ ایک دم مسکرائی، بولی "یہ اندازہ تو مجھے بھی ہے۔ میرے سوال کو نئے رُخ سے سمجھنے کی کوشش کرو۔ کیا احسان کا بدلہ احسان سے چکانے کی ہمت رکھتے ہو؟"

میں اُس کے کس کام آسکتا تھا؟ سوچ کر دل بیٹھنے لگا۔ کہا "میرے پاس دینے کے لیے، سوائے اپنے خون کے کچھ نہیں ہے۔"

اُس کی مسکراہٹ میں مزید گہرائی سمٹ گئی۔ آنکھیں نیم باز ہوگئیں۔ قدرے شوخی سے بولی "دیہاتی خون میں جھوٹ نہیں رچتا۔ منافقت اور دھوکا شامل نہیں ہوتا۔ تم مجھے خون دو، بڑی بات ہے۔ میں اُسے بدن سے کیسے کشید کروں گی، یہ میرا کام ہے۔"

پھر اُس نے اپنے بائیں جانب پڑی ہوئی چھوٹی سی بلوریں تپائی پر سے انٹرکام ریسیور اُٹھایا۔ کوئی نمبر پش کیا اور کان سے لگا کر کسی کو فوراً کمرے میں پہنچنے کا حکم صادر کیا۔ چند لمحوں بعد ایک باوردی ملازم کمرے میں داخل ہوا۔ وہ حاکمانہ انداز میں بولی "شبو! مہمان کو گیسٹ روم میں لے جاؤ۔ اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔ ہاں! ٹیلی فون کی ایکس ٹینشن اشارٹ کردینا۔ کہیں فون کرنا چاہے گا تو کرلے گا۔"

پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولی "شمیر یار! اب تم گیسٹ روم میں جا کر آرام کرو۔ کسی شے کی ضرورت ہو تو روم میں موجود انٹرکام کا بزر بجا دینا۔ شبو کمرے میں ٹیلی فون لگا دے گا۔ تم اپنے گاؤں میں کسی کو فون کرکے اپنے گھر میں اپنی خیریت کی اطلاع کردینا مگر ایک دھیان رکھنا کہ میرے بارے میں کچھ نہ بتانا۔ اوکے؟"

"بہت شکریہ میڈم! میں شاید آپ کے احسانات کا بدلہ کبھی چکا نہیں پاؤں گا۔" میں نے کہا اور شبو کی معیت میں اُس کے کمرے سے نکل کر اُسی گیسٹ روم میں آگیا جہاں، میری اور امیر شاہ عرف میروشاہ کی شب بسری کا ہنگامی اہتمام ہوا تھا۔ شبو، جس کا نام شبیر یا شمیر ہوسکتا تھا، نے فون کی سہولت مہیا کی۔ گیلری میں ہی ٹی وی لاؤنج اور لائبریری کے دروازے کھلتے تھے۔ گیلری کا آخری دروازہ ایک بڑے اور خوبصورت لان میں کھلتا تھا۔ شبو نے حقِ میزبانی ادا کرتے ہوئے مجھے بہت سی کارآمد معلومات فراہم کیں۔

آٹھ بڑے چھوٹے کمروں پر مشتمل یہ حصہ گیسٹ ان کہلاتا تھا۔ میڈم کے سامنے خاموش گو دکھائی دینے والا [illegible]نت میں خاصا باتونی ثابت ہوا تھا۔ میرے استفسار پر [illegible]ے میروشاہ کی واپسی کا وقت بتانے سے معذوری ظاہر [illegible]ی۔ میں اس سے مل کر یہاں سے رخصت ہونا چاہتا تھا۔

اُس کے جانے کے بعد میں نے فون پر امیر نواز سے [illegible]کرنے کی کوشش کی مگر قریشی چوک والی ایکس چینج میں [illegible]ی فنی خرابی عود کر آئی تھی جس کی وجہ سے 'ٹوں، ٹوں' کی [illegible]دیدہ آواز نے ہی میرا استقبال کیا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ امیر [illegible]کے سیٹ کی بیٹری ڈاؤن ہوگئی ہو۔

ایک مسلسل اضطرابی کسک کے باوجود میں خود کو اس جگہ [illegible]ی محفوظ خیال کرنے لگا تھا۔ گھر والوں کی اُداسی، پروین [illegible] پریشانی کا احساس، کھالے کی عدم دستیابی اور نور پور میں پیش آنے والے ممکنہ خطرات نے ذہن کو خاصا پراگندہ کر رکھا تھا جبکہ میں ان سوچوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا مسلسل ناکام ہو رہا تھا۔

ڈاکٹر شاہ جی اکثر کہا کرتے تھے کہ جب سوچ کی چشم [illegible]از کوئی واضح شبیہ بنانے میں کامیاب نہ ہو پا رہی ہو تو [illegible] سوچ سے فی الوقت چھٹکارا حاصل کرکے ذہن کی صحت کو [illegible]حال کرنے کی کوشش کی جائے۔ مطمئن، آسودہ اور ہلکی ڈگر [illegible] بنا ہوا ذہن ہی قائدہ مند صورت کی تشکیل دے سکتا [illegible]۔ شاہ جی کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے ان تکلیف دہ [illegible]وں کو پسِ پشت ڈال کر دوپہر تک کا وقت میں نے لان، [illegible]اُس کے بیرونی لان، لائبریری اور ٹی وی لاؤنج میں [illegible]را۔ اس عرصے میں شبو، ظاہر خان اور دو ملازموں کے [illegible] مجھے کوئی شخص دکھائی نہیں دیا تھا اور نہ ہی میڈم کی شکل [illegible]ی دی تھی۔ ظاہر خان خاصا خشک مزاج آدمی تھا۔ اُس کا [illegible]وا لئے ہاتھ والی گیلری کے آخری سرے پر تھا۔ وہ رات [illegible]وٹھی کی چوکیداری کے فرائض سرانجام دیتا تھا اور دن بھر [illegible]ام کرتا تھا۔ گیٹ پر زردار نامی شخص بہ طور واچ مین کم [illegible]ورنی گارڈ تعینات تھا۔ اُس کے کاندھے پر وہی کلاشن[illegible]ل جیسی سب مشین گن لٹک رہی تھی جسے میں نے رات کو ظاہر خان [illegible]اندھے پر لٹکا دیکھا تھا۔

وقفے وقفے سے میں نے کئی مرتبہ امیر نواز کو فون کیا۔ [illegible]رکت خان کا نمبر بھی ٹرائی کیا مگر کام نہیں بنا۔ کتنا اچھا [illegible]ر نور پور تک سیلولر سسٹم پھیل چکا ہوتا تو مجھے وہاں کے [illegible]ے آگہی حاصل کرنے میں اتنی دشواری کا سامنا نہ [illegible] پڑتا۔

دو بجے شبو نے میرے آگے پُرتکلف کھانا چُن دیا۔ میں نے ڈٹ کر کھایا، چائے پی اور بیڈ پر دراز ہوگیا۔ دو تین گھنٹوں کی نیند، نیم گرم پانی کے غسل اور محفوظ ہونے کے احساس نے میری خود اعتمادی اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو جلا بخش دی تھی۔ مجھے اب میروشاہ کی آمد یا میڈم شکیلہ کے طلب کیے جانے کا انتظار تھا اور اسی انتظار میں شام ڈھل گئی۔ آٹھ ساڑھے آٹھ بجے شبو نے پھر پُرتکلف کھانا میرے سامنے سجا دیا۔ میں نے اُس سے میروشاہ کے بارے میں پوچھا تو اُس نے مجھے یہ کہہ کر حیران کردیا کہ میروشاہ آیا تھا اور میڈم سے ملنے کے بعد واپس چلا گیا تھا۔ عجیب بات تھی کہ اُس نے مجھ سے ملنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ جدا ہونے تک وہ مجھ پر بے حد مہربان تھا۔ میڈم سے ملاقات ہوتے ہی میں نہ جانے کیوں اُس کے لیے بالکل غیر اہم ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ نکتہ میری فہم سے بالاتر تھا۔ میں نے شبو سے اُس کا فون نمبر مانگا۔ اُسے زبانی یاد تھا۔ اُس نے ایک پرچی پر لکھ کر میز پر رکھ دیا، بولا "کھانے کے بعد آپ اُس سے رابطہ کرسکتے ہیں۔"

میں نے اُس کا موبائل فون نمبر ملایا تو اُس کی تیز آواز کانوں میں پڑی "لاڈے خان! ماڑے کو یاد کرے ہو۔ ہے نا!"

میں نے گلہ کیا "تم مجھ سے ملے بغیر ہی چلے گئے، کیوں؟"

"ماڑا دھندا ہی بڑا غلط ہووے ہے۔ پاؤں ملتان میں تو کھوپڑی لاہور میں ہووے ..... پر تم فکرمند کیوں ہووت ہے؟"

"میں اکیلا ہوں۔ بور ہو رہا ہوں۔ تم وقت نکال کر یہاں آجاؤ، کچھ وقت اچھا گزر جائے گا۔" میں نے کہا۔

"ماڑے کو مت چھیڑو۔ وقت نکال کر ملنے کے لیے آوت ہوں۔ اگر کسی چیچ (چیز) کی جرورت ہو تو شبو میاں سے کہوے ہے۔ وہ الٰہ دین کے جن کی طرح فٹافٹ حاضر کر دیوت ہے۔ لاڈے خان! موج کرے۔ میڈم جیسے میں چھچے کانٹے جبان (زبان) سے چن لیوت ہے۔ ہاں......"

اُس کی نان اسٹاپ زبان چل پڑی تھی۔ میں نے ملنے کی استدعا کو دہرانے کے بعد ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ ایک اُمید بندھ کر ٹوٹ چلی تھی۔ اگر کھالے نے امیر نواز سے رابطہ کیا تو اُسے میرا نمبر مل جائے گا اور وہ یقیناً مجھے فون کرے گا۔ ساتھ ہی یاد آگیا کہ امیر نواز کا فون ہی اٹینڈ نہیں ہو رہا تھا۔ کھالا اُس سے رابطہ کیسے کرسکتا تھا؟

گیسٹ ہاؤس کے لان میں کھڑے ہو کر کوٹھی کو دیکھنے سے اُس کے حجم اور وسعت کا قدرے درست اندازہ ہوتا تھا۔ نور پور میں خانزادوں کی حویلیوں کو دیکھ رکھا تھا۔ ذہن نے تصور باندھ رکھا تھا کہ اُن سے بڑی اور لگژری کوٹھیاں کم از کم اس ملک میں نہیں ہیں مگر جب میڈم کی اس پراسرار کوٹھی کو دیکھا تو حیرت دوچند ہوگئی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق تین فلورز پر مشتمل اس عمارت میں کم از کم چالیس کمرے تھے۔ گراؤنڈ فلور، جس میں گیسٹ ہاؤس واقع تھا، کسی بیاباں کی طرح پُرسکون تھا جبکہ فرسٹ فلور پر نقل و حرکت اور ملی جلی آوازوں کا شور بھی کبھار سنائی دیتا تھا۔ شیو، ظاہر خان، زوار اور دو مسکین طبع ملازموں کو میں نے سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ظاہر یہی ہوتا تھا کہ اُنہیں محض گیسٹ ہاؤس تک محدود رہنے کی ہدایت ملی ہوئی تھی۔ شیو اور ظاہر خان بے تکلفی کے ابتدائی مراحل عبور کر رہے تھے جبکہ باقیوں نے مجھ پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

رات میرے بستر پر کانٹے چبھتے ہوئے گزرتی جارہی تھی مگر میڈم کی طرف سے بلاوا نہیں آیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ مجھے دلاسا دینے کے بعد فراموش کر بیٹھی تھی۔ گیارہ کے قریب میں کروٹیں بدل بدل کر اکتا گیا اور سست روی سے چلتا ہوا لان میں آ گیا۔ تراشیدہ مخملیں گھاس اوس زدہ ہو کر سرد رات کی نصف خنکی اپنے اندر سمیٹے میری طرح جاگ رہی تھی۔ میں نے جوتے اُتار دیے اور لان کے آخری سرے تک ٹہلتا چلا گیا۔ جلتے ہوئے بدن کے ساتھ برف پر چلنا بڑا عجیب لگ رہا تھا۔

پہلے سا خوف میرے ذہن پر سوار نہیں تھا۔ چونکہ حیات خان کے دارے پر بہ کثرت آنے جانے کی بدولت تھانے کچہری کے معاملات سے کافی حد تک آگاہ تھا۔ لوگ زمین، قبضے اور چھوٹے موٹے جرائم کے سلسلے میں حیات خان سے قانونی اور پنچایتی معاونت لینے کے لیے آتے رہتے تھے۔ اُن کے حل طلب مسائل اور خان کے مشورے سنتا سمجھتا رہتا تھا۔ معمولی نوعیت کے قانونی معاملے گھروں کو چاٹ جاتے تھے۔ میں تو قتل کی لرزہ خیز اور سرعام وقوع پذیر ہونے والی واردات میں ملوث ہوا تھا۔ بجا طور پر اگر امیر شاہ اور میڈم میری مدد نہ کرتے تو شاید میری بقیہ زندگی سلاخوں کے پیچھے ہی گزرتی۔ چاچا چراغ میں اتنا دم خم نہیں تھا کہ وہ میرے کیس کی پیروی کرتے، کوئی اچھا وکیل کرتے یا ضمانت کی کامیاب کوشش کرتے۔ صحیح معنوں میں مجھے اچانک اور غیر متوقع میسر آنے والی کمک ناقابل یقین امداد تھی۔

رات کو گہری نیند سویا۔ صبح ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ میرو شاہ آن پہنچا۔ وہ خاصا تروتازہ دکھائی دیتا تھا۔ مجھ سے ہاتھ ملا کر صوفے پر ٹانگیں پسار کر بیٹھ گیا، بولا ”کیوں رے، کوئی پرابلم تو نہ ہووت ہے ادھر؟“

میں نے کہا ”نہیں، البتہ بہت زیادہ بوریت محسوس کر رہا ہوں۔ اگر تم میرے ساتھ ہوتے تو شاید وقت گزرنے کا پتا بھی نہ چلتا۔ کہاں غائب ہو گئے تھے؟“

”کہا تو تھا کہ ماڑا کام ہی ایسا ہے۔ نہ جانے کا پتا نہ آنے کا۔ ابھی میڈم سے مل کر آ دے ہوں۔“

”اُس نے کچھ کہا؟“

”ارے صبر تو کر یو دو چار گھڑی لاڈے میاں! جرا (ذرا) لینے دیوت ہے کہ نہیں......“ وہ ہاتھ اُٹھا کر بولا ”میری مانو، میڈم بھی لٹو ہو گئی ہے تیرے پر...... ماڑے کو آکھیں ہے کہ لاڈا تو ایک دم نواں نکور ہووے ہے، معشوق کے ماف۔ تیری چاندی ہو گئی ہے غنچے، چاندی...... سووے تو ہیروں کی سیج پر، جاگے تو سونے کی چپل پہنے، چلے تو نوٹوں کی گڈیوں پر نخرے سے پاؤں دھرے...... اڑے کیا کہنے میڈم کے معشوق کے!“

میں نے اُسے بہ غور دیکھا۔ کہیں مذاق تو نہیں کر رہا؟ مگر اس کے چہرے پر ستائش کے جذبات کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیا۔ میں نے اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا ”میں یہاں سے جانے کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔“

”جانے کو چلا ہی جاوت ہے پر کچھ باتیں کان کھول کے سنتا جاوے ہے تو!“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا اور مجھے اپنے مخصوص انداز میں ’راز‘ کی باتیں بتانے لگا۔

اُس کی گھنٹا بھر کے دورانیے پر مشتمل مخصوص انداز گفتگو کا خلاصہ یہی تھا کہ میڈم کی آنکھوں نے مجھے قابل اعتبار قرار دیا تھا۔ وہ مجھے اپنے ہاں ملازمت دینے کی خواہاں تھی۔ میرو شاہ نے تنخواہ کی جو رقم بتائی، وہ اتنی زیادہ تھی کہ مجھے کافی دیر یقین نہیں آیا۔ جب اُس نے اپنی تنخواہ کے بارے میں بتایا تو میری آنکھیں مزید پھیل گئیں۔ مجھے امیر شاہ جی کی تنخواہ بہت زیادہ محسوس ہوا کرتی تھی۔ میڈم نے اُس سے دگنی تنخواہ کی آفر کی تھی۔ میرو شاہ نے میرے استفسار پر بتایا کہ میڈم نے ابھی کام کی نوعیت کے بارے میں کوئی بات نہیں کی، صرف اتنا ہی کہا تھا کہ میں نور پور جاؤں اور ہر دو ے چوتھے روز میڈم سے فون پر رابطہ کروں۔ وہ مجھے ڈکٹیشن دے گی۔ جب میں نور پور سے آنے پر آمادہ ہو جاؤں گا، میری پکی نوکری کر دی جائے گی۔ میرو شاہ نے ایک پرچی پر میڈم کا فون نمبر لکھ کر

دیا ”غنچے! اپنے گاؤں میں جا کر جندگی (زندگی) کے مجے (مزے) لوٹو۔ گھر جا کر ماڑے کو دعائیں دیوے گا ناں؟“

”ر(ضرور) دیوے گا ماڑا لاڈا......“

اُس نے اپنی بغلی جیب میں سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال اور میری جھولی میں ڈال دی ”موجاں کرنے کو روکڑا جیب میں ہونا جروری ہووے ہے لاڈے میاں! یہ میڈم کا تحفہ ہووے۔ چل، اب میرو شاہ تیرے کو لاری اڈے پر چھوڑ آوے۔“

میں عجیب گومگو کی کیفیت میں ڈوبا، نوٹوں کی گڈی کو ہاتھوں میں سختی سے تھامے بیٹھا میرو شاہ کو دیکھ رہا تھا۔ بجا طور پر اتنی بڑی رقم پہلی مرتبہ میرے ہاتھوں میں آئی تھی۔ میں نے تھوک نگلا ”یہ تو بہت زیادہ ہے۔ مجھے تو بس کرایہ......“

وہ صوفے سے اُٹھ کر میرے قریب آ گیا، اپنی عادت کے مطابق میرے کندھے پر دھپ مار کر بولا ”اڑے کیا جیادہ (زیادہ) ہووے...... یہ سسری کے نوٹ جیادہ ہیں؟ اڑے بچے! تیرے پہ ماڑی میڈم عاشق ہو جاوت ہے۔ وہ لاکھوں تیری جوانی پر وار دیوے اور پوچھے بھی نہیں...... ہاں تو!“

اُس نے میری خالی الذہنی کی کیفیت کو تاڑ لیا اور ہاتھوں سے نوٹوں کی گڈی اور فون نمبر والی پرچی کھینچ کر میری بغلی جیب میں ڈال دیں۔ مجھے چونکہ نور پور جانے کی اجازت مل چکی تھی، اس لیے میں یہاں سے نکلنے کے لیے خاصا بے تاب تھا۔ میڈم سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو میرو شاہ نے بتایا کہ میڈم بہت زیادہ مصروف ہونے کے سبب ملاقات نہیں کرے گی۔ اب جو بھی بات ہوگی، ٹیلی فون پر ہوگی۔

ہم دونوں گیسٹ روم سے نکل کر پارکنگ میں آ گئے۔ سفید رنگ کی ہنڈا اکارڈ ہمارے لیے تیار تھی۔ ہمارے ہی ڈرائیور نے گاڑی پارکنگ سے نکال لی۔ دس منٹ بعد میں لاری اڈے میں ڈیرا اسٹینڈ کے عین سامنے سڑک پر کھڑا تھا جبکہ میرو شاہ اپنے مخصوص انداز میں کلکاریاں کرتا ہوا، ہاتھ لہرا کر خدا حافظ کہتا ہوا اکارڈ میں بیٹھ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

میں نے غیر محسوس انداز میں اپنی بغلی جیب کو ٹٹولا۔ سو سو کے سرخ نوٹوں کی گڈی کی موجودگی کے احساس نے باور کرا دیا کہ میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا تھا بلکہ جو کچھ دیکھا تھا حقیقت میں دیکھا تھا۔ ایسے ہی وقت میں ڈیرا جانے والی بس اسٹینڈ سے نکلتی دکھائی دی اور میں لپک کر اُس میں سوار ہو گیا۔

میں ایک ڈیڑھ بجے چوک قریشی پہنچ گیا۔ شیدو نے مجھے بس سے اُترتے ہی دیکھ لیا تھا۔ بھاگ کر میرے پاس آیا، سلام لے کر جھٹ سے پوچھنے لگا ”اُستاد کہاں ہے؟“

اُس کا اشارہ کھالے کی طرف تھا۔ میں نے کہا ”کیا وہ ابھی تک نہیں پہنچا؟“

”نہیں تو! وہ تمہارے ساتھ گیا تھا، اکیلا کیسے آ جاتا؟“ شیدو متفکر ہو گیا ”سارے گھر والے بڑے پریشان ہیں، تمہارے گھر والے بھی بار بار پوچھنے آتے ہیں اُستاد!“

ہم دونوں چلتے ہوئے ویگن کے قریب آ گئے۔ ڈرائیور عزت خان ہوٹل کے ماچے پر براجمان تھا۔ ابھی ویگن کو نکلنے میں دیر تھی۔

موسم بہت اچھا تھا۔ بادل جھوم جھوم کر اٹکھیلیاں کر رہے تھے اور کسی دم بھی بارش ہونے والی تھی۔ جب میں نور پور میں پہنچا تو بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنی گلی میں داخل ہوا اور میں نے گھر میں داخل ہونے سے پہلے اطراف کا احتیاط بھری نظروں سے جائزہ لے لیا تھا۔ میری توقع کے عین مطابق پروین اور چاچی نے مجھے دیکھتے ہی سخت باز پرس شروع کر دی۔ اُن کے لہجوں میں جہاں برہمی عیاں تھی وہاں گہرے تفکر اور اندیشے بھی سر ابھار رہے تھے۔ اُن کی بلند آوازیں سن کر گھر کے دوسرے افراد بھی وہاں آ گئے اور ہر ایک نے میری ’آؤ بھگت‘ میں مقدور بھر حصہ ڈالا۔

شانو میرے لیے چائے کا بڑا پیالہ تیار کر لائی۔ میں نے ماقبل شیدو، عزت خان اور اب گھر والوں کی باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ نور پور میں میری اور کھالے کی واردات کی خبر نہیں پہنچی تھی اور نہ ہی کوئی ہمارے تعاقب میں یہاں تک آیا تھا۔ میں نے اپنے ٹرنک میں میڈم کی دی ہوئی نوٹوں کی گڈی چھپا کر محفوظ کر دی تھی کیونکہ اتنی بڑی رقم کی موجودگی گھر میں طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی۔

کچھ دیر ستانے کے بعد بھرپور انداز میں غسل لیا اور کھیتوں میں چلا گیا۔ معمول کے کام کاج میں ہاتھ بٹایا اور شام اپنی سرمئی چادر نور پور پر پھیلائے خندہ زن تھی، جب میں ویگن اسٹینڈ پر پہنچا۔ کرکٹ کے گراؤنڈ میں لڑکوں کی ایک ٹولی بڑا سا دائرہ بنا کر بیٹھی دکھائی دی۔ مراد بخش دیوانے کی موجودگی کا شبہ ہوا۔ قریب پہنچ کر میں نے اُسے لڑکوں پر اپنے علم کی دھاک بٹھاتے سنا۔ وہ تھوڑا کھسک کر میرے بیٹھنے کی جگہ بناتے ہوئے بولا ”ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ اس وقت سرا گنگی دو بڑا عالمی ادب میں اپنی انفرادی جگہ بنا چکا ہے۔“

ایک لڑکے نے جھٹ سے پوچھا ”کیا انگریزوں کو

سرائیکی کی سمجھ آتی ہے؟"

وہ تاسف بھرے انداز میں بولا۔ "یار ایک تو میں تم جیسے جاہلوں سے بڑا تنگ ہوں۔ او میرے بھائی! سرائیکی دوہڑوں کا ہر زبان میں ترجمہ ہوتا ہے، انگریزی میں بھی۔"

میں نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ "اور اپنے دیوانے کے دوہڑوں نے تو یورپ کی لڑکیوں کو حواس باختہ کر کے رکھ دیا ہے۔ سنا ہے کہ وہاں مراد بخش دیوانے کے مجسمے نصب کیے جا رہے ہیں۔"

سبھی لڑکوں کے چہرے معنوی استعجاب سے دمک اُٹھے۔ دیوانے کا چہرہ فرطِ غیظ سے دہک اُٹھا۔ اُس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ ابے الو کے پٹھے! میں تمہاری چالاکی سمجھتا ہوں۔

میں نے اُس کی پھڑکتی ہوئی رگوں کو دیکھ کر ہنستے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگایا اور اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے اُسے دوہڑا سنانے کی فرمائش کی۔ یہی وہ چاہتا تھا۔ اُس کی گردن اکڑ گئی اور لبوں سے سیکڑوں مرتبہ کے جھڑے ہوئے 'پھول' تواتر سے جھڑنے لگے۔ میں نے کچھ دیر مراد بخش دیوانے کے چکنے چپڑے دوہڑے سنے پھر اُس سے جان چھڑا کر کھانے کی خبر لینے کے لیے ویگن اسٹینڈ کا رُخ کیا۔ ویگن آخری پھیرا لے آئی تھی مگر کھالا نہیں آیا تھا۔ چونکہ دیہاڑی دار ڈرائیور عزت خان کو واپس چوک قریشی جانا تھا، اس لیے وہ خالی ویگن لے کر چلا گیا اور میں دل ہی دل میں کھالے کی پریشانی ذہنی بساط پر سمیٹے نڈھال سا ہو گیا۔ وہ نہ جانے اس وقت کس حال میں تھا۔ آج ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں جانے کی سکت نہیں تھی مگر علی الصباح چہل قدمی کے دوران میں ڈاکٹر شاہ جی کے نقشِ پا پر چل رہا تھا۔

میں نے چمن زار جھیل پر ہونے والے بھیانک واقعے کا تذکرہ گول کر لیا اور اُس کے تقاضے پر عاشی کے بارے میں حاصل کردہ معلوماتی چارٹ اُس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا۔ "تمہیں ایک دن مظفر گڑھ میں جا کر گزارنا ہوگا۔ دیکھنا ہوگا کہ عشرت پڑھنے جاتی ہے، کیا پڑھتی ہے اور کسے پڑھانے کی کوشش کرتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اگلے ہفتے جاؤں گا۔"

"اس ہفتے کیوں نہیں؟"

"بدھ اور جمعرات کی درمیانی رات جیت شاہ کے مزار پر مصروف رہوں گا۔"

"نہیں، تم مزار کے نزدیک بھی نہیں جاؤ گے۔ بخت خان جو کھیل کھیلتا ہے، کھیلنے دو اور دُور بیٹھ کر تماشا دیکھو۔"

"اگر اُس نے مجھے بلا لیا تو؟"

"کوئی سا بہانہ کر دینا۔ کہہ دینا کہ بخار نے آن لیا ہے۔ میرے پاس آ کر سو جانا اور ظاہر کر دینا کہ تم فوراً سے باہر کسی ضروری کام کے سلسلے میں جا رہے ہو۔" اُس نے اٹل لہجے میں کہا۔

"مگر کیوں؟" میں سخت متعجب ہوا۔

"تم ابھی نادان ہو، ضائع ہو جاؤ گے۔"

"شاہ جی! میں بچہ تو نہیں ہوں۔"

"مگر بڑے بھی نہیں ہو برخوردار! کسی زعم میں مت رہنا۔ بخت خان بھی آج نہیں تو کل پیچھے ہٹ جائے گا۔ میرا جہاں تک خیال ہے، دل جیت شاہ اکیلا نہیں ہے۔ اُس کا ساتھ وریام خان دے رہا ہے جبکہ حیدر خان پشت پناہی کر رہا ہے۔ یقینی بات ہے کہ بڑے خان کی مرضی اور شہ کے بغیر سائیں جیت شاہ کوئی بھی ناجائز کام نہیں کر سکتا۔ جب بخت خان پر اپنے بھائی کے کرتوت عیاں ہوں گے، وہ مجبوراً پیچھے ہٹ جائے گا اور تب تک تم خان اور دل جیت شاہ کی نظروں میں کانٹے کی طرح چبھ چکے ہو گے۔ وہ تمہیں توڑ دیں گے، جلا دیں گے یا پرے پھینک دیں گے۔"

خوف کی ایک سرد لہر میرے بدن میں سرایت کر گئی۔ ڈاکٹر شاہ جی کے اندازے کبھی غلط ثابت نہیں ہوتے تھے۔ اگر ایسا تھا تو بہت ہی بُرا تھا۔ واضح تھا کہ وریام خان کے مقابلے میں سردار بخت خان زیادہ دیر سینہ سپر نہیں رہ سکتا تھا۔ ہار جاتا، پیچھے ہٹ جاتا تو میرا کیا ہوتا؟ وہی ہوتا جو ڈاکٹر شاہ جی مجھ پر قبل از وقت آشکار کر رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"میں یہ نہیں کہتا کہ تم بالکل غیر متعلق ہو جاؤ، نہیں..... بخت خان سے مفاد حاصل کرنے کے لیے اُس کی ہاں میں اپنی ہاں ملاتے رہو، زبانی کلامی اپنی وفاداریاں گنگناتے رہو مگر جہاں بھی اوکھلی دکھائی دے، موسلوں کے ڈر سے اپنا سر پیچھے ہٹا لینا۔" اُس نے میرا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "اب چھوڑو ان باتوں کو، نرم سی مسواک بنا لاؤ..... تم کام کم اور باتیں زیادہ کرنے کے عادی ہوتے جا رہے ہو اور یہ اچھی عادت نہیں ہے۔"

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور ایک دیسی کیکر کی طرف بڑھ گیا۔ اُس کی باتیں میرے دل کو لگی تھیں۔ ویسے بھی میں اُس کے اخلاص پر شک کرنے کی کوئی توجیہ نہیں رکھتا تھا۔

میرا دن واہموں کی زد میں گزر رہا تھا۔ سہ پہر تک چلے

سے متعدد بار ویگن اسٹینڈ کا چکر لگایا۔ بے ساختہ میری ...رتی چوک کو جانے والی سڑک کا بھی احاطہ کرتی ...میں کھالے کا منتظر تھا مگر اُس نے ابھی تک کسی طرف ...رُخ نہیں نکالا تھا۔ میری عافیت اُس کی سلامتی سے مشروط ...اگر وہ ملتان میں پولیس والوں کے ہتھے لگ جاتا تو ...را بھی خبر نہیں تھی۔ ایک پُرسہ دل کو ڈھارس دیتا تھا کہ اگر ...وہ پکڑا گیا تو وہ میرا نام نہیں لے گا۔ میں اُس کی سرشت ...ہی آگاہ تھا کہ وہ مر تو سکتا تھا مگر پولیس کے سامنے ...ان کھول کر مجھے مصیبت میں مبتلا نہیں کر سکتا تھا۔ خود کو ...مروف کرنے کے لیے میں ڈھلتی سہ پہر میں تیار ہو کر بخت ...کی حویلی پہنچ گیا۔ خان موجود نہیں تھا۔ نوکرانی نے مجھے ...معمول کے مطابق ملکہ کے کمرے میں پہنچا دیا۔ صحن میں ...بی دکھائی نہیں دی تھی۔ میں نے اُس کی غیر موجودگی کو ...یت نہیں دی کہ وہ کہیں گئی ہوئی ہوگی یا کسی کمرے میں محو ...فراحت ہوگی۔

ملکہ کمرے کے انتہائی کونے میں رکھی ہوئی جدید سنگار میز کے سامنے کھڑی تھی۔ اُس کی پشت میری ...جانب تھی۔ کمر کو اُس کے چمک دار بالوں نے چھپا لیا تھا۔ وہ ...ی نزاکت کے ساتھ ہیئر برش کو پیشانی پر جھولنے والے ...لوں میں پھیر رہی تھی۔ ایسے میں اُس کی نگاہ آئینے میں مجھ ...پڑی۔ چونک کر پلٹی اور بیڈ پر سے لٹکتے ہوئے دوپٹے کو ...اُٹھا کر سر پر رکھتے ہوئے سلام کو ہوئی۔ میں بیڈ کے بڑے ...والے تختے سے لگ کر کھڑا اور شوق سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ...اپنی کی طرف مائل لڑکپن کی آخری سرحد پر پورے ...طمطراق سے آن کھڑی ہوئی تھی۔ اُس کا رنگ گورا نہیں تھا ...مگر سرخی آمیز تھا۔ گال تمتماتے رہتے تھے۔ آنکھیں بڑی، پلکیں ...بھری بھری اور ہونٹ نسبتاً موٹے اور گداز تھے۔ وہ گھر ...والوں کی نظر میں بچی تھی، دیکھنے والے کی نگاہ بچی نہیں رہی ...تھی۔ کتابیں کھول کر قالین پر بیٹھ گئی اور اُس نے بیڈ کے ...پہلو کے ساتھ کمر ٹکا کر خود کو آسان کر لیا تھا۔ "سر! کون سی ...کتاب کھولوں؟"

"ریاضی یا انگریزی کی..... یا جس بھی مضمون میں تم ...اپنے کو کمزور محسوس کرتی ہو۔"

وہ بولی۔ "مجھے ریاضی مشکل لگتی ہے۔"

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ اُس نے ریاضی کی ...کتاب کھول کر مجھے تھما دی۔ کاپی اپنے زانوؤں پر رکھ لی۔ ...مجھے پڑھانے کا تجربہ نہیں تھا۔ جیسے پڑھا تھا، ویسے پڑھانے ...کی کوشش کرنے لگا۔ سوال حل کرنے میں اُس کی مدد کی۔

معجزہ

ایک بادشاہ کسی خوفناک مرض میں مبتلا ہو گیا اطبائے یونان کے ایک گروہ نے متفقہ طور پر فتویٰ دے دیا کہ اس کی بیماری کی کوئی دوا نہیں ہے البتہ چند خاص صفات رکھنے والے آدمی کے پتے سے اس کا علاج ہو سکتا ہے۔ بادشاہ نے ایسے آدمی کو تلاش کرنے کا حکم دے دیا۔ ایک دہقان کا لڑکا ایسا ہی مل گیا جیسا کہ طبیبوں نے بتایا تھا۔ بادشاہ نے اس کے ماں باپ کو بلایا اور بہت سی دولت دے کر خوش کر دیا اور انہیں اس بات پر رضامند کر لیا کہ ان کا بیٹا بادشاہ پر قربان کر دیا جائے۔

ادھر قاضی نے فتویٰ دے دیا کہ رعیت کے کسی آدمی کا خون بہانا بادشاہ کی سلامتی کے لیے جائز ہے۔

جب جلاد نے اس لڑکے کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو اس نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور مسکرانے لگا۔

بادشاہ نے پوچھا۔ "یہ ہنسی کا کون سا موقع ہے؟"

لڑکے نے کہا۔ "اولاد کا ناز ماں باپ پر ہوتا ہے جو قاضی کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کرتے ہیں اور بادشاہ سے انصاف چاہتے ہیں۔ اب کیفیت یہ ہے کہ ماں باپ نے دنیاوی مال کے لالچ میں مجھے قتل ہونے کے لیے سونپ دیا ہے۔ قاضی نے میرے قتل کا فتویٰ دے دیا ہے اور بادشاہ اپنی سلامتی میری ہلاکت میں دیکھتا ہے۔ اب سوائے خدائے بزرگ و برتر کے میں کوئی پناہ نہیں دیکھتا۔ اے بادشاہ تیرے ظلم کی فریاد میں کس کے آگے کروں میں تیرے ہاتھ سے تیرے ہی سامنے انصاف چاہتا ہوں۔"

لڑکے کی یہ باتیں سن کر بادشاہ کا دل بھر آیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہنے لگا۔ "اس بے گناہ بچے کا خون بہانے سے میرا مر جانا بہتر ہے۔" یہ کہہ کر اس کا منہ چوما اور گود میں اٹھا لیا پھر اسے بہت سا مال اور دولت دے کر آزاد کر دیا۔ کہتے ہیں کہ اسی ہفتے کے اندر بادشاہ صحت یاب ہو گیا۔

خیر حسین، سکھر

ہمارے یہاں ایک المیہ عام رہا ہے کہ سبق سمجھائے نہیں جاتے تھے، رٹوائے جاتے تھے۔ نتیجتاً جونہی ایک کلاس کے نصاب سے جان چھوٹتی تھی، وہ بھول جاتا تھا۔ مجھے بھی آٹھویں کلاس کی ریاضی کے سوالات بھول گئے تھے۔ میں نے نصابی کتاب میں دی گئی مثالوں پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ میرا طریقہ کارگر رہا اور میں ملکہ کو مشقی سوالات حل کرانے میں کامیاب رہا۔

نصف گھنٹے میں ہی وہ ریاضی سے اُکتا گئی، بولی۔ ”میری ہینڈ رائٹنگ بھی خاصی خراب ہے۔“

میں نے اُسے اُردو کی کتاب اور کاپی لانے کا حکم صادر کیا۔ وہ دونوں چیزیں لے آئی۔ میں نے مارکر اور شیونگ بلیڈ کا تقاضا کر دیا۔ اُس نے نوکرانی کو کریانہ کی دکان پر بھیج کر دونوں چیزیں منگوالیں۔ میں نے ماہرانہ انداز میں مارکر کی گول نب کو ’ٹک‘ لگایا، چند الفاظ لکھ کر تجربہ کیا، پھر مارکر اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اُسے اُردو کی کتاب کا کوئی سبق لکھنے کو دیا۔ اُس نے لکھنا شروع کیا تو بے اختیار میرے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ اُس کی لکھائی واقعی بہت خراب تھی۔ میں نے اُسے ’الف، ب، ج‘ لکھ کر دیا۔ اُس نے نقل کرنے کی کوشش کی۔ ناکام ہو کر میری طرف مدد طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔

لکھنا آسان نہیں ہوتا، خوب صورت لکھنا اور بھی مشکل ہوتا ہے۔ میں نے اُسے اپنے پاس صوفے پر بٹھایا۔ ہاتھ پکڑ کر حروف لکھنے سکھائے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ نسبتاً اچھا لکھنے لگی۔ شوق کے عالم میں اُس نے میرے بیٹھے بیٹھے کئی صفحات بھر دیے۔ میں نے مشق چیک کی اور اُسے ستائش بھری نظروں سے دیکھا۔ اُس کی پہلی کوشش نے باور کرا دیا کہ اس پر محنت نہیں کی گئی تھی۔

وہ بولی۔ ”مجھے میری مس جیسا لکھ کر دیتی ہیں، میں ویسا لکھ دیتی ہوں۔ پھر وہ خود ہی کہہ دیتی ہیں کہ ’تمہاری لکھائی اچھی نہیں ہے‘...... آپ جیسا لکھ کر دیں گے، میں بالکل ویسا لکھنے کی کوشش کروں گی۔ کہیں یہ نہ ہو کہ مس کی طرح آپ بھی کہہ دیں کہ مجھے لکھنا نہیں آتا۔“

میں مسکرایا۔ ”نہیں بی بی! اچھی چیز ہر ایک کو اچھی لگتی ہے۔“

وہ جواباً مسکرائی۔ ”یہ ضروری بھی تو نہیں ہوتا سرا! بابا کو کالے تیتر اچھے لگتے ہیں، مجھے اور باجی کو ایک آنکھ نہیں بھاتے۔“

میں ہنس کر خاموش ہو گیا۔ وہ ٹھیک کہتی تھی۔ کمالے

اُستاد کو مرغوں کی لڑائی دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اصیل مرغ اُس کی کمزوری تھے جبکہ مجھے اُس کا یہ شوق زہر لگتا تھا۔ مرغوں کو دیکھتے ہی میرے ماتھے پر بل پڑ جایا کرتے تھے۔

میں نے کہا۔ ”اب میں چلتا ہوں، کل آؤں گا۔ تم فارغ وقت میں زیادہ سے زیادہ لکھنے کی کوشش کرو گی۔ جتنا زیادہ لکھو گی، اتنی روانی اور خوب صورتی سے لکھ پاؤ گی۔“

اُس نے ہامی بھری اور بکھری ہوئی کتابوں کو سمیٹنے میں جُت گئی۔ ایسے ہی وقت میں کمرے کا دروازہ کھلا اور میں بُری طرح چونک کر کھڑا ہو گیا۔ ادھ کھلے دروازے سے صدف بی بی کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔ اُس کے لبوں پر بڑی دل آویز مسکراہٹ ثبت تھی۔ چند لمحے ٹھہر کر وہ کمرے میں داخل ہوئی، مجھ پر، پھر ملکہ پر ایک نگاہ ڈال کر آہستہ روی سے چلتے ہوئے میرے مقابل آ کر بیڈ پر بیٹھ گئی، بولی ”شہرے! کیسے ہو؟“

میں نے قدرے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ”ٹھیک ہوں بی بی جی!“

اُس نے ملکہ کو کن انکھیوں سے دیکھا۔ شاید اُن کے درمیان کچھ پہلے سے طے شدہ تھا، وہ کتابیں وہیں چھوڑ کر تیز قدموں سے چلتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

صدف کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ کچھ ایسا تھا جسے میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ پُراشتیاق نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”شہرے! توں میکوں بہوں سوہنا لگدیں۔“

(شہرے! تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو)

میں دم بخود رہ گیا۔ اُس نے کتنی آسانی سے اتنی بڑی بات کہہ دی تھی۔ میں جواباً کچھ نہ کہہ سکا تو وہ بولی۔ ”ہنیں ملکہ آ ویسی! میکوں جلدی نال ڈسا جو توں میکوں کتھاں کیویں مل سکدیں جو میں تیڈے نال بہوں ساریاں گالاں کرنیاں ہن؟“

(ابھی ملکہ آ جائے گی۔ تم مجھے جلدی سے بتا دو کہ تم مجھے کہاں مل سکتے ہو؟ مجھے تمہارے ساتھ بہت سی باتیں کرنی ہیں)

وہ خوب صورت تھی، اُس کی آواز اور لہجہ اُس سے بھی کہیں زیادہ خوب صورت تھا مگر اُس کے لبوں سے نکلنے والی باتیں بہت خطرناک تھیں۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”نہیں بی بی جی! بڑے خان کو پتا چلے گا تو وہ میری کھال کھینچ لے گا۔“

”بابا کو پتا نہیں چلے گا۔“ وہ بدستور سرائیکی میں بات کر رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ”آپ وہ باتیں مجھے رقعے میں لکھ کر

دے دیں۔“

”نہیں......“ وہ قطعیت سے بولی۔ ”تم مجھے جگہ بتاؤ، نظر بچا کر وہاں پہنچنا میرا کام ہے۔ ہمارا ملنا بہت ضروری ہے۔“

میری حالت دگرگوں تھی۔ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرے تذبذب کو اپنی سوچ کے مطابق مفہوم دیتے ہوئے وہ بولی۔ ”میں کل دس بجے تمہارے گھر آ جاؤں گی۔ اوکے؟“

میں نے کہا۔ ”آپ کا وہاں آنا مناسب نہیں ہے بی بی!“

”میں جانتی ہوں کہ کیا مناسب ہے اور کیا نہیں ہے۔ اُس وقت تمہارے گھر والے ڈیرے پر چلے جاتے ہیں۔ کوئی سا بہانہ کر کے گھر میں رہ جانا۔ میں ضرور آؤں گی۔ ٹھیک ہے ناں؟“

میں نے نیم وا دروازے کی طرف دیکھا۔ ابھی تک کوئی بھی اِدھر نہیں آیا تھا۔ شاید ملکہ نے راہ مسدود کر رکھی تھی ورنہ مجھے اور صدف کو حویلی میں ایسی تنہائی میسر نہیں آ سکتی تھی۔ میں اُسے گھر میں آنے سے منع کرنا چاہتا تھا مگر اُس کے اٹل ارادے کے سامنے شکست خوردہ ہو گیا اور خاصی کمزور آواز میں بولا۔ ”اچھا بی بی!“

وہ ایک جھٹکے سے اُٹھی اور دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ ایک پل کو رُکی، پلٹی، ادا سے زندہ مسکراہٹ اُچھالی اور سر لہرا کر بولی۔ ”ولا ملسوں سوہنا!“

میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ اُس کا انداز بڑا والہانہ اور عجیب تھا۔ اُس نے چند لمحوں کو ٹھہر کر میرے جواب کا انتظار کیا اور پھر جواب نہ پا کر دروازہ کھول کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اُس کے جانے کے چند ہی پل بعد ملکہ کمرے میں داخل ہوئی اور معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولی۔ ”سرا! کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“

میں اُس کی شرارت بھری آنکھوں میں جھانک کر ہارا ہوا سا بولا۔ ”مجھے تمہارا اس طرح کمرے سے باہر جانا اچھا نہیں لگا۔“

”باجی صدف کو تو اچھا لگا ہے۔“

”میں اپنی بات کر رہا ہوں۔“ میرے لہجے سے شکوہ عیاں تھا۔

اس کی آنکھوں میں تیرتی ہوئی شرارت کی پرچھائیں گہری ہو گئی۔ منہ سے کچھ نہ بولی مگر ادا سے سمجھا گئی کہ اُس نے میری بات پر یقین نہیں کیا تھا بلکہ اُس گلنار چہرے پر لکھی ہوئی تحریر کو سچ مانا تھا جو کمرے سے نکلتے ہوئے صدف کے چہرے پر رقم تھی۔

ملکہ کی شوخیاں ایک نئے محاذ کی خبر آرائیاں کرنے لگیں۔ اُس کا سامنا کرنا مشکل محسوس ہوا تو حویلی سے باہر نکل آیا۔ کمالے کا پتا کیا مگر وہ ہنوز غائب تھا۔ اُس کے گھر والوں کو بھی اب اُس کا غیر معمولی غیاب پریشان کرنے لگا تھا۔ صدف سے ہونے والی پُرہیجان ملاقات اگر عام حالات میں ہوئی ہوتی تو میرے رگ و پے میں سرمستی اور سرشاری بھر جاتی مگر اب کیفیت خاصی مختلف تھی۔ میرا ذہن پوری طرح کمالے کی ذات میں اُلجھا ہوا تھا۔ ڈھارس دینے کو ابھی تک کوئی موہوم سی خبر بھی تو نہیں ملی تھی۔ اسما سے ملاقات ممکن نہیں تھی اور نہ ہی میں اُس سے رابطے کی کوئی سبیل نکال سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ میری طرح کمالے کی موجودہ پوزیشن سے لاعلم ہی ہوتی۔

امیر نواز اپنی حویلی کے مین گیٹ پر کھڑا ملا۔ راز داری سے پوچھنے لگا۔ ”شہرے! سچ سچ بتا، کمالا کہاں ہے؟“

چونکہ ہمارے ساتھ درپیش آنے والے حالات میں اسما کا مرکزی کردار متحرک تھا، اس لیے میں نے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے لاعلمی کا اظہار کیا۔ خدا جانے اُس نے دل سے میری بات تسلیم کر لی یا نہیں، بہ ظاہر مطمئن ہو گیا، بولا۔ ”اُس بے غیرت کو اپنے گھر والوں کی پریشانی اور بابا کی ویگن کی ذرا بھر پروا نہیں ہے۔ بابا خاصا گرم ہے۔“

میں نے کندھے اُچکائے، کہا۔ ”آج نہیں تو کل آ جائے گا۔ کہہ رہا تھا کہ گاؤں میں رہ رہ کر دل اوب گیا ہے۔ دو تین دنوں کی آوارگی سے اُس کی طبیعت کو قرار آ جائے گا۔“

اُس نے بُرا سا منہ بنایا پھر موضوع بدل دیا، بولا۔ ”چاچے بخت خان کے حکم پر میں اور مراد بخش دیوانہ جیت شاہ کی سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ کوئی سرا ہاتھ نہیں لگتا، سمجھ نہیں آتی کہ وہ کیا کرتا ہے۔ یہ بات تو طے ہے کہ اُس کی حرکات مشکوک ہیں۔“

”پھر کیا سوچا؟“

”اُس کا محاسبہ ضروری ہے۔“ اُس نے پُرارادہ لہجے میں کہا۔ ”دیوانے کا خیال ہے کہ جیت شاہ کے پیچھے چاچے دریام خان اور حیدر خان کا ہاتھ ہے۔“

”اس شک کی وجہ؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”وہ کہتا ہے کہ اگر جیت شاہ کا دونوں خانوں سے کوئی گہرا تعلق نہ ہوتا تو وہ گاہے بہ گاہے دونوں حویلیوں کا چکر ضرور لگاتا مگر وہ یوں ظاہر کرتا ہے جیسے دریام خان اور بابا کو سرے سے جانتا ہی نہیں۔ یہی بات دیوانے کے نزدیک

مشکوک ہے۔“

میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

وہ بولا۔”ہم نے آج رات کو ’آپریشن نائٹ‘ قرار دیا ہے۔ دو تین بدھ راتیں تمہاری وجہ سے ضائع ہو چکی ہیں۔ مزید انتظار نہیں کیا جا سکتا۔ کیا تم اب پوری طرح فٹ ہو؟“

میں نے کہا۔”ہاں! میں تو فٹ ہوں مگر کھالا......“

”تب تک وہ آ جائے گا ناں! فرض کیا، نہیں آتا، تب بھی ہم اپنا کام کریں گے۔ ٹھیک ہے ناں؟“

”کیا تیاری مکمل ہے؟“

”ہاں تو...... دیوانے نے اُنہیں گھیرنے کا پورا انتظام کر لیا ہے۔“ امیر نواز نے کہا۔”چاچا بخت خان اور ڈاکٹر شاہ جی بھی ہمارے ساتھ ہوں گے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے، جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ اللہ مالک ہے۔“ میں نے ہامی بھر لی۔ ڈاکٹر شاہ جی کی اس آپریشن میں شرکت میرے لیے باعث استعجاب تھی کیونکہ اُس نے مجھے دُور رہنے کا مشورہ دیا تھا اور خود آگ کی ان نادیدہ لپٹوں کو ہاتھ میں لینے پر تیار تھا۔

گھر پہنچا تو سبھی کو کھانے میں مشغول پایا۔ حسب معمول پروین نے میرے سامنے کھانا چُن دیا۔ اُسے میں نے نسبتاً مضمحل اور قدرے نڈھال پایا۔ اُس کا رویہ بھی بدلا بدلا سا تھا۔ مجھے گمان گزرا کہ وہ میرے غیاب کے باعث مجھ سے خفا تھی۔ میں نے اُسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ اُس کے بے تحاشا رونے کا خدشہ تھا۔ رات گئے تک میں بخت خان اور امیر نواز کی طرف سے بلاوے کا انتظار کرتا رہا مگر مایوس رہا۔ اُنہوں نے اپنا پروگرام ملتوی کر دیا تھا یا شاید اُنہیں کسی ذریعے سے خبر ہوگئی تھی کہ آج اُن کی مچان بے نیل مرام ثابت ہونے والی تھی۔ مجھے افسوس ہوا کہ اُنہوں نے اپنے پروگرام کے تغیر کے بارے میں مجھے یکسر اندھیرے میں رکھا تھا۔ مقررہ وقت کے ایک گھنٹے بعد تک میں نے جاگ کر انتظار کیا، پھر گہری نیند سو گیا۔

کہا جاتا ہے کہ نیند میں خواب ملتے ہیں، حقیقتیں روٹھنے لگتی ہیں۔ وہ رات بھی ایسی ہی تھی جس کا نشہ دروازے پر ہونے والی تیز اور سماعت شکن دستک پر ٹوٹ گیا۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھا۔ قدرے سراسیمہ نگاہوں سے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ میرے گھر میں اتنی زوردار دستک دینے کا رواج نہیں تھا۔ میں ابھی بستر سے اُٹھ ہی رہا تھا کہ پھر دروازہ دھڑدھڑایا گیا۔ ساتھ ہی چاچی کی چیختی آواز کانوں میں پڑی۔”اوئے بدبخت! اُٹھ وِج...... ڈیکھ تیڈے لیکھ کتھ وِج ستے ہن!“

(بدبخت! بیدار ہو جا اور دیکھ کہ تیرے نصیب سو گئے ہیں)

اس کے ساتھ ہی چاچی کی چیخیں بتدریج بلند ہونے لگیں۔ دروازہ کھولا تو وہ گرنے کے سے انداز میں اندر داخل ہوئی اور میرے سینے پر دو ہتھڑ مار کر بین کرنے کے سے انداز میں چلانے لگی۔ میں ہونقوں کی طرح یک ٹک اُسے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اُس کے منہ سے اُبلنے والے ہولناک الفاظ کی سرے سے سمجھ نہیں آ رہی تھی مگر یہ سجھائی دے رہا تھا کہ میری خوابیدگی کے دوران ایسا کوئی واقعہ رونما ہو گیا تھا، جسے نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے چاچی کو بانہوں میں بھر لیا، اُس کے کندھوں کے اوپر سے کھلے صحن میں دیکھا۔ کوئی نظر نہیں آیا۔ سورج نکلنے کو تھا۔ اس وقت تو گھر میں چہل پہل ہوا کرتی تھی۔

”چاچی! ہوش کر......“

”اب ہوش کرنے کا کیا فائدہ...... عزت کی چادر تار تار ہو گئی ہے پتر!“

اُس نے پھر میرے سینے پر پوری قوت سے دو ہتھڑ مارا۔ میں لڑکھڑا کر پسپا ہوا، پھر خود کو سنبھال کر چاچی کو سنبھالنے لگا جو دم بہ دم بکھرتی جاتی تھی۔ میں نے اُسے چارپائی پر دھکیلا۔ دلاسا دینے کی ناکام کوشش کی پھر قدرے غصے سے پوچھا۔”کچھ بتاؤ بھی سہی چاچی! میرا دماغ گھومنے لگا ہے۔“

چاچی نے عجیب نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھٹی پھٹی آنکھیں لیے کمر کے بل چارپائی پر گر گئی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ چاچی کی بے ہوشی نے سمجھا دیا کہ گھر میں خیر نہیں ہے۔ میں اُسے وہیں چھوڑ کر دوڑتے قدموں سے صحن میں آیا۔ اردگرد دیکھا۔ یوں لگا جیسے گھر میں کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا۔ میں نے پروین کو آوازیں دیں، چاچے چراغ کو پکارا مگر جواب ندارد...... میں پانی کا کٹورا اُٹھائے واپس کمرے میں آیا۔ چاچی کے منہ پر چھینٹے مارے۔ وہ کسمسا کر اُٹھ بیٹھی۔ خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر چیخ مار کر مجھ سے دیوانوں کی طرح لپٹ گئی۔

معاشرتی ناہمواریوں پر مبنی دلوں کی دھڑکن، لہو کی گردش تیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری
اس سفر کے اگلے پڑاؤ کا احوال آئندہ ماہ

نہلے پہ دہلا

سلیم انور

عقلمندی ہو یا حماقت، کبھی کسی ایک کی جاگیر نہیں رہی... یہ کبھی بھی کسی سے بھی سرزد ہو سکتی ہے اور اگر مجرم عجلت کا شکار ہو جائے تو ساری ہوشیاری دھری کی دھری رہ جاتی ہے... مگر خوف کے سائے میں وہ جتنی بہادری کا مظاہرہ کر بیٹھی تھی اتنی بے خوف و خطر تو وہ کبھی نہیں رہی...... بہرحال جو بھی ہوا اچھا ہوا... اور ثابت ہو گیا کہ دینے والا جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔

ایک ایسے منصوبہ ساز کا قصہ جسے واردات کی سنگینی کا احساس نہ تھا

یہ جمعہ کی سہ پہر تھی اور ابھی پانچ بجنے میں چند منٹ باقی تھے جب میلکم دی فرسٹ نیشنل بینک کے دروازے پر پہنچا۔

سورج کی تمازت سے میلکم کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور بینک میں داخل ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس وقت بینک تقریباً خالی ہوگا کیونکہ ویک اینڈ کا آغاز ہو چکا تھا اور ہر کوئی ویک اینڈ پر جانے اور چھٹیوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے بے تاب تھا۔ ویسے بھی اس بینک میں عملے کی کمی تھی۔

میلکم کو علم تھا کہ ویک اینڈ شروع ہونے کی وجہ سے سیکیورٹی کے معاملے میں بھی زیادہ احتیاط نہیں برتی جا رہی ہوگی اور دوسری جانب کیشئر کی درازیں بھی رقم سے بھری ہوں گی۔

میلکم ٹہلتا ہوا اس چھوٹے سے کاؤنٹر پر چلا گیا جہاں بینک کی ڈپازٹ سلپس اور دیگر فارم ڈبلے پر رکھے ہوئے تھے۔ میلکم بہ ظاہر ایک بینک سلپ پُر کرنے میں مصروف ہوگیا۔ ساتھ ہی کن انکھیوں سے بینک کے اندر کا بہ غور جائزہ لینے لگا۔

ایک کیشئر کا کاؤنٹر لین دین کے لیے کھلا ہوا تھا۔ ایک میز کے پیچھے ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی اور دو کسٹمر بینک سے باہر جانے کے لیے دروازے کی جانب جا رہے تھے۔

یہ بہترین موقع ہے، میلکم نے فیصلہ کر ڈالا۔ سب کچھ بہ آسانی ہو جائے گا۔

میلکم کی پوری زندگی ایک گیراج میں بہ طور مکینک کام کرتے ہوئے گزر گئی تھی۔ اب وہ اس بے لطف زندگی سے اکتا چکا تھا جہاں ہر وقت کپڑے اور ہاتھ پیر گریس میں لت پت رہتے تھے۔ پینتالیس سال عمر ہونے کے باوجود وہ اب بھی خود کو اتنا توجوان اور توانا محسوس کرتا تھا کہ خود پر مزید کوئی اضافی بوجھ ڈالے زندگی کی نعمتوں سے بھرپور لطف اٹھا سکے۔ وہ سیاحت، سیر و تفریح، عمدہ لذیذ کھانوں اور اسپورٹس کاروں کا رسیا تھا۔

لیکن اس کی محدود آمدنی ان عیاشیوں کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ یہ تمام حسرتیں اب تک دل میں لیے ہوئے تھا۔ سو اس نے مختلف اسٹورز لوٹنا شروع کر دیے۔ لیکن یہاں سے جو رقوم اس کے ہاتھ لگتیں وہ بھی محدود ہوتی تھیں اور اس کی حسرتیں دل کی دل میں ہی رہ جاتیں۔

تب اس نے بڑا ہاتھ مارنے کا فیصلہ کیا اور اپنے اسی مقصد کی خاطر اس نے دی فرسٹ نیشنل بینک کا انتخاب کیا تھا۔ یہ بینک شہر کے ایک پوش علاقے میں تھا۔ میلکم کو یقین تھا کہ اس علاقے میں اسے کوئی نہیں پہچانے گا۔ اسی لیے اس نے اپنا حلیہ بدلنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ عام طور پر اپنے مکینک کا یونیفارم زیب تن کیے رہتا تھا اور اس کے ہاتھ پیر اور کپڑے گریس میں لت پت رہتے تھے۔

پھر بھی احتیاطاً میلکم نے سر پر سنہرے بالوں کی ایک وگ پہن لی تھی اور جوتوں میں روئی رکھ لی تھی تاکہ ایڑیاں اٹھ جائیں اور اس کی چال بھی قدرے بدل جائے۔

اتنے میں میز کے پیچھے بیٹھی ہوئی عورت اپنی کرسی سے اٹھ کر ہال کی جانب چل پڑی۔ میلکم نے ایک گہری سانس لی اور سمجھ گیا کہ اس کے ایکشن میں آنے کا بھی بہترین موقع ہے۔

وہ سیدھا کیشئر کے کاؤنٹر کی جانب چل دیا۔ اس نے بینک ڈپازٹ سلپ جو چند لمحوں پہلے پر کی تھی، اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لی اور وہ کاغذ کا پرزہ جیب سے نکال لیا جس پر اس نے پہلے سے پیغام تحریر کیا ہوا تھا۔

جب وہ کاؤنٹر پر پہنچا تو وہاں بیٹھی ہوئی نوجوان عورت نے مشینی انداز میں کہا۔ ”گڈ آفٹر نون سر۔ میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟“ بیزاری اس عورت کے چہرے سے عیاں تھی۔

میلکم نے ایک نگاہ اس عورت کے سینے پر آویزاں نیم ٹیگ پر ڈالی۔ اس عورت کا نام رابرٹا تھا۔

میلکم نے خاموشی کے ساتھ اپنا تحریر کردہ پیغام کاؤنٹر پر اس عورت کی جانب کھسکا دیا۔ جلی حروف میں لکھے ہوئے پیغام کو پڑھتے ہی اس عورت کی آنکھوں سے بیزاری یکلخت غائب ہوگئی اور اس کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔ پیغام میں لکھا تھا۔

”یہ ایک واردات ہے۔ اپنی دراز میں موجود تمام رقم مجھے دے دو۔“

میلکم نے اپنی ڈھیلی ڈھالی پتلون کی جیب میں سے مُڑے تُڑے کاغذ کا ایک خالی تھیلا نکالا اور کاؤنٹر پر اپنے تحریری پیغام کے برابر میں رکھتے ہوئے آہستگی سے بولا۔ ”جلدی سے اس پر عمل کرو اور الارم بجانے یا شور مچانے کی حماقت مت کرنا۔“ ساتھ ہی اپنے کوٹ کی ابھری ہوئی جیب کی جانب اشارہ کیا۔

جب اس خاتون کیشئر نے اس کی جیب کی طرف دیکھا تو وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ تمہیں شوٹ کرنے کی نوبت آئے۔“ اس کا لہجہ سرگوشی کے مانند تھا۔

رابرٹا نے ایک لمحے کے لیے تذبذب کیا۔ اس نے گردن گھما کر اپنی ساتھی میری کی میز کی طرف دیکھا لیکن وہ جا چکی تھی۔ رابرٹا کو ٹریننگ کے دوران بھی سکھایا گیا تھا کہ اگر کبھی ڈاکوؤں کا سامنا کرنا پڑ جائے تو وہ چپ چاپ ان کے حکم کی تعمیل کر دے اور تمام معاملات پولیس پر چھوڑ دے۔ وہ خود ہی اس معاملے کو ہینڈل کرلیں گے۔ وہ ذاتی طور پر کسی قسم کی بہادری یا حماقت کا اظہار کرنے سے گریز کرے۔

”جلدی کرو!“ میلکم نے پھنکارنے کے انداز میں سرگوشی کی۔ ساتھ ہی کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔

رابرٹا نے دراز کے کوڈ کو پنچ کیا تو دراز کھل گئی۔

رابرٹا نے دراز میں موجود تمام کرنسی نوٹ تھیلے میں ڈالنا شروع کر دیے۔ اس کی جلد بازی کی وجہ سے چند نوٹ دراز سے نکالنے کے دوران فرش پر گر پڑے۔ رابرٹا انہیں اٹھانے کے لیے نیچے جھکی تو اس کا چہرہ میلکم کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

”یہ تم کیا کر رہی ہو؟“ میلکم نے زہر آلودہ لہجے میں کہا۔

ساتھ ہی کاؤنٹر پر آگے کی جانب جھک گیا۔ وہ سمجھا کہ رابرٹا شاید خطرے کے الارم کا بٹن دبانے لگی ہے۔

رابرٹا نے چہرہ فوراً ہی اوپر اٹھایا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے میلکم کو دیکھتے ہوئے کاغذ کے بڑے لفافے کو اوپر کرتے ہوئے دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔

”م ـــ مجھ سے...... چند نوٹ نیچے گر گئے تھے۔“ ہکلاتے ہوئے بولی۔ ”میں انہیں تھیلے میں ڈال رہی تھی۔“

میلکم کے حلق سے ہلکی سی غراہٹ بلند ہوئی۔

”یہ...... یہ لو۔“ اس نے کاغذی تھیلا میلکم کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

میلکم نے اطمینان کا سانس لیا اور ہاتھ بڑھا کر لفافہ لے لیا۔ اس نے رابرٹا کو اس حد تک خوفزدہ کر دیا تھا کہ وہ ایکشن لینا تو کجا کوئی بات بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ رابرٹا کی جانب سے مطمئن ہونے کے بعد میلکم نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔

بینک بہ دستور خالی پڑا تھا اور کوئی کسٹمر دکھائی نہیں دے رہا تھا اور نہ ہی کوئی ایسی حرکت ہو رہی تھی کہ کسی کو یہ شبہ ہوا ہو کہ ڈکیتی کی واردات عمل میں آ رہی ہے۔

”تھینک یو، رابرٹا!“ میلکم نے قدرے اونچی آواز میں کہا اور پھر مسکراتے ہوئے آہستگی سے بولا۔ ”پانچ منٹ پہلے الارم بجانے کی کوشش مت کرنا ورنہ......“ لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

پھر وہ پلٹا اور تیز تیز قدموں سے بینک کے داخلی دروازے کی جانب چل دیا۔

بینک اب بھی خالی تھا۔ کوئی بھی اس کی جانب توجہ نہیں دے رہا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر بینک سے باہر نکل گیا۔

اس نے اپنی کار بینک سے چند بلاک کے فاصلے پر پارک کی ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا اپنی کار تک پہنچا اور کار میں سوار ہو کر اپنے اپارٹمنٹ کی جانب روانہ ہوگیا۔

اس سے قبل وہ یہ اطمینان کر چکا تھا کہ بینک سے نکلنے کے بعد نہ تو کوئی سائرن بجا تھا اور نہ ہی کسی نے اس کا تعاقب کیا تھا۔ پھر بھی ادھر ادھر فالتو سڑکوں پر گاڑی دوڑانے کے بعد جب اسے تسلی ہوگئی کہ پولیس اس کے تعاقب میں نہیں ہے تو تب اس نے اپنی کار اس سڑک پر ڈال دی جو سیدھی اس کے گھر کی جانب جاتی تھی۔

اب وہ یہ جاننے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا کہ کتنی رقم اس کے ہاتھ لگی ہے۔ اسے علم تھا کہ بینک کے کیشئر کی دراز میں بہت زیادہ رقم تو نہیں تھی لیکن یہ ابھی آغاز تھا۔ اگر یہ سلسلہ کامیابی سے جاری رہا تو وہ جلد ہی اچھی خاصی رقم اکٹھی کر لے گا۔ اب اس کام کے لیے اسے شہر کے مختلف علاقوں میں بینکوں کا انتخاب کرنا ہوگا اور پولیس کو دھوکا دینے کے لیے اسے مختلف بہروپ بھی بدلنا ہوں گے۔

لیکن یہ کوئی پرابلم نہیں تھی۔ وہ اپنے بال ڈائی کر لے گا۔ اپنی مونچھیں صاف کر لے گا یا پھر رنگین کنٹیکٹ لینسز پہننا شروع کر دے گا۔ بہرحال کسی بھی قیمت پر اس کی یہ آمدنی تیزی سے بڑھتی چلی جائے گی اور پھر جلد ہی وہ اپنے دن کے کام کو خیرباد کہہ دے گا۔ وہ اپنے مکینک کے کام سے پہلے ہی بری طرح اکتا چکا تھا۔

پھر ایک عمدہ خوش گوار زندگی اس کی منتظر ہوگی اور یہ پرلطف زندگی اس کی دسترس میں ہوگی۔ نئی زندگی کے تصور نے میلکم کے جسم میں سنسنی سی پیدا کر دی۔ وہ گنگناتا ہوا اپنے اپارٹمنٹ جا پہنچا۔

اس نے اپنی کار پارک کر دی، کاغذ کا تھیلا اٹھایا اور اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوگیا۔

اس نے دروازے کو اندر سے تالا لگا دیا اور اپنے لیونگ روم کے فرش پر بیٹھ گیا۔ لیونگ روم میں آرائش برائے نام تھی۔ وہ رقم گننے کے ارادے سے کاغذ کے تھیلے کا منہ کھول کر اسے فرش پر الٹنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اچانک کسی نے اپارٹمنٹ کا دروازہ زور زور سے بجانا شروع کر دیا۔

پھر کسی نے بلند آواز سے کہا۔ ”دروازہ کھولو۔“

میلکم خاموش رہا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا تھا کہ اس وقت کون آ سکتا ہے۔

”دروازہ کھولو۔“ وہی آواز پھر ابھری۔

''کون ہے؟'' میلکم نے پوچھا۔

''پولیس!''

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، میلکم کا ذہن فوراً حرکت میں آ گیا۔ وہ ڈکیتی کی اس واردات کا اتنی جلدی کسی صورت سراغ نہیں لگا سکتے تھے۔ جبکہ اس نے اپارٹمنٹ میں داخل ہونے سے پہلے تک اس بات کی اچھی طرح تسلی کرلی تھی کہ کوئی اس کا تعاقب تو نہیں کر رہا۔ کیا واردات کے دوران اس سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی تھی؟

لیکن اب کیا، کیا جائے؟ میں اس رقم کو کہاں چھپاؤں؟

اتنے میں اس کے دروازے پر ایک زوردار ضرب پڑی اور تالا ٹوٹ گیا۔ ساتھ ہی چار پولیس افسر اپنے ریوالور تانے دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ ان کے ریوالورز کی نال میلکم کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔

میلکم فرش پر بھونچکا بیٹھا رہ گیا اور اس نے ایک جھٹکے سے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔

''میلکم ڈیننگ؟'' ایک پولیس افسر نے پوچھا۔

میلکم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تمہیں بینک ڈکیتی کے جرم میں حراست میں لیا جا رہا ہے؟'' یہ کہہ کر ایک پولیس افسر نے میلکم کا بازو اپنی گرفت میں لیا اور اسے کھینچ کر کھڑا کر دیا۔ پھر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دی۔

''لل...... لل...... لیکن......؟'' میلکم ہکلانے لگا۔

''یہ کس طرح......'' جملہ اس کے حلق میں اٹک گیا۔

''اس کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر کو پہچانتے ہو؟'' ایک پولیس افسر نے کاغذ کا ٹکڑا میلکم کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔

میلکم کی آنکھیں حیرت سے پھٹ پڑیں۔

یہ اس کی اپنی ہینڈ رائٹنگ تھی اور کاغذ کا ٹکڑا وہی تھا جو اس نے بینک کی کیشئر کو تھماتے ہوئے اس سے رقم تھیلے میں ڈالنے کا حکم دیا تھا۔

''تم نے یہ بہت اچھا کیا کہ اس پیغام کے لیے اپنی ذاتی اے ٹی ایم رسید استعمال کرلی۔ اس رسید کی پشت پر تم نے اپنا پیغام تحریر کیا تھا۔ تمہاری اس رسید کی بدولت وہ کیشئر جسے تم نے لوٹا تھا، تمہارے اکاؤنٹ نمبر کے ذریعے تمہارا سراغ لگانے میں کامیاب ہوگئی اور اس نے ہمیں تمہارا پتا فراہم کر دیا۔ ہمیں اس طرح یہاں تم تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔'' پولیس افسر نے کہا۔

میلکم نے اپنا سر تھام لیا۔

تب ایک پولیس افسر نے جھک کر فرش پر رکھا کاغذ کا تھیلا اٹھایا اور اسے کھول کر اندر جھانکنے لگا۔

پھر دوسرے لمحے اس نے غصے سے میلکم کی قمیص کا کالر پکڑ لیا اور اسے جھٹکا دیتے ہوئے بولا۔ ''رقم کہا ہے؟''

یہ سن کر اس کے ساتھی پولیس افسر نے تھیلے کے اندر جھانکا تو اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ اس نے تھیلے کو ہتھیلی پر الٹ دیا۔

تھیلے کے اندر سے آدھا کھایا ہوا سینڈوچ اور ایک کینڈی بار اس کے ہاتھ پر آ گئے۔

''بتاؤ رقم کہاں ہے؟'' وہ پولیس افسر بھی میلکم پر گرجنے لگا۔

میلکم بھونچکا ان سب کا منہ تکنے لگا۔

***

پولیس کو اپنا بیان قلمبند کرانے کے بعد رابرٹا اپنا پھولا ہوا پرس اٹھا کر اپنے کاندھے پر لٹکایا اور بینک سے نکل گئی۔

بینک سے باہر قدم رکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر ایک دل آویز مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس احمق ڈاکو کا چہرہ بار بار اس کی نظروں میں گھوم رہا تھا۔ جب دراز میں سے نوٹ فرش پر گر پڑے تھے اور وہ انہیں اٹھانے کے لیے نیچے جھکی تو تب مکڈونلڈز کے اپنے لنچ کے تھیلے پر نگاہ پڑتے ہی اس کے ذہن میں یہ خیال بجلی کی طرح کوندا تھا کہ وہ اس کے تھیلے کو بدل دے تو وہ سیر و تفریح منانے کے لیے ویک اینڈ پر رینو جیسے تفریحی مقام پر جا سکتی ہے۔

سو اس نے اپنے آدھ کھائے لنچ کے مکڈونلڈز کے کاغذی تھیلے کو ڈاکو کے رقم سے بھرے ہوئے مکڈونلڈز کے کاغذی تھیلے سے بدل لیا تھا اور اپنے لنچ کا تھیلا ڈاکو کو تھما دیا تھا۔

اور وہ احمق ڈاکو تھیلے کو چیک کیے بغیر وہاں چمپت ہو گیا تھا۔

اب تمام کی تمام رقم رابرٹا کے پرس میں موجود تھی وہ ایک پرلطف ویک اینڈ گزارنے کا تصور لیے خوشی خوشی اپنے گھر کی جانب رواں تھی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام

رضوانہ ساجد

جب سے تخلیقِ کائنات عمل میں آئی ہے اور انسان کو دنیا میں اتارا گیا ہے... تب سے انسانیت اصلاحی مدارج طے کرتے ہوئے معراجِ انسانیت کی طرف گامزن تو ہے مگر... اصلاحِ اعمال کے لیے اللہ نے بعثت کا سلسلہ جاری کیا تاکہ خالق و مخلوق کے درمیان پہچان کا رشتہ قائم رہے... ان ہی برگزیدہ بندوں میں حضرت سلیمانؑ کا بھی شمار ہوا۔ جنہیں اپنے والد حضرت داؤدؑ کی طرح بادشاہت کے ساتھ ساتھ نبوت بھی عطا ہوئی اور جن و انس، چرند پرند آپؑ کے تابع ہوئے... اور ایسا عظیم الشان دربار نصیب ہوا کہ کبھی کسی اور کے حصے میں نہ آیا کہ جہاں ہر مخلوق ہاتھ باندھے کھڑی تھی... سبحان اللہ۔

ایک عظیم بادشاہ اور عظیم پیغمبر حضرت سلیمانؑ کی روداد حیات

حضرت داؤد علیہ السلام اپنے بستر پر تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے کہ آپؑ کی زوجہ، والدہ حضرت سلیمان علیہ السلام کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار تھے۔ نہیں چاہتی تھیں کہ بیمار شوہر کے آرام میں خلل ڈالیں اور وہ انہیں بتائیں جو وہ سن کر آ رہی تھیں لیکن بات ایسی تھی کہ کہے بغیر رہا نہیں جا سکتا تھا۔

''حضور، کیا آپؑ نے مجھ سے وعدہ نہیں کیا تھا کہ سلیمان علیہ السلام آپ کے جانشین ہوں گے۔''

''میں کوئی بات اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ بذریعۂ وحی مجھ سے یہی کہا گیا تھا۔''

"مگر ایسا ہے تو ادونیاہ (حضرت داؤد علیہ السلام کے ایک اور صاحبزادے) کیوں بادشاہ بن بیٹھا ہے؟"

ابھی حضرت داؤد علیہ السلام حیران بھی نہیں ہو پائے تھے کہ آپ کے چند مشیر بھی ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ ان میں ایک نے آگے بڑھ کر کچھ کہنے کی ہمت کی۔

"اے میرے مالک بادشاہ کیا تو نے فرمایا ہے کہ میرے بعد ادونیاہ بادشاہ ہو اور وہی میرے تخت پر بیٹھے کیونکہ اس نے! بیل اور موٹے موٹے جانور اور بھیڑیں کثرت سے ذبح کی ہیں اور سلیمان (علیہ السلام) کے سوا بادشاہ کے سب بیٹوں اور لشکر سرداروں کی دعوت کی ہے اور کہتے ہیں ادونیا بادشاہ جیتا رہے۔ کیا یہ بات میرے مالک بادشاہ کی طرف سے ہے؟"

حضرت داؤد علیہ السلام اب بڑھاپے کی منزل میں تھے۔ کمزور تھے اور بیمار بھی۔ آپ کے بیٹے ادونیا نے اسی کا فائدہ اٹھا بادشاہت پر قبضہ کرنا چاہا تھا جبکہ خدا اس تخت پر اسے دیکھنا چاہتا تھا جو بادشاہ بھی ہو اور نبوت کے اعزاز سے معزز بھی۔ اس کے خدا نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا انتخاب کیا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے ایک مرتبہ پھر اپنے اور خدا کے وعدے کو دہرایا اپنی زوجہ کو مخاطب کرکے فرمایا۔ "مجھے یہی بتایا گیا ہے۔ خدا کا کہا کبھی غلط نہیں ہوتا۔ تیرا بیٹا سلیمان (علیہ السلام) ہی میرے بادشاہ ہوگا اور وہی میری جگہ میرے تخت پر بیٹھے گا۔ میں آج کے دن ویسا ہی کروں گا۔"

والدہ، سلیمان علیہ السلام کو خوش خبری مل گئی تھی۔ وہ وہاں سے ہٹ گئیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے مشیروں کو حکم دیا "میرے بیٹے سلیمان علیہ السلام کو میرے خچر پر سوار کراؤ اور اسے جیحون (ایک چشمہ) کو لے جاؤ۔ وہاں کاہن اس کا کریں کہ وہ اسرائیل کا بادشاہ ہو اور تم نرسنگا پھونکنا اور کہنا کہ سلیمان علیہ السلام بادشاہ جیتا رہے۔ پھر تم اس کے پیچھے پیچھے چلے آنا وہ آکر میرے تخت پر بیٹھے کیونکہ وہی میری جگہ بادشاہ ہوگا اور میں نے اسے مقرر کیا ہے۔"

حضرت داؤد علیہ السلام کے وفادار سرداروں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو خچر پر سوار کرایا جیحون پر لے آئے۔ رسم مطابق کاہنوں نے تیل کا سینگ لیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو مسح کیا۔ نرسنگا پھونکا اور سب لوگوں نے کہا کہ سلیمان علیہ السلا بادشاہ جیتا رہے۔ پھر ہدایت کے مطابق سب لوگ ان کے پیچھے پیچھے آئے۔ ناچتے گاتے، جشن مناتے، بانسریاں بجاتے شہر داخل ہوئے تو زمین ان کے شوروغل سے گونج اٹھی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نہایت ادب واحترام سے اپنے والد حضرت داؤد علیہ السلام کے تخت پر بٹھا دیے گئے اور فضا بار پھر مبارک سلامت کے خوش آئند الفاظ سے گونج اٹھی۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے بہ آواز بلند فرمایا۔

"خداوند اسرائیل کا خدا مبارک ہو، جس نے مجھے ایک وارث بخشا جو میری آنکھوں کے سامنے آج میرے تخت پر بیٹھے۔"

قرآن مجید نے اسی جانشینی کو وراثت داؤد سے تعبیر کیا ہے۔

"اور سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام کا وارث ہوا۔" (سورۂ نمل)

ابن کثیرؒ کہتے ہیں یہاں وراثت سے مراد مالی وراثت نہیں ہے ورنہ حضرت داؤد علیہ السلام کی اور بھی بہت سی اولاد تھی، کیوں محروم رہتی۔"

نبی کی فطرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ مال جیسی حقیر شے پر ان کی وراثت کا انتساب ہو۔ اس لیے کہ جن ہستیوں کا مقصد حیا تبلیغ وارشاد اور راہ خدا کی دعوت ہو وہ کب گوارا کرسکتی ہیں کہ علوم ونبوت کے علاوہ ایک ادنیٰ شے ان کی وراثت قرار پائے۔

جس ہستی کو اللہ تعالیٰ شرف نبوت سے سرفراز کرتا ہے اس کو یہ منصب جلیل سن رشد کے بعد عطا فرماتا ہے تاکہ وہ دنیوی اعتبا کے لحاظ سے بھی عمر طبعی کا وہ حصہ طے کرلے جس میں عقل وپختگی میں استواری پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ طریقہ حضرت سلیمان علیہ السلا کے حق میں بھی کارفرما رہا چنانچہ سن رشد کے بعد ان کو حکومت وخلافت کے ساتھ ساتھ منصب نبوت بھی منجانب اللہ عطا ہوا۔

قرآن مجید اس کی گواہی کے لیے موجود ہے۔

"بے شک! ہم نے (اے محمدؐ) تیری طرف وحی بھیجی جس طرح ہم نے نوح علیہ السلام کی جانب وحی بھیجی اور اس کے بعد دوسرے پیغمبروں کی طرف وحی بھیجی اور ابراہیم کی جانب، اسماعیل، یعقوبؑ اور اس کی اولاد کی جانب اور عیسیٰ کی اور ایوبؑ کی اور یونس علیہ السلام کی اور ہارونؑ کی اور سلیمان علیہ السلام کی جانب وحی بھیجی۔" (سورۂ نسا)

"بے شک! ہم نے داؤد اور سلیمان علیہ السلام کو علم (نبوت کا علم) دیا۔" (ص)

حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام کے فرزند ہیں لہٰذا ان کا نسب بھی یہودا کے واسطے سے حضرت یعقوب

لام تک پہنچتا ہے۔ قرآن بھی یہی کہتا ہے کہ وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے واسطے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام میں ذکاوت اور فصل مقدمات میں اصابت رائے کا کمال فطرت ہی سے ودیعت کر دیا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے ان کے اس جوہر کو پہچان لیا تھا اس لیے بچپن ہی سے انہیں امور مملکت میں شریک کار رکھتے تھے موماً فصل مقدمات میں ان سے ضرور مشورہ لیا کرتے تھے۔

آپ سن رشد کو پہنچے تو نبوت اور بادشاہت دونوں آپ کی طرف منتقل ہو گئیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے آپ کی تخت نشینی پر آپ کو نصیحت فرمائی۔

"اے میرے بیٹے سلیمان (علیہ السلام) اپنے باپ کے خدا کو پہچان اور پورے دل اور روح کی مستعدی سے اس کی عبادت کر کیونکہ خدا سب دلوں کو جانتا ہے اور جو کچھ خیال میں آتا ہے، اسے پہچانتا ہے۔ اگر تو اسے ڈھونڈے تو وہ تجھ کو مل جائے گا اور اگر تو اس کو چھوڑے تو وہ ہمیشہ کے لیے تجھے رد کردے گا۔ سو ہوشیار ہو کیونکہ خداوند نے تجھ کو مقدس کے لیے ایک گھر بنانے کو چنا ہے۔ سو ہمت باندھ کر کام کر۔"

حضرت داؤد علیہ السلام کو یہ خیال ہمیشہ رہتا تھا کہ اتنی وسیع سلطنت کے باوجود وہ ابھی تک ایسی عمارت (بیت المقدس) کی تعمیر نہیں کر سکے ہیں جہاں متبرک صندوق (تابوتِ سکینہ) رکھا جائے جس میں تورات بھی ہے اور موسیٰ علیہ السلام وہارون علیہ السلام کے تبرکات بھی محفوظ ہیں۔ یہ صندوق ایک خیمے میں رکھا ہوا ہے اور میں ایک محل میں رہتا ہوں۔ ان کا یہ خیال، خیال ہی رہا کیونکہ وحی الٰہی سے انہیں معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھوں بیت المقدس کی تعمیر کے حق میں نہیں۔

"خدا آپ کو ایک فرزند عطا کرے گا جو صلح سلامتی سے حکومت کرے گا۔ وہی خدا کے ہیکل کی تعمیر کرے گا۔"

حضرت داؤد علیہ السلام کو یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ ہیکل کی تعمیر ان کے ہاتھوں نہیں ہوگی لیکن یہ سن کر خوشی بھی ہوئی تھی کہ ان کے بعد ان کا بیٹا تخت پر بیٹھے گا اور صلح سلامتی کے ساتھ حکومت کرے گا اور وہی ہیکل کی تعمیر بھی کرے گا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا وقت وفات قریب تھا۔ انہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو قریب بلایا اور وصیت فرمائی۔

"میں اسی راستے جانے والا ہوں جو سارے جہان کا ہے۔ اس لیے تو مضبوط ہو اور مردانگی دکھا اور جو موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں لکھا ہے اس کے مطابق اس کی راہوں پر چل اور اس کے حکموں پر چل تاکہ تجھے کامیابی ہو۔ خدا نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اگر تیری اولاد اپنے طریق کی حفاظت کرکے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان سے میرے حضور راستی سے چلے تو اسرائیل کے تخت پر تیرے ہاں۔ آدمی کی کمی نہ ہوگی۔"

حضرت سلیمان علیہ السلام تخت پر بیٹھ چکے تھے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا انتقال ہوا۔ توریت نے اسے اس طرح بیان کیا۔

"اور داؤد (علیہ السلام) اپنے باپ دادا کے ساتھ سو گیا اور داؤدؑ کے شہر میں دفن ہوا اور کل مدت جس میں داؤد علیہ السلام نے اسرائیل پر سلطنت کی، چالیس برس کی تھی۔ سات برس تو اس نے حبرون میں سلطنت کی اور 33 برس یروشلم میں اور حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے باپ داؤد علیہ السلام کے تخت پر بیٹھا اور اس کی سلطنت نہایت مستحکم ہوئی۔"

حضرت داؤد علیہ السلام ایک عظیم مملکت کے مالک تھے۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے گردونواح کی ان تمام سرسبز وادیوں، زرخیز میدانوں، شاداب چراگاہوں پر قبضہ کرلیا تھا جنہیں بنی اسرائیل صدیوں سے حسرت کی نگاہ سے دیکھتے چلے آرہے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ تمام زرخیزی وشادابی بغیر جنگ وجدال کے ہاتھ آئی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام بادشاہ ہی نہیں، اللہ کے نبی بھی تھے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انہیں بعض خصوصیات اور امتیازات سے نوازا اور اپنی نعمتوں میں سے بعض ایسی نعمتیں عطا فرمائیں جو ان کی زندگی مبارک کا امتیاز بنیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام دونوں کو یہ خصوصیت عطا فرمائی تھی کہ وہ چرند پرند کی بولیاں سمجھ لیتے تھے۔

"اور بے شک ہم نے داؤد (علیہ السلام)، سلیمان (علیہ السلام) کو "علم" دیا اور ان دونوں نے کہا، حمد اللہ کے لیے ہی زیبا ہے جس نے اپنے بہت سے مومن بندوں پر ہم کو فضیلت عطا فرمائی اور سلیمان علیہ السلام، داؤد علیہ السلام کا وارث ہوا اور اس نے کہا۔ "اے لوگو! ہم کو پرندوں کی بولیوں کا علم دیا گیا ہے اور ہم کو ہر چیز بخشی گئی ہے۔ بے شک! یہ خدا کا کھلا ہوا فضل ہے۔" (سورۂ نمل)

اس کا یہ مطلب نہیں جیسا کہ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ وہ (حضرت سلیمان علیہ السلام) اپنے قیاس کے ذریعے ان کی مختلف قسم کی آوازوں سے صرف ان کے مقصد اور مراد کو سمجھ لیتے تھے اور اس سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ نہیں ہرگز نہیں بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام

...... پرندوں کی باتوں کو اسی طرح سمجھتے اور سمجھاتے تھے جیسے ایک انسان دوسرے انسان سے کرتا ہے۔ یہ خلاف عقل سہی لیکن یہ ایک معجزہ تھا جو حضرت سلیمان علیہ السلام کو عطا ہوا تھا۔

ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا لشکر جرار سفر میں تھا کہ یہ لشکر ایک ایسی وادی میں پہنچا جہاں چیونٹیاں بے شمار تھیں اور پوری وادی ان کا مسکن بنی ہوئی تھی۔ چیونٹیوں کے بادشاہ نے لشکر کے اس کثیر انبوہ کو دیکھ کر اپنی امت سے کہا کہ تم فوراً اپنے بلوں میں گھس جاؤ۔ سلیمان علیہ السلام اور اس کے لشکر کو کیا معلوم کہ تم اس کثرت کے ساتھ وادی کی زمین میں رینگ رہی ہو۔ نہ معلوم ان کے گھوڑوں اور پیادوں کے نیچے تم میں سے کتنی تعداد بے خبری میں روندی جائے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے چیونٹیوں کے بادشاہ کی یہ باتیں سنیں تو ان کو ہنسی آگئی اور اس کے عاقلانہ حکم کی داد دینے لگے۔

یہ واقعہ قرآن میں بھی بیان ہوا ہے۔

"اور جمع ہوا لشکر سلیمان (علیہ السلام) کے لیے جن، انسان اور پرندوں سے اور وہ درجہ بدرجہ قرینے کے ساتھ آگے پیچھے چل رہے تھے حتیٰ کہ وہ وادی نملہ پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا، اے چیونٹیو اپنے گھروں میں گھس جاؤ ایسا نہ ہو کہ بے خبری میں سلیمان علیہ السلام اور اس کا لشکر تم کو پیس ڈالے۔

چیونٹی کی یہ بات سن کر سلیمان (علیہ السلام) ہنس پڑا اور کہنے لگا اے پروردگار! مجھ کو یہ توفیق دے کہ میں تیرا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر انعام کیا ہے اور یہ کہ میں وہ نیک عمل کروں جو تجھ کو پسند آئے اور مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل فرما۔"

مفسرین "وادی نملہ" شام میں بتلاتے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایک امتیاز یہ بھی عطا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے "ہوا" کو ان کے حق میں مسخر کر دیا اور وہ ان کے زیر فرمان کر دی گئی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام جب چاہتے تو صبح کو ایک مہینے کی مسافت اور شام کو ایک مہینے کی مسافت کی مقدار سفر کر لیتے تھے۔ یہ تسخیر صرف اس نوعیت کی نہیں تھی کہ ان کے تخت کو اڑا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی بلکہ آپ کا حکم اس درجہ چلتا تھا کہ تیز و تند ہوا آپ کے حکم سے نرم اور خوشگوار ہو جاتی تھی لیکن اس کی رفتار میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ آپ ایک دن میں اتنا سفر طے کر لیتے تھے جتنا ایک شخص گھوڑے پر سوار ہو کر ایک ماہ میں فاصلہ طے کرتا ہے۔ تخت سلیمان علیہ السلام آج کل کے تیز رفتار جہاز سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ ہوا کے کاندھے پر اڑا چلا جاتا تھا۔

عقل پرست انسانوں کی نگاہ میں یہ بات بعید از عقل ہے لیکن اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کر سکتا ہے۔ عام قانون قدرت تو یہ ہے کہ انسان ہوا میں نہیں اڑ سکتا۔ ظاہری اسباب کے بغیر تخت سلیمان علیہ السلام کس طرح اڑ سکتا تھا؟ لیکن قدرت کے کچھ خاص قوانین بھی ہیں جو ان نفوس قدسیہ کے لیے مخصوص ہیں جنہیں انبیا علیہم السلام کہا جاتا ہے۔ خاص طور پر جب قرآن اس کی گواہی دیتا ہے تو یقین کے ساتھ کوئی راستہ نہیں رہ جاتا۔

"اور مسخر کر دیا سلیمان (علیہ السلام) کے لیے تیز و تند ہوا کو کہ اس کے حکم سے زمین پر چلتی تھی جس کو ہم نے برکت دی تھی اور ہم ہر شے کے جاننے والے ہیں۔" (انبیا)

"اور سلیمان علیہ السلام کے لیے مسخر کر دیا ہوا کو کہ ایک مہینے کی مسافت (طے کراتی) اور شام کو ایک مہینے کی مسافت" (سبا)

"اور مسخر کر دیا ہم نے اس (سلیمان) کے لیے ہوا کو چلتی ہے وہ اس کے حکم سے، نرمی کے ساتھ جہاں وہ پہنچنا چاہتے۔" (ص)

آپ کا ایک بڑا امتیاز جو کائنات میں کسی کو نہیں ملا یہ تھا کہ ان کے زیر نگیں صرف انسان ہی نہیں تھے بلکہ جنات بھی تابع فرمان تھے اور آپ ان سے اسی طرح کام لیتے تھے جیسے کوئی مزدوروں اور غلاموں سے لیتا ہے۔

قرآن پاک میں آپ کی شان و صفات کے بارے میں مذکور ہے۔

"اور دیووں (شیطانوں کی جماعت کو بھی ان کے تابع کر دیا تھا کہ ان) میں سے بعض ان کے فرمان سے غوطے مارتے تھے اور اس کے سوا اور کام بھی کرتے تھے اور ہم ان کے نگہبان تھے۔" (الانبیا)

"اور طاقت ور جنات کو بھی (ان کے زیر فرمان کیا) یہ سب معمار عمارتیں بنانے والے اور غوطہ خور تھے۔" (ص)

"وہ جو کچھ چاہتے یہ ان کے لیے بناتے مثلاً قلعے اور مجسمے اور (بڑے بڑے) لگن جیسے تالاب اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے والی بھاری دیگیں۔ اے داؤد کی اولاد (میرا) شکر کرو اور میرے بندوں میں سے شکر گزار تھوڑے ہیں۔" (سبا)

آپ کے عہد حکومت میں اسرائیل کا عروج نقطہ کمال پر پہنچ چکا تھا۔ دور و نزدیک کے سب بادشاہوں کے دلوں پر آپ کے

نام کی ہیبت تھی۔ آپ کی سلطنت شمال میں گلیلی، جنوب میں مصر کی حدود تک، شمال مشرق میں دریائے فرات تک، جنوب مشرق میں یمن تک اور مغرب میں بحیرۂ روم تک پھیلی ہوئی تھی۔

✂✂✂

وہ دونوں طوائفیں تھیں۔ ان دونوں کو ایک ہی مقدمہ درپیش تھا۔ ایک ہی وقت میں وہ دونوں حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر ہوئیں۔ ان میں سے ایک کہنے لگی۔

"اے میرے مالک! میں اور یہ عورت دونوں ایک ہی گھر میں رہتی ہیں۔ اس کے ساتھ گھر میں رہتے ہوئے میرے ایک بچہ ہوا۔ تیسرے دن ایسا ہوا کہ یہ عورت بھی زچہ ہوگئی اور ہم ایک ساتھ ہی تھے۔ اس عورت کا بچہ رات کو مر گیا۔ یہ بدبخت رات کو اٹھی اور میرے بیٹے کو میری بغل سے لے کر اپنی گود میں لٹا لیا اور اپنے مرے ہوئے بچے کو میرے برابر لٹا دیا۔"

"تجھے کیوں نہ معلوم ہوا؟"

"اس لیے کہ میں سو رہی تھی۔"

"پھر کیا ہوا آگے سنا؟"

"صبح کو جب میں اٹھی کہ اپنے بچے کو دودھ پلاؤں تو کیا دیکھتی ہوں کہ وہ مرا پڑا ہے۔ میں نے غور کیا تو وہ میرا لڑکا نہیں تھا۔"

حضرت سلیمان علیہ السلام نے دوسری عورت سے فرمایا۔ "اب تو بتا، تیرا کیا کہنا ہے؟"

"میں تو صرف یہی کہہ سکتی ہوں کہ یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ یہ جو زندہ ہے یہی میرا بیٹا ہے اور مرا ہوا اس کا بیٹا ہے۔ یہ میرا بیٹا چھیننے کے لیے مجھ پر الزام لگا رہی ہے۔ اپنا بیٹا مار دیا اور میرا بیٹا ہتھیانے کی کوشش کر رہی ہے۔"

حضرت سلیمان علیہ السلام نے پہلی عورت سے پوچھا۔ "تیرے پاس کیا ثبوت ہے کہ جو مر گیا وہ تیرا نہیں اس کا بیٹا ہے جبکہ تین دن کے بچے کی کوئی ایسی شناخت بھی نہیں ہوتی۔ کہیں تو اس پر الزام تو نہیں لگا رہی ہے؟"

وہ عورت رونے لگی۔ "مالک! میں طوائف ضرور ہوں لیکن ایک ماں بھی تو ہوں۔ میں دل کی آنکھوں سے دیکھتی ہوں، مردہ بچہ ہرگز میرا نہیں۔"

"تیری اس بات کو کون مانے گا؟"

"کیا میرے آنسو مجھے سچ ثابت نہیں کرتے؟"

"ہو سکتا ہے تو اپنے بچے کے غم میں رو رہی ہو اور زندہ بچہ حاصل کرنا چاہتی ہو۔"

"مالک! جب آپ بھی یہ کہیں گے تو مجھے انصاف کہاں ملے گا۔"

وہ دونوں عورتیں آپس میں جھگڑ رہی تھیں۔ دونوں کا اصرار تھا کہ جو بچہ زندہ ہے وہ اس کا۔ جب کوئی کسی کی بات ماننے کو تیار نہیں ہوئی تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک تلوار منگوائی۔

اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ "اس جیتے بچے کو چیر کر دو ٹکڑے کر دو اور آدھا ایک کو، آدھا دوسری کو دے دو۔" یہ حکم سنتے ہی پہلی عورت چیختی چلاتی تلوار کے سامنے آگئی۔

"مجھے بچہ نہیں چاہیے۔ اے بادشاہ! یہ بچہ اسی کو دیدے مگر اسے مار مت۔ مجھے ہرگز یہ گوارا نہیں ہوگا کہ یہ مارا جائے۔"

دوسری عورت خاموش کھڑی تھی جیسے اس حکم کا اسے دکھ ہی نہ ہوا ہو۔

پہلی عورت کی ممتا تھی جو اسے چیخنے چلانے پر مجبور کر رہی تھی جبکہ دوسری عورت کو معلوم تھا کہ یہ بچہ میرا نہیں اس لیے وہ پرسکون تھی۔

یہی وہ نکتہ تھا جسے حضرت سلیمان علیہ السلام ...... نے بھانپ لیا اور حکم دیا کہ بچہ پہلی عورت کو دیا جائے کیونکہ یہی اس کی ماں ہے۔ اب دوسری عورت کو قبول کرنا پڑا کہ وہ جھوٹی تھی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایسے ہی دانش مندانہ فیصلوں نے لوگوں پر ان کا رعب طاری کر دیا۔ لوگ ڈرنے لگے کہ اگر انہوں نے کسی کے ساتھ ظلم کیا تو حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکمت و دانائی انہیں اپنی گرفت میں لے لے گی۔ بنی اسرائیل جو ہمیشہ سرکشی پر آمادہ رہتے تھے حضرت سلیمان علیہ السلام کے خوف سے لڑائی جھگڑوں سے تائب ہو گئے۔ ایسا انصاف ملا تو خوشحالی لازمی تھی۔ توریت کا بیان ہے۔

"یہودا اور اسرائیل کے لوگ کثرت میں سمندر کے کنارے کی ریت کے مانند تھے اور کھاتے پیتے اور خوش رہتے تھے اور

سلیمان علیہ السلام دریائے فرات سے فلسطینیوں کے ملک تک اور مصر کی سرحد تک سب مملکتوں پر حکمران تھے۔ وہ ان کے لیے ہدیے لاتی تھیں۔"

حضرت سلیمان علیہ السلام کے رتھوں کے لیے چالیس ہزار تھان اور بارہ ہزار سوار تھے۔ ان کے منصب داروں میں سے ہر ایک اپنے مہینے میں سلیمان علیہ السلام کے لیے اور ان سب کے لیے جو سلیمان علیہ السلام کے دسترخوان پر آتے تھے، رسد پہنچاتا تھا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس خوش حالی اور نام وری کے باوجود ہمیشہ یہ خیال رہتا تھا کہ وہ اب تک خدا کا گھر ہیکل (مسجد اقصیٰ) تعمیر نہیں کر سکے ہیں جبکہ حضرت داؤد علیہ السلام سے خدا کا یہ عہد تھا کہ تیرا بیٹا جس کو میں تیری جگہ تخت پر بٹھاؤں گا وہی میرے نام کے لیے گھر بنائے گا، اب حضرت سلیمان علیہ السلام کو حکومت کرتے چار برس ہو گئے تھے۔ یہ خیال روز بہ روز شدت اختیار کرنے لگا تھا۔ ایک روز انہوں نے اپنے تمام منصب داروں اور عہدے داروں کا اجلاس طلب کیا اور ان کے سامنے اپنا منصوبہ رکھ دیا۔

"آپ لوگ جانتے ہیں کہ میرے والد حضرت داؤد علیہ السلام اپنے خدا کے نام کے لیے گھر نہ بنا سکے کیونکہ ان کے گرد ہر طرف لڑائیاں ہوتی رہیں۔ اب خداوند میرے خدا نے مجھ کو ہر طرف امن دیا ہے۔ نہ تو کوئی مخالف ہے نہ آفت کی مار۔ اب کوئی نہیں ہے جو مجھے اس کی تعمیر سے روکے۔ اب میں دیودار اور صنوبر کی لکڑی جمع کروں گا اور بڑے بڑے پتھروں سے عمارت تعمیر کروں گا اور اس کے گرد عظیم الشان شہر آباد کیا جائے گا۔"

تمام منصب داروں نے خوشی خوشی اس خدمت کو قبول کیا اور اپنے تعاون کا یقین دلایا لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام جانتے تھے کہ جس عظیم تعمیر کا وہ خواب دیکھ رہے ہیں وہ انسانوں کے بس کا نہیں۔ وہ انسانوں کے ہی نہیں جنات کے بھی بادشاہ تھے لہٰذا انہوں نے ارادہ کرلیا کہ یہ کام وہ جنات سے لیں گے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی خواہش تھی کہ مسجد اور شہر کو بیش قیمت پتھروں سے بنوائیں اور اس کے لیے دور دراز سے حسین اور بڑے بڑے پتھر منگوائیں۔ اس زمانے کے محدود رسل و رسائل آپ کی خواہش کی تکمیل کے لیے ناکافی تھے۔ یہ کام صرف "جن" انجام دے سکتے تھے۔ آپ نے انہیں طلب کیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ مسجد کی تعمیر کے لیے کام کریں۔ وہ دور دور سے خوبصورت اور بڑے بڑے پتھر جمع کر کے لاتے رہے۔ کاریگروں نے ان پر نقش و نگار کندہ کیے۔ لبنان سے دیودار اور صنوبر کی لکڑی منگوائی گئی اور مسجد کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔

خداوند تعالیٰ کو لکڑی اور پتھروں کی عمارت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا چنانچہ کلام الٰہی حضرت سلیمان علیہ السلام پر نازل ہوا۔

"یہ گھر جو تو بناتا ہے سو اگر تو میرے آئین پر چلے اور میرے حکموں کو پورا کرے اور میرے فرمانوں کو مان کر ان پر عمل کرے تو میں اپنا وہ قول جو میں نے تیرے باپ داؤد علیہ السلام سے کیا تیرے ساتھ قائم رکھوں گا اور میں بنی اسرائیل کے درمیان رہوں گا اور اپنی قوم اسرائیل کو ترک نہیں کروں گا۔"

یہ گھر جب تعمیر ہوا تو اس کی لمبائی ساٹھ ہاتھ اور چوڑائی بیس ہاتھ اور اونچائی تیس ہاتھ تھی اور ہیکل کے سامنے ایک برآمدہ اس گھر کی چوڑائی کے مطابق بیس ہاتھ لمبا تھا اور اس گھر کے سامنے اس کی چوڑائی دس ہاتھ تھی۔ جھروکے بنائے گئے تھے جن میں جالیاں جڑی ہوئی تھیں۔ گرداگرد منزلیں اور حجرے بنوائے۔ فرش صنوبر کے تختوں سے بنایا گیا تھا۔ فرش سے دیواروں تک دیوار کے تختے لگائے گئے تھے۔

اس گھر کے اندر بیچ میں الہام گاہ تیار کی تاکہ خداوند کے عہد کا صندوق وہاں رکھا جائے۔

جب سات سال کی مدت میں یہ عمارت بن کر تیار ہو گئی تو آپ نے اسرائیل کے بزرگوں اور قبیلوں کے سب سرداروں کو اپنے پاس یروشلم طلب کیا۔ تمام لوگوں کو مخاطب کر کے آپ نے کلام کیا۔

"میرے باپ داؤد علیہ السلام کے دل میں تھا کہ خداوند اسرائیل کے خدا کے نام کے لیے ایک گھر بنائے لیکن خدا نے اسے روک دیا کیونکہ یہ اعزاز میرے حصے میں آنا تھا۔ خداوند کے وعدے کے مطابق میں اسرائیل کے تخت پر بیٹھا ہوں اور میں نے خداوند اسرائیل کے خدا کے نام کے لیے اس گھر کو بنایا ہے اور میں نے یہاں ایک جگہ اس صندوق کے لیے مقرر کر دی ہے جس میں خداوند کا وہ عہد ہے جو اس نے ہمارے باپ دادا سے جب وہ ان کو ملک مصر سے نکال لایا باندھا تھا۔"

اس خطاب کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسرائیل کی ساری جماعت کے روبرو خداوند کے مذبح کے آگے کھڑے

ہو کر اپنے ہاتھ آسمان کی جانب پھیلا دیے۔

"اے خداوند اسرائیل کے خدا تیرے مانند نہ تو اوپر آسمان میں نہ نیچے زمین پر کوئی خدا ہے۔ تو نے اپنے بندے داؤد علیہ السلام کے حق میں وہ بات قائم رکھی جس کا تو نے اس سے وعدہ کیا تھا۔ تو نے اپنے منہ سے فرمایا اور اپنے ہاتھ سے اسے پورا کیا۔ آسمانوں کے آسمان میں بھی تو نہیں سما سکتا تو یہ گھر کچھ بھی نہیں جسے میں نے بنایا۔ اے خدا اس دعا اور فریاد کو سن لے جو تیرا بندہ آج کے دن تیرے حضور کرتا ہے۔

اور تو اپنے بندے اور اپنی قوم اسرائیل کی مناجات کو جب وہ اس جگہ کی طرف رخ کر کے کریں سن لینا۔ اور سن کر معاف کر دینا۔ اگر کوئی کوئی تیرے مذبح کے آگے قسم کھائے تو تو آسمان پر سے سن کر عمل کرنا اور اپنے بندوں کا انصاف کرنا۔ جب تیری قوم اسرائیل اپنے دشمنوں سے شکست کھائے اور پھر تیری طرف رجوع کرے تو تو آسمان پر سے سن کر اپنی قوم اسرائیل کا گناہ معاف کر دینا اور ان کو اس ملک میں جو تو نے ان کے باپ دادا کو دیا پھر لے آنا۔

اگر ملک میں کال ہو۔ اگر وبا ہو۔ اگر باد سموم ہو غرض کیسی ہی بلا ہو۔ اگر یہ قوم تجھ سے معافی کی طلب گار ہو تو اسے معاف کر دینا۔ اگر تیرے لوگ خواہ کسی راستے سے تو ان کو بھیجے اپنے دشمن سے لڑنے کو نکلیں اور وہ اس گھر کی طرف جسے میں نے تیرے نام کے لیے بنایا ہے رخ کر کے دعا کریں تو تو آسمان پر سے ان کی دعا اور مناجات سن کر ان کی حمایت کرنا۔

اگر تو ان سے ناراض ہو کر انہیں دشمن کے حوالے کر دے اور پھر وہ تیری طرف رجوع کریں تو تو آسمان پر سے جو تیری سکونت گاہ ہے ان کی دعا اور مناجات سن کر ان کی حمایت کرنا۔"

یہ اور اس جیسی دعائیں کر چکے تو آپ مذبح کے سامنے سے جہاں وہ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلائے ہوگھٹنے ٹیکے تھے اٹھے اور کھڑے ہو کر اسرائیل کی ساری جماعت کو بلند آواز سے برکت دی۔

"خداوند جس نے اپنے سب وعدوں کے مواقق اپنی قوم اسرائیل کو آرام بخشا مبارک ہو۔ خداوند ہمارا خدا ہمارے ساتھ رہے۔ جیسے وہ ہمارے باپ دادا کے ساتھ رہا اور ہمیں ترک کرے نہ چھوڑے۔"

بزرگوں کی ایک جماعت صیون روانہ ہوئی جہاں تابوتِ سکینہ رکھا ہوا تھا۔

کاہنوں نے صندوق اٹھایا اور خیمۂ اجتماع کو اور ان سب مقدس ظروف کو جو خیمے کے اندر تھے، لے آئے۔ جیسے ہی صندوق پہنچا ساری جماعت نے صندوق کے سامنے کھڑے ہو کر اتنی بھیڑ بکریاں اور بیل ذبح کیے کہ ان کی کثرت کے سبب ان کا شمار یا حساب نہ ہو سکا۔

جب کاہن یہ صندوق رکھ کر الہام گاہ سے باہر نکلے تو ہر طرف ابر چھا گیا۔ اس میں ایسا جلال تھا کہ کاہن اپنے قدموں پر کھڑے نہ رہ سکے۔

اسی وقت وحیِ الٰہی نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو اپنے حصار میں لے لیا۔

"میں نے تیری دعا اور مناجات جو تو نے میرے حضور کی ہے سن لی اور اس گھر میں جسے تو نے بنایا ہے اپنا نام ہمیشہ تک رکھنے کے لیے میں نے اسے مقدس کیا اور میری آنکھیں اور میرا دل سدا وہاں لگے رہیں گے۔ اب رہا تو، سو اگر تو جیسے تیرا باپ داؤد چلا ویسے ہی میرے حضور خلوص دل اور راستی سے چل کر اس سب کے مطابق جو میں نے تجھے فرمایا عمل کرے اور میرے آئین اور احکام کو مانے تو میں تیری سلطنت کا تخت اسرائیل کے اوپر ہمیشہ رکھوں گا جیسا میں نے تیرے باپ داؤد علیہ السلام سے وعدہ کیا اور کہا کہ تیری نسل میں اسرائیل کے تخت پر بیٹھنے کے لیے آدمی کی کمی نہ ہوگی لیکن تم یا تمہاری اولاد اگر تم میری پیروی سے برگشتہ ہو جاؤ اور میرے احکام اور آئین کو جو میں نے تمہارے آگے رکھے نہ مانو بلکہ جا کر اور معبودوں کی عبادت کرنے اور ان کو سجدہ کرنے لگو تو میں اسرائیل کو اس ملک سے جو میں نے ان کو دیا ہے کاٹ ڈالوں گا اور اس گھر کو جسے میں نے اپنے نام کے لیے مقدس کیا ہے اپنی نظر سے دور کر دوں گا۔"

ان وعدوں کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام .... راہ راست پر چلتے ہوئے شہر کی تعمیر اور خصوصاً اپنے لیے شاندار محل کی طرف متوجہ ہوئے۔

اس محل کی تعمیر میں تیرہ برس خرچ ہوئے۔

یہ محل انہوں نے لبنان کے جنگلوں کی لکڑی سے بنایا۔ اس کی لمبائی سو ہاتھ اور چوڑائی پچاس ہاتھ اور اونچائی تیس ہاتھ تھی اور وہ دیودار کے چار ستونوں کی چار قطاروں پر بنا تھا اور ستونوں پر دیودار کے شہتیر تھے۔ ہر قطار میں پندرہ شہتیر تھے۔ کھڑکیوں کی تین

قطاریں تھیں اور تینوں قطاروں میں ہر ایک روزن دوسرے روزن کے مقابل تھا۔

ستونوں کا برآمدہ تھا۔ اس کے سامنے ایک ڈیوڑھی تھی اور ان کے آگے ستون اور موٹے موٹے شہتیر تھے۔ تخت شاہی کے لیے ایک برآمدہ بنایا جہاں وہ عدالت کر سکیں اور فرش سے فرش تک اسے پورا پاٹ دیا۔ یہ سب اندر اور باہر بنیاد سے منڈیر تک بیش قیمت پتھروں کے بنے ہوئے تھے جو ناپ کے مطابق آروں سے چیرے گئے تھے اور ایسا ہی باہر بڑے صحن تک تھا۔ اسی طرح کی اور بھی بیش قیمت اور حیران کن تعمیرات تھیں جو انہوں نے محل میں قائم کی تھیں۔

اس محل کی تعمیر بھی صاف بتارہی تھی کہ اس میں قوم جن نے حصہ لیا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام حیران کن تعمیرات میں جنات سے کام لیتے تھے۔ ہیکل کی عمارت ہو یا محل کی تعمیر یا پھر قلعوں کی تعمیر۔ قرآن اس پر شاہد ہے۔

''وہ (جن) اس کے لیے بناتے تھے جو کچھ وہ چاہتا تھا۔ قلعوں کی تعمیر، ہتھیار اور تصاویر اور بڑے بڑے لگن جو حوضوں کے مانند تھے۔'' (سبا)

اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام پر ایسے عظیم الشان احسانات کیے اور پھر یہاں تک فرمایا کہ اس بے انتہا دولت کے صرف وخرچ پر کوئی باز پرس بھی نہیں ہے مگر ان تمام باتوں کے باوجود حضرت سلیمان علیہ السلام اس دولت کو مخلوق خدا کی خدمت کے لیے ''امانت الٰہی'' سمجھ کر ایک حبہ اپنی ذات پر صرف نہیں فرماتے بلکہ اپنی روزی ٹوکریاں بنا کر حاصل کرتے تھے۔ رہی محل کی تعمیر تو وہ رعب شاہی کے لیے تھی، نہ کہ نمود ونمائش کے لیے۔

ایک اسرائیلی روایت یہ بھی ہے کہ قوم جن نے تخت سلیمان علیہ السلام کو اس کاریگری سے بنایا تھا کہ تخت کے نیچے دو زبردست اور خونخوار شیر کھڑے تھے اور دو گدھ معلق تھے اور جب حضرت سلیمان علیہ السلام تخت حکومت پر جلوہ افروز ہونے کے لیے تخت کے قریب تشریف لے جاتے تو دونوں شیر اپنے بازو پھیلا کر بیٹھ جاتے اور تخت نیچا ہو جاتا اور وہ بیٹھ جاتے تو شیر پھر کھڑے ہو جاتے اور فوراً ہیبت ناک گدھ اپنے پروں کو پھیلا کر سر مبارک پر سایہ فگن ہو جاتے۔ اسی طرح انہوں نے پتھروں سے بڑی اور بھاری دیگیں بنائی تھیں جو چولہوں پر قائم تھیں اور اپنی ضخامت کی وجہ سے حرکت میں نہیں آتی تھیں اور بڑے بڑے حوض پتھر تراش کر بنائے تھے اور شہر بیت المقدس اور ہیکل اور ان سب اشیا کی تعمیر اور کاریگری میں صرف سات سال لگے تھے۔

تورات میں متعدد جگہ ان تعمیری خدمات کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔

''اور یہی باعث ہے جس نے سلیمان علیہ السلام بادشاہ تے لوگوں کی بے گاری کہ خداوند کا گھر اور اپنا قصر اور یروشلم کی شہر پناہ اور شہر (حاصور اور مجد و اور جاذر بھی بنائے...... سو سلیمان علیہ السلام نے جاذر اور بیت حوران اسفل کو پھر تعمیر کیا اور بعلات اور دشت تدمر کو مملکت کے درمیان...... اور خزانے کے سارے شہر جو سلیمان علیہ السلام کے تھے اور اس کی گاڑی کے شہر اور اس کے سرداروں کے شہر بنائے اور جو کچھ سلیمان علیہ السلام کی تمنا تھی سو یروشلم میں اور لبنان میں اور اپنی مملکت کی ساری زمین میں بنائے۔''

تورات میں پتھر کے عظیم الشان حوض اور بھاری دیگوں اور تصویروں اور ان کے بنانے کے لیے بیش قیمت پتھروں کے متعلق طویل فہرست دی گئی ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے چونکہ عظیم الشان عمارات اور پر ہیبت قلعوں کی تعمیر کے نقشے تھے اور آپؑ ان تعمیرات کے استحکام کے بھی شائق تھے۔ اس لیے ضرورت تھی کہ گارے اور چونے کے بجائے پگھلی ہوئی دھات گارے کی طرح استعمال کی جائے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اس قدر کثیر مقدار میں یہ کیسے میسر آئے۔ یہ سوال تھا جس کا حل حضرت سلیمان علیہ السلام چاہتے تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی اس مشکل کو اس طرح حل کر دیا کہ ان کو پگھلے ہوئے تانبے چشمے کے رحمت فرمائے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حسب ضرورت سلیمان علیہ السلام کے لیے تانبے کو پگھلا دیا تھا اور یہ حضرت سلیمان علیہ السلام ...... کے لیے ایک نشان (معجزہ) تھا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام پر یہ انعام کیا کہ زمین کے جن حصوں میں تانبا پانی کی طرح پگھل کر بہہ رہا تھا ان چشموں کو حضرت سلیمان علیہ السلام پر آشکارا کر دیا۔ ان سے قبل کوئی شخص زمین کے اندر دھات کے ان چشموں سے واقف نہیں تھا۔

ابن کثیر کہتے ہیں کہ پگھلے ہوئے تانبے کے یہ چشمے یمن میں تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام پر ظاہر کر دیا تھا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو معلم السحر بھی کہا جاتا ہے اور ان کے جادو کی بنیاد ہاروت و ماروت کے سحر پر مبنی بتائی جاتی ہے۔ لیکن یہ محض روایات ہیں۔ قرآن اس کا انکار کرتا ہے۔

''ایک فرقے نے اللہ کی کتاب کو اسی طرح پیچھے ڈال دیا گویا وہ جانتے ہی نہیں اور ان فضول چیزوں کے پیچھے لگ گئے جو

ن علیہ السلام کے عہد میں شیاطین پڑھا کرتے تھے اور سلیمان علیہ السلام نے مطلق کفر کی بات نہیں کی بلکہ شیاطین ہی کفر تے تھے کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور ان باتوں کے بھی (پیچھے لگ گئے) جو شہر بابل میں دو فرشتوں ہاروت اور ماروت ی تھیں اور وہ دونوں کسی کو کچھ اس وقت تک نہیں سکھاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو ایک ذریعہ آزمائش ہیں، تم ۂ میں نہ پڑو۔

یہود نے تین کتابیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی جانب منسوب کی ہیں۔ ان کتابوں کے ایک قصے میں لکھا ہے کہ حضرت لمان علیہ السلام کے پاس ایک انگوٹھی تھی۔ اس پر اسم اعظم کندہ تھا۔ اس کی تاثیر یہ تھی کہ انسان، حیوان، چرند پرند اور جن ت وغیرہ آپؑ کے پاس کھنچے چلے آتے تھے۔ جب آپؑ کی سلطنت عظیم الشان ہو گئی تو آپ کو اپنی قوت و قدرت پر ناز ہونے ا۔ خدا کو یہ بات ناگوار گزری اور آپؑ کو آزمائش میں ڈال دیا گیا۔

اسرائیلی روایات میں ہے کہ جنوں کا بادشاہ اشمیدائی آپؑ سے خوش نہیں تھا اور اس فکر میں تھا کہ اسم اعظم والی انگوٹھی سے آپؑ کو محروم کر دے جس کی وجہ سے آپؑ کی شان و شوکت برقرار ہے۔ ایک روز اسے موقع مل گیا اور وہ یہ انگوٹھی لے اڑا۔ اس انگوٹھی کے ذریعے اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی شکل اختیار کر لی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی شکل میں تبدیلی آگئی چنانچہ جب آپؑ محل میں واپس آئے تو دربانوں نے انہیں روک دیا کہ یہ اجنبی شخص کیسے دربار میں گھسا چلا آتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام حیران تھے کہ یہ کیسا انقلاب آگیا کہ دربان تک پہچاننے سے انکار کر رہے ہیں۔ وہ لاکھ کہتے تھے کہ میں تمہارا بادشاہ سلیمان علیہ السلام ہوں لیکن کوئی ماننے کو تیار نہیں تھا۔ سب کہہ رہے تھے کہ سلیمان علیہ السلام تو اندر ہیں۔

''اچھا تم میرا ایک کام کر دو۔'' حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا۔ ''میری خواب گاہ میں تکیے کے نیچے ایک انگوٹھی رکھی ہے وہ لا کر مجھے دے دو۔ اس کے بعد تم مجھے پہچان لو گے۔ میرا جاہ و جلال اس انگوٹھی ہی میں پوشیدہ ہے۔''

دربان ہنسنے لگے لیکن ایک جہاندیدہ دربان نے مشورہ دیا کہ اندر جا کر دیکھا تو جائے کہ وہاں سلیمان علیہ السلام موجود ہیں یا نہیں۔

دربان نے ایک کنیز کو اندر بھیجا۔ وہ اسی وقت یہ خبر لے آئی کہ سلیمان علیہ السلام اندر موجود ہیں۔ یہ شخص کسی طرح سلیمان علیہ السلام نہیں ہو سکتا۔

''اب تم چپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ۔'' دربانوں نے کہا۔ ''بادشاہ اندر موجود ہیں۔ اگر انہیں معلوم ہو گیا تو تم گرفتار کر لیے جاؤ گے۔''

جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے جانے سے انکار کر دیا تو وہ لوگ آپؑ کو زبردستی باہر نکالنے لگے۔ اتنی دیر میں ایک شخص نظر آیا جو رکن سلطنت اور آپؑ کا مشیر تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام بڑی امید کے ساتھ اس کی طرف بڑھے۔

''تم تو میرے مشیر ہو۔ تم تو مجھے ضرور پہچان لو گے۔ سچ بتاؤ کیا میں سلیمان علیہ السلام نہیں؟''

اس شخص نے حیرانی سے آپؑ کی طرف دیکھا اور یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ''مجھے تو نہیں معلوم کہ تم کون ہو اور کیوں اپنے آپ کو بادشاہ کہلوانے کی ضد کر رہے ہو۔''

اب تو دربانوں کی ہمت اور بڑھ گئی۔ انہوں نے آپؑ کو محل سے باہر نکال دیا۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ آپؑ پاگل مشہور ہو گئے۔ خلق خدا کثرت سے تماشا دیکھنے آنے لگی کہ کیسا پاگل ہے جو خود کو بادشاہ کہہ رہا ہے۔

آپؑ یروشلم کی گلیوں میں چیختے پھر رہے تھے۔

''لوگو! میری باتیں غور سے سنو! میں داؤد علیہ السلام کا بیٹا سلیمان علیہ السلام ہوں۔ یروشلم کا بادشاہ۔ تمہارا بادشاہ۔ مجھے پہچانو، میں نے یروشلم کو آباد کیا۔ تمہیں خوش حالی دی اور آج تم ہی مجھے پہچاننے سے انکار کر رہے ہو۔ کوئی بہروپیا تمہارا بادشاہ بن بیٹھا اور تم مجھے مجنوں اور دیوانہ کہہ رہے ہو۔''

لوگ ان کی باتیں سن رہے تھے۔ کچھ کے دلوں پر اثر بھی ہو رہا تھا لیکن جلد ہی آپؑ کی باتیں قہقہوں میں اڑ جاتی تھیں۔ آپؑ سے اپنوں کی یہ بے وفائی برداشت نہ ہوئی اور آپؑ شہر چھوڑ کر جنگل کی طرف نکل گئے۔ جنگلی پھل آپؑ کی گزر اوقات کا ذریعہ بن گئے۔ رفتہ رفتہ جسم کے کپڑے پھٹنے لگے۔ اب وہ واقعی مجنوں نظر آتے تھے۔

ایک مرتبہ پھر آپؑ جنگل سے نکلے اور ایک نامعلوم سمت کی طرف چل پڑے۔ چلتے چلتے ایک شہر میں پہنچ گئے۔ ایک دکان کے سامنے دیکھا کہ کسی شخص نے کھانے پینے کا کچھ سامان خریدا ہے اور اب اسے اٹھانے کے لیے کسی مزدور کی تلاش میں ہے۔

آپؑ اس کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ اس شخص نے یہی سمجھا ہو گا کہ کوئی مزدور آ گیا۔

"یہ سامان اٹھاؤ گے؟" اس شخص نے کہا۔

"کیوں نہیں اٹھاؤں گا۔ مزدوری ملے گی تو میں اپنے کھانے کے لیے بھی کچھ خریدوں گا۔ یہ بتاؤ جانا کہاں ہے۔"

"شاہی محل تک۔ میں وہاں شاہی باورچی ہوں۔ یہ سارا سامان وہیں کے لیے لے جا رہا ہوں۔"

"تمہارے بادشاہ کا نام کیا ہے؟"

"آلمون"

یہ نام سنتے ہی حضرت سلیمان علیہ السلام پر ظاہر ہو گیا کہ وہ دشمن ملک میں آ گئے ہیں۔ یہاں بنی عمون کی حکومت تھی۔ یہ لوگ بنی اسرائیل کے موروثی دشمن تھے۔ آپؑ نے شکر بھیجا کہ ابھی تک اپنے بارے میں انہوں نے اس شخص کو کچھ نہیں بتایا۔ انہوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ کچھ بتائیں گے بھی نہیں۔

شاہی محل میں پہنچ کر شاہی باورچی نے آپؑ کے ہاتھ پر اجرت رکھ دی۔

"یہ تو میری ایک روز کی اجرت ہو گئی۔" حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا۔ "اگر آپؑ کے ذریعے میری آمدنی کا کوئی مستقل بندوبست ہو جائے تو آپ کی مہربانی ہو گی۔ آپ شاہی باورچی ہیں۔ آپ کو اتنا اختیار تو ہو گا۔"

"اختیار تو ہے۔" باورچی نے کہا۔ "لیکن سوال یہ ہے کہ آپ کر کیا سکتے ہیں۔"

"آپ مجھے اپنے مددگار کے طور پر رکھ لیں۔"

کچھ دنوں میں جب بھوک کی کمزوری دور ہوئی۔ نئے کپڑے بھی جسم پر آ گئے تو آپ کی وجاہت ظاہر ہونے لگی۔ محل میں جو بھی آپ کو دیکھتا متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔ یہ خبریں بادشاہ تک بھی پہنچیں کہ ایک شخص نیا ملازم ہوا ہے لیکن کسی طرح بھی ملازم معلوم نہیں ہوتا۔ بادشاہ کو شک ہوا کہ یہ کوئی اسرائیلی تو نہیں جو جاسوس بن کر یہاں آ گیا ہو۔ اس نے آپ کو اپنے پاس طلب کر لیا۔ اب شاہی باورچی کو اپنی جان کی فکر ہوئی کہ اگر یہ شخص واقعی اسرائیلی نکلا تو میری خیر نہیں۔ اس نے آپؑ سے ایک مرتبہ پھر پوچھنے کی کوشش کی۔

"اے شخص! سچ سچ بتا تو اسرائیلی تو نہیں۔ اگر ہے تو ابھی بھاگ جا۔ میں کہہ دوں گا کہ تو میرے پاس سے بھاگ گیا اور تیری جان بچ جائے گی۔"

"میں جو بھی ہوں تو اس کو چھوڑ دے۔ مجھے بادشاہ کے پاس لے چل۔ میں اسے مطمئن کر دوں گا۔ میں خود بھی سلامت رہوں گا، تیری جان بھی بچ جائے گی۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ تیری جان بچا لوں گا۔"

شاہی باورچی ڈرتے ڈرتے انہیں بادشاہ کے پاس لے گیا۔ خود ایک کونے میں کھڑا رہا اور بادشاہ نے آپؑ سے سوال جواب شروع کر دیے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام حکمت و دانائی کا مجموعہ تھے۔ گفتگو کے پھول برسائے تو بادشاہ سحر زدہ سا ہو کر رہ گیا۔ یہ پوچھنا ہی بھول گیا کہ وہ اسرائیلی تو نہیں؟

صرف اتنا کہہ سکا۔ "تم جیسے قابل آدمی کے لیے یہ زیبا نہیں کہ باورچی کے مددگار کے طور پر کام کرو۔ آج سے تم شاہی باورچی خانے کے داروغہ کے طور پر کام کرو گے۔"

شاہی باورچی خوش ہو گیا کہ میری جان بھی محفوظ رہی اور نوکری بھی۔

محل میں باتیں تو بن ہی رہی تھیں۔ یہ سن کر لوگوں کو اور بھی تعجب ہوا کہ بادشاہ نے اس اجنبی کو داروغہ مطبخ بنا دیا ہے۔ ارکان شاہی کو جستجو ہوئی کہ اس شخص کو دیکھا تو جائے۔

کئی شہزادے ان سے ملنے آئے تو متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ آپ کی وجاہت اور گفتگو دونوں نے پورے محل کو اپنے حصار میں لے لیا۔

بادشاہ کی ایک بیٹی شہزادی لغامہ بھی تھی۔ یہ باتیں سن سن کر اس کا دل بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی جانب کھنچنے لگا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کس طرح ان سے ملاقات کرے۔ پھر ایک دن یہ ترکیب اسے سوجھ گئی۔ وہ دل ہی دل میں مسکرائی اور محل کے اس حصے میں پہنچ گئی جہاں اس کے خیال میں داروغہ مطبخ یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام کو ہونا چاہیے تھا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے شہزادی کی آمد کا سنا اور پھر اسے اپنے سامنے دیکھا تو اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"میرا نام شہزادی لغامہ ہے۔"

"آپ کی آمد کا شکریہ لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے یہ زحمت کیوں کی؟"

"میں ایک کھانے کی فرمائش کرنے آئی ہوں۔ آپ باورچی سے کہہ کر وہ کھانا تیار کرائیں۔"

"شہزادی صاحبہ، آپ کا حکم ملتا تو میں خود حاضر ہو جاتا۔ آپ نے زحمت کیوں کی۔"

"میں اپنا کام خود کرنے کی عادی ہوں۔ مجھے جب بھی کوئی فرمائش کرنی ہو گی، میں خود آؤں گی۔"

"مجھے اچھا نہیں لگے گا کہ مالک اپنے نوکر کے پاس خود چل کر آئے۔"

"آپ کو اچھا نہ لگے لیکن مجھے اچھا لگے گا کہ میں آپ سے ملاقات کرنے کے لیے روزانہ آؤں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا؟"

"آپ کی خواہش میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے لیکن کیا اس سے باتیں بنانے والوں کو سہولت حاصل نہیں ہو جائے گی؟"

"میں شہزادی ہوں۔ میرے سامنے کون سر اٹھا سکتا ہے۔"

"نقصان آپ کو نہیں مجھے ہو گا۔ بہت سے حاسد ہوں گے جو یہ دیکھیں گے کہ مجھے اہمیت مل رہی ہے تو وہ میرے دشمن بن جائیں گے۔ کہیں مجھے نوکری ہی سے ہاتھ دھونے نہ پڑ جائیں۔"

"میں آپ پر کوئی آنچ نہ آنے دوں گی۔"

شہزادی اب روز اپنی فرمائش کے بہانے آپؑ سے ملاقات کے لیے آنے لگی تھی۔ ہر ملاقات میں آپ کی کوئی نہ کوئی خوبی اس پر ظاہر ہو جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ ملاقاتیں محبت میں تبدیل ہو گئیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اندازہ تھا لیکن شہزادی کے دل میں کیا ہے، ان پر ظاہر نہیں ہوا تھا کیونکہ شہزادی نے ابھی تک اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔

ایک روز شہزادی، آپؑ سے ملاقات کر کے واپس آ رہی تھی کہ ملکہ کی نظر اس پر پڑ گئی۔ ملکہ تک خبریں پہنچ تو رہی تھیں لیکن اب اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔

"اس کا مطلب ہے جو باتیں میں سن رہی تھی وہ ٹھیک ہیں۔" ملکہ نے کہا۔

"آپ کیا باتیں سنتی رہی ہیں؟"

"یہی کہ تو داروغہ مطبخ سے ملنے جاتی ہے۔"

"میں اپنی پسند کے کھانے کا حکم دینے جاتی ہوں۔"

"مجھ سے جھوٹ مت بول۔ یہ کام تو تجھے کسی کنیز سے لینا چاہیے۔ تو ایک معمولی باورچی کے پاس خود چل کر آتی ہے۔"

"وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ وہ ضرور کچھ چھپا رہا ہے ورنہ وہ کسی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔"

"کہیں کا بادشاہ تو نہیں ہے۔ تو شہزادی ہے اس سے تیرا میل جول ٹھیک نہیں۔"

اس وقت تو شہزادی چپ ہو گئی لیکن اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس جانا نہیں چھوڑا۔ تب ملکہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ شہزادی کو اپنے پاس آنے سے منع کر دیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام .... کو یہ سن کر ہنسی آ گئی۔

"میں ایک معمولی سا نوکر ہوں اور وہ ایک شہزادی۔ میں بھلا انہیں کیسے منع کر سکتا ہوں۔ یہ کام تو آپ کر سکتی ہیں۔ وہ یہاں آئیں گی تو میں انہیں نہیں روک سکتا۔"

ملکہ کے چلے جانے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام سوچ میں پڑ گئے۔ وہ سوچنے لگے کہ بات بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ میری نوکری تو گئی۔ رہنے کا ایک ٹھکانا بن گیا تھا۔ دیکھو اب کہاں جانا پڑتا ہے۔

اگلے روز شہزادی آئی تو آپؑ نے اسے منع کر دیا۔

"ملکہ کا حکم ہے کہ آپ میرے پاس نہ آیا کریں۔ آپ کے آنے سے جو مصیبت مجھ پر آئے گی اسے میں برداشت کر لوں گا لیکن جس مصیبت سے آپ دوچار ہو جائیں گی وہ مجھ سے نہیں دیکھا جائے گا۔"

"میں ہر مصیبت برداشت کر لوں گی لیکن آپ کے پاس آنا نہیں چھوڑوں گی۔ آپ کو ملکہ کے حکم کا پاس ہے، میری خواہش کا احترام نہیں۔"

"میں تو آپ کو اونچ نیچ سمجھا رہا تھا۔ اب جو ہو سو ہو۔"

"اگر آپ کو محل سے نکال دیا جاتا ہے تو میں بھی آپ کے ساتھ محل سے نکل جاؤں گی۔ ہر عیش کو ٹھوکر مار دوں گی۔"

شہزادی یہ کہہ کر چلی گئی۔ اب تک وہ اشاروں اشاروں میں ماں کو سمجھاتی رہی تھی لیکن اب اس نے کھل کر اپنے عشق کا اظہار اپنی ماں کے سامنے کر دیا اور زور دیا کہ داروغہ مطبخ سے اس کی شادی کرادی جائے۔
یہ ایسی فرمائش نہیں تھی جسے شاہی خاندان بہ آسانی پورا کر سکتا۔ ملکہ کے ذریعے یہ خبر بادشاہ تک پہنچ گئی۔ بادشاہ کے غضب نے سر اٹھایا۔ اس نے ملکہ سے صاف کہہ دیا کہ وہ اس شخص کو قتل کرا دے گا۔ ملکہ بھی چپ ہو گئی تھی لیکن باورچی سے معلومات کرنے کے بعد سب کے منہ اتر گئے۔
باورچی نے بتایا۔ ”وہ شخص اسرائیلی معلوم ہوتا ہے اور کسی اچھے خاندان کا ہے۔ اگر اس قتل کی خبر سلیمان۔۔۔۔۔۔۔ (علیہ السلام) تک پہنچی تو وہ اسے معاف نہیں کرے گا۔“
یہ سن کر بادشاہ بھی سوچ میں پڑ گیا۔
کئی روز کے غور و فکر کے بعد بادشاہ نے یہ طے کیا کہ اس شخص کو شہر سے نکال دیا جائے لیکن ملکہ نے مخالفت کی۔
”اگر بات یک طرفہ ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی۔ ہماری بیٹی بھی اس کے عشق میں گرفتار ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ ان دونوں کی شادی کر دی جائے۔“
بادشاہ مجبور تو ہو گیا لیکن اپنے غصے کو نہ دبا سکا۔ اس نے ملکہ کو خوش کرنے کے لیے حضرت سلیمان علیہ السلام کی شادی شہزادی سے کر دی۔ بہت کچھ جواہرات بھی شہزادی کو دیے لیکن ایک رات اس نے شہزادی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو بلا کر حکم دیا کہ وہ محل سے چلے جائیں بلکہ یہ شہر ہی چھوڑ دیں۔ اس نے ایک آدمی بھی ان کے ساتھ کر دیا جو انہیں ایک صحرا میں چھوڑ آیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے خدا پر بھروسا کر کے آگے بڑھتے رہے۔ پوری رات گزر گئی۔ دن کا کچھ حصہ بھی گزر گیا لیکن صحرا ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ اب انہیں فکر ہونا شروع ہوئی۔ شہزادی بھی پریشان تھی بالآخر دوسرے دن صبح کے وقت انہوں نے خود کو ایک گاؤں کے قریب پایا۔ یہاں کے لوگ ہمدرد تھے کہ انہیں ایک بڑھیا نے اپنے گھر میں پناہ دے دی۔ یہ بستی سمندر کے کنارے تھی اور یہاں ماہی گیر آباد تھے۔ وہ دن رات اپنے گرد مچھلیاں ہی مچھلیاں دیکھتے تھے۔
ایک روز شہزادی نے کہا کہ ہمیں بڑھیا کے دسترخوان پر کھاتے ہوئے کئی روز ہو گئے ہیں۔ آپ بازار جا کر مچھلی خرید لائیں تاکہ ہم اس بڑھیا کی دعوت کریں۔
آپ بازار گئے اور ایک بڑی مچھلی خرید کر لے آئے۔ شہزادی نے مچھلی کا پیٹ چاک کیا تو پیٹ سے ایک انگوٹھی نکلی اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو فوراً بلایا۔
”یہ دیکھیے یہ کیسی انگوٹھی ہے۔“
”یہ تمہیں کہاں سے ملی؟“
”میں نے مچھلی کا پیٹ چاک کیا تو یہ انگوٹھی نکلی۔ کسی کی گری ہوگی مچھلی نے کھالی ہوگی۔“
حضرت سلیمان علیہ السلام نے رب کا شکر ادا کیا۔ شہزادی پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اندر کمرے میں گئے اور خدا کے حضور سجدے میں گر گئے۔ خدا نے ان کی توبہ قبول کر لی تھی۔ انگشتری ان کے قبضے میں تھی۔
رات کو جب وہ سونے کے لیے لیٹے تو شہزادی کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ سن کر حیران ہو رہی تھی لیکن یقین نہ کرنے والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔
انگوٹھی آنے کے بعد ”جن“ ایک مرتبہ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع ہو گئے تھے۔ انگوٹھی ملنے کا مطلب بھی یہ تھا کہ آزمائش کے دن پورے ہو چکے۔ انہوں نے جنوں کو حکم دیا کہ وہ انہیں اور شہزادی کو یروشلم کے شاہی محل میں پہنچا دیں۔ یہاں پہنچا تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا دربان آپ کو دیکھتے ہی تعظیم کے لیے جھک گئے۔ یہ سب جنوں کے بادشاہ اشمیدئی کو ہی سلیمان علیہ السلام سمجھ رہے تھے۔ انہیں یہ خبر ہی نہیں تھی کہ سلیمان علیہ السلام برسوں سے غائب تھے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔
جنوں کا بادشاہ اب کسی غلام کی طرح ان کے سامنے کھڑا تھا اور معافی کا خواستگار تھا۔ آپ نے اسے معاف کر دیا کیونکہ آپ کے نزدیک جو کچھ ہوا تھا خدا کی مرضی سے ہوا تھا۔

(جاری ہے)

ماخذات: قصص القرآن۔ قصص الانبیا۔ توریت

کیتھرین اپنی نئی پڑوسن کو خاموشی سے دیکھ رہی تھی جو اپنی کار میں سے اپنا سامان نکال کر ان کے برابر کے فلیٹ میں منتقل کر رہی تھی۔ اس کا سامان مختصر اور چند بند بکسوں پر مشتمل تھا۔
کیتھرین اس وقت بھی خاموش رہی جب اس کے شوہر کین نے اس سنہری زلفوں والی حسینہ کو سامان اٹھا کر فلیٹ میں مدد کی پیشکش کی۔ کیتھرین کو اپنے شوہر کی اس دلچسپی والی تشویش نہیں ہوئی اس لیے کہ کیتھرین کو معلوم تھا کہ اگلے ہفتے تک اس کا شوہر کین موت کے منہ میں پہنچ جائے گا۔
یقیناً کیتھرین کو اس حقیقت کا علم بھی تھا کہ سنہری زلفوں والی اس کی نئی پڑوسن اس کے شوہر کین کی محبوبہ تھی اور ان کا معاشقہ گزشتہ چھ ماہ سے جاری تھا اور اس حسینہ کو ان کے اپارٹمنٹ کمپلیکس میں منتقل کرنے کی اسکیم صرف اس لیے تیار کی گئی تھی کہ انہیں ایک دوسرے سے ملنے کے بہتر مواقع میسر آجائیں اور کیتھرین کو کسی قسم کا شبہ بھی نہ ہو۔
کیتھرین سوچنے لگی کہ کین اسے کس حد تک احمق سمجھتا ہے؟ ظاہر ہے اسے بالکل ہی گاؤدی خیال کرتا ہے۔ جبھی تو وہ اپنی محبوبہ کو اپنے پڑوس میں لے آیا تھا اور نہ صرف گاؤدی بلکہ اس حد تک مہربان بھی سمجھتا ہے کہ وہ دونوں کو آسانی کے ساتھ گل چھرے اڑانے کی اجازت دیدے گی؟
بے شک وہ اتنی احمق بھی نہیں تھی کہ کین کی بے وفائی پر خاموش بیٹھی رہتی۔ جوں ہی اس پر کین کے معاشقے کا

ایک سنگدل اور کم فہم حسینہ کی خوش فہمیاں

جیت ہار

ثمر عباس

شطرنج کی بساط ہو اور شاطر کھلاڑی ہو تو کھیل میں ہار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مگر... کھیل اور جرم میں فرق تو ہوتا ہے... بس اسی ذرا سے فرق نے اسے کھلاڑی سے اناڑی بنا دیا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم کی داستان بن کر وہ خود کو کتنا تنہا محسوس کر رہی تھی۔ بہرحال تیر اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا، یہ ستم الگ کہ نشانہ بھی خطا گیا۔
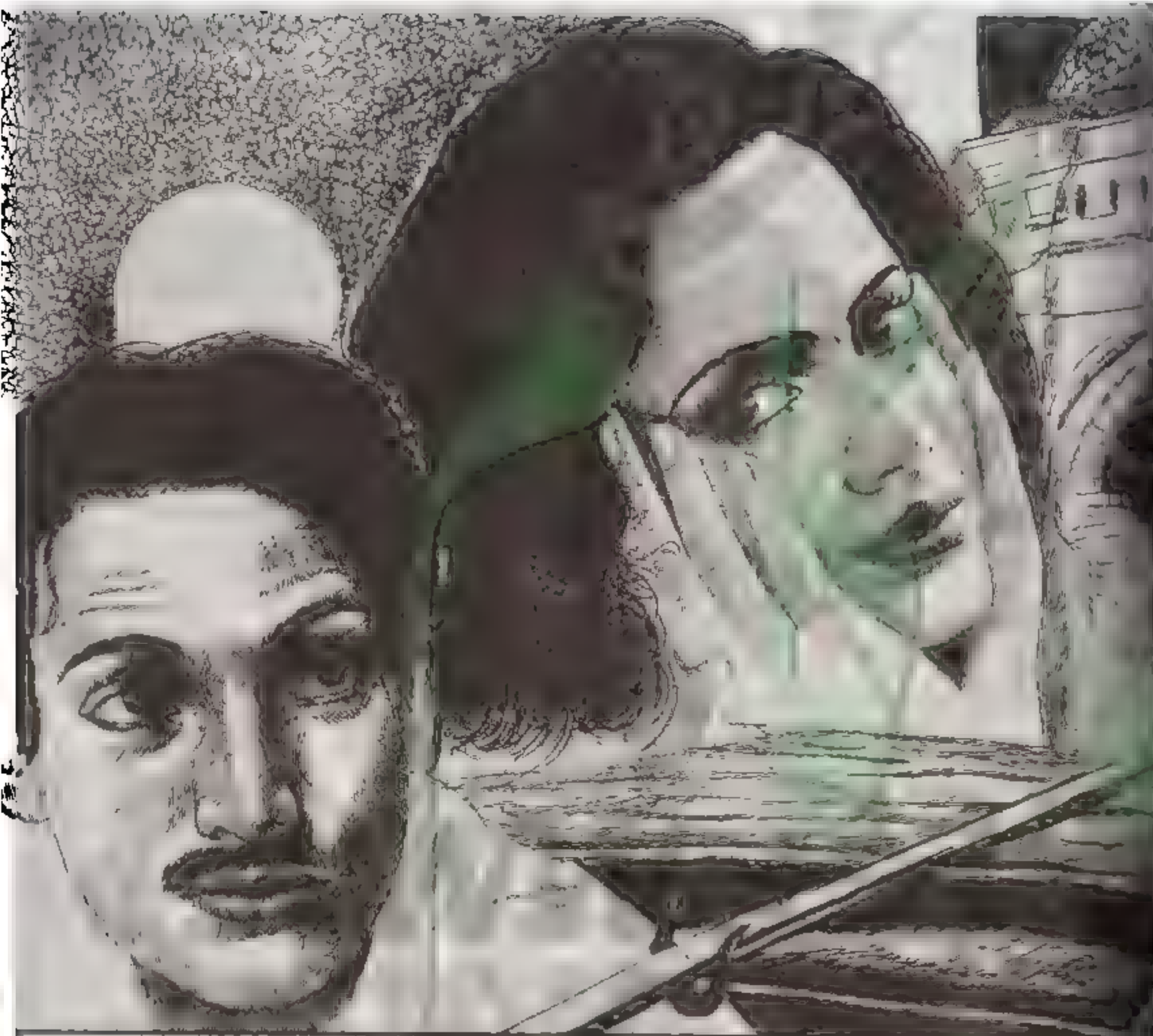
انکشاف ہوا وہ اس اپارٹمنٹ کمپلیکس کی دیکھ بھال کرنے والے نوجوان میکس کو متوجہ کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

میکس نوجوان، پرکشش اور توانا مرد تھا اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ میکس کا خیال ذہن میں آتے ہی کیتھرین کی آنکھیں جگمگانے لگیں۔

اسی لیے وہ کین کو قتل کرنا چاہتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ کین اسے کبھی طلاق نہیں دے گا۔ اس کی ایک اہم وجہ تھی۔ وہ لاٹری کے انعام کی ایک لاکھ ڈالرز کی نصف رقم سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتا تھا جو وہ ہر سال وصول کیا کرتے تھے۔ لاٹری کی شرائط کے مطابق وہ ہر سال انعام کی کل رقم میں سے ایک لاکھ ڈالر وصولی کے حق دار تھے اور وہ اس رقم کو آپس میں آدھا آدھا بانٹ لیا کرتے تھے۔

اور یہی وجہ تھی کہ کیتھرین بھی کین کو طلاق نہیں دے سکتی تھی۔ اس صورت میں وہ بھی انعامی رقم سے محروم ہوجاتی۔ ریاست کے طلاق کے قوانین کے مطابق طلاق کی صورت میں تمام نقدی اور جائداد دونوں میں برابر برابر تقسیم ہوجائے گی اور کیتھرین چاہتی تھی کہ اس سے قبل کہ وہ اس انعامی رقم کا آدھا حصہ لے کر اسے چھوڑ کر چلا جائے، وہ کین کو قتل کردے گی۔

میکس کو کیتھرین اور کین کو ہر سال موصول ہونے والی انعامی رقم کا کوئی علم نہیں تھا۔ اسی لیے کیتھرین کو یقین تھا کہ میکس اس سے سچا پیار کرتا ہے۔ جبھی اس نے کیتھرین سے التجا کی تھی کہ وہ اپنے شوہر کو چھوڑ دے اور اس کے ساتھ شادی کرلے۔

کیتھرین نے سوچ بچار کے بعد ایک ایسا طریقہ سوچ لیا تھا جس پر عمل کرکے وہ یقینی طور پر میکس کے ساتھ تمام انعامی رقم کی مالک بھی بن سکتی تھی۔ یہ درحقیقت ایک سادہ سا پلان تھا۔

کین کو سوئمنگ پول کے ایک المناک حادثے میں ڈوب کر مرجانا تھا۔ وہ روزانہ رات گئے اپارٹمنٹ کمپلیکس کے سوئمنگ پول میں تیراکی کیا کرتا تھا۔ یہ اس کا معمول تھا جس کی گواہی اپارٹمنٹ کمپلیکس کے درجنوں رہائشی دے سکتے تھے۔ ایسی ہی ایک رات پانی میں ڈوب کر اس کی موت واقع ہوتی تھی اور اگلے روز صبح کسی کو اس کی لاش سوئمنگ پول میں تیرتی ہوئی مل جاتی۔ کوئی بھی اتنا عقلمند نہیں تھا کہ کیتھرین پر کسی قسم کا شبہ کرتا۔

اگر رات کو کسی نے اسے باہر دیکھ بھی لیا ہوتا تو وہ یہی رپورٹ کرتا کہ وہ رات گئے اپارٹمنٹ کمپلیکس کے جاگنگ ٹریک پر روزانہ چہل قدمی کیا کرتی تھی۔ اس کے ہاتھ اور پیروں میں وزن بندھا ہوتا تھا جو چہل قدمی کی کڑی ورزش کے فوائد بڑھانے کے لیے ہوتا تھا۔

وہ گزشتہ کئی ماہ سے ان اوزان میں اضافہ کرتی جارہی تھی تاکہ اپنا کل جسمانی وزن بہ شمول ان اوزان کے کین کے ایک سو چالیس پونڈ وزن کے برابر لے آئے۔

کیتھرین کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ چپکے سے اس وقت پانی میں اتر جائے گی جب کین سوئمنگ پول میں اپنی معمول کی تیراکی کررہا ہوگا۔ پھر اس بہلاوے کے ساتھ اس کی جانب بڑھے گی جیسے اپنی خواہش کی تکمیل چاہتی ہو۔ پھر اسے زیر آب دبوچے رہے گی۔ کین ان کی شادی کے بیس برس کے تمام عرصے میں بلا کا سگریٹ نوش رہا تھا۔ لہٰذا کیتھرین کو علم تھا کہ کین کے پھیپھڑے لازمی کمزور ہوچکے ہوں گے اور ان میں زیادہ دیر تک زیر آب رہنے کی طاقت ختم ہوچکی ہوگی۔

یہ ایک پرفیکٹ پلان تھا۔

کیتھرین نے اس پلان پر عمل کے لیے آنے والی اتوار کی شب کا انتخاب کیا۔ اتوار کی رات بیشتر لوگ جلدی سونے کے لیے چلے جاتے تھے اور اس بات کا امکان کم ہی تھا کہ اس رات کوئی اور سوئمنگ پول کے پاس چہل قدمی یا تیراکی کی غرض سے موجود ہوگا۔ اس نے یہ ایک عادت سی بنا لی تھی کہ جب اپنی چہل قدمی کے لیے نکلتی تو سوئمنگ پول کے پاس رک کر تیراکی کرتے ہوئے کین کے ساتھ ایک آدھ منٹ بات ضرور کرتی تھی۔ اس دوران میں اس نے یہ مشاہدہ کرلیا تھا کہ اس وقت وہاں سے گزرنے والے شاذونادر ہی ہوا کرتے تھے۔

اتوار کی اس شب جب کیتھرین سوئمنگ پول کے پاس نمودار ہوئی تو کین نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اس میں حیرانی کی کوئی بات بھی نہیں تھی کیونکہ ان دنوں وہ آپس میں کبھی کبھار ہی گفتگو کیا کرتے تھے۔

البتہ اس وقت کین نے کیتھرین پر قدرے الجھی ہوئی نگاہ ڈالی جب اس نے کیتھرین کو پول کے پانی میں قدم رکھتے ہوئے دیکھا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر کمر کے پانی میں آن کھڑی ہوئی تھی۔ کین پول میں ادھر سے ادھر تیراکی کرنے میں مصروف رہا۔ وہ دونوں آپس میں کوئی بات نہیں کررہے تھے۔

اپنا آخری چکر مکمل کرنے کے بعد جب کین کا سانس چڑھ گیا اور وہ ہانپنے لگا تو کیتھرین کے پاس آکر کھڑا ہوگیا اور اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

کیتھرین نے اس کے ساتھ مختصر سی باتیں شروع کردیں جیسے کہ ان کے درمیان مراسم اب دوستانہ ہوگئے ہوں

ساتھ ہی وہ دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھتی رہی حتیٰ کہ اس کے اس حد تک قریب پہنچ گئی کہ اپنی ٹانگیں اس کے گرد حائل کرسکے۔ پھر اس نے اچانک اپنی ٹانگیں کین کے گھٹنوں کے پیچھے لے جاکر قینچی لگاتے ہوئے ایک زوردار جھٹکا دیا۔ کین کے پیر زمین پر سے اکھڑ گئے اور وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ پانی میں پیچھے کی طرف گر پڑا۔ جب کیتھرین نے ساتھ ہی اپنے جسم کا پورا وزن کین پر اس طرح ڈال دیا کہ اسے زیر آب دبائے رکھنے میں دیر تک کامیاب رہ سکے۔ کین کا جسم سوئمنگ پول کی تہ میں تھا۔

کین خود کو بچانے کے لیے جدوجہد کرنے لگا۔

وہ کیتھرین کی اس ٹانگ کو کھینچنے کی کوشش کررہا تھا جس سے کیتھرین نے اس کی گردن پر مضبوطی سے پیر رکھا ہوا تھا۔ کبھی وہ کیتھرین کی دوسری ٹانگ کو گرفت میں لینا چاہ رہا تھا جس سے کیتھرین نے پوری قوت سے اس کی کمر کو دبایا ہوا تھا۔ کین کی اس جدوجہد میں کیتھرین کئی مرتبہ ڈگمگائی اور اپنا توازن کھوتے کھوتے بچی۔ لیکن کین خود کو اس کے چنگل سے چھڑانے میں کامیاب نہ ہوسکا۔

اس کی اسی جدوجہد نے بالآخر اسے تھکا مارا۔ اگر کین پرسکون انداز میں اپنی سانس روک کر اپنے ذہن سے کام لیتے ہوئے خود کو کیتھرین کے بوجھ سے نجات دلانے کا کوئی طریقہ ڈھونڈتا تو وہ کامیاب ہوسکتا تھا۔ اس لیے کہ کیتھرین اس پھرتی کے ساتھ اس پر اپنا دباؤ برقرار نہیں رکھ سکتی تھی کیونکہ وہ خود بھی پانی میں تھی اور وہ وزن میں بھی اس سے زیادہ نہیں تھی۔

لیکن حسب معمول کیتھرین کو احساس ہوچکا تھا کہ کین اس کے چنگل سے نکلنے کے لیے اپنے ذہن سے نہیں بلکہ اپنے جسم سے کام لے رہا تھا اور یہی کوتاہی اسے دھوکا دے گئی۔ کیتھرین سے لڑائی کے عمل کی بنا پر اس کا سانس وقت سے پہلے ہی ٹوٹ گیا اور ہاتھ پیر مارنے کی مشقت نے اسے گہرے گہرے سانس لینے پر مجبور کردیا۔

یہ کین کی ہولناک غلطی تھی۔

گو وہ صرف تین فٹ گہرے پانی میں تھا لیکن اسے احساس ہوگیا تھا کہ ہوا اس کے پھیپھڑوں میں نہیں پہنچ رہی ہے۔ وہ گھبراہٹ میں مزید گہری سانسیں لینے لگا۔

بالآخر پھیپھڑوں میں آکسیجن نہ پہنچنے کی بنا پر وہ بے ہوش ہوگیا۔

کیتھرین نے مزید ایک منٹ تک اس کے پانی میں ڈوبے ہوئے بے ہوش جسم پر اپنا دباؤ برقرار رکھا۔ جب اسے یقین آگیا کہ وہ اب بے حس وحرکت ہوچکا ہے تو کیتھرین نے محتاط نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لیا۔

جب اسے اطمینان ہوگیا کہ آس پاس کوئی موجود نہیں ہے تو وہ آہستہ آہستہ سوئمنگ پول سے باہر نکل آئی تاکہ کوئی اس کی عجلت پسندی یا گھبراہٹ کی بنا پر اس کی جانب متوجہ نہ ہونے پائے۔ سوئمنگ پول کے کنارے پہنچ کر اس نے پلٹ کر پول کی جانب دیکھا اور پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے کین کے بے جان جسم سے مخاطب ہوکر قدرے اونچی آواز میں بولی۔ ”تم سے بعد میں گھر پر ملاقات ہوگی، ڈیئر!“

پانی کے اوپر تیرتے ہوئے کین کی بے نور آنکھیں خالی نظروں سے اسے تک رہی تھیں۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک اور پلان کے مطابق ہوگیا تھا۔ کسی نے بھی اسے سوئمنگ پول کے پاس نہیں دیکھا تھا۔ گو بعد میں کیتھرین نے پولیس کو یہی بتایا کہ وہ معمول کی چہل قدمی کے لیے گئی تھی اور سوئمنگ پول کے پاس سے گزری تھی لیکن پولیس نے اس بارے میں کوئی خاص توجہ نہیں دی کیونکہ ہر شب کی چہل قدمی اس کے روز کے معمولات میں شامل تھی جس کی گواہی ہر کوئی دے رہا تھا۔

کین کی تجہیز و تکفین اسی غم زدہ ماحول میں ہوئی جیسے کہ ہونی چاہیے تھی۔ کیتھرین کو اس بات سے بڑا اطمینان ہوا کہ اس کی سنہری زلفوں والی پڑوسن نے اس عقلمندی کا مظاہرہ کیا کہ وہ ایک مرتبہ بھی تعزیت کرنے یا دلاسا دینے کے لیے اس کے پاس نہیں آئی۔ کیتھرین کسی کو بھی یہ تاثر نہیں دینا چاہتی تھی کہ ان کی ازدواجی زندگی کسی آئیڈیل سے کم تھی۔ اسے ان دنوں اپنی وہ پڑوسن نظر بھی نہیں آرہی تھی اور نہ ہی کیتھرین کو اسے دیکھنے کی کوئی جستجو تھی۔

وہ تو درحقیقت صرف میکس سے ملنا چاہتی تھی اور وہ بھی اس وقت جب معاملات بالکل ٹھنڈے پڑجائیں اور میکس سے ملنے میں کسی قسم کا کوئی خطرہ یا شبہ نہ ہو۔ کین کی تدفین کے کئی ہفتوں بعد کیتھرین ایک رات میکس کے اسٹوڈیو اپارٹمنٹ کی جانب چل دی جو کمپلیکس کے عقبی حصے میں واقع تھا۔ کین کو قتل کرنے کے بعد سے اس نے میکس کو نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی وہ خود اس طرف آئی تھی۔ میکس نے بھی عقلمندی سے کام لیتے ہوئے خود کو اس سے دور رکھا ہوا تھا۔

اگر میکس کو اس بات کا علم بھی تھا کہ اس نے کین کو قتل کیا ہے تب بھی اس نے کیتھرین سے کچھ نہیں کہا تھا۔

کیتھرین جب اس کے اپارٹمنٹ کے پاس پہنچی تو دیکھا کہ میکس کی کار پارکنگ لاٹ میں کھڑی تھی۔ یہ اس

بات کا ثبوت تھا کہ میکس اپنے اپارٹمنٹ میں موجود ہے۔
میکس کا اپارٹمنٹ ایک کمرے پر مشتمل تھا اور کمرے کی عقبی دیوار کے ساتھ ایک اسٹوڈیو کا کاؤچ رکھا ہوا تھا۔ کیتھرین کے اندازے کے مطابق میکس اسی کاؤچ پر سوتا تھا۔ کمرے کے سامنے کی کھڑکی کا پردہ گرا ہوا تھا۔ کمرے کے عقب میں ایک چھوٹی کھڑکی بھی تھی جسے میکس ہمیشہ کھلی رکھتا تھا۔ خاص طور پر رات کے وقت اسے کھلے آسمان کا نظارہ بہت اچھا لگتا تھا۔
کیتھرین دبے پاؤں کمرے کے عقبی حصے کی جانب بڑھنے لگی۔ کمرے کے اندر مدھم سی روشنی جھلمل کر رہی تھی۔ عقبی کھڑکی سے کمرے کے اندر کا جائزہ لینے میں کیتھرین کو کچھ وقت لگا کیونکہ اندر بلب کے بجائے شمع روشن تھی۔
تب اسے کاؤچ پر دو سائے حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیے۔ مرد کا چہرہ عورت کی سنہری زلفوں میں چھپا ہوا تھا۔ کیتھرین کو ان دونوں کو پہچاننے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔
وہ میکس اور کیتھرین کی وہی پڑوسن تھی جسے اس کا شوہر کین اس کمپلیکس میں لایا تھا۔
کیتھرین کے دل میں ٹیس کی ایک لہر سی اٹھی اور پورا بدن سن سا ہو گیا۔ وہ بہ مشکل تمام کھڑکی سے پیچھے ہٹ گئی۔ وہ دونوں کیتھرین کی موجودگی سے قطعی بے خبر اپنے فعل میں مگن تھے۔
کیتھرین بوجھل قدموں سے اپنے اپارٹمنٹ کی جانب پلٹ گئی۔

☞☞☞

اسے بے حد تکلیف پہنچی تھی۔ اسے نیند نہیں آرہی تھی اور دیر تک جاگتی رہی لیکن پھر اس خیال نے اس کے درد کے احساس کو تقریباً مٹا دیا کہ اب انعام میں ملنے والی تمام کی تمام رقم اس کی ذاتی ملکیت ہوگی۔
ہر سال ایک لاکھ ڈالرز سے وہ اس جیسے بے شمار میکس خرید سکتی ہے۔
یہ دلی اطمینان حاصل ہونے کے بعد اسے نیند آگئی۔
اگلے روز کیتھرین نے اپنے اٹارنی کو فون کیا۔
”مسز کین، میں خود بھی آپ کو فون کرنا چاہ رہا تھا۔“ اٹارنی نے کہا۔ ”گو کہ مسٹر کین کی وصیت بالکل صاف اور واضح ہے اور انہوں نے اپنا سب کچھ آپ کے لیے چھوڑ دیا ہے لیکن ایک معاملہ ایسا ہے جس پر میں آپ سے تفصیلی گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“
”میں نے بھی اسی لیے آپ کو فون کیا ہے مسٹر رالف! میں اس بارے میں فکرمند تھی کہ لاٹری کے انعام کی آدھی رقم کے بجائے پوری رقم اپنے نام کرانے اور ہر سال انعامی رقم کا چیک لینے بجائے اپنے نام جاری کرانے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟“
”ویل، یہی وہ بات ہے جس کے لیے میں آپ کو فون کرنا چاہ رہا تھا مسز کین۔ اس بات کی تصدیق کے لیے میں نے اسٹیٹ لاٹری کمیشن سے رابطہ کیا تھا۔“ مسٹر رالف نے بتایا۔ ”ویل، ان کا کہنا ہے انعامی رقم کا اب آئندہ کوئی چیک جاری نہیں کیا جائے گا۔“
”کیا مطلب؟“ کیتھرین چونک گئی۔
”مسز کین، مجھے احساس ہے کہ یہ کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ کے شوہر نے انعامی رقم تنہا کلیم کی تھی۔ اس کے باوجود کہ انعامی رقم آپ دونوں شیئر کرتے تھے۔ اگر انعامی لاٹری ٹکٹ کے مشترکہ مالکان کے طور پر آپ دونوں ہی نے انعام کی رقم کا دعویٰ کیا ہوتا تو پھر آپ کے حصے کی نصف انعامی رقم آپ کو بہ دستور ملتی رہتی۔ لیکن ریاست کے قانون کے مطابق انعام جیتنے والے کی موت کے بعد ریاست انعامی رقم کے اجرا کو موقوف کر دیتی ہے۔ انعام کی بقیہ رقم ریاست کی ملکیت ہو جاتی ہے۔ ایک مرتبہ جب انعام جیتنے والا مر جاتا ہے تو پھر اس کے شیئر کی ادائی نہیں ہوتی۔ لہٰذا اگر لاٹری ٹکٹ پر انعام کا مطالبہ آپ نے تنہا کیا ہوتا تو تمام کی تمام رقم آپ ہی کو مل رہی ہوتی لیکن چونکہ یہ مطالبہ آپ کے شوہر نے تنہا کیا تھا، اس لیے آپ کو ان کے نام کا چیک جاری نہیں ہو سکتا اور نہ ہی آپ اس رقم کا دعویٰ کر سکتی ہیں۔ اب آئندہ اس انعامی رقم کا کوئی چیک ایشو نہیں ہوگا۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا مسز کین؟“
کیتھرین نے خاموشی کے ساتھ فون کریڈل پر رکھ دیا۔ اس کا ذہن ماضی میں اس دن کا تصور کرنے لگا جب اس نے خود یہ لاٹری ٹکٹ خریدا تھا اور پھر اس دن کا جب اس پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ لاٹری کا انعام جیت گئی ہے۔
”اپنے آپ کو کچھ تو کارآمد بناؤ، کین۔“ اس نے انعام جیتنے کے بعد کہا تھا۔ ”اپنی سست روزندگی میں کبھی کچھ کر بھی لیا کرو، کاہل آدمی! میں نے تم جیسا نکھٹو کوئی نہیں دیکھا۔ جاؤ، یہ لاٹری ٹکٹ لے جاؤ اور انعامی رقم کا دعویٰ داخل کر دو۔ پھر واپس آکر مجھے بتاؤ کہ وہ پیاری سی انعامی رقم ہمیں جلد از جلد کب سے ملنا شروع ہو جائے گی۔“
”ٹھیک ہے، ڈیئر۔“ کین نے سعادت مندی سے جواب دیا تھا۔ ”جیسے تم کہو، میں ابھی جاتا ہوں۔“

گھٹیا حرکت

عبدالقیوم شاد

ہیرے کی قدر جوہری جانتا ہے اگرچہ یہ بات درست ہے مگر... جب روپ بدل بدل کر جوہری ہیرے کی قدر کرنے کی کوشش کرے تو ایسی ہی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے جیسی کہ یہاں... وہ بھی ایسے ہی قدردان تھے یہ اور بات کہ ان کی یہ خوبی گھٹیا حرکت میں بدل گئی... مگر یہ بھی ان کے حق میں غنیمت ہوا... اگر ان کی قدردانی کا راز فاش ہوجاتا تو... سرکاری مہمان خانے میں ان کی اچھی خاصی قدر ہوجاتی۔

ایک ذرا سی چوک سے چونکا دینے والے دلچسپ واقعات

شام کے چھ بجے تھے۔ پیٹر ہاپکنز پلازا فاؤنٹین کے کنارے بیٹھا دولت حاصل کرنے کا کوئی سہل اور اچھوتا طریقہ سوچ رہا تھا۔ فوارے کے اردگرد تفریح کے لیے آئے ہوئے بے شمار خواتین و حضرات بیٹھے تھے جن کے ساتھ ایک

کثیر تعداد بچوں کی بھی تھی۔ اکثر بچے چھوٹے چھوٹے سکے فوارے کے گرد بنے ہوئے حوض میں پھینکتے اور پھر خوشی سے تالیاں بجانے لگتے۔

پیٹر کی نظریں حوض کے ساتھ بنی ہوئی کئی منزلہ عمارت کی طرف اٹھتی چلی گئیں۔ پھر تیسری منزل پر لگے ہوئے سائن بورڈ پر ٹک گئیں جس پر نمایاں الفاظ میں ''ڈائمنڈ شاپ'' اور ''ہیروں کے بیوپاری'' لکھا ہوا تھا۔ بورڈ کے ساتھ ہی ایک کھلی ہوئی کھڑکی تھی جو عین حوض کے اوپر تھی۔ ان تمام تفاصیل کو دیکھ کر پیٹر کے ذہن میں ایک لاجواب منصوبہ جنم لینے لگا۔

وہ ٹہلتا ہوا عمارت کے کونے پر واقع ٹیلی فون بوتھ کے اندر گھس گیا اور جونی اسٹوپ کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ جونی ایک ہوشیار اور فیشن ایبل شاطر، نہایت بارعب اور پروقار شخصیت کا مالک تھا۔ اگر وہ کسی اسٹور میں داخل ہوجاتا تو سیلز مین دوسرے گاہکوں کو چھوڑ کر ایکدم اس کی طرف متوجہ ہوجاتے اور خوش قسمتی سے مشرقی ریاستوں میں اس کا ریکارڈ بالکل صاف تھا۔ دس سال قبل اس نے کیلی فورنیا میں کئی ایک فراڈ کیے تھے۔ تاہم اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ پولیس والے اتنی پرانی کڑیاں ملانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ رابطہ ملنے کے بعد پیٹر نے کہا۔

''ہیلو جونی، میں پیٹر بول رہا ہوں۔ شکر ہے کہ تم گھر پر مل گئے۔''

''پیارے، میں دن کے وقت گھر پر ہی ہوتا ہوں۔ ویسے اس وقت باہر نکلنے کی تیاری کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے قیلولہ فرما رہا تھا۔''

''سنو، میرے پاس تمہارے لیے ایک کام ہے۔''

''کیسا کام ہے؟'' جونی نے پوچھا۔

''فون پر بتانے والا نہیں۔'' پیٹر نے کہا۔ ''اگر تم فارغ ہو تو روبی اسنیک بار میں آجاؤ۔ وہاں بیٹھ کر تفصیلی بات ہوجائے گی۔''

''کتنے بجے؟''

''اب سے ایک گھنٹے کے بعد۔'' پیٹر نے کہا۔ ''یعنی سات بجے۔''

''سات بجے نہیں۔'' جونی نے کہا۔ ''مجھے ایک چھوٹا سا کام کرنا ہے، میں ٹھیک آٹھ بجے وہاں پہنچ جاؤں گا۔''

''اوکے۔ تو پھر آٹھ بجے ملاقات ہوگی۔''

☆☆☆

روبی اسنیک بار ایک خاموش اور پرسکون علاقے میں واقع تھا۔ شام کے وقت وہاں زیادہ رش نہیں ہوتا۔ پیٹر مقررہ وقت سے پندرہ منٹ پہلے ہی وہاں پہنچ گیا اور عقبی حصے میں واقع ایک کیبن میں بیٹھ کر کافی کا آرڈر دیا۔

آٹھ بج کر دس منٹ پر جونی بار میں داخل ہوا اور گہری نظروں سے اندر کا جائزہ لیا۔ گویا وہ وہاں ڈاکا ڈالنے یا کسی لڑکی کو اغوا کرنے آیا تھا۔ اندر دو یا تین گاہک بیٹھے تھے۔ بارمین فون پر کسی شخص کے ساتھ تکرار کر رہا تھا۔

کیبن میں داخل ہوکر جونی کرسی پر بیٹھ گیا اور استفہامیہ نظروں سے پیٹر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں تو دوست! اب بتاؤ، تم کیسا کام تلاش کرکے لائے ہو؟''

پیٹر نے رسمی گفتگو کو نظرانداز کرتے ہوئے۔۔۔۔ رازداری کے ساتھ کہا۔

''فاؤنٹین پلازا کی تیسری منزل پر جواہرات کی ایک بہت بڑی دکان ہے۔ یقیناً تم نے وہ دکان دیکھی ہوگی۔ اس دکان سے بڑی آسانی کے ساتھ ہیرے چرائے جاسکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ معمولی کوشش سے ہم پچاس ہزار ڈالرز کی مالیت کے ہیرے اڑا سکتے ہیں۔''

''بہ ظاہر بڑی پرکشش بات ہے۔'' جونی بولا۔ ''منصوبہ کیا ہے؟''

''اندر کی کارروائی تم کرو گے اور میں باہر سے تمہاری مدد کروں گا۔''

''اور پھر میں اندر سے اور اندر چلا جاؤں گا اور تم باہر عیش کرو گے۔''

''تم آرام سے باہر آجاؤ گے۔'' پیٹر نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ''منصوبہ بالکل سیدھا سادا اور آسان ہے۔ ہم دوپہر کے قریب وہاں جائیں گے۔ اس وقت وہاں زیادہ گاہک نہیں ہوتے۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ دکان تیسری منزل پر واقع ہے۔ تم اندر جاکر ہیرے دیکھنے کی خواہش ظاہر کرنا۔ جب سیلز مین ہیرے نکال کر تمہیں دکھائے گا تو میں مرکزی ہال میں کچھ گڑبڑ کردوں گا۔ قدرتی طور پر سیلز مین کی توجہ ایک آدھ منٹ کے لیے ہال کی طرف ہوجائے گی۔ اس دوران میں تم چند ہیرے پار کرلینا۔''

''ہیرے پار کرلوں۔ یعنی انہیں نگل لوں، جس طرح خانہ بدوش جپسی کرتے ہیں؟''

''کوئی بے ڈھنگی بات نہیں جونی۔'' پیٹر نے کہا۔ ''پولیس والے اس قسم کی چالوں سے خوب واقف ہیں۔ تم ان ہیروں کو کھڑکی سے باہر پھینک دینا۔''

''بس؟'' جونی گرجا۔ ''مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ تم نے کوئی بے ہودہ منصوبہ بنایا ہوگا۔''

''میرے بھائی میں پوری سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہا ہوں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ عام طور پر کھڑکیاں کھولی ہی نہیں جاتیں، شاید تمہیں معلوم نہیں کہ تازہ ہوا کے لیے اسٹور میں ایئرکنڈیشنر لگا ہوا ہے اس لیے کھڑکی کھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''آج میں نے اپنی آنکھوں سے کھڑکی کھلی دیکھی ہے۔ آج کل تیل کے بحران کی وجہ سے لوگ بجلی کم خرچ کرتے ہیں۔ ایئرکنڈیشنر بند رکھتے ہیں اور کھڑکیاں کھول دیتے ہیں۔ بہرحال یہ لوگ اس اصول پر پورے خلوص کے ساتھ عمل کر رہے ہیں چونکہ یہ کھڑکی تیسری منزل پر واقع ہے اس لیے وہاں سے کسی کے اندر داخل ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ البتہ وہاں سے سامان باہر جاسکتا ہے۔ میرا اشارہ ہیروں کی طرف ہے۔''

''نہایت غیر معقول بات نظر آتی ہے۔''

''سنو، تم کھڑکی والے کاؤنٹر کے سامنے کھڑے ہونا، کاؤنٹر سے کھڑکی کا فاصلہ تقریباً دس فٹ ہے۔'' اس نے اندر۔۔۔۔ کھڑکی اور کاؤنٹر کا خاکہ بناتے ہوئے کہا۔ جب ہال کے اندر گڑبڑ ہو اور اسٹور کے تمام ملازمین کی توجہ اس طرف ہوجائے تو تم ہیرے کھڑکی سے باہر پھینک دینا۔ کسی کا خیال اس بات کی طرف نہیں جائے گا کہ تم نے ہیرے کھڑکی سے باہر پھینک دیے ہیں، کیونکہ تم کھڑکی کے قریب نہیں گئے اور کھڑکی کاؤنٹر کے پیچھے ہے۔ ہیرے باہر پھینکنے کے بعد تم دوسرے شوکیس کے قریب جاکر اندر رکھے ہوئے ہیرے دیکھنے لگ جانا۔ اگر ہیروں کی گمشدگی کا انکشاف ہو بھی گیا تو شک صرف تم پر نہیں کیا جائے گا بلکہ اسٹور میں موجود دیگر تمام گاہکوں پر بھی کیا جائے گا۔ بہرحال تمہاری تلاشی لیں گے اور طرح طرح کے سوالات کریں گے لیکن ظاہر ہے کہ تمہارے پاس سے مال مسروقہ برآمد نہیں ہوگا لہٰذا تمہیں جانے دیا جائے گا۔ یوں بھی تم ایک معزز'' اور ''پرامن'' شہری ہو۔''

''سوال یہ ہے کہ ان ہیروں کا کیا بنے گا جنہیں میں کھڑکی سے باہر پھینکوں گا کیونکہ تم اس وقت ہال کے اندر ہوگے۔''

''یہی تو اس منصوبے کا خوبصورت ترین حصہ ہے۔'' پیٹر نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اس کھڑکی کے عین نیچے۔۔۔۔۔

عقل مند نصیحتیں

☆ کبھی اپنی بیوی کی چوائس پر [illegible]

آپ اس کی چوائس میں سے ہی ہوتے ہیں

☆ کبھی اپنی چوائس پر غرور نہ کریں کیونکہ ان میں سے ایک چوائس آپ کی بیوی ہے۔

جاوید احمد۔ کراچی

لیڈیز فرسٹ

وہ دونوں بُری طرح ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا تھے لیکن ان کے والدین ان کی یکجائی کے خلاف تھے۔ دونوں نے سارے جتن کرلیے لیکن ان کا گھر بسانے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر نہ آیا۔ آخرکار دونوں نے قریبی پہاڑ کی چوٹی سے کود کر خودکشی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

راوی کہتا ہے کہ مقررہ چوٹی پر پہنچنے کے بعد لڑکے پر خوف اور رقت نے غلبہ پالیا۔ اس کے لیے اپنی ساتھی کی خودکشی کا منظر دیکھنا ممکن نہیں رہا۔۔۔ اسے ڈر تھا کہ چیختی چلاتی لڑکی کے کھائی میں گرنے کا اندوہناک منظر دیکھ کر وہ خودکشی سے پہلے ہی مرجائے گا۔

فیصلہ ہوا کہ پہلے لڑکا چھلانگ لگائے۔ وہ آنکھیں بند کرکے بلند چوٹی سے کھائی میں کود گیا۔ لڑکی کے لیے اس کی آخری حالت قابلِ دید اور قابلِ رحم تھی۔ اپنے دوست کی آخری چیخوں کے بعد اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور اس بے ہودہ انداز میں اپنی جان گنوانے کے بجائے واپس چل دی۔

ایک متبادل ساتھی پہلے سے اس کی نظر میں تھا۔ اس بار گھر والے آڑے نہ آئے اور اس نے گھر بسالیا۔ سیانوں کے لیے وہ واقعہ عبرت اثر تھا۔ انہوں نے نتیجہ اخذ کیا کہ عورت قابلِ اعتبار نہیں، جب بھی کوئی فیصلہ ہو تو عورت کو اس پر پہلے عمل کرنا ہوگا تاکہ اس کے فرار کی راہ مسدود ہوجائے اور مرد بے چارہ مفت میں نہ مارا جائے۔

سیانوں کا یہ مشاہدہ اس قدر مقبول ہوا کہ آج ہر طرف لیڈیز فرسٹ کا اصول کارفرما نظر آتا ہے۔

(کراچی سے ثمین دانش کا ایک جدید چٹکلا)

فوارہ ہے اور اس کا حوض خاصا بڑا ہے، جب تم ہیرے کھڑکی سے باہر پھینکو گے تو وہ سیدھے حوض کے اندر جا کر گریں گے۔ فوارے کی وجہ سے پانی کے اندر چھینٹے اڑتے رہتے ہیں۔ اس لیے حوض کے قریب پھرنے والے لوگوں کو ہرگز ہیروں کے گرنے کا پتا نہیں چلے گا اور سطح پر سے ان کے نظر آنے کا بھی کوئی امکان نہیں کیونکہ وہ پانی کی طرح شفاف ہوتے ہیں۔"

"بات تو ٹھیک ہے۔" جونی نے کہا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ جب حوض پر دھوپ پڑے گی تو......"

اول تو حوض کی تہ تک دھوپ پہنچتی ہی نہیں۔" پیٹر نے کہا۔ "لیکن اگر دھوپ وہاں تک پہنچ بھی جائے تو جب تک کسی کو معلوم نہ ہو کہ تہ میں ہیرے پڑے ہیں۔ کوئی شخص ان کو دیکھ نہیں سکتا۔ ویسے بھی ہم انہیں زیادہ دیر تک وہاں چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔"

جونی نے سر کو اوپر نیچے حرکت دیتے ہوئے کہا۔ "بات تو معقول ہے۔ اس منصوبے پر عمل درآمد کب کیا جائے گا؟"

پیٹر نے مسکراتے ہوئے بیئر کا گلاس بلند کیا اور کہا۔ "کل۔"

***

ٹھیک سوا بارہ بجے جونی شاہانہ انداز میں ڈائمنڈ شاپ کے اندر داخل ہوا۔ اس وقت وہ اپنا بہترین سوٹ زیب تن کیے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے پر زبردست سنجیدگی اور متانت نظر آ رہی تھی، گویا وہی اس پوری عمارت کا مالک تھا۔ دروازے پر موجود باوردی چوکیدار نے قدرے خم ہو کر دروازہ کھولا اور ادب سے ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔

پیٹر پر ہجوم ہال کمرے سے جونی کی حرکات کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اسٹور کا بیرونی دروازہ شیشے کا بنا ہوا تھا۔ اس لیے وہ اندر ہونے والی تمام کارروائی بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ جیسے ہی جونی حسب پروگرام کھڑکی کے سامنے والے کاؤنٹر پر پہنچا ایک مستعد سیلز مین لپک کر اس کے سامنے پہنچ گیا۔ یہ دیکھ کر پیٹر نے اطمینان کا سانس لیا کہ کھڑکی کھلی ہوئی تھی پھر جیسے ہی سیلز مین نے جونی کے سامنے ہیروں کی ٹرے رکھی پیٹر ٹہلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ کاؤنٹر کے سامنے پہنچ کر وہ تھوڑا سا لڑکھڑایا اور دھڑام سے فرش پر گر گیا۔ ایک سیلز مین اور چوکیدار جلدی سے اس کی مدد کو پہنچ گئے۔ سیلز مین نے جھک کر پوچھا۔

"کیا بات ہے جناب! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہم...... میں ٹھیک ہے سانس...... اوہ ہاں میرا...... دم گھٹ رہا ہے۔" چوکیدار جلدی سے پانی کا گلاس بھر لایا۔ پیٹر نے رک رک کر پانی پی لیا پھر اس نے سر اٹھا کر آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھا اور بولا۔ "شاید میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی دل کی تکلیف ہو جاتی ہے۔ شکریہ!"

"ٹھہرے جناب میں آپ کے لیے کرسی لے آتا ہوں۔" ایک سیلز مین نے کہا۔ "شاید آپ خریداری کے لیے تشریف لائے تھے؟"

"شکریہ...... میرا خیال ہے کہ مجھے گھر جانا چاہیے۔" وہ کھڑا ہو گیا اور کوٹ جھاڑتا ہوا بولا۔ "آپ صاحبان کا بہت بہت شکریہ! میں پھر کسی وقت آ جاؤں گا۔"

یہ کہتا ہوا وہ دھیرے دھیرے دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ اس نے جونی کی طرف دیکھنے کی حماقت نہیں کی۔ تاہم اسے امید تھی کہ ہیرے حوض میں پہنچ چکے ہوں گے۔ لفٹ میں بیٹھ کر وہ نیچے آ گیا اور ٹہلتا ہوا فوارے کے قریب پہنچ گیا۔ حوض کے اردگرد دفتروں میں کام کرنے والی لڑکیاں بیٹھی لنچ کر رہی تھیں۔ ان کے چاہنے والے قریب کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ کچھ بابو لوگ ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ فوارے کا پانی چھینٹے اڑاتا ہوا واپس حوض میں گر رہا تھا۔ پیٹر کنارے کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ہیرے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن سوائے چھوٹے موٹے سکوں کے کچھ نظر نہ آیا۔ بہرحال یہ بات خوش کن تھی کہ باہر سے دیکھنے پر ہیرے نظر نہیں آ رہے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹا انتظار کرنے کے بعد وہ گھر چلا گیا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ پولیس جونی سے پوچھ گچھ کر رہی ہوگی۔ دو گھنٹے بعد جونی نے فون کیا۔

"سب ٹھیک ہو گیا ہے۔" اس نے بتایا۔ "پولیس کسی طرح چھوڑنے پر تیار نہ تھی لیکن ثبوت کے بغیر وہ روک بھی نہیں سکتے تھے۔"

"یہ بتاؤ کام ہو گیا کہ نہیں؟"

"بالکل ہو گیا۔" جونی نے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے کہ انہوں نے لنچ کے لیے مجھے وہاں روک لیا تھا۔ ایسے کرو، ایک گھنٹے کے بعد روبی اسنیک بار میں ملو۔ باقی باتیں وہیں پر ہوں گی۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں پولیس میرے پیچھے نہ لگی ہو۔"

ایک گھنٹے کے بعد دونوں روبی اسنیک بار میں اکٹھے

جونی نے پیٹر کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "...ت معاملہ بخیر و خوبی انجام پا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ...ے کا اگلا حصہ بھی کامیابی کے ساتھ مکمل ہو جائے گا۔"

"پولیس کو تم نے کیا بتایا؟"

"میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے گمشدہ ہیروں ...بارے میں کچھ معلوم نہیں۔" جونی نے جواب دیا۔ "یہ ...ر ہے کہ میں نے ہیرے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی ...ن اس دوران اسٹور کے اندر کچھ گڑبڑ ہو گئی۔ بس ...دوسرے لوگوں کے ساتھ میں بھی حقیقت حال سے آگاہ ...ہونے کے لیے ادھر چلا گیا۔ میرے علاوہ اسٹور کے اندر ...ایک اور تھے۔ پولیس والے کسی ایک شخص پر بھی شک کا اظہار نہیں کر سکے۔ پھر وہ ہم پانچوں کو ایکسرے کے لیے ...لوا کر لے گئے۔ وہ اس بات کی تسلی کرنا چاہتے تھے کہ کسی نے ہیرے نگل تو نہیں لیے۔"

"میں بھی حیران تھا کہ اتنی دیر کہاں لگ گئی۔" پیٹر نے کہا۔

"خوش قسمتی سے مجھے سب سے پہلے رخصت کر دیا گیا۔" جونی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "دوسرے ...لوگوں کا رویہ کچھ زیادہ ہی مشکوک تھا۔ غالباً وہ گھبرا گئے تھے بلکہ ایک نے تو کسی زمانے میں کار چوری کی تھی۔ یہ ...ت ریکارڈ سے نکل آئی۔ پولیس والے یہ سمجھے کہ جو شخص کار ...چوری کر سکتا ہے، وہ ہیرے بھی چرا سکتا ہے...... احمق کہیں کے۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے اچھی طرح میری طرف دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی۔"

"میرے متعلق کسی نے شبہے کا اظہار تو نہیں کیا؟" پیٹر نے پوچھا۔ "میں نے چونکہ گڑبڑ پھیلائی تھی اس لیے ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ میں نے ...البتہ یہ حرکت کی تھی۔"

"تمہارا کسی کو خیال بھی نہیں آیا۔" جونی نے کہا۔ "آج رات ہیرے حوض سے نکال لیں گے اور ایک دو روز کے بعد یہ شہر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔"

"ہیروں کی تعداد کتنی تھی؟"

"پانچ۔" جونی نے کہا۔ "پانچوں بڑھیا کوالٹی کے تھے۔"

شام کے اخبارات نے اس "پراسرار ڈکیتی" کی تصدیق کر دی۔ انہوں نے ہیروں کی قیمت کا تخمینہ پینسٹھ ہزار ڈالرز لگایا تھا آخر میں اس بات پر اظہار افسوس کیا گیا تھا کہ پولیس مجرم کا سراغ لگانے میں ناکام رہی ہے۔

آدھی رات کے قریب دونوں حوض پر پہنچ گئے لیکن پیٹر جلد بازی کے حق میں نہیں تھا۔

"دوست جلد بازی میں بنا بنایا کھیل بگڑ سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے تمہاری نگرانی کی جا رہی ہو۔ اس لیے ایک روز انتظار کر لینا اچھا ہے۔ ہیرے بہرحال محفوظ ہیں۔"

جونی راضی ہو گیا اور دونوں واپس چلے گئے۔ اگلے روز ہیروں کی چوری کی خبر پرانی ہو گئی۔ بلکہ اس کی جگہ بینک میں ہونے والی ایک ڈکیتی نے لے لی۔

اگلی رات دونوں تقریباً تین بجے حوض کے کنارے پہنچ گئے۔ جونی ٹارچ لے کر کنارے پر بیٹھ گیا اور پیٹر جوتے اتار کر اور پتلون کے پائنچے چڑھا کر حوض میں اتر گیا۔ فوارہ رات کو بند کر دیا جاتا تھا اس لیے حوض کے اندر گھسنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ پیٹر نے دو ہیرے تو اندر جاتے ہی ڈھونڈ لیے۔ پھر تقریباً دس منٹ کے بعد تیسرا ہیرا بھی مل گیا۔

"میرا خیال ہے کہ تین ہی کافی ہیں۔" پیٹر نے کہا۔ "اب ہمیں چلے جانا چاہیے۔"

"نہیں، نہیں۔" جونی نے کہا۔ "جلدی نہیں کرو۔ دو ہیروں کی قیمت کم از کم پچیس ہزار ڈالرز تو ضرور ہوگی۔ ذرا اچھی طرح تلاش کرو۔"

پیٹر پھر تلاش کرنے لگا۔ دفعتاً دونوں ایک تیز روشنی میں نہا گئے۔ "خبردار!" ایک آواز سنائی دی۔ "اپنی جگہ پر کھڑے رہو۔ کوئی حرکت نہیں کرنا۔ ہم پولیس افسر ہیں۔"

"لعنت ہو تمہاری پولیس افسری پر۔" جونی نے ٹارچ پھینک کر کہا اور بھاگنے کی کوشش کرنے لگا لیکن دو پولیس افسر اسکواڈ کار سے نکل کر ان کے سروں پر پہنچ چکے تھے بلکہ ایک نے پستول بھی نکال لیا تھا۔ جونی نے بھاگنے کا ارادہ ترک کر دیا اور خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ پیٹر نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے اور خاموشی سے باہر نکل کر بولا۔

"آخر تم لوگوں نے ہمیں دھر ہی لیا؟"

"بالکل دھر لیا۔" پستول بردار آفیسر گرجا۔ "تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ حوض کے اندر پائے جانے والے سکے براہ خیراتی فنڈ میں دیے جاتے ہیں۔ ان کو چرانا نہایت ہی گھٹیا حرکت ہے۔ مجھے امید ہے کہ مجسٹریٹ تم دونوں کو کم از کم تین تین مہینے کی سزائے قید دے گا۔ اب ذرا کار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو جاؤ تا کہ تم دونوں کی تلاشی لی جائے۔"

دشتِ امکاں

عائشہ فاطمہ

محبت میں بچھڑ کر ملنا... مل کر بچھڑنا اگرچہ چاہنے والوں کی روایت سہی مگر کبھی کبھی ایسی دل لگی اتنی کٹھن آزمائش تخلیق کرتی ہے کہ "ہمارے ہجر کے قصے سمیٹو گے تو لکھو گے... ہزاروں بار سوچو گے ہمیں تحریر کرنے تک" کی کھلی تفسیر بن جاتی ہے... وہ جو کبھی دھوپ، کبھی چھاؤں بن کر نظروں سے اوجھل ہو جاتا اور چھپ چھپ کر اپنے چاہنے والوں کے تڑپنے کا تماشا دیکھتا، وہ جو رشتے آزما کر لطف اٹھانے کا عادی تھا کہ اچانک وقت کی گرد و غبار نے اسے ایسے ڈھانک لیا کہ کوئی بستی بستی صحرا صحرا ڈھونڈتا ہی رہ گیا مگر... وہ تو جانے وقت کے سورج تلے سائے میں ڈھل گیا تھا یا راتوں کے اندھیروں میں گم ہو گیا کہ اس کی پرچھائی تک کسی کو نہ ملی... ایسے دھندلے تصور کے ساتھ بھلا کوئی کیسے جیون گزارنے کے سپنے دیکھ سکتا ہے مگر... کسی نے ایسا سپنا دیکھنے کی غلطی کر ڈالی تھی اور پھر... "انداز بیاں کچھ ایسا تھا، ہر دل پہ اثر ہو جاتا تھا... اب چپ کا گہرا ساگر ہوں وہ شعلہ بیانی بھول گئی..." کا عکس بن کر رہ گئی۔ جس کے آگے لفظ ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے، زندگی کے اس موڑ پر اپنا دکھ بیان کرنے کے قابل بھی نہ رہی۔ بس یہی زندگی کی حکایت ہے اور حقیقت بھی یہی کہ تقدیر کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتی، جس کی جھولی میں جو ڈالنا ہو بڑی شان سے ڈال دیتی ہے... چاہے خوشی ہو یا غم۔

وہ کسی مملکت کی ملکہ نہ سہی لیکن نام کی ملکہ ضرور تھی بلکہ اگر آنکھوں کی پتلیاں ذرا پھیلا کر دیکھو تو اس کی ایک مملکت بھی تھی۔ اس کی فوجیں اس کے الفاظ تھے جو اس کے سامنے صفیں بنائے، ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے، جس لفظ کو آواز دیتی، وہ تسلیمات بجا لاتا۔ کوئی بڑا معرکہ ہوتا تو لفظوں کا لشکر لے کر نکلتی اور غنیم کے قلعے مسمار کر کے پلٹتی۔ یہی الفاظ تھے جن کے سہارے وہ اپنی حدودِ سلطنت میں برابر اضافے کرتی جا رہی تھی۔

اس کا کمرا ٹرافیوں سے بھر گیا تھا۔ نمائش کا شوق نہیں تھا لیکن صحافیوں کو اس سے ملنے کا شوق ہو گیا تھا۔ نہ نہ کرتے کرتے بھی کئی بڑے اخباروں میں اس کے کارناموں کی تفصیل آب و تاب سے شائع ہوئی تھی، حالانکہ اسے یہ تاب نہیں تھی کہ کوئی اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرے۔ نام ہی ایسا تھا کہ مزاج خودبخود شاہانہ ہو گیا تھا۔ زمین پر پاؤں اس طرح رکھتی تھی جیسے احاطۂ زمین اس نے فتح کر لیا ہو۔ کچھ لوگ اسے اس کا غرور کہتے تھے لیکن دراصل یہ اس کے اکلوتی ہونے کا فخر تھا یا پھر اس پٹھان خون کا ابال تھا جو اس کی رگوں میں گردش کرتا رہتا تھا۔ اس کے والد اکثر کہا کرتے تھے کہ عام انسانوں کی رگوں میں لہو دوڑتا ہے، پٹھان کی رگوں میں لہو اچھلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک نامی گرامی وکیل ہونے کے باوجود کروڑوں میں کبھی نہیں کھیلے۔ جب ملکہ چھوٹی تھی، اس کے ساتھ کھیلتے تھے۔ کلب جاتے تھے اور دوستوں کے ساتھ برج کھیلتے تھے۔ کھیلنے کی فرصت اس لیے مل جاتی تھی کہ وہ مہینوں برسوں میں کوئی ایک کیس اپنے ہاتھ میں لیتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ وہ کاہل یا نااہل تھے بلکہ اس لیے کہ کوئی جھوٹا کیس لینے کے روادار نہیں تھے۔ پہلے خود تحقیق کرتے تھے کہ ان کے پاس کیس لانے والا سچا ہے یا جھوٹا؟ ایسی جرح کرتے تھے کہ اکثر انہیں وکیل بنانے سے پہلے ہی بھاگ جاتے تھے لیکن جو ہمت کر کے ڈٹا رہتا تھا، اس کی کامیابی یقینی تھی۔ جب انہیں یقین ہو جاتا کہ کیس لانے والا سچا ہے تو پھر فیس کی پروا نہیں کرتے تھے۔ جتنے پیسے جو دیتا، رکھ لیتے۔

ان تمام تر کوتاہیوں کے باوجود انہوں نے اتنا کر لیا تھا کہ شہر کے ایک بارونق علاقے میں شاندار مکان بنوا لیا تھا۔ پہلے ایک گاڑی تھی لیکن جب ملکہ کالج جانے لگی تو اس کے لیے الگ

گاڑی ہوگئی۔

اس کی والدہ اپنے دورِ طالب علمی کی بہترین مقررہ تھیں۔ شاید یہ انہی کے دودھ کا اثر تھا، جو ملکہ کی تقریروں میں گھل مل گیا تھا۔ جب تک وہ اسکول میں تھی، اس کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس کے اندر ایک مقررہ چھپی ہوئی ہے۔ اسے بھی یوں معلوم ہوا کہ اسکول میں اکثر تقریری مقابلے ہوا کرتے تھے۔ وہ ان تقریروں کو غور سے سنتی تھی۔ پھر گھر آکر آئینے کے سامنے کھڑی ہوجاتی اور سنی ہوئی تقریروں میں اپنے خیالات شامل کرکے اس طرح دُہراتی کہ خود پر خود ہی واری ہوجاتی۔ اس کی ملکہ دل ہی دل میں اس سے مخاطب ہوتی "یہ سب تو گرجتے ہیں، برستا کوئی تم سے سیکھے۔ یہ کیا کہ اندھیرے کو اندھیرا کہہ لیا۔ لفظوں کی چاندی یوں بکھیرو کہ اندھیرے کی کوکھ سے دن پھوٹے۔" لفظ بھی تو دوستوں کی طرح ہوتے ہیں اور دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا۔ ہم دوستوں کا انتخاب تو کرتے ہیں، لفظوں کا انتخاب نہیں کرتے۔ دلائل تو ناتراشیدہ ہیرا ہوتے ہیں جنہیں لفظوں سے تراشا جاتا ہے۔ جادو ایک حقیقت ہے لیکن اس کے لیے جادوگر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب بتاؤ جادو اہم ہوا یا جادوگر؟ لفظوں کی ترازو کے بغیر دلائل کا انبار اناج کے انبار سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اناج پر تو جانور بھی منہ مار لیتے ہیں۔ دلائل انسانوں سے خطاب کرتے ہیں۔ یہ خطاب مرصع نہ ہو تو گونگے کی پکار بن کر رہ جاتا ہے جو متوجہ تو کرتا ہے، مطلب نہیں سمجھا سکتا۔

اپنے قد سے بڑی باتیں سوچتے سوچتے وہ وقت آگیا جب وہ اسکول کی دیوار پھلانگ کر کالج کے دروازے میں داخل ہوگئی۔ اسکول اور کالج کے درمیان ایک سڑک کا فاصلہ تھا لیکن دراصل یہ دو زمانوں کے بیچ کا فاصلہ تھا۔ ملکہ اچانک نہ صرف بڑی ہوگئی تھی بلکہ پہلے سے زیادہ بااعتماد بھی۔

اس نے کالج میں ہونے والے ایک مباحثے کے لیے اپنا نام پیش کردیا۔ اپنے سوا کسی سے باتیں نہیں کی تھیں اور مباحثے کے لیے اپنا نام درج کرا رہی تھی۔

"اس سے پہلے کسی مقابلے میں حصہ لیا ہے؟"

"اسکول کے زمانے میں تقریریں کرتی رہی ہوں۔" ملکہ نے شاید زندگی میں پہلی مرتبہ جھوٹ بولا تھا۔

"اسکول اور کالج کا فرق جانتی ہو؟"

"منبر کوئی بھی ہو، کمال تو خطیب کا ہوتا ہے۔"

"بہت خوب!" مس نوشی نے کہا۔ "پھر تو ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ کمالِ خطیب کیا ہوتا ہے؟"

"اظہارِ کمال کے لیے اذنِ کلام کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"ہم تمہیں ایک موضوع دیتے ہیں، اس پر چند الفاظ بول کر دکھاؤ۔"

"مور جب اپنی دھن میں ناچتا ہے تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ جنگل کا جنگل اس کے ساتھ محوِ رقص ہوتا ہے، بہرحال آپ موضوع دیں، میں کوشش کروں گی۔"

"تمہیں معلوم ہے مباحثے میں قرارداد پیش کی جاتی ہے۔ اس کی حمایت میں بھی تقریریں کی جاتی ہیں اور مخالفت میں بھی۔"

"آپ کوئی بھی لڑکی میرے مقابل لے آئیں۔ وہ حمایت میں دلائل دے میں مخالفت کرلوں گی..... یا وہ مخالفت کرے، میں حمایت کرلوں گی۔"

"دونوں فرائض تم خود ہی انجام دو۔ حمایت بھی تم خود ہی کرو، مخالفت میں بھی تم ہی دلائل دو۔"

"میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔ چلنے کی سکت ہو تو دائیں بھی چلا جاسکتا ہے، بائیں بھی۔"

"آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل!" یہ تھی وہ قرارداد جو اس کے سامنے پیش کی گئی۔

ملکہ نے سوچنے کے لیے کچھ وقت طلب کیا اور پھر اس کی آواز نے خاموشی کے تاروں کو چھیڑا۔

"آنکھ کا کام دیکھنا ہے اور دل کا کام دیکھتے رہنا۔ جنابِ صدر! یہ قرارداد اس لیے ادھوری ہے کہ بعض حقیقتیں آنکھ سے نہیں، دل سے دیکھی جاتی ہیں یا آنکھوں کے رستے دل میں اتر جاتی ہیں۔ پھر ہم خود تماشا ہوتے ہیں، خود ہی تماشائی۔ آنکھ کی حیثیت ثانوی ہوجاتی ہے۔ فریقِ ثانی کی جسمانی موجودگی ضروری نہیں رہتی۔ محبوب اور محب کا فرق مٹ جاتا ہے۔ یہ لمحہ اس وقت آتا ہے جب محبت سے محبت ہوجائے۔ محبت کسی غرض کی محتاج نہیں ہوتی۔ وجودِ محبوب شرط ہو تو آنکھ پر تہمت۔ شرط مٹ جائے تو دل کے لیے نعمت۔ جذبہ یہ ہو تو پہاڑ کیا ذرہ بھی اوجھل نہیں ہوسکتا۔

آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل پر یقین کرنے والے وہ لوگ ہوسکتے ہیں جو غرض کے بندے ہیں، بدن کے پجاری ہیں۔ روح سے غافل ہیں، دنیاداروں میں شامل ہیں۔"

مس نوشی اور ان کے ساتھ بیٹھی ہوئی دوسری

نیاں ان پھولوں کو برستے ہوئے دیکھ رہی تھیں جو ملکہ کے لبوں سے ادا ہو رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں حیرت بھی تھی اور خوشی بھی لیکن ابھی تعریفی کلمات کا بے پناہ اظہار ان کی شان کے خلاف تھا۔

"ٹھیک ہے۔ اب اگر اس قرارداد کی حمایت کرنی ہو تو کیا کہو گی؟"

ملکہ نے ان کی آنکھوں میں جھانکا جیسے آئینہ دیکھ رہی ہو۔ پھر اس نے بولنا شروع کیا۔ "جنابِ صدر! فاصلے بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ چہرے دھندلا جاتے ہیں۔ جذبے سرد پڑ جاتے ہیں۔ ہاتھ چھوٹ جائیں تو ساتھ چھوٹ جاتے ہیں۔ زخم کتنا ہی گہرا ہو، وقت کے پاس ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے۔ زندگی سفر ہے، جو رکتا نہیں۔ ایک چہرے کی جگہ دوسرا چہرہ لے لیتا ہے۔ دل کی دیوار سے ایک تصویر اترتی ہے تو کچھ دن نشان ضرور رہتا ہے۔ ایک ٹیس سی ضرور اٹھتی ہے لیکن رفتہ رفتہ نشان مٹ جاتا ہے اور درد کم ہوجاتا ہے۔ کبھی بھولے بسرے یاد آجائے تو آجائے ورنہ راستہ سنسان پڑا رہتا ہے۔ پھر اس راستے پر کوئی اور مسافر آنکلتا ہے۔ آنکھ کا کام دیکھنا ہے، اسے دیکھتی ہے اور آنکھ تو وہی دیکھتی ہے جو سامنے ہو۔ اسی لیے تو کہتے ہیں "آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل" اگر یہ حقیقت نہ ہوتی تو یہ کبھی نہیں ہوتا کہ دو بچھڑنے والے جب اچانک ملتے ہیں تو وہی ہوتا ہے جو تیل کو ماچس دکھانے سے ہوتا ہے، یعنی دوری نے جس پہاڑ کو آنکھ سے اوجھل کردیا تھا، قربت نے اسے پھر موجود کردیا۔ میں اس قرارداد کی مکمل حمایت کرتی ہوں اور یقین رکھتی ہوں کہ دوری محبت کو کم کردیتی ہے۔"

اس مرتبہ تو مس نوشین بخل سے کام نہ لے سکیں۔ بھرپور داد بھی دی اور اپنی ہتھیلیوں کے کٹورے میں اس کا چہرہ رکھ کر اس کی پیشانی چوم لی۔

"تم واقعی باکمال ہو۔ اتنی سی عمر میں ایسے پختہ خیالات، الفاظ کا ایسا چناؤ، لہجے میں ایسا اعتماد۔ آؤ میں تمہیں میڈم سے ملواؤں۔"

مس نوشی کو اپنی دریافت پر اتنا ناز ہو رہا تھا کہ وہ اس ملکہ کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے میڈم کے کمرے کی طرف چل دیں۔ اس وقت ان کا وہی حال تھا جو کسی مصور کا اس وقت ہوتا ہے جب وہ کوئی شاہکار مکمل کرتا ہے۔

ملکہ کو اس کالج میں پڑھتے ہوئے ایک سال ہونے کو آرہا تھا۔ اس نے میڈم کو ایک دو بار دیکھا ضرور تھا لیکن ان کے کمرے میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ہوتا بھی کیسے، میڈم کے پاس جانے سے سزا کا تصور ابھرتا تھا۔ عام طور پر وہی لڑکیاں میڈم کے کمرے کی سیر کرتی تھیں جو شرارتوں کی بھیڑ میں کان سے نکالی جاتی تھیں۔

میڈم کے کمرے میں سرکش لڑکیوں کو سزا سنائی جاتی تھی مگر وہ اپنی قابلیت کا انعام وصول کرنے جارہی تھی۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے نہیں، کامیابی کے تمغے جڑے ہوئے تھے۔

"میڈم! یہ ملکہ ہیں۔"

"کیا، کیا ہے انہوں نے؟" میڈم نے چشمہ اپنی آنکھوں سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"میڈم! یہ ہمارے کالج کا اثاثہ ہیں مگر افسوس کہ ایک سال بعد دریافت ہوئی ہیں۔ میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہیں لہٰذا ایک سال بعد کسی میڈیکل کالج میں چلی جائیں گی۔"

"میں انہیں میڈیکل کالج میں جانے سے روک تو نہیں سکتی۔ مجھے تو یہ بتاؤ کہ انہوں نے ایسا کیا کارنامہ انجام دے دیا؟"

"میڈم، ایسی مقررہ میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔"

"کمال ہے، یہ آپ کہہ رہی ہیں جو خود اپنے زمانے میں ایک مایہ ناز مقررہ رہ چکی ہیں۔"

"میں اپنے تجربے کی روشنی میں ہی کہہ رہی ہوں۔ ہم اسے قائدِ ایوان، قائدِ حزبِ مخالف کچھ بھی بنا کر کہیں بھی کسی بھی مقابلے میں بھیج سکتے ہیں۔ اگر اسے آپ کی سرپرستی ملی تو ہمارا کالج اس لڑکی کے نام سے پہچانا جائے گا۔"

"مس نوشی، تم نے تو ہمارا اشتیاق بڑھا دیا۔" پھر وہ ملکہ سے مخاطب ہوئیں۔ "جس کرسی کے پاس تم کھڑی ہو اسے ڈائس تصور کرو اور اپنی شعلہ بیانی دکھاؤ۔"

"میڈم، آپ کوئی موضوع دیں۔"

"بھئی ہمارے ذہن میں تو اس وقت موضوع کوئی نہیں ہے۔ تم نے اتنی تقریریں کی ہوں گی، اپنی تیار کی ہوئی تقریر میں سے کوئی بھی سنا دو۔"

ملکہ کو دل ہی دل میں ہنسی آگئی۔ اس نے نہ کبھی کسی مقابلے میں حصہ لیا تھا، نہ کبھی کوئی تقریر تیار کی تھی۔ جو کچھ کتابوں میں پڑھا تھا، وہ محفوظ تھا یا فطری صلاحیت تھی جو چمک دکھاتی رہتی تھی۔

اس نے تقدیر کو موضوع بنایا اور بولنا شروع کیا۔ لگتا تھا بجلی کوندرہی ہے۔ دلائل کا سمندر ہے جو ٹھاٹیں ماررہا ہے۔ اشعار کی رنگینی، قرآن وحدیث کے حوالے، مفکرین کے اقوال۔ کیا نہیں تھا جو اس مختصر سے وقت میں اس نے میڈم کے حوالے نہیں کر دیا۔

میڈم کا کمرا تالیوں سے گونج اٹھا۔ میڈم نے بھی وہی کیا جو اس سے پہلے مس نوشی کر چکی تھیں۔ اپنی جگہ سے اٹھیں اور اس کی پیشانی پر مہرِ شفقت ثبت کر دی۔ "ماشا اللہ اللہ نظرِ بد سے بچائے۔"

ملکہ خوشی کے بوجھ سے گردن جھکائے کھڑی تھی لیکن مس نوشی کی گردن فخر سے بلند ہوگئی تھی۔ اپنی کامیابی کو میڈم کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے دیکھا تو حوصلے نے ایک اڑان اور بھری۔

"ملکہ، یہ تو تم نے تقدیر کے حق میں تقریر کی۔ اب ذرا اس کی مخالفت بھی کر ڈالو۔ میڈم کو بتاؤ کہ اصل چیز تدبیر ہوتی ہے نہ کہ تقدیر۔"

ملکہ نے اس مرتبہ سوچنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ مس نوشی کی زبان سے جملہ ادا بھی نہیں ہوا تھا کہ ملکہ نے لفظوں کے طشت میں دلائل کے موتی سجا دیے۔ پھر تو یہ عالم تھا، وہ کہے اور سنا کرے کوئی۔ بجلی پھر کوندی، بادل پھر گرجا، جادو پھر جاگا۔ سامعتیں پھر حیران ہوئیں۔ ہوش آیا تو وہ اس شعر پر تقریر ختم کر رہی تھی۔

میں سمجھتی ہوں کہ میرے پاؤں ہیں میرے نصیب
میں جدھر جاؤں وہی ہے فیصلہ تقدیر کا

میڈم کا کمرا ایک مرتبہ پھر جلسہ گاہ بن گیا۔ تالیوں نے شور مچایا۔ تعریفوں کے ہار ملکہ کے گلے میں آگئے۔ تعلیمی سال کے دوسرے سیشن کی نرم ونازک سی لڑکی، اس شان سے بیٹھی تھی جیسے کمرے میں اس کے سوا کوئی نہ ہو۔

"مس نوشین، آپ ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ یہ لڑکی ہمارے کالج کے لیے واقعی اثاثہ ہے۔ فی البدیہہ تقریر اور ایسی مرصع۔"

"میڈم، میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہا تھا۔"

"اچھا ملکہ، یہ بتاؤ....." میڈم نے پوچھا۔ "اب تک تم کتنے مقابلوں میں حصہ لے چکی ہو؟"

"اب تک میں نے صرف آئینے کے سامنے تقریریں کی ہیں، کسی مقابلے میں بھی حصہ نہیں لیا۔"

اس کا یہ کہنا تھا کہ سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ مس نوشی تو یوں چونک پڑیں جیسے ان کا جھوٹ پکڑا گیا ہو۔

"ملکہ، تم تو یہ کہہ رہی تھیں کہ اسکول کے مقابلوں میں حصہ لیتی رہی ہو؟"

"یہ نہ کہتی تو آپ میرا نام کبھی شامل نہ کرتیں.... ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں نے کبھی کسی مقابلے میں حصہ نہیں لیا۔ اس جھوٹ کے لیے معافی چاہتی ہوں۔ چاہیں تو میرا نام کاٹ دیں۔"

"یہ کہہ کر تو تم نے اور بھی حیران کر دیا۔ کبھی تقریر نہیں کی اور ایسی تقریر کرتی ہو!"

میڈم کی حیرانی نے ایک اور ہی رنگ اختیار کیا۔ انہیں ملکہ کے بارے میں جاننے کا شوق دامن گیر ہوا۔

"ملکہ، تمہارے بہن بھائیوں میں سے بھی کوئی مقرر ہے؟"

"میرا کوئی بہن بھائی نہیں، میں اکلوتی ہوں۔"

"تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟"

"وہ جی وکیل ہیں ہائی کورٹ کے۔"

"پھر تو یہ انہی کا اثر ہے جو تمہارے دلائل میں آیا ہے۔ گھر کے ماحول کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ کیا.... نام کیا ہے تمہارے والد کا؟"

"عباداللہ خاں۔"

"تمہاری والدہ بھی کہیں جاب وغیرہ کرتی ہیں؟"

"جی نہیں۔ وہ پڑھی لکھی تو ہیں لیکن میرے ابو عورتوں کی نوکری کے حق میں نہیں اس لیے....."

"اوہ، آئی سی!"

"اپنی امی سے کہنا کسی دن مجھ سے آکر ملیں۔"

"میری شکایت کریں گی؟" ملکہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں، تمہاری ڈھیر ساری تعریف کروں گی۔"

ملکہ نے ان کا شکریہ ادا کیا اور مس نوشی اسے وہاں سے لے کر اٹھ گئیں۔ اب کالج کی چھٹی کا وقت ہونے کو آیا تھا۔ وہ کچھ دیر مس نوشی کے کمرے میں جا کر بیٹھی رہی۔ اسے معلوم تھا کہ اب تک ڈرائیور اسے لینے آچکا ہوگا لہٰذا وہ کالج سے باہر نکل آئی۔

خوشیوں اور تعریفوں سے لدی پھندی وہ گھر پہنچی تو اس کا جی چاہا کہ اپنی خوشیوں میں ماں کو بھی شریک کرے۔ اکیلی تھی لہٰذا ہر کام میں ماں کو شریک کیا کرتی تھی۔ آتے ہی باتوں کا پنڈورا بکس کھول کر بیٹھ جاتی تھی۔ آج کالج میں یہ ہوا تھا، آج وہ ہوا تھا۔ اس کی والدہ بھی

بات کرنے کو ترستی تھیں لہٰذا ملکہ کے دم کو غنیمت سمجھتی تھیں۔ آج وہ دیکھ رہی تھیں کہ ملکہ چپ ہے۔ ملکہ یہ سوچ رہی تھی کہ ابھی بتانے کا کیا فائدہ۔ جب وہ کسی مقابلے میں شریک ہوگی اور انعام جیت کر لائے گی، اس دن ماں پر ظاہر کرے گی۔

"ملکہ، آج کیا کالج میں سب نے چپ کا روزہ رکھا ہوا تھا؟"

"کیا ہوا امی؟"

"آج کالج سے آکر تو نے کوئی بات ہی نہیں کی۔"

"آج کوئی اہم بات ہوئی ہی نہیں تو بتاتی کیا؟"

"یہی میں سوچ رہی تھی کہ آج تیری زبان کی قینچی میرے کان کیوں نہیں کتر رہی ہے۔"

ملکہ ہنس کر چپ ہوگئی۔ وہ کیا بتاتی کہ آج اس کی قینچی ایسی چلی ہے کہ بڑے بڑوں کے کان کتر دیے ہیں۔ اب میں نہیں میری باتیں آپ کو دوسرے سنائیں گے۔

اس کی ماں نے بھی فی الحال اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ انہیں معلوم تھا کہ اسے زیادہ چھیڑو تو منہ پھلا کر بیٹھ جاتی ہے۔ وہ بیٹھی تو ماں کے پاس تھی۔ یہاں بیٹھنے کو جی نہ چاہا تو اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ کچھ دیر اپنی کامیابیوں کے خوابوں سے کھیلتی رہی پھر نیند نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

اسے تو یوں لگا جیسے ابھی سوئی تھی، ابھی اٹھا دی گئی ہو۔ اس کی ماں اس کے سرہانے کھڑی اسے یوں بیدار کر رہی تھیں جیسے بہت جلدی میں ہوں۔ اس نے کروٹ بدلی لیکن جب کان کھینچنے کی نوبت آئی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیا ہے امی! آپ تو سونے بھی نہیں دیتیں ٹھیک سے۔"

"میں نہیں، جو آیا ہے اس کا حکم ہے کہ تمہیں اٹھا دیا جائے۔"

"پاپا یہ حرکت کبھی نہیں کر سکتے۔"

"پاپا نہیں، تمہاری پرنسپل آئی بیٹھی ہیں۔ نہ جانے کالج میں کیا کر کے آئی ہو کہ شکایت گھر تک پہنچ گئی ہے۔"

"امی! آپ کیا سمجھتی ہیں۔ میں نے ایسی ویسی کوئی حرکت کی ہوگی؟ میں کر سکتی ہوں؟"

"نہیں میری جان! تمہاری شکایت نہیں، تعریف گھر تک آئی ہے۔ تمہاری میڈم تمہاری اتنی تعریف کر رہی ہیں کہ میرا سر فخر سے بلند ہوگیا ہے۔ یہ تو میں بعد میں پوچھوں گی کہ تم نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی کیوں، فی الحال جلدی سے تیار ہو کر آجاؤ۔ تمہارے پاپا بھی بس آتے ہی ہوں گے۔"

"توبہ ہے، میڈم کو بھی اسی وقت آنا تھا۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی اور چپل گھسیٹی ہوئی واش روم کی طرف بڑھ گئی۔

کپڑے بدلتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اس سے ایسا کیا کارنامہ سرزد ہوگیا کہ میڈم سے صبر نہ ہوا اور ڈھونڈ ورا پیٹنے چلی آئیں۔ میرا تو سارا پلان ہی فیل کر دیا۔ میں امی کو اندھیرے میں رکھنا چاہتی تھی، انہوں نے سب کچھ بتا بھی دیا۔

وہ جھجکتی، ڈرتی، جھجکتی ڈرائنگ روم میں پہنچی تو میڈم کو براجمان دیکھا۔ شاگردوں کے لیے پرنسپل تو مافوق الفطرت ہستی ہوتی ہے۔ یہاں وہ عام سی عورت کی طرح اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھیں۔ اس نے ادب سے سلام کیا اور ایک طرف بیٹھنے لگی لیکن میڈم نے بلا کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ تعریفوں کے وہی پھول پھر نچھاور ہونے لگے جن کی مہک ابھی تک اس کی رگ رگ میں رچی ہوئی تھی۔ اب میڈم کے ساتھ اس کی والدہ بھی اس میں شریک تھیں۔

"میڈم، آپ تو کہہ رہی تھیں کہ میں امی کو آپ کے پاس بھیجوں، آپ خود ہی چلی آئیں۔"

"میں نے سوچا تمہاری امی کو تو جب فرصت ہوگی، تب آئیں گی اور مجھے تھی جلدی۔"

"چلیے اچھا ہوا آپ آگئیں مگر آپ کو ایڈریس کیسے معلوم ہوا؟"

"مجھے کیا نہیں معلوم ہے۔ اپنے پاپا کو آنے دو۔ وہ انکشاف کروں گی کہ تم بھی کہو گی مجھے کیا، کیا معلوم ہے۔"

ملکہ اور اس کی والدہ دونوں یہ سمجھے تھے کہ جو تعریفیں وہ اب تک کرتی رہی ہیں، ان میں کوئی اور اضافہ کر دیں گی اور کیا انکشاف ہو سکتا ہے۔

عباداللہ خاں کورٹ سے تو کب کے فارغ ہو چکے تھے۔ اپنے دفتر میں دوستوں کے ساتھ گپ شپ لڑا رہے تھے۔ بیوی کا فون پہنچا کہ ملکہ کی پرنسپل آئی بیٹھی ہیں اور ان کا انتظار ہو رہا ہے تو وہ بھی یہی سمجھے کہ ملکہ کی کوئی شکایت لائی ہوں گی۔ انہوں نے بیوی سے کہا بھی کہ وہ خود ہی بات کر لیں لیکن جب انہوں نے یہ کہا کہ وہ ان سے ملنے کی خواہش مند ہیں تو انہیں دوستوں سے اجازت لینی پڑی۔

گھر آئے تو کالے کوٹ ہی میں ڈرائنگ روم میں آگئے۔ میڈم انہیں دیکھ کر کھڑی ہوگئیں تو ملکہ کو تعجب بھی ہوا

اور فخر بھی کہ لوگ اس کے باپ کی کتنی عزت کرتے ہیں۔
میڈم نے بات تو ملکہ کی تعریف سے شروع کی لیکن صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہیں۔ پھر انہوں نے اچانک یہ سوال اٹھا دیا۔
''عباد بھائی، آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟''
''یہ بتا تو رہی تھیں کہ آپ ملکہ کی پرنسپل ہیں۔''
''اس کے علاوہ آپ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے؟''
''محترمہ، میں آپ سے آج پہلی بار مل رہا ہوں۔''
''جہاں تک مجھے یاد ہے آج سے پہلے بھی کئی بار مل چکے ہیں۔ بات پرانی ہو گئی اس لیے یاد نہیں ہوگا۔''
سب کے چہرے فق تھے کہ آخر ماجرا کیا ہے؟ ملکہ کبھی باپ کی طرف دیکھتی، کبھی میڈم کی طرف۔ یہی حال اس کی والدہ کا بھی تھا۔ ملکہ نے اپنے باپ کو پہلی مرتبہ گھبرائے ہوئے دیکھا تھا۔ بھری عدالت میں جرح کرنے والا، لاجواب نظر آ رہا تھا۔
میڈم اس عقدے کے حل کی طرف بڑھیں ''میرا نام شہناز آفریدی ہے۔''
''آپ کا نام تو میں اپنی بیٹی ملکہ سے بھی پوچھ سکتا تھا۔ آپ یہ کون سی نئی بات بتا رہی ہیں۔''
''آگے تو سنیے۔'' میڈم نے کہا ''آپ کی والدہ کے ایک سوتیلے چچا تھے جنہیں سب چاچا بابو کہا کرتے تھے۔ شاید آپ کو بھی یاد ہوں۔''
''آپ انہیں کیسے جانتی ہیں؟''
''میری چھوڑیے، یہ بتائیے آپ کو یاد ہیں یا نہیں؟''
''جی یاد ہیں، آگے کہیے۔''
''وہ یاد ہیں تو ان کے بیٹے نعمت اللہ بھی یاد ہوں گے۔''
''وہ بھی یاد ہیں کیونکہ وہ تو رہتے ہی ہمارے گھر کے ایک حصے میں تھے مگر آپ کو یہ سب داستان کس نے سنا دی؟''
''عباد بھائی، اب آگے بھی تو سنیے۔'' میڈم اس وقت بالکل بچی لگ رہی تھیں ''آپ کے انہی نعمت ماموں کی ایک لڑکی بھی جس سے آپ کی خوب بنتی تھی۔ اپنی اماں کے منع کرنے کے باوجود آپ اس کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔''
عباد اللہ خاں کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا تھا۔ وہ خوف زدہ آنکھوں سے میڈم کی جانب دیکھ رہے تھے جیسے ان کا کوئی راز کھلنے والا ہو، جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔
میڈم کی کہانی سفر میں تھی۔ ''پھر یاد ہے..... نعمت ماموں کا انتقال ہو گیا تھا۔ چاچا بابو پہلے ہی انتقال کر چکے تھے۔ اب نعمت ماموں کی بیوہ کا اس گھر میں کوئی نہیں رہ گیا تھا۔ آپ کی والدہ اس بیوہ سے پہلے ہی خوش نہیں تھیں، اب ستانے کا موقع مل گیا۔ وہ بیوہ اس لڑکی کو لے کر اپنے بھائی کے گھر منتقل ہو گئیں۔ اس بچی کا نام شہناز تھا اور وہ میں ہوں..... عباد بھائی!''
''تم..... وہ شہناز ہو، نعمت ماموں کی بیٹی.....
میڈم شہناز!'' عباد اللہ خاں اپنی جگہ سے اٹھے۔ میڈم بھی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔ عباد اللہ خاں نے آگے بڑھ کر انہیں گلے سے لگا لیا۔ دونوں کی آنکھیں نم تھیں۔ الگ ہوئے تو عباد اللہ خاں نے ان کے سر پر ہلکی سی چپت رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں تو خیر معلوم ہی نہیں تھا کہ تم کہاں گئیں لیکن تم نے بھی ملنے کی زحمت نہیں کی۔ اسی شہر میں ہو، مجھ سے یقیناً واقف بھی ہو گی۔ پھر آج سے پہلے کیوں نہیں آ گئیں؟''
''آپ ہی ڈھونڈ لیتے۔''
''میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ تمہارے چلے جانے کے بعد ابا نے وہ مکان بیچ دیا اور ہم بہن بھائیوں کے بہتر مستقبل کے لیے یہاں آ گئے۔ بچپن کے کھلونے، دوست احباب یاد تو بہت آتے ہیں لیکن بہت دور ہو جاتے ہیں۔ کچھ دن تم لوگ بہت یاد آئے پھر مصروفیات نے کچھ سوچنے ہی نہیں دیا۔ تم نے کمال کر دیا، مجھے یاد رکھا۔ پہچان بھی لیا اور یہاں تک چلی آئیں۔ یہ سب ہوا کیسے، کیا جاسوس پیچھے لگائے ہوئے تھے۔''
''قصہ یہ ہے کہ کچھ دن پہلے آپ کا انٹرویو کسی اخبار میں شائع ہوا تھا۔ بس یہ انٹرویو میرے لیے تلاش گم شدہ کا اشتہار ثابت ہوا۔ آپ نے اس میں کچھ ایسی باتیں کہہ دی تھیں کہ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ آپ ہی ہیں جو ایڈووکیٹ بنے گھوم رہے ہیں۔''
''بندی خدا کی، جب سراغ مل ہی گیا تھا تو آ کر مل لیتیں۔''
''بس ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی کہ نہ جانے آپ کس طرح ملیں۔ آپ کا جو تصور ذہن میں تھا، میں اس کو قائم رکھنا چاہتی تھی۔ ملکہ سے ملاقات ہوئی، اس کی ولدیت

معلوم ہوئی تو نہ جانے کیوں اس میں مجھے آپ کی جھلک دکھائی دی۔ غور کیا تو وہی نقش و نگار تھے۔ میں نے سوچا یہ لے لیا جائے، چل کر دیکھا تو جائے، یہ وہی عباد اللہ ہیں یا کوئی اور۔ اگر وہی عباد اللہ ہوئے تو ٹھیک ورنہ میرے پاس بہانہ تو ہے، میں تو اپنی اسٹوڈنٹ کے گھر آئی ہوں۔''
کچھ دیر کے لیے ماحول اتنا جذباتی ہو گیا تھا کہ سب کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں لیکن میڈم کو باتوں میں الجھانے کا طریقہ آتا تھا۔ انہوں نے کچھ ایسی باتیں چھیڑ دیں کہ کچھ دیر کے لیے سب کے چہرے گلنار ہو گئے۔ سب سے زیادہ خوشی ملکہ کو ہو رہی تھی۔ میڈم کا رعب پورے کالج پہ تھا لیکن اس وقت وہ کوئی دوسری ہی خاتون معلوم ہو رہی تھیں۔ ملکہ کو سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ وہ اس کی رشتے دار نکلیں۔
باتوں باتوں میں اور بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ ان کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا۔ دو بچے تھے، ایک بیٹی ایک بیٹا۔ بیٹی اپنے گھر کی ہو چکی تھی، بیٹا امریکا میں زیر تعلیم تھا۔ میڈم اکیلے فلیٹ میں تنہا زندگی گزار رہی تھیں۔

☆☆☆

ہاتھ میں ٹرافی کیا آئی، آنسوؤں کو بہانہ مل گیا۔ کالج کے باہر کا مقابلہ تھا۔ شہر بھر کے نامی گرامی مقرر شریک تھے اور اس نے پہلا انعام حاصل کر لیا تھا۔ مس لوشی اسے لپٹائے کھڑی تھیں اور وہ تھی کہ روئے جا رہی تھی۔
''اتنے قیمتی موتی یوں مت لٹاؤ۔''
''مس، یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ میں.....'' اس کی ہچکی بندھ گئی۔
''تم اس کی حق دار تھیں۔ تقریر کے دوران ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ٹرافی تمہارے ہاتھ میں ہو گی۔''
وہ گھر پہنچی تو ماں کی مبارک باد نے اس کا استقبال کیا۔ ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگے ہوئے تھے۔ اس وقت وہ ملکہ کے روپ میں اپنا عکس دیکھ رہی تھیں۔
''ملکہ! تجھے پتا ہے، میں بھی اپنے طالب علمی کے زمانے میں ان مقابلوں میں حصہ لیا کرتی تھی اور ہمیشہ اول آتی تھی۔ میں ناقابل شکست تصور کی جاتی تھی۔''
''ارے واہ امی، آپ تو بڑی چھپی رستم ہیں۔ آپ نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔ آپ تو مجھے ہر بات بتاتی ہیں، یہی بات چھپا گئیں۔''
''مجھے خود ابھی یاد آیا ہے۔ میں تو بھول بھال گئی تھی۔''
''کامیابی اور شکست کوئی نہیں بھولتا، آپ کیسے بھول گئیں؟''
''میں کامیابی بھول گئی، شکست یاد رہ گئی۔ اب اپنی شکست کا قصہ تجھے کیا سناتی؟''
''آپ تو ابھی کہہ رہی تھیں کہ آپ ناقابل شکست تھیں؟''
''شکست یوں ہوئی کہ تمہارے پاپا سے میری شادی ہو گئی۔ سارے شوق دھرے رہ گئے۔ اب تو یاد بھی نہیں کہ میں کیا تھی۔''
''یہ تو پاپا کی شکست ہوئی۔'' ملکہ نے کہا اور بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔
بیگم عباد اللہ اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لیے لیٹیں تو ارسلان ان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

ارسلان سے ان کی ملاقات ایک مقابلے کے دوران ہوئی تھی۔ وہ تقریر کرنے کے بعد تالیوں کی گونج میں اپنی جگہ آ کر بیٹھی تھیں کہ ارسلان کا نام پکارا گیا۔ انہوں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ نیلی آنکھوں، گورے رنگ کا ایک دراز قد لڑکا اپنی جگہ سے اٹھا اور پروقار چال چلتا ہوا اسٹیج پر پہنچ گیا۔ وہ لڑکا کچھ گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ چہرے کا رنگ بتا رہا تھا کہ وہ نروس ہے۔
ان کی تقریر کی گونج اب تک سنائی دے رہی تھی۔ ارسلان کی تقریر کے ابتدائی جملے ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ کسی نے توجہ بھی نہیں دی لیکن یہ کیا، اس نے ایک شعر پڑھا اور پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ وہ اسی موقعے کی تلاش میں تھا۔ سامعین کی توجہ ملتے ہی اس نے ایسے مضبوط دلائل دیے کہ سب کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیا۔ انہیں خود تعجب ہو رہا تھا کہ کیا تقریر اس طرح بھی کی جا سکتی ہے۔ یہ تعجب بھی ہو رہا تھا کہ ایسا عمدہ بولنے والا کسی مقابلے میں آج سے پہلے نظر کیوں نہیں آیا؟
وہ تقریر کر کے نیچے اترا تو یہ معلوم ہوتا تھا جیسے اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے گیا۔ اس کے بعد وہی ہوا جس کا انہیں اندیشہ تھا۔ نتائج کا اعلان ہوا تو انہیں دوسرا انعام ملا اور ارسلان پہلے انعام کا حق دار ٹھہرا تھا۔
یہ پہلا موقع تھا جب وہ پہلے نمبر سے دوسرے نمبر پر آ گئی تھیں۔ انہیں ایسا افسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی انعام ملا ہی نہ ہو۔ وہ بہت غصے میں تھیں لیکن اپنے جذبات پر قابو رکھنا

بھی ضروری تھا۔ پھر انہیں یاد آیا۔ وہ ریفریشمنٹ کی ٹیبل پر ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔" اس نے کہا تھا۔

"کیسی زیادتی؟"

"آپ کی تقریر مجھ سے اچھی تھی۔ پہلا انعام آپ کو ملنا چاہیے تھا۔"

"نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی تقریر مجھ سے اچھی تھی۔ منصفین ہم دونوں سے بہتر جانتے ہیں کہ کون بہتر ہے۔"

"منصفین غلطی بھی تو کر سکتے ہیں۔"

"غلطی ہوئی بھی ہے تو اسے زیادتی نہیں کہہ سکتے۔"

پھر کوئی درمیان میں آ گیا تھا۔ سلسلۂ کلام منقطع ہوا تو ارسلان کے پرستاروں نے اسے گھیر لیا۔ وہ بھی کسی اور سے معروف گفتگو ہو گئی تھیں۔

بات آئی گئی ہو گئی تھی۔ لیکن بعض باتیں گزر جانے کے لیے نہیں ہوتیں۔ ایک اور مقابلے میں ان کا سامنا ارسلان سے ہو گیا مگر اس دن عجیب ماجرا ہوا۔ بیگم عباداللہ اس سے پہلے ایک مقابلہ ہار چکی تھیں اس لیے خوب تیاری سے آئی تھیں۔ تقریر کو پڑھا بھی اس خوبصورتی سے کہ سب اش اش کر اٹھے۔ ارسلان کا نام آیا تو اس کے قدم ہی بتا رہے تھے کہ وہ کس ارادے سے جا رہا ہے۔ ڈھیلے ڈھالے قدموں سے چلتا ہوا اسٹیج تک پہنچا۔ تقریر بھی یوں کر رہا تھا جیسے لکھی ہوئی تحریر پڑھ رہا ہے۔ ایک آدھ جگہ بھول بھی گیا۔

اس نے پورا موقع دیا اور دوسرا انعام تو دور کی بات کسی بھی انعام کا مستحق نہیں ٹھہرا۔ مقابلہ ختم ہوا تو وہ اسے ڈھونڈتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئیں۔ تعارف تو ہو ہی چکا تھا۔ بات کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

"تمہارے پاس گاڑی ہے؟"

"نہیں۔" اس نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"کیسے جاؤ گے؟"

"کالج والوں نے ٹیکسی کا کرایہ دیا تھا۔"

"میرے ساتھ آ جیے۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ کہیں گی تو آپ کو بھی چھوڑ دوں گا۔"

بیگم عباداللہ کو اب تک یاد تھا کہ وہ دل میں بہت ہنسی تھیں۔ ارسلان کی بات کا جواب دیے بغیر وہ اپنی گاڑی تک پہنچ گئی تھیں۔ ڈرائیور نے دروازہ کھولا۔

"بیٹھیے۔"

"یہ آپ کی گاڑی ہے؟"

"ڈیڈی کی۔" انہوں نے ارسلان کو کچھ اور کہنے کا موقع ہی نہیں دیا اور اس کے ساتھ ہی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔

"ہوٹل اسٹار چلو۔" انہوں نے ڈرائیور کو حکم دیا۔

ہوٹل پہنچنے تک دونوں چپ بیٹھے رہے تھے۔ ہوٹل نزدیک ہی تھا لہٰذا کوئی ایسی زیادہ الجھن بھی نہیں ہوئی۔ ایک دو مرتبہ ارسلان نے پوچھا بھی کہ ہم ہوٹل کیوں جا رہے ہیں لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ ان سے اتنا مرعوب ہو چکا تھا کہ زیادہ زور دینے کی ہمت بھی نہیں ہوئی۔

ہوٹل پہنچنے کے بعد دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

"ارسلان، تم میرے مقابلے میں جان بوجھ کر کیوں ہار گئے؟"

"بھلا جان بوجھ کر بھی کوئی ہارتا ہے۔" ارسلان نے کہا لیکن صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

"بعض احمق ہوتے ہیں ایسے۔"

"میں آپ کو احمق دکھائی دیتا ہوں؟"

"بعض ہوتے ہیں مگر وہ دکھائی نہیں دیتے۔"

"بس، یہی لطیفہ سنانے کو یہاں لائی تھیں۔"

"ارسلان، میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ تمہارے ہارنے کا مجھے دکھ ہوا ہے۔ اس لیے پوچھ رہی ہوں۔ تم جان بوجھ کر کیوں ہارے؟"

"سچ بتاؤں؟"

"سچ ہی پوچھ رہی ہوں۔"

"سچ تو یہ ہے کہ آپ کا ہارنا مجھے گوارہ نہیں تھا۔"

"پوچھ سکتی ہوں، کیوں؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ بس میرا دل چاہ رہا تھا آپ خوش ہو جائیں۔ میں آپ کو اداس نہیں دیکھ سکتا تھا۔"

"وہی تو پوچھ رہی ہوں، کیوں؟"

"یہ بتانے کی نہیں سمجھنے کی بات ہے۔ اس جذبے کا جو بھی نام ہے، وہ آپ خود جانتی ہیں۔ میں اسے خود کوئی نام نہیں دے سکتا کہ میں آپ کے لائق نہیں۔"

"بس اور کار کے فرق کے سوا بھی کوئی فرق ہے؟"

"اس فرق کو آپ معمولی فرق سمجھتی ہیں؟"

"میں تو فرق ہی نہیں سمجھتی۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ

مجھ سے زیادہ ذہین ہو۔"

"آپ یہ کہتی ہیں تو میں یہ پوچھوں گا کہ کیا ہم کبھی بھی مل سکتے ہیں؟"

"میں تم سے بہت کچھ سیکھوں گی۔"

"میں آپ کو ایسے شاندار ہوٹل میں تو نہیں لا سکتا۔"

"پے منٹ میں کروں گی۔"

"یہ مجھے گوارہ نہیں ہوگا۔"

"میں کل برنس گارڈن میں آپ کا انتظار کروں گی۔"

ملاقات کا آغاز ہونا تھا کہ پھر یہ ملاقاتیں تواتر سے ہونے لگیں۔ آنکھ بھی یہیں تھی، پہاڑ بھی یہیں تھا۔ کوئی بھی کسی سے اوجھل نہیں ہوا۔ یہی قربت محبت میں تبدیل ہو گئی تھی۔

بیگم عباداللہ ماضی کی طرف چلتے ہوئے اس مقام تک پہنچی تھیں کہ ارسلان کا چہرہ دھندلا گیا۔ اس کی جگہ عباداللہ نے لے لی۔ عباداللہ ان کے والد کے دوست کے بیٹے تھے۔ ان کا رشتہ آیا تو فاخرہ (بیگم عباداللہ) کی جذباتی زندگی میں زلزلہ سا آ گیا۔ انہوں نے ماں کو اعتماد میں لیا لیکن بے سود۔ گھر میں باپ کا حکم چلتا تھا۔ ہزاروں کے مجمع میں تقریر کرنے والی باپ کے سامنے گونگی ہو گئی۔

آج ان کی بیٹی ٹرافی جیت کر لائی تو ان کا ماضی ان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ سیکڑوں اندیشے دل میں جاگ اٹھے۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھ گئے۔ "اے خدا! اس کا دامن اسی طرح کامیابیوں سے بھرا رہے۔ اس کا کرا لڑائیوں سے بچ جائے۔ وہ ہمیشہ جیت کر آئے۔ اس کی خاطر ہارنے والا کوئی نہ ہو۔ اس کی زندگی میں کوئی ارسلان نہ آئے۔"

☆☆☆

ملکہ سائنس کالج سے نکل کر میڈیکل کالج میں پہنچی تو جیسے شاخوں پر پھول آ گئے۔ وہ شہرت کی سواری پر سوار ہو کر آئی تھی۔ وہ کالج کے گیٹ میں داخل ہوئی تو مشتاق آنکھیں اسے اپنے ساتھ لے کر چلتی رہیں۔ کسی نے پہچان لیا، کسی نے پہچان کر دوسروں کو بتایا۔ اپنی اہمیت کا احساس تو اسے اس وقت ہوا جب کالج پہنچتے ہی پرنسپل نے اسے اپنے کمرے میں طلب کر لیا۔ وہ اسٹوڈنٹ تھی لیکن اس وقت مہمان خصوصی بنی پرنسپل کے سامنے بیٹھی تھی۔ پرنسپل کی ٹیبل ناشتے کی میز بنی ہوئی تھی۔ تمام اسٹاف بھی موجود تھا۔

"مس ملکہ، آپ نے یہاں داخلہ لیا اس پر آپ ہماری طرف سے شکریہ قبول کیجیے۔ ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔" پرنسپل نے اسٹاف کی طرف سے اس کا شکریہ ادا کیا۔

"میں بھی آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ میری اتنی پذیرائی کی جا رہی ہے۔"

"ہمیں امید ہے کہ آپ اولین ترجیح تو اپنی تعلیم کو دیں گی اور ملک کو ایک اچھی ڈاکٹر بن کر دکھائیں گی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنی صلاحیتوں سے کالج کا نام بھی روشن کریں گی۔ انتظامیہ آپ کے ساتھ پورا تعاون کرے گی۔"

حیرت انگیز بچہ

ایک یہودی عالم نے مجمع سے 3 سوال کیے مسلمانوں میں وسوسے ڈالنے کے لیے۔

1۔ اللہ ایک ہے تو اس سے پہلے بھی تو کوئی ہوگا؟

2۔ اگر اللہ ہے تو اس کا چہرہ کس طرف ہے؟

3۔ اللہ اس وقت کیا کر رہا ہے؟

مجمع میں سے ایک 9 سال کا بچہ اٹھا اور یہودی عالم سے کہا کہ گنتی گنو۔ 1,2,3,4,5,6,7

یہودی عالم نے گنتی گنی پھر لڑکے نے کہا۔ "اب اسے الٹا گنو۔"

"7,6,5,4,3,2,1" جب یہودی عالم نے ایک کہا تو لڑکے نے پوچھا۔ "ایک سے پہلے کیا آتا ہے؟"

یہودی بولا۔ "کچھ نہیں۔"

لڑکے نے جواب دیا۔ "تو بس اللہ ایک ہے اس کے بعد ہی سب کچھ آتا ہے، اس سے پہلے کچھ نہیں۔"

دوسرے سوال کے جواب میں بچے نے موم بتی منگوائی اور اس کو جلا کے کہا۔ "اس کی روشنی کا منہ کس طرف ہے؟"

یہودی عالم نے جواب دیا۔ "چاروں طرف۔"

لڑکا بولا۔ "اللہ نور ہے اس کا چہرہ ہر طرف ہے"

اور تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اللہ اس وقت 9 سال کے بچے سے یہودی عالم کو ذلیل کروا رہا ہے۔"

مرسلہ: محمد جاوید بلوچ، تحصیل علی پور، ضلع مظفر گڑھ

"میں کوشش کروں گی کہ آپ کی توقعات پر پوری اتر سکوں۔"

میڈیکل کالج تھا۔ لڑکے لڑکیاں انسانی اعضا اور ان کے فنکشن کے بارے میں رٹے لگاتے پھرتے تھے۔ ادبی ذوق سرے سے ناپید تھا۔ چند لڑکیاں تھیں جنھیں کچھ لگاؤ تھا۔ لڑکوں میں یہ بھی نہیں تھا۔ اسے اب احساس ہو رہا تھا کہ اس نے میڈیکل میں آکر غلطی کی۔ اسے تو ادب کی طرف آنا چاہیے تھا۔ اسے اپنے والد پر غصہ آرہا تھا جو اسے ڈاکٹر کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ والدین بھی خوب ہوتے ہیں۔ اپنے خواب اولاد کی آنکھوں میں ڈال دیتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ ان کے مشن کو ان کی اولاد پورا کرے۔ اولاد کیا چاہتی ہے، یہ بہت کم لوگ سوچتے ہوں گے۔ بڑوں کو تو یہ ناز ہوتا ہے کہ ہم بڑے ہیں لہٰذا جو سوچیں گے، بہتر سوچیں گے۔ ان خیالات نے بہت دن تک اس کا پیچھا کیا تھا۔ یہ ماحول تو رہا در کنار، یہ کتابیں تک اسے اپنی جانب متوجہ نہیں کر پا رہی تھیں جو اس کے نصاب میں شامل تھیں۔ چھ مہینے گزر چکے تھے اور اس نے کسی کتاب کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اسے تو بس یہ یاد تھا کہ اپنی صلاحیتوں سے کالج کا نام روشن کرنا ہے۔ جب بازار جاتی ایسی کتابیں خرید کر لے آتی جن سے اس کی جنرل نالج میں اضافہ ہو اور اس کی تقریروں کے لیے مواد جمع ہو سکے۔ اسے یقین ہونے لگا تھا کہ وہ ڈاکٹر کبھی نہیں بن سکتی۔ اس نے ضروری سمجھا کہ ماں سے بات کرے لیکن ماں نے تو پوری بات سنی بھی نہیں۔

"خبردار! اپنے پاپا سے یہ بات کہہ بھی مت دینا۔ وہ ابھی سے تمہیں ڈاکٹر تسلیم کر چکے ہیں۔ دن رات سوچتے رہتے ہیں کہ تمہارے لیے اسپتال کہاں بنائیں گے۔ اس میں کیا کیا چیزیں ہوں گی، وغیرہ وغیرہ۔ یہ خواب بکھرا تو وہ ٹوٹ جائیں گے۔ تمہیں ان کا دل رکھنا ہے۔"

"امی، میں جاہل رہ جانے کے لیے تو نہیں کہہ رہی ہوں۔ تعلیم کسی ایک شعبے تک تو محدود نہیں۔ میں اردو ادب میں ایم اے کر کے ڈاکٹریٹ کرلوں گی۔ ڈاکٹر تو اس وقت بھی کہلاؤں گی۔"

"اس پر تمہاری بحث ہی فضول ہے۔ تم ڈاکٹر بنو، انسانیت کی خدمت کرو۔ ذہین ہو، پڑھنے بیٹھو گی تو سب سمجھ میں آنے لگے گا۔ دلچسپی بھی ہو جائے گی۔ اور سچی بات یہ ہے کہ خود میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ تم ڈاکٹر بنو۔"

"مجھے معلوم ہے کہ آپ یہ نہیں چاہتیں لیکن میں سمجھوں گی آپ چاہتی ہیں۔ آپ لوگوں کو خوش دیکھنے کے لیے میں ڈاکٹر بن کر دکھاؤں گی۔"

"شاباش! میری بچی۔"

وہ نصاب کی کتابیں لے کر بیٹھی تو مشکلیں آسان ہوتی گئیں بلکہ کچھ دن بعد اب محسوس ہوا کہ ان کتابوں سے تو اسے مزید روشنی مل رہی ہے جو اس کی تقریروں کو روشن کردے گی۔ اس کے دلائل کو نئے زاویے نصیب ہوں گے۔

کالجوں میں بہار کا موسم اترا ہوا تھا۔ امتحانات قریب تھے اور امتحانوں سے پہلے جگہ جگہ ہفتۂ طلبہ کا انعقاد کیا جا رہا تھا۔ وہ ہر جگہ اپنے کالج کی نمائندگی کر رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پرنسپل کا کمرا اس کی لائی ہوئی ٹرافیوں سے بھر گیا۔ وہ جس مقابلے میں شریک ہوتی، اعلان سے پہلے ہی نتیجہ اس کے حق میں ہوتا۔ ناکامی تو بڑی بات، کبھی یہ بھی نہیں ہوا کہ وہ پہلے زینے سے دوسرے پر آجائے۔

ان مقابلوں کا اختتام ہوا اور کارروائیاں اخباروں میں شائع ہوئیں تو اخبارات اس کی تصویروں اور کارناموں سے بھر گئے۔

وہ میڈیکل کے دوسرے سال میں تھی کہ یونیورسٹی سے دعوت نامہ آیا۔ اس کے علاوہ کون تھا جو کالج کی نمائندگی کرتا، پرنسپل نے اس کا نام بھیج دیا۔

مقابلہ یونیورسٹی میں تھا اس لیے اہم بھی تھا اور مشکل بھی۔ یہ آل پاکستان مقابلہ تھا لہٰذا پورے ملک کے بولنے والوں کے سامنے بولنا مذاق نہیں تھا۔ وہ کمرا بند کر کے بیٹھ گئی۔ نہایت عرق ریزی سے تقریر تیار کی اور پھر آئینے کو اپنا سامع بنا کر مشق کرتی رہی۔ یہ پہلا موقع تھا جب اس نے اپنی والدہ کو بھی شریک کیا۔ انہیں مختلف انداز سے تقریر پڑھ پڑھ کر سناتی رہی۔

جب ہر طرح سے مطمئن ہوگئی اور مقابلے کا دن آیا تو وہ یونیورسٹی پہنچ گئی۔ یونیورسٹی کا آسمان طرح طرح کے ستاروں سے آباد تھا۔ کس میں کتنی روشنی ہے، یہ کچھ دیر بعد معلوم ہونے والا تھا۔ مقررین کے لیے الگ نشستوں کا انتظام تھا۔ ہر کرسی پر مقرر کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس نے اپنی کرسی تلاش کی اور بیٹھ گئی۔ اس کے برابر والی کرسی پر ایک لڑکا آکر بیٹھا جو اس کے لیے اجنبی تھا۔ اس سے پہلے اس نے کسی مقابلے میں اسے نہیں دیکھا تھا۔ صاف ظاہر تھا وہ کسی دوسرے شہر سے آیا ہے۔ اس نے سوچا کہ وہ اس سے معلوم کرے لیکن تعارف نہیں تھا اس لیے جھجک کر

رہ گئی۔ اس نے سوچا، یہاں تو بہت سے چہرے اجنبی ہیں۔ کس کس سے معلوم کرتی پھرے گی۔ جب نام اناؤنس ہوگا تو شہر کا نام بھی پکارا جائے گا۔ خود معلوم ہو جائے گا کہ کون کہاں سے آیا ہے؟

مقابلے کا آغاز ہوا۔ چند ابتدائی تقریروں کے بعد وہ گرما گرمی ہوئی کہ پنڈال میدان جنگ بن گیا۔ ایک سے ایک اچھی تقریر سنائی دے رہی تھی۔ ایک تقریر پر تو ملکہ کو یہ گمان ہونے لگا کہ اس کی تقریر پٹ جائے گی مگر اس میدان میں وہ نئی نہیں تھی کہ گھبرا جاتی۔ اس نے حوصلہ کیا۔ پچھلی کامیابیوں پر غور کیا اور جم کر بیٹھی رہی۔ آنے والا مقرر تقریر ختم کر کے جا چکا تھا۔ تالیوں کا طوفان تھا کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اسی شور میں ایک نام پکارا گیا جسے وہ سن بھی نہیں سکی۔ جب برابر والا لڑکا اٹھ کر جانے لگا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا نام پکارا گیا ہے۔ اس نے اس کی کرسی کی پشت پر دیکھا۔ اس کا نام کاشف رحمٰن تھا۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی کہ دیکھیے، محترم کیا کارنامہ انجام دیتے ہیں۔

کاشف نے تقریر کا آغاز ہی ایک لاجواب شعر سے کیا۔ ایسے مقابلوں میں عموماً سنے سنائے شعر سنائے جاتے ہیں لیکن اس نے جو شعر سنایا وہ بالکل نیا تھا۔ حسب حال بھی ایسا کہ تالیاں بج اٹھیں۔

اس شعر نے ایسا تاثر پیدا کیا کہ ابتدا ہی میں تالیاں بج اٹھیں۔ جب اس نے تقریر شروع کی تو ملکہ کے تجربے نے سمجھ لیا کہ وہ کس پائے کا مقرر ہے۔ لفظوں کی بندش، فقروں کی چستی، دلائل کا زور، رنگینی اشعار کا شور۔ ایک مکمل تقریر تھی۔ نہ کہیں جھول تھا نہ وقت گزاری۔ لہجہ بھی ایسا کہ میں صدقے، میں واری۔ ملکہ نے ترچھی نظروں سے منصفین کو دیکھا کہ شاید ان کے تاثرات سے کچھ اندازہ ہو سکے۔

وہ تقریر ختم کرنے کے بعد جب تک اپنی نشست پر نہیں آگیا، تالیاں بجتی رہیں۔ وہ اسے مبارک باد دینے کے لیے لب کھولنے کو تھی کہ اس کا نام پکار لیا گیا۔ وہ یوں لگی کہ جیسے ذرا دیر لگائی تو کاشف کے نام کی تالیاں دوبارہ بجنے لگیں گی۔

اتنی اچھی تقریر کے بعد کسی کو بھی بلایا جاتا تو اس کی آواز ہوا میں تحلیل ہو جاتی لیکن اس وقت وہ اپنی شہرت کی فصل کاٹ رہی تھی۔ وہ کسی کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ اس کے بولنے سے پہلے ہی اس کے حق میں تالیوں کا شور بلند ہو گیا۔

بڑی مشکل سے یہ طوفان تھما اور پنڈال میں سناٹا ہو گیا۔ اس سناٹے کو ملکہ نے مزید گہرا کر دیا جب اس نے اپنی تقریر کا آغاز قرآن کی ایک آیت سے کیا۔ ایک طرف اس کی خوش الحانی، دوسری جانب اس آیت کے ترجمے کا موضوع پر چسپاں ہونا۔ دنیا کی سب سے بڑی کتاب کی سب سے بڑی دلیل اس نے پیش کر دی۔ اس کے بعد ایک حدیث پیش کی پھر فارسی کا ایک شعر پڑھا، پھر ایک انگریز مفکر کا قول نہایت شائستہ لب و لہجے میں سنایا۔ اب اس کے اعتماد نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ اب عالم یہ تھا کہ جب چاہتی تالی بجواتی، جب چاہتی سناٹا کر دیتی۔ پورا پنڈال اس کے حکم پر چلنے پر مجبور تھا۔

اس کی تقریر ختم ہوئی تو گویا مقابلہ ختم ہو گیا۔ اب کسی کو سننے کو کوئی تیار نہیں تھا۔ اگلا مقرر آیا ضرور لیکن اس کی آدھی تقریر شور و غل میں گزر گئی۔

وہ اپنی نشست پر واپس آئی تو اس کے برابر کی کرسی خالی پڑی تھی ورنہ وہ تو یہ سوچ کر آئی تھی کہ اتنی اچھی تقریر پر وہ اسے مبارک باد ضرور دے گا۔ نہ جانے کاشف نامی اس لڑکے سے اسے اتنی دلچسپی کیوں ہو رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ بھی اس کی طرح باصلاحیت تھا۔

مقابلے کا آخری شریک تقریر کر رہا تھا۔ کاشف ابھی تک غائب تھا۔ مقابلہ ختم ہوا۔ اب نتیجے کا انتظار تھا۔ اسٹیج سے اچانک ایک اعلان ہوا۔

"منصفین حضرات نتیجہ مرتب کر رہے ہیں۔ آیئے اس وقت تک ہم اپنے مہمان مقرر کاشف رحمٰن سے ان کا کلام سنتے ہیں۔ کاشف رحمٰن صرف اچھے مقرر ہی نہیں، نہایت اچھے شاعر بھی ہیں۔"

وہ اسی لاابالی انداز سے اسٹیج پر آیا۔ وہ خود چپ تھا، اس کی آنکھیں باتیں کر رہی تھیں۔ خطاب ملکہ سے تھا جیسے کہہ رہی ہوں 'یہ نظم تمہاری نذر ہے' پھر اس نے سب کو بتا بھی دیا۔

"ایک نظم اس اجنبی کے نام جس کے لیے میں ابھی اجنبی ہوں۔"

میں عجیب اجنبی ہوں
کہ وہ جانتی ہے مجھ کو
میں عجیب اجنبی ہوں
وہ قریب میرے بیٹھی
میں عجیب اجنبی ہوں

کہ اسی کی آنکھ بن کر
اسے دیکھتا رہا ہوں
یہ یقین ہے کہ اک دن
تجھے دیکھ کر کہے گی
تم عجیب اجنبی ہو
کہ میں جانتی ہوں تم کو
مرے ساتھ ساتھ چل کر
یہ سفر کیا ہے پورا
یہ سفر کہ جس سے بچ کر
میں چلوں تو چل نہ پاؤں
میں رکوں تو رک نہ پاؤں
مرے ساتھ ساتھ چلنا
مرے ساتھ ساتھ رہنا
تم عجیب اجنبی ہو
کہ میں جانتی ہوں تم کو۔

ملکہ کو بجا طور پر یہ خوش فہمی ہو رہی تھی کہ کاشف یہ نظم اسی کے لیے پڑھ رہا ہے۔ وہ اجنبی ہے اور میں ہی اس کے قریب پہنچی ہوں۔ اس کے بعد جو کچھ اس نے کہا، وہ اس کی شاعرانہ قلابازیاں تھیں۔ شاعروں کو یہی سہولت تو حاصل ہے کہ جس کی شان میں چاہیں قصیدہ پڑھ دیں۔ بہر حال ملکہ کو یہ موقع مل گیا تھا کہ وہ اس کی تقریر کے ساتھ ساتھ اس کی نظم کی بھی تعریف کر سکے۔

کاشف نے ایک مرتبہ پھر اسے یہ موقع نہیں دیا اور اسٹیج سے اتر کر کہیں اور غائب ہو گیا۔ ملکہ کو یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھ سکتے۔ ایسے لوگوں کی طبیعت میں ایک اضطراب ہوتا ہے جو انہیں بے چین رکھتا ہے۔ ایسے لوگ اگر کسی پر عاشق ہو جائیں تو بڑے پاگل قسم کے عاشق ہوتے ہیں کیونکہ ان کا سارا اضطراب کسی ایک طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

منصفین نتیجے کا اعلان کرنے کے لیے اسٹیج پر آ چکے تھے۔ ملکہ نے جو نقشہ اپنے ذہن میں مرتب کیا تھا اس کے مطابق کاشف کو پہلا انعام ملنے والا تھا اور خود اسے دوسرا انعام لیکن نتیجہ اس کے برعکس آیا۔ ملکہ کے لیے پہلے اور کاشف کے لیے دوسرے انعام کا اعلان ہوا۔

اب کاشف کی مجبوری تھی کہ وہ اسٹیج سے نہیں اتر سکتا تھا کیونکہ اعلان یہ ہوا تھا کہ انعام یافتگان کا گروپ فوٹو بنے گا۔ وہ اسٹیج پر موجود رہیں۔

گروپ میں بھی وہ ملکہ کے برابر کھڑا ہوا کیونکہ ملکہ پہلے نمبر پر آئی تھی اور کاشف دوسرے نمبر پر تھا۔ وہ برابر برابر کھڑے ضرور تھے لیکن یہ کوئی موقع نہیں تھا کہ وہ اس کی نظم کی تعریف کرتی یا کاشف کچھ کہتا۔ پرندہ ایک مرتبہ پھر اڑ گیا۔ دسیوں کیمرے ایک ساتھ چمکے اور بجھ گئے۔ دھوپ سے چھاؤں میں آتے ہی کم از کم ایک منظر آنکھ سے اوجھل ہو گیا۔ ملکہ نے نماز کی طرح سلام پھیرا۔ گردن گھمائی تو کاشف غائب تھا۔ عجیب لڑکا ہے۔ لڑکے تو بات کرنے کے مواقع ڈھونڈتے ہیں لیکن یہ تو چپ رہنے کی قسم کھا کر آیا ہے۔ وہ سیکڑوں مقابلوں میں ایسے کئی مناظر دیکھ چکی تھی۔ لڑکے ایسے پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑتے تھے کہ پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا تھا۔ وہ کاشف میں خود دلچسپی لے رہی تھی اور وہ تھا کہ اس کے پاؤں زمین پر نہیں تھے۔

ملکہ کے پرستار بھی کم نہیں تھے۔ اسٹیج سے اتری تو لڑکے لڑکیوں نے اسے گھیر لیا۔ وہ کچھ دیر کے لیے کاشف کو بھول گئی۔

لڑکیوں کے ہجوم میں گھری ہوئی وہ ریفریشمنٹ روم تک پہنچ گئی۔ یہاں صرف شرکا کے لیے انتظام کیا گیا تھا اس لیے لڑکیاں باہر رہ گئیں، اس نے اندر قدم رکھ دیا۔

وہ اپنی پلیٹ بنانے کے لیے میز کے قریب پہنچی تھی کہ اسے کاشف نظر آ گیا۔ ملکہ نے اسے مخاطب کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ اپنی پلیٹ بنا کر میز سے الگ ہوئی تھی کہ کاشف اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

''آپ کو پہلا انعام مبارک ہو۔'' کاشف نے کہا۔

''اس انعام کے حق دار آپ تھے۔''

''ارے واہ...... وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ آپ کی تقریر مجھ سے اچھی تھی۔''

''منصفین کو معلوم تھا کہ لڑکی ہے بے چاری، رونے لگے گی۔''

''آپ تو شاعر بھی بہت اچھے ہیں۔''

''میں یہاں آیا تھا کہ آپ کی تعریف کروں گا، آپ نے تو مجھ پر ہی حملے شروع کر دیے۔''

''مجھے جھوٹ بولنے کی بڑی عادت ہے۔'' ملکہ نے کہا اور دونوں ہنسنے لگے۔

''مجھے یہی عادت تو پسند ہے۔ میں بھی کوئی کم جھوٹا نہیں ہوں۔ آپ بہت خوب صورت ہیں۔''

''میرے لیے یہ کوئی نئی اطلاع نہیں۔''

''جی ہاں۔ اس شہر میں جھوٹوں کی کمی تھوڑی ہے۔''

ابھی کچھ اور باتیں ہوتیں کہ کسی نے اسے آواز دی اور وہ کسی معذرت کے بغیر اس آواز کے جواب میں بھاگ کھڑا ہوا۔

اس مرتبہ کوشش کے باوجود وہ اسے تلاش نہ کر سکی۔ اسے اس کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ اس کا نام کاشف رحمٰن ہے۔ سلطان پور میں رہتا ہے اور بی اے کا طالب علم ہے۔ اتنا موقع ہی نہیں ملا کہ فون نمبر کا تبادلہ ہوتا یا اس سے زیادہ کچھ اور پتا چلتا۔ وہ اس کے بارے میں صرف اتنا اندازہ لگا سکی تھی کہ لاابالی سا لڑکا ہے، خود پسند ہے، اپنے سوا کسی کی پروا نہیں کرتا۔

وہ دو چار دن اس کے سحر میں مبتلا رہی اور پھر اسے خیال بھی نہیں رہا کہ کون اس سے ملا تھا۔ امتحان قریب تھے۔ وہ پڑھائی میں مصروف ہو گئی۔

امتحانوں کے بعد وہ دوبارہ کالج جانے لگی تھی۔ اس دوران چند مقابلے ہوئے۔ اس نے حسب معمول کامیابی حاصل کی۔

ایک دن وہ کلاس میں تھی کہ اسے اطلاع ملی، کوئی اس سے ملنے آیا ہے، ویٹنگ روم میں اس کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ حیران تھی کہ کون اس سے ملنے آ گیا۔ پھر خیال آیا ریڈیو یا ٹی وی کا کوئی نمائندہ ہوگا۔ وہ کلاس سے فارغ ہونے کے بعد ویٹنگ روم میں گئی۔ کاشف کو دیکھ کر اس کا حیران ہونا لازمی تھا۔

''ارے آپ، اب تک اسی شہر میں ہیں؟''

''جی نہیں۔ کل آیا ہوں۔''

''دوبارہ؟ کیا پھر کوئی مقابلہ ہے؟''

''جی ہاں، ملاقاتوں کا مقابلہ ہے۔''

''ملاقاتوں کا مقابلہ......!''

''میں کم از کم دو سال کے لیے آپ کے شہر میں آ گیا ہوں لہٰذا ملاقاتوں کا مقابلہ تو شروع ہو ہی جائے گا۔''

''وہ کون خوش نصیب ہے جس سے آپ ملاقات فرمائیں گے؟''

''یہی تو آپ سے پوچھنے آیا ہوں کہ آپ اس مقابلے میں شریک ہونا پسند فرمائیں گی؟''

''موضوع کیا ہے اس مقابلے کا......؟''

''موضوع ہے ''کسی کے دور رہنے سے محبت کم نہیں ہوتی۔''

''میں تو اس کی مخالفت کروں گی۔ فاصلے سب کچھ بھلا دیتے ہیں۔ وقت ہر زخم کا علاج کر دیتا ہے۔ چہروں کے نقوش دھندلاتے دھندلاتے مٹ جاتے ہیں۔ محبت کے لیے قربت ضروری ہے۔ دوری کی آواز کون سنتا ہے؟''

''میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ محبت تو وہ آگ ہے جو اپنی ہی آگ میں جلتی ہے۔ کیا قربت کیا فاصلہ...... محبت ہو جائے تو پھر اختیار سے باہر ہوتی ہے۔ یہ تو وہ آگ ہے جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے۔''

''فرض کرو تمہیں کسی لڑکی سے محبت ہو جائے۔ پھر اس کی شادی کہیں اور ہو جائے تو کیا پھر بھی تمہارا جذبہ محبت اسی طرح رہے گا؟''

''میں اس کو کبھی نہیں بھولوں گا بلکہ یہ دوری تو میری آگ کو مزید بھڑکائے گی۔ میں اسے یا اس کے شوہر کو قتل بھی کر سکتا ہوں۔''

''اسے قتل کر دو گے، یہ کیسی محبت ہوئی؟''

''تو پھر میں خودکشی کر لوں گا۔''

''یہ محبت تو نہیں، خود غرضی ہوئی۔ محبت ہے تو محبت کرتے رہو، کسی کو قتل کیوں کرتے ہو؟''

''یہ بتانے کے لیے کہ کسی کے دور رہنے سے محبت کم نہیں ہوتی۔''

''بتانے کی ضرورت پڑتی ہی اس وقت ہے جب کوئی چیز اتنی کم ہو جائے کہ نظر ہی نہ آ رہی ہو۔''

''مس ملکہ، مجھے معلوم ہے آپ مجھ سے اچھی ڈیبیٹر ہیں۔ اس موضوع پر بھی آپ جیت گئیں میں ہار گیا۔ مجھے تو یہ بتایئے ملاقاتوں کے ان مقابلوں میں آپ شریک ہوں گی یا نہیں؟''

''شرکت کا وعدہ...... مگر یہ تو بتایئے مقابلے ہوں گے کہاں اور آپ میرے شہر کا سکون غارت کرنے کے لیے دو سال کے لیے یہاں کیوں آ دھمکے ہیں؟''

''ملکہ، اب مذاق چھوڑیے۔ سنجیدہ بات یہ ہے کہ سلطان پور چھوٹا شہر ہے۔ وہاں کوئی یونیورسٹی نہیں۔ مجھے اردو ادب میں ایم اے کرنا تھا لہٰذا میں نے یہاں یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا ہے۔ اور ہاسٹل میں مقیم ہوں۔ آتی جاتی رہیے گا۔''

''جی بہتر جناب! یہ بڑا شہر ہے۔ یہاں تقریری مقابلے بھی بہت ہوتے ہیں۔ ان مقابلوں میں ملاقاتیں تو ہوتی رہا کریں گی۔''

''آج کی بحث کے لیے موضوع ہے'' ہاسٹل کی

ایک شام۔"

"میرے پاس ان فضول بحثوں کے لیے وقت نہیں۔"

"پھر شام کو کہاں مل رہی ہیں؟"

"کہیں مقابلہ ہوا اور کسی نے رحم کھا کر آپ کو بھی بلا لیا تو ضرور ملاقات ہوگی۔"

اس چھیڑ چھاڑ میں اتنا وقت ہوگیا کہ ملکہ کو اجازت لینی پڑی اور کاشف اٹھ کر چلا گیا۔ اس نے چلتے چلتے یہ بھی نہیں کہا کہ پھر کب ملاقات ہوگی یا ملاقات ہونی چاہیے۔ جس تپاک سے آیا تھا اسی عجلت میں روانہ ہوگیا۔

ملکہ کو اس ملاقات سے خوشی بھی ہوئی تھی کہ لائق لڑکا ہے۔ اچھی باتیں کرتا ہے لیکن یہ دھڑکا بھی لگ گیا تھا کہ یہ لڑکا بلا کی طرح پیچھے پڑ جائے گا۔ جب منہ اٹھے گا چلا آئے گا۔ اس سے صاف کہنا پڑے گا کہ ملاقاتیں مقابلوں تک محدود رہیں تو اچھا ہے۔

اس ملاقات کو ایک ہفتہ گزرا پھر پندرہ دن ہوگئے۔ کاشف کی کوئی خیر خبر ہی نہیں تھی۔ ملکہ کو تعجب ہو رہا تھا کہ وہ کیوں ملنے نہیں آیا۔ اس نے خود بھی مناسب نہیں سمجھا کہ اسے تلاش کرنے یونیورسٹی پہنچے اور اس کی خود پسندی کو ہوا دے۔

کاشف ان لوگوں میں سے تھا جو خود نہیں جھکتے، دوسروں کو جھکانے کے خواہاں رہتے ہیں۔

وہ اس دن ایک پروگرام میں حصہ لینے ریڈیو گئی ہوئی تھی کہ کاشف سے اس کی ملاقات ہوگئی۔ وہ کسی مشاعرے میں شرکت کے لیے ریڈیو آیا تھا۔

تپاک سے ملا، عجلت میں روانہ ہوگیا۔

اب ملکہ کو یقین ہوگیا تھا کہ وہ موڈی لڑکا ہے۔ اس پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے بھی سوچ لیا کہ وہ بھی اسی طرح ملا کرے گی۔

انہی دنوں موسم بدلا۔ کالجوں میں ہفتۂ طلبہ منانے کے دن آگئے تو اس کی مقبولیت نے ایسا پریشان کیا کہ ایک ایک دن میں دو دو مقابلوں میں جانا پڑتا تھا۔ کاشف بھی ہر مقابلے میں شریک ہو رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی صلاحیتوں سے واقف ہوئے تو ایک دوسرے کے قائل بھی ہوتے چلے گئے۔ وہ اس خلوص سے ملا، اس اپنائیت کا مظاہرہ کیا کہ وہ بے اختیار اس کی طرف کھنچی چلی گئی۔

ایک شہر میں تھے، ہم مزاج تھے، ہم خیال تھے۔ ملے تو واقعی ملاقاتوں کا مقابلہ شروع ہوگیا۔ وہ لڑکا جسے وہ لاابالی اور موڈی سمجھتی رہی تھی، اس پر نئے انداز سے کھل رہا تھا۔ جیسے مرنے کے وعدے سبھی کرتے ہیں لیکن اس کی دیوانگی سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اسے نہیں ملی تو وہ واقعی مر جائے گا۔ کئی مرتبہ کہہ چکا تھا کہ اگر تم نے بے وفائی کی تو میں ان لوگوں میں سے نہیں جو رو دھو کر چپ ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو گولی مار لوں گا یا تمہیں قتل کر دوں گا۔

ملکہ کو اس کی دیوانگی سے ڈر لگنے لگا تھا۔ اس کی یہی دیوانگی تھی جو ملکہ کو مجبور کر رہی تھی کہ وہ اس کی ہر بات مانتی رہے۔ اب وہ ہر جگہ ایک ساتھ دیکھے جا رہے تھے۔ مقابلوں سے نکل کر انہوں نے تفریح گاہوں میں بھی جانا شروع کر دیا تھا۔

کاشف فائنل ایئر میں آیا تو ان ملاقاتوں نے دوسرا ہی رخ اختیار کر لیا۔ کاشف اب شادی پر اصرار کرنے لگا تھا جبکہ ملکہ نے اپنی ماں سے اس کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ انہیں معلوم بھی نہیں تھا کہ ملکہ کی زندگی میں کوئی کاشف آچکا ہے۔ وہ اسے یہ کہہ کر ٹالتی رہی کہ میری تعلیم کا بھی آخری سال ہے اور تمہارا بھی فائنل ایئر ہے۔ شادی اس کے بعد ہی ہوسکتی ہے۔

"مجھے کون سی جلدی ہے۔ میں تو یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ تمہیں اس شادی پر کوئی اعتراض تو نہیں۔ مجھے اپنے لائق سمجھتی بھی ہو یا میں یونہی وقت ضائع کر رہا ہوں؟"

"کاشف، اب تک تمہیں یہی اندازہ نہیں ہوسکا کہ میں تمہیں کیا سمجھتی ہوں؟"

"میں بھلا تمہارے دل کا حال کیسے جان سکتا ہوں؟"

"پھر تو میں بھی یہی کہوں گی کہ میں بھی اپنا وقت ضائع کر رہی ہوں۔ جو دل کا حال ہی نہ جانتا ہو، اس سے تعلق رکھنے کا کیا فائدہ؟"

"ارے ارے...... تم تو ناراض ہوگئیں۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ میں تو تمہارے دل میں اٹھنے والی ایک ایک لہر سے واقف ہوں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ تم کل رات سوتے سوتے اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں اور سوچ رہی تھیں کاشف جیسا عظیم لڑکا مجھ پر مرنے لگا ہے۔ کتنی خوش قسمت ہوں میں۔ پھر تم اس خیال سے رو پڑی تھیں کہ تمہاری شادی کہیں اور نہ ہو جائے۔ تمہیں رومال نہیں مل رہا تھا۔ پھر تم نے دوپٹے سے آنسو پونچھے اور یہ کہہ کر سونے کے لیے لیٹ گئیں کہ کہیں بھی ہو بس شادی ہو جائے۔"

"نہیں! میں نے تو ٹیلی فون پر کسی طوطی کا آرڈر نہیں دیا۔"

"بس یا کچھ اور کہنا ہے؟" ملکہ کی آنکھوں میں واقعی آنسو آگئے۔ "کاشف! اگر آئندہ میرا اس طرح مذاق اڑایا تو میں تم سے زندگی بھر بات نہیں کروں گی۔"

"سوری ملکہ، سوری! تمہیں معلوم ہے میری عادت مذاق کی ہے۔ آئندہ ایسا مذاق نہیں کروں گا۔ مجھے معلوم ہے تم مجھے کتنا چاہتی ہو۔ میں تو بس تمہاری زبان سے سننا چاہتا تھا۔"

"سننا چاہتے ہو تو سنو۔ میں تمہیں پانے کے لیے پوری دنیا سے بغاوت کر دوں گی۔"

"اگر دنیا نے مجھے تم سے جدا کر دیا؟"

"تمہارے دور چلے جانے سے تم سے میری محبت تو کم نہیں ہوگی۔"

"لیکن تم تو یہ کہتی رہی ہو کہ دور کی آواز کون سنتا ہے۔ فاصلے محبت کو ختم کر دیتے ہیں؟"

"تم نے یہ بھی تو کہا تھا کہ یہ بات تجربے کی ہے۔ جب تمہیں کسی سے محبت ہوگی، اس وقت اپنے دل سے پوچھنا۔" ملکہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "مجھے اب محبت بھی ہوگئی ہے اور میں نے اپنے دل سے پوچھ بھی لیا ہے۔ اب میں اس مقولے پر قائم ہوگئی ہوں کہ کسی کے دور رہنے سے محبت کم نہیں ہوتی۔ میرے منہ میں خاک...... اگر تم مجھ سے دور بھی چلے گئے تو بھی میں تمہاری رہوں گی۔"

کاشف نے اس سے کہا کہ وہ کچھ دیر کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لے۔ ملکہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ کاشف اس کے قریب گیا اور اس کی بند آنکھوں پر دو بوسے ثبت کر دیے۔ ملکہ نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

"میں نے یہ حرکت کر کے اپنی دو نشانیاں تمہاری آنکھوں کے حضور چھوڑ دی ہیں۔ اگر قسمت نے مجھے تم سے جدا کر دیا تو یہ آنکھیں تمہیں یاد دلائیں گی کہ تمہیں میرا انتظار کرنا ہے۔"

"خدا نہ کرے ایسا وقت آئے۔"

"دیکھنا تو پڑے گا...... تم میرا انتظار کرتی ہو یا نہیں؟"

"یہ بھی دیکھ لینا۔"

وعدوں کی اس چھاؤں میں سفر کرتے کرتے ملکہ کے امتحان سر پر آگئے۔ دونوں نے طے کیا کہ جب تک امتحان ختم نہیں ہو جاتے، ملاقاتوں کا یہ مقابلہ ختم۔ ملکہ نے ایک ہوٹل میں اسے الوداعی پارٹی دی اور دونوں اپنی اپنی راہ روانہ ہوگئے۔

ملکہ نے یہ بات ابھی اسے بتانا مناسب نہیں سمجھی کہ امتحان ختم ہوتے ہی وہ اسے اپنے والدین سے ملائے گی۔ اس کے بعد کسی کو بتانے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ پاپا نے میری کوئی بات آج تک نہیں ٹالی، یہ بات بھی نہیں ٹالیں گے۔

دونوں کے درمیان کوئی ملاقات نہیں ہو رہی تھی۔ فون پر بھی رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ ملکہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ خود کوئی رابطہ نہیں کرے گی ہاں، اگر کاشف نے رابطہ کیا تو وہ اس کا فون اٹینڈ ضرور کرے گی لیکن کاشف بھی وعدے کا پکا تھا، اس نے بھی کوئی رابطہ نہیں کیا۔

امتحان شروع ہوگئے تھے۔ ہر پرچے کے بعد اسے اپنی کامیابی کا یقین ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ آخری پرچے کا دن آگیا۔ اسے اپنی کامیابی سے زیادہ یہ خوشی تھی کہ اب وہ کاشف سے رابطہ کرنے میں نہ صرف آزاد ہوگی بلکہ کاشف کی ملاقات اپنے والدین سے کرا سکے گی۔

وہ پرچہ دے کر گھر آئی تو عباداللہ خاں خلاف معمول گھر پر تھے۔ گھر کے اندرونی دروازے میں داخل ہوتے ہی پھولوں کا فرش بچھا ہوا تھا جس پر چلتے ہوئے وہ اپنے کمرے تک گئی۔ فریش ہو کر باہر نکلی تو عباداللہ خاں کی درازباہیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ بھاگتی ہوئی آئی اور باپ کی آغوش میں سما گئی۔

"مجھے اپنی بیٹی پر فخر ہے۔ آج میرا دیرینہ خواب پورا ہوگیا ہے۔"

"میں نے ایسا کیا کر دیا پاپا!"

"جب سے تو پیدا ہوئی تھی، میری آرزو تھی کہ تجھے

ڈاکٹر کے روپ میں دیکھوں۔ تو نے یہ خواب پورا کر دکھایا۔ کیا یہ تیرا کارنامہ نہیں۔ اس خوشی میں کل میں نے ایک پارٹی کا اہتمام کیا ہے۔ اس پارٹی کے بعد تجھے ایک سرپرائز بھی دینا ہے۔"

"کوئی تحفہ ہوگا اور کیا ہو سکتا ہے۔"

"ایسا تحفہ جو تیری زندگی بدل دے گا۔"

"بتائیے نا..... کیا تحفہ ہے؟"

"آج نہیں کل بتاؤں گا۔"

"پاپا! ابھی تو میرا رزلٹ بھی نہیں آیا۔ رزلٹ کے بعد پارٹی کرنا تھی۔"

"اس کے بعد بھی کر دیں گے۔ اب تم آرام کرو۔ امتحانوں کی تھکن ایک دن میں تو اتر ہی جائے گی۔"

تھکن تو کیا اتارنی تھی، اسے موقع مل گیا۔ جب پارٹی ہوتی ہے تو مہمانوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ اس کا خاص مہمان تو کاشف تھا۔ کام خود بخود آسان ہوتے جا رہے تھے۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ کاشف کو اپنے والدین سے ملوائے گی۔ اب یہ تقریب ایک جواز خود بن گئی تھی۔ اس نے سوچا، جب پاپا مجھے تحفہ دیں گے تو جواب میں انہیں میں بھی تحفہ دوں گی۔ اس تحفے کا نام ہوگا کاشف۔ اس نے کاشف کا نمبر ملایا اور فون کان سے لگا لیا۔ اس کا موبائل پاور آف تھا۔ پھر وہ وقفے وقفے سے نمبر ملاتی رہی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نے جھنجلا کر موبائل کو بستر پر پٹخا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

ابھی اتنی دیر نہیں ہوئی تھی کہ اسے تشویش ہوتی۔ اس نے سوچا ممکن ہے وہ بھی سو رہا ہو۔ شام کو اٹھے گی تو دوبارہ ٹرائی کرے گی۔ اس نے سونے کی کوشش کی، کچھ دیر کروٹیں بدلتی رہی اور پھر نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔

کئی راتوں کی نیند جمع تھی۔ سوئی تو پھر اندھیرے کی خبر لائی۔ آنکھ کھلی تو کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ اس نے سرہانے رکھا ٹیبل لیمپ روشن کیا۔ پھر جیسے اس کی یادداشت واپس آ گئی ہو۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے یاد آیا کہ اسے کاشف کو فون کرنا ہے۔ ڈائل میں گئی اور "کال" کا بٹن دبا دیا۔ جواب یہی ملا کہ موبائل بند ہے۔ کل پارٹی ہے اور نواب صاحب گھوڑے بیچ کر سوئے ہوئے ہیں۔ خیر ابھی تو رات پڑی ہے۔ کل کا دن بھی ہے۔ پارٹی تو شام کو ہے۔ وہ کمرے سے نکلی اور ماں کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"ملکہ، تم اپنی کچھ دوستوں کو بلانا چاہو تو فون کر دو کل کی پارٹی کے لیے۔"

"امی، ایک خاص دوست ہے میری۔ اسے فون کر رہی ہوں، اس کا فون ہی بند جا رہا ہے۔"

"کمال ہے۔ صرف ایک دوست ہے تمہاری؟"

"دوست تو ایک ہی ہوتا ہے امی۔ باقی تو سب ملنے والے ہوتے ہیں۔ اتنی بڑی پارٹی تو ہے نہیں کہ سب کو بلاؤں۔"

"یہ بھی تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر اس خاص دوست کا فون ہی بند ہے، تم کہہ رہی ہو۔ ایسا کرو اس کے گھر چلی جاؤ ڈرائیور کو ساتھ لے جاؤ۔"

"یہی سوچ رہی ہوں، اب کل جاؤں گی۔"

ماں کے پاس سے اٹھ کر وہ پھر کمرے میں آ گئی۔ نمبر پھر ملایا۔ بہ دستور وہی جواب آیا۔ اب اس کی الجھن تشویش میں بدل گئی تھی۔ گھر میں کل کی پارٹی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اسے ان باتوں میں بھی شریک ہونا تھا اور کاشف میں بھی جان اٹکی ہوئی تھی۔ باتوں میں کوئی وقفہ آتا تو اٹھ کر موبائل کان سے لگا لیتی اور پھر درمیان میں آ کر بیٹھ جاتی۔ کسی کو کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کس اضطراب سے گزر رہی ہے۔

وہ رات گئے تک فون ملانے کی کوشش کرتی رہی اور پھر یہ سوچ کر سونے کے لیے لیٹ گئی کہ صبح اٹھ کر وہ یونیورسٹی جائے گی۔

وہ سو کر اٹھی تو گھر میں چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ عباد اللہ خاں نے اپنی تمام مصروفیات منسوخ کر دی تھیں، وہ آج کورٹ بھی نہیں گئے تھے۔ ڈیکوریشن والے آ گئے تھے۔ لان میں ٹینٹ لگایا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے ملکہ کو محسوس ہوا جیسے اس کی شادی کے انتظامات کیے جا رہے ہوں۔ اس نے اپنی ماں سے سہیلی کو مدعو کرنے کا بہانہ کیا اور گاڑی لے کر نکل گئی۔

یونیورسٹی میں چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ ڈیپارٹمنٹ اجاڑ پڑے ہوئے تھے۔ صرف انتظامیہ کے دفاتر کھلے ہوئے تھے۔ وہ رجسٹرار کے کمرے میں چلی گئی۔ رجسٹرار اس کے والد کے دوست تھے اس لیے اسے امید تھی کہ وہ کاشف کو ڈھونڈنے میں اس کی مدد ضرور کریں گے۔ انہوں نے اسے بتایا کہ یونیورسٹی کے بیشتر لڑکے ہاسٹل چھوڑ کر گھروں کو جا چکے ہیں۔ چند ہی لڑکے ہوں گے جو اب بھی رو رہے ہوں گے۔ میں کاشف کے بارے میں چیک کرتا ہوں۔ انہوں نے کہیں فون کیا اور ملکہ کو بتا دیا کہ اس نام کا

لڑکا ہاسٹل چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اس کا فائنل ایئر تھا اس لیے شاید اب وہ نہ آئے۔

"اس نے اپنے گھر کا فون نمبر تو یہاں لکھوایا ہوگا۔ وہ نمبر مجھے مل سکتا ہے؟"

"اگر لکھوایا ہوگا تو ضرور ملے گا۔"

تھوڑی دیر میں فون نمبر اسے مل گیا۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے اس نمبر پر فون ملایا۔ بیل جا رہی تھی لیکن کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ نمبر ملایا لیکن ہر مرتبہ یہی ہوا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس وقت کوئی گھر پر نہیں ہے۔

وہ وہاں سے اٹھ آئی لیکن اب کچھ امید بندھ گئی تھی کہ اس وقت کوئی گھر پر نہیں لیکن گھر کا نمبر مل تو گیا ہے، کسی وقت کوئی اٹھا ہی لے گا۔ اگر وہ تقریب میں شریک نہ بھی ہو سکا تو بعد میں سہی، بات تو ہو جائے گی۔ وہ گھر پہنچی تو تیاریاں زور شور سے جاری تھیں۔ گھر پہنچ کر کاشف کے گھر کا نمبر پھر ملایا۔ اس مرتبہ بھی کسی نے نہیں اٹھایا۔ وہ شام کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ خود کو پریشان رکھ کر دوسروں کو شک میں ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے والدین جس ارمان سے اس کے امتحان ختم کرنے کی خوشی منا رہے تھے، وہ اس خوشی کو غارت کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ کس پریشانی میں ہے۔

شام کو مہمان آنے شروع ہوئے تو وہ دروازے پر باپ کے ساتھ کھڑی ایک ایک کو ویلکم کہہ رہی تھی۔ عباد اللہ خاں کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ وہ چاہتے تو شہر کا شہر اُمڈ آتا لیکن وہ یہ تقریب گھر میں کر رہے تھے اس لیے منتخب لوگوں کو ہی مدعو کیا تھا۔

وہ اس وقت چونکی جب اس کے کالج کے زمانے کی پرنسپل میڈم شہناز داخل ہوئیں۔ اس نے انہیں اس وقت تک دیکھا تھا جب وہ کالج کو خیر باد کہہ رہی تھی۔ تقریباً چار سال بعد انہیں دوبارہ دیکھ رہی تھی۔ ان کے ساتھ ایک لڑکا بھی تھا جس کی عمر تیس سال ہوگی۔ نہایت خوبرو اور اسمارٹ تھا۔ وہ یہی سمجھی تھی کہ میڈم شہناز کا بیٹا ہوگا لیکن میڈم نے یہ بتا کر اس کی غلط فہمی دور کر دی کہ وہ ان کے میکے کی طرف سے ان کا رشتہ دار ہے۔ ان دنوں ان کے پاس آیا ہوا تھا لہٰذا وہ اسے بھی اپنے ساتھ لے آئیں۔

جگمگاتی روشنیوں میں مسکراتے چہروں کو دیکھ کر اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ اس وقت اگر کاشف بھی ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس سے رہا نہیں گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور نسبتاً ایک خاموش گوشے میں جا کر کاشف کو فون کرنے لگی۔ پہلے اس کا موبائل نمبر ملایا پھر گھر کا نمبر ملایا اور مایوسی سے گردن جھٹک دی۔ واپس آئی تو فنکشن شروع ہو چکا تھا۔ عباد اللہ خاں نے ایک معروف گلوکار کو بلا رکھا تھا جسے چند غزلیں سنانی تھیں پھر کھانا شروع ہونا تھا۔ گلوکار نے غزل بھی اس کے حسب حال شروع کی تھی۔

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے
اگر تو مل بھی جائے اتفاقاً
تری فرقت کے صدمے کم نہ ہوں گے
دلوں کی رنجشیں بڑھتی رہیں گی

نعمان سکندر نے ایک دن موڈ میں آ کر کہا۔

"میری بیوی اتنی پڑھی لکھی ہے کہ وہ کسی بھی موضوع پر گھنٹا بھر بات چیت کر سکتی ہے۔"

جواب میں ناصر مغل صاحب بولے۔ "اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ یہی کام میری بیوی بھی کر سکتی ہے اور اس کے لیے موضوع کی شرط بھی نہیں ہوتی۔"

باتوں سے خوشبو آئے

☆ محبت اتنی طاقتور ہوتی ہے کہ جو کسی لمحے میں ایک وحشی کو انسان اور انسان کو وحشی بنا دیتی ہے۔

☆ کچھ تعلق انا سے ٹوٹ جاتے ہیں لیکن کچھ رشتوں کو قائم رکھنے کے لیے انا بے حد ضروری ہے۔

☆ محبت دکھ نہیں دیتی۔ یہ دکھ ہم خود مستعار لیتے ہیں، اپنے غلط فیصلوں اور غلط نقطہ نظر سے۔

☆ حسین یادوں کو کبھی فراموش نہ کیجیے کیونکہ یہ آئندہ زندگی کے لیے آبِ حیات سے کم نہیں ہوتیں۔

☆ جو لوگ آپ سے اختلاف رکھتے ہیں، ان کے بارے میں پریشان نہ ہوں، پریشان تو ان لوگوں کے بارے میں ہونا چاہیے، جو آپ سے اختلاف تو رکھتے ہیں لیکن اظہار نہیں کرتے۔

سبحان فاروق..... کراچی

اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے

وہ لڑکھڑائی اور جہاں جگہ ملی وہاں بیٹھ گئی۔ اتفاق دیکھیے کہ وہ میڈم شہناز کے برابر بیٹھی تھی اور ان کے برابر ان کا وہ رشتہ دار لڑکا بیٹھا تھا۔

گلوکار نے غالب کی غزل شروع کردی تھی۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

میڈم نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے لڑکے کو دیکھا پھر اس سے مخاطب ہوئیں "کل میں نے فاخرہ کو، عباد بھائی کو اور تمہیں ہوٹل اسٹار میں مدعو کیا ہے۔"

"وہ کیوں میڈم!"

"تمہاری کامیابی کی خوشی میں ٹریٹ دے رہی ہوں۔"

"مجھ سے ایسا کیا کارنامہ سرزد ہوگیا۔ آج پاپا نے یہ ہنگامہ مچادیا کل آپ زحمت کررہی ہیں۔"

"تم اتنی تنہائی پسند تو کبھی نہیں تھیں جتنا میں اب دیکھ رہی ہوں۔ کچھ پریشان ہو؟"

"نہیں میڈم! ابھی امتحانوں کی تھکن اتری نہیں تھی کہ یہ ہوگیا۔"

"کل سب تھکن اتر جائے گی، میری بھی تمہاری بھی۔" انہوں نے عجیب ذومعنی فقرہ کہہ دیا تھا۔ ادھر گلوکار نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

مدت سے تری صورت اے ماہ لقا ہم نے
محسوس بہت کی ہے آنکھوں سے نہیں دیکھی

وہ آپے سے باہر ہوگئی۔ اس نے عجیب بدتمیزی کا مظاہرہ کیا۔ میڈم سے اجازت لیے بغیر اٹھی اور تقریباً بھاگتے ہوئے گھر کے اندر چلی گئی۔ بیڈروم میں پہنچی تھی کہ بیڈ پر اوندھے منہ گر کر سسکیاں بھرنے لگی۔ "تم نے ٹھیک کہا تھا کاشف۔ کسی کے دور رہنے سے محبت کم نہیں ہوتی۔ یہ دیکھو، میں تمہاری یاد میں آنسو بہارہی ہوں۔ تمہارے بغیر میں ادھوری ہوگئی ہوں۔ لوگ میرے مکمل ہونے کا جشن منارہے ہیں اور میں ادھوری ہوں۔ جلدی چلے آؤ کاشف! ورنہ میں ادھوری بھی نہیں رہوں گی۔ تم کہاں گم ہوگئے ہو؟ اس طرح کوئی جاتا ہے بھلا۔"

دنیا بھی عجیب جگہ ہے۔ آنسو خود نہیں پوچھتی، رونے والے سے خود کہتی ہے کہ اس کے خوف سے وہ اپنے آنسو پونچھ لے۔ وہ اٹھی، آنسو پونچھے، ہلکا سا میک اپ دوبارہ کیا اور محفل میں پہنچ گئی۔ گلوکار مصطفیٰ زیدی کی غزل گارہا تھا۔

میری روح کی حقیقت مرے آنسوؤں سے پوچھو
مرا مجلسی تبسم مرا ترجماں نہیں ہے

کسی نے تھوڑی دیر کے لیے اس کی غیر موجودگی کو محسوس بھی نہیں کیا۔ اس کی تلاش تو اس وقت ہوئی جب موسیقی کا یہ پروگرام ختم ہوا اور تحفوں کی ترسیل کا وقت آیا۔ اسے اسٹیج پر بلایا گیا۔ مہمان ایک ایک کرکے اسٹیج پر آتے رہے اور وہ تحفے وصول کرتی رہی۔

اس کے بعد کھانا شروع ہوا۔ وہ بھی بے دلی سے کھانے کے لیے کھڑی ہوگئی۔ پھر مہمان ایک ایک کرکے رخصت ہونے لگے۔

مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر سنسان ہوگئی۔

تھکن کا بہانہ کرکے اپنے کمرے میں آگئی۔ ایک مرتبہ پھر اس نے موبائل کی بھول بھلیوں میں کاشف کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اندھیرے پھر مسلط ہوگئے۔ وہ ٹامک ٹوئیاں مارتی رہی۔ پھر یہ اندھیرے اس کی آنکھوں میں اتر گئے۔ وہ واقعی اتنی تھک گئی تھی کہ اس کی آنکھ لگ گئی۔

دوسرا دن بھی چاند چکور کے اسی کھیل میں گزر گیا۔ نمبر ملاتے ملاتے اس کی انگلیاں تھک گئی تھیں لیکن کاشف تو یوں غائب ہوگیا تھا جیسے غائب ہونے کے بہانے ڈھونڈ رہا ہو۔

میڈم شہناز نے ڈنر پر بلا رکھا تھا لہٰذا شام سے تیاریاں شروع ہوگئیں۔ ہوٹل اسٹار شہر کا سب سے مہنگا ہوٹل تھا۔ وہ کاشف کو پہلی مرتبہ اسی ہوٹل میں لے کر گئی تھی۔ اس خیال سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

وہ وہاں پہنچی تو ڈنر میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ سب لوگ اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور وہ ٹہلتی ہوئی سوئمنگ پول کی طرف چلی گئی۔ اسی وقت میڈم شہناز بھی وہیں پہنچ گئیں۔

"کیا ہوا ملکہ، یہاں کیوں چلی آئیں؟"

"ایسے ہی بس!"

"جانتی ہو، میں نے کس کی فرمائش پر تمہیں یہاں بلایا ہے؟"

"پتا نہیں میڈم!"

"عاطف علی خاں کی خواہش تھی کہ میں تمہیں یہاں بلاؤں۔"

"کون عاطف علی خاں اور ان کی یہ خواہش کیوں

تھی؟"

"عاطف رشتے میں میرا بھانجا لگتا ہے۔"

"وہ تو ہے میڈم لیکن یہ موصوف ہیں کون؟"

"یہی تو ہیں جو میرے ساتھ آئے ہیں۔ محراب پور میں مجسٹریٹ کے عہدے پر تعینات ہیں۔ چھوٹے شہروں میں ان لوگوں کی بادشاہت ہوتی ہے۔"

"وہ تو ہے مگر ان کی خواہش پر مجھے ڈنر دینے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟"

"یہ بادشاہ ہیں اور انہیں ایک ملکہ کی ضرورت ہے۔ ان کی نظر تم پر پڑی اور انہوں نے تمہیں مدعو کرلیا۔"

"مجھے نہیں، پاپا اور امی کو مدعو کیا گیا ہے۔ میں تو ان کے ساتھ آگئی ہوں۔"

"بات ایک ہی ہے۔ عباد بھائی اور فاخرہ کوئی تم سے الگ تھوڑی ہیں بلکہ اس معاملے میں پہلے تو وہی ہیں۔"

"آئیے وہاں انتظار ہورہا ہوگا۔" ملکہ اس قصے کو یہیں ختم کردینا چاہتی تھی اس لیے وہاں سے ہٹ گئی۔ میڈم شہناز کو بھی اس کے ساتھ آنا پڑا۔

ڈنر ہال میں آکر اس نے پہلی مرتبہ غور سے عاطف کی طرف دیکھا۔ اسے اگر کاشف کا انتظار نہ ہوتا تو اسے خوبصورت کہا جاسکتا تھا۔ کاشف کی طرح اس کی آنکھیں بھی نیلی اور بال بھورے تھے۔ گورا رنگ، دراز قد۔ ہر طرح سے معقول تھا لیکن کاشف نہیں تھا۔ اس کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔

کچھ تو کاشف کا خیال تھا، کچھ اسے میڈم کی باتوں نے اداس کردیا تھا۔ وہ سر جھکائے کھانا کھاتی رہی۔ عاطف نے کئی مرتبہ اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ہوں ہاں سے آگے نہیں بڑھی۔ یہ بھی بدتہذیبی تھی کہ کسی بات کا جواب ہی نہ دیتی۔ دو چار باتوں کا جواب بھی دینا پڑا۔

کھانے کے بعد کافی کا دور چلتا رہا۔ درمیان میں باتیں بھی ہوتی رہیں۔ باتیں کیا کارناموں کا تبادلہ تھا۔ میڈم شہناز عاطف کے قصیدے پڑھ رہی تھیں۔ عباداللہ خاں اپنی بیٹی کے کارناموں کی تفصیل بتارہے تھے۔ کافی کا دور ختم ہوا تو میڈم شہناز، عباداللہ خاں کو لے کر ایک طرف چلی گئیں۔ ملکہ کو معلوم تھا کہ کیا باتیں ہورہی ہوں گی لیکن وہ انہیں روک تو نہیں سکتی تھی البتہ یہ احساس ہوگیا تھا کہ اسے اب ایک اور محاذ پر لڑنا پڑے گا۔ اس نے وہ تمام بہانے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے ذہن میں محفوظ کرلیے جو اس لڑائی میں پیش کیے جاسکتے تھے۔

وہ رات خیریت سے گزر گئی لیکن دوسرے دن عباداللہ خاں نے عدالت سے آتے ہی اسے اپنی عدالت میں طلب کرلیا۔ فاخرہ بیگم بھی ان کے قریب ہی بیٹھی تھیں۔ وہ سمجھ گئی کہ کوئی خاص وقت آگیا ہے۔ اس نے بہانوں کے ہتھیار باندھے اور باپ کے کمرے میں پہنچ گئی۔

"بیٹا، کل کا ڈنر کیسا رہا؟"

"میڈم شہناز نے خواہ مخواہ کی تکلیف کی۔" ملکہ نے کہا۔

"میری رشتہ دار ہیں اور پھر مجھ پر تو وہ جان چھڑکتی ہیں۔ تکلیف کیسی، ان کی محبت کا ثبوت یہ ہے کہ انہیں تمہاری فکر ہے۔ فکر اپنوں کو ہی ہوتی ہے۔"

"مجھے کیا ہوگیا جو انہیں میری فکر ہے؟"

"بھئی تمہاری تعلیم مکمل ہوگئی ہے۔ اب تمہاری شادی ہوجانی چاہیے۔ اپنوں کی سب سے بڑی فکر یہی ہوتی ہے کہ لڑکیاں اپنے گھروں کی ہوجائیں۔"

"یہ سب پرانے زمانے کی فکریں ہیں پاپا!"

"یہ فکر ایسی ہے جو ہر زمانے کی ہے۔ ہمیں بھی فکر ہے کہ تمہاری شادی ہوجائے۔ میڈم شہناز بہت اچھا رشتہ لائی ہیں۔ میں نے اور تمہاری ماں نے تو تقریباً ہاں کردی ہے۔ تم بھی انکار نہیں کروگی۔ عاطف علی خاں ضلع مجسٹریٹ ہے۔ چھوٹی جگہوں پر ایسے لوگ بادشاہت کرتے ہیں۔ سرکاری گاڑی، نوکر چاکر سب ملا ہوتا ہے۔ عیش کرے گی ہماری بیٹی!"

"پاپا، ابھی تو میرا رزلٹ بھی نہیں آیا۔" اس نے پہلا ہتھیار پھینکا۔

"رزلٹ بھی آتا رہے گا۔ شادی کے بعد بھی رزلٹ آسکتا ہے۔"

"پاپا، رزلٹ آجائے تو میں F.R.C.S کرنے لندن جاؤں گی۔ آپ ہی نے تو کہا تھا۔"

"میں نے کہا ضرور تھا لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس دوران اتنا اچھا رشتہ آجائے گا۔ میں نے شہناز سے کہہ دیا ہے کہ وہ تیاری کریں، ہم تیار ہیں۔"

ملکہ نے کہنا چاہا کہ اس کی زندگی کا فیصلہ کرنے والے وہ کون ہوتے ہیں۔ بچے کو ایک کھلونا بھی دلایا جاتا ہے تو بچے سے پوچھ لیا جاتا ہے۔ انہوں نے اتنا بڑا فیصلہ کرلیا اور میری پسند پوچھے بغیر۔ اس نے انکار کرنا چاہا لیکن

وہ باپ کے سامنے گونگی بن کر رہ گئی لیکن ماں کے سامنے تو زبان کھول سکتی تھی۔

''امی، پاپا کو منع کر دیں۔''

''کیا پاگل ہو گئی ہو۔ اتنے اچھے رشتے بار بار نہیں ملتے۔''

''میں پاپا سے تو نہیں کہہ سکی لیکن آپ سے کہہ رہی ہوں۔ میں فی الحال شادی نہیں کروں گی۔''

''تمہاری مرضی ہے لیکن تمہارے پاپا زبان دے چکے ہیں۔''

''ان کی غلطی ہے۔ ان کو پہلے مجھ سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔''

''یہ تم اس باپ کے لیے کہہ رہی ہو جس نے ہمیشہ تمہیں بانہوں میں جھلایا، آنکھوں پہ بٹھایا۔ خبردار، جو ان کے سامنے تم نے انکار کیا۔''

اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ انکار نہیں کرے گی لیکن جب ایک مرتبہ پھر عباد اللہ خاں نے اس سے پوچھا تو اسے اچانک کاشف یاد آ گیا۔ وہ گستاخ بن گئی۔ کاشف کی محبت میں اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اس کا باپ بھی تو اس سے محبت کرنے والوں میں ہے۔

قیامت ہی تو آ گئی۔ عباد اللہ خاں نے اعلان کر دیا کہ ملکہ کی شادی عاطف سے ہوگی۔ اب یہ ملکہ کی مرضی کہ وہ اپنی سسرال زندہ جانا چاہتی ہے یا مردہ۔

فاخرہ بیگم کو معلوم تھا کہ عباد اللہ خاں جو کہتے ہیں وہ کر گزرتے ہیں۔ انہوں نے ملکہ کو بٹھا کر سمجھایا۔ ملکہ ایک ہی دن میں مرجھایا ہوا پھول بن گئی تھی۔ ٹھیس لگی تو پتی پتی ہو کر بکھر گئی۔

''امی، میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں۔''

''کیا کہا......؟'' فاخرہ بیگم کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''وہی جو آپ نے سنا ہے۔''

''کون ہے وہ......؟''

''میرے ساتھ تقریری مقابلوں میں حصہ لیا کرتا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔''

''کہاں ہے وہ۔ اسے لے کر آؤ تاکہ میں اسے عاطف کے مقابلے میں پیش کر سکوں۔''

''وہ کہیں چلا گیا ہے۔ میں اسے ڈھونڈوں گی اور ڈھونڈتی رہوں گی۔ پاپا سے کہیں کچھ روز انتظار کریں۔''

''وہ اب کبھی نہیں آئے گا، اس کا انتظار چھوڑ دو۔''

''نہیں، وہ مجھے ستانے کے لیے کہیں چھپ گیا ہے، ضرور آئے گا۔''

''آیا بھی تو اس وقت آئے گا جب وقت گزر چکا ہوگا۔''

''اسی لیے میں وقت کو اپنی مٹھی میں قید کر کے رکھنا چاہتی ہوں۔''

''تم سے پہلے بھی ایک لڑکی تھی، اسے بھی ایک لڑکا ملا تھا۔ پھر وہ بھی اسی طرح غائب ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی بڑی تیز آندھی چلی تھی، بڑا خطرناک طوفان آیا تھا۔ اس لڑکی نے بھی بہت شور مچایا تھا، بہت چیخی تھی لیکن طوفان کے شور میں بے جان آواز کا شور کون سنتا ہے۔ وہ لڑکا آیا ضرور لیکن اس وقت جب وقت گزر چکا تھا۔''

''اسی لیے میں فی الحال وقت کو روکنے کے لیے کہہ رہی ہوں، شاید وہ آ جائے۔''

''تم مجھے اس چیز کو روکنے کے لیے کہہ رہی ہو جو کسی کے اختیار میں نہیں۔ وقت گزر جائے تو پھر پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اس لیے جو مل جائے اسے حاصل کر لو۔ کسی کی بے وفائی کے لیے اپنی آنکھیں کیوں نم کرتی ہو۔ وہ اگر سامنے ہوتا تو میں تمہارا مقدمہ لڑ سکتی تھی۔ تمہاری شادی پرچھائیں سے نہیں ہو سکتی۔''

''آپ کسی طرح پاپا سے مجھے چھ مہینے کی مہلت دلوا دیں۔ اتنے عرصے میں تو وہ آ ہی جائے گا۔ وہ گیا نہیں ہے مجھے ستانے کے لیے کہیں چھپ گیا ہے۔''

''دیکھو، میں کوشش کرتی ہوں لیکن میرا تجربہ کہتا ہے کہ اس نے تم سے بے وفائی کی ہے۔ وہ اب کبھی نہیں آئے گا۔''

فاخرہ بیگم کے سامنے ایک مرتبہ پھر ارسلان آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ بھی اسی طرح غائب ہو گیا تھا۔ اس نے لوٹ کر آنے میں دو سال لگا دیے تھے اور ان کی شادی عباد اللہ سے ہو چکی تھی۔ ان کی بیٹی بھی آج اسی موڑ پر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی بیٹی کسی کی ہو جائے اور اس کے بعد آنے والا آ جائے لیکن یہ ضمانت بھی نہیں دی جا سکتی تھی کہ آنے والا واقعی آ جائے گا۔ اگر اس کے پاؤں واپسی کے لیے نہیں اٹھے تو اس وقت ملکہ پر کیا گزرے گی۔ کیا دو سال کے بعد پھر دو سال، نہیں نہیں۔ عورت کی زندگی شادی کے بغیر ادھوری ہی رہتی ہے۔ ملکہ کی شادی ہو جانی چاہیے۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ شادی ہوگی، بچے ہوں گے، ماضی دھندلا سا خواب بن کر رہ جائے گا۔ محبت تو چراغ کی آگ کی طرح ہوتی ہے۔

بجھا دو تو کچھ دیر دھواں اٹھتا ہے پھر خاموشی۔ روشن دن سامنے ہو تو چراغ کے بجھنے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ وہ جس گھر میں بیاہ کر جا رہی ہے وہاں عیش ہی عیش ہوگا۔ کچھ دن میں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ انہوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے شوہر سے پندرہ دن کی مہلت طلب کر لی۔ ملکہ سے بھی کہہ دیا کہ تمہارے پاس سوچنے کے لیے پندرہ دن ہیں۔ پرچھائیں کا پیچھا کرو یا حقیقت قبول کر لو۔

ملکہ نے یہ پندرہ دن پندرہ سال سمجھ کر قبول کر لیے ور انتظار کی بارگاہ میں جوگن بن کر بیٹھ گئی۔ فاخرہ بیگم اپنے تجربے کی چاندنی اس پر نچھاور کرتی رہیں۔ اندھیرے اجالے کا فرق بتاتی رہیں۔ آنسو پونچھتی رہیں، سسکیاں دباتی رہیں۔ ملکہ اب خود بھی سوچتی تھی تو کاشف کسی ہرجائی کے روپ میں نظر آتا تھا۔ اس کے پیروں میں پہیے لگے ہوئے تھے۔ کسی ایک جگہ ٹکتا ہی نہیں تھا۔ ابھی اس سے باتیں کر رہا ہے، ابھی کسی دوست کی آواز پر دوڑ پڑا۔ سنجیدگی اس کے قریب سے ہو کر نہیں گزری تھی۔ ہر چیز کو مذاق ہی سمجھتا تھا۔ اس نے میری محبت کو بھی مذاق ہی سمجھا ہوگا۔ کسی اور آواز پر دوڑ پڑا ہوگا۔ اس خیال نے ایک مرتبہ سر اٹھایا تو اسی سمت پر سفر شروع ہو گیا۔ اس نے کہا تھا، دیکھتا ہوں تم میرا انتظار کرتی ہو یا نہیں۔ بار بار ذکر کرتا تھا، اگر حالات نے ہمیں جدا کر دیا۔ اس نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ وہ جدائی کا راستہ اختیار کرے گا۔

جب اس کی بے وفائی کا یقین پختہ ہو گیا تو عاطف کے خیال نے جگہ بنانی شروع کر دی۔ کاشف نے اس شہر میں دل لگانے کے لیے مجھے منتخب کیا تھا۔ جب اس شہر میں رہنے کا جواز ختم ہو گیا تو اپنے شہر واپس لوٹ گیا اور اس طرح گیا کہ قدموں کے نشان تک مٹا گیا۔ اسے مجھ سے محبت نہیں تھی، میرے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی اسے وہ زندگی یاد آنے لگی جو اس کا انتظار کر رہی تھی۔ عاطف خوب صورت ہے، تعلیم یافتہ ہے، اعلیٰ عہدے پر فائز ہے اور سب سے بڑھ کر میرا انتخاب ہے۔ اب وہ خود وہ تمام باتیں سوچ رہی تھی جو فاخرہ بیگم اس سے کہہ چکی تھیں۔

پندرہ دن پندرہ لمحوں کی طرح گزر گئے لیکن وہ اس مختصر سے وقت میں ایک بڑا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس نے اس فیصلے سے اپنی ماں کو بھی آگاہ کر دیا۔

☆☆☆

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

اس کا ماضی پیچھا کرتے ہوئے اس کے ڈرائنگ روم تک آ گیا تھا۔

بے وفائی کا مارا رہتا نہیں ہے۔ وہ بھی نہ رہ سکی۔ نہ اپنے گھر میں نہ شہر میں۔ گھر بھی چھوٹا شہر بھی گیا۔ وہ عاطف کی بیوی بن کر محراب پور آ گئی۔ گھر میں تین بندے، عاطف، اس کی ماں اور وہ خود۔ نوکروں کی تعداد چار۔ ڈرائیور، دو مالی، ایک خانساماں، سرکاری بنگلا نہ فون کا خرچ نہ بجلی کا۔

شادی کو تیسرا دن ہوا تھا۔ ابھی اس نے پاؤں نیچے نہیں رکھے تھے کہ دفتر سے عاطف کا بلاوا آ گیا۔ جیپ دروازے پر کھڑی تھی۔ وہ اسے خدا حافظ کہنے دروازے تک گئی۔ واپس آ رہی تھی کہ سوچا گھر کا جائزہ ہی لے لے۔ ڈرائنگ روم سامنے تھا، اس نے قدم رکھ دیا۔ شاندار فرنیچر، عاطف کو ملنے والے ایوارڈز، پتھر کے دو مجسمے اور پھر وہ خود پتھر بن گئی۔ ایک شیلف پر کاشف کی تصویر مسکرا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی تصویر سے نکل آئے گا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹی اور ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ مہمان آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، اپنی تصویر چھوڑ کر تھوڑی جاتے ہیں۔ یہ تو اسی گھر کا آدمی ہے جو مجھے دیکھ کر کہیں چھپ گیا ہے۔ وہ ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی تھی کہ اس کی ساس نے اس کی محویت کو توڑ دیا۔

''یہ میرا چھوٹا بیٹا ہے کاشف، تمہارا دیور۔ کبھی آئے تو دیکھنا۔ ایسا شریر ہے کہ تمہارا جینا دوبھر کر دے گا۔''

''کہاں ہیں یہ؟''

''تمہاری شادی سے پہلے ہی تو لندن گیا ہے۔''

''شادی میں بھی شریک نہیں ہوئے۔''

''اس کے جانے کے بعد شادی کا سلسلہ چلا۔ اسے لکھتے تو تعلیم چھوڑ چھاڑ کر فوراً چلا آتا۔ ہم نے تو اب بھی نہیں لکھا ہے۔ بھابی کو دیکھنے فوراً چلا آئے گا۔ شاعری وہ کرتا ہے، مصور وہ ہے، تقریریں وہ کرتا پھرتا ہے۔ جانے کیا کیا ہے، خیر سے آیا تو دیکھنا۔''

وہ ڈرائنگ روم سے اپنے کمرے تک یوں بھاگتی ہوئی آئی جیسے آگ نے اس کا دامن پکڑ لیا ہو۔ آگ پانی سے بجھتی ہے، اسے بھی پانی کا خیال آیا۔ بیڈ روم فریج سے پانی کی بوتل نکالی۔ ایک گلاس سے آگ کہاں بجھنے والی تھی، دوسرا گلاس بھی پی لیا۔ حواس تھے کہ قابو میں آ ہی نہیں رہے تھے۔ آنے والا وقت الٹے پاؤں چلتا ہوا اس تک

آ گیا تھا۔ کاشف اسی گھر کا فرد ہے اور مجھ سے پہلے سے یہاں رہ رہا ہے۔ وہ آ گیا تو ہر وقت کا ساتھ ہوگا۔ کیا میں اس کے زہریلے فقرے برداشت کر سکوں گی؟ وہ مجھے اپنے بھائی کی بیوی کے روپ میں دیکھ سکے گا؟ میرا ضمیر مجھے چین لینے دے گا؟ میں نے ایک مرتبہ کسی تقریر میں کہا تھا، دو بچھڑے ہوئے اگر مل جائیں تو پھر وہی ہوتا ہے جو تیل کو ماچس دکھانے سے ہوتا ہے۔ تو کیا وہ وقت آنے والا ہے؟ کتنے ہی سوالات تھے جن کے جواب اس کے پاس نہیں تھے۔ وہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی۔

دوپہر کی دھوپ گھر سے جانے والی تھی کہ عاطف آ گیا۔ وہ خود بہت شرمندہ تھا کہ شادی کے تیسرے دن اسے نوکری پر جانا پڑ گیا تھا لیکن ملکہ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی چونک اٹھا۔

”یہ تمہارے چہرے کو کیا ہوا؟“

”کچھ بھی نہیں۔ کیا ہو گیا؟“

”تمہارا رنگ پیلا پڑا ہوا ہے، جیسے کوئی خوف دامن گیر ہو۔“

”مجھے کیا خوف ہو سکتا ہے، مجسٹریٹ صاحب کی بیوی ہوں۔“ اس نے ایسے کہا جیسے طنز کر رہی ہو۔

”میرے چلے جانے پر خفا ہو۔ بھئی نوکری ہی ایسی ہے۔ کسی وقت بھی جانا پڑ جاتا ہے۔ زیادہ ہوا تو یہ نوکری ہی چھوڑ دیں گے۔ اب تو خوش ہو۔“

”میں نے کہا نا...... میں خفا نہیں ہوں۔“ تلخی اس کے لہجے سے صاف ظاہر تھی۔

”جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ کہیں باہر چلتے ہیں۔“

”آج رہنے دیں، کل چلیں گے۔“

”معلوم ہوتا ہے اس گھر میں ضرور کوئی ایسی چیز ہے کہ جناب کا دل لگ گیا ہے۔“

ملکہ یوں چونک گئی جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو، عاطف کو معلوم ہو گیا ہو کہ میں نے کاشف کی تصویر دیکھ لی ہے۔ میں اگر اس وقت اس کے ساتھ نہیں گئی تو وہ یہی سمجھے گا کہ میں کاشف کی تصویر دیکھنے کے لیے رک گئی ہوں۔ یہ اس کے دل کی آواز تھی جو اس کے کانوں تک آ رہی تھی۔ وہ چلنے کے لیے تیار ہو گئی۔

”کمال ہے! ابھی انکار ابھی اقرار۔“

”آپ پر رحم آ گیا۔“

”رحم تو اس پر آتا ہے جس سے محبت نہیں ہوتی۔“

”کبھی کبھی یہ دونوں رشتے ایک چھت کے نیچے جمع ہو جاتے ہیں۔“

”دو کشتیوں میں سفر کتنا مشکل ہوتا ہوگا۔“

”اب آپ کو معلوم ہوا میرا رنگ پیلا کیوں نظر آ رہا تھا۔“

وہ باتیں بھی کرتی رہی اور تیار بھی ہوتی رہی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اسے کاشف کا خیال آ گیا۔ جی چاہتا تھا کوئی اس کی باتیں کرے۔

”سنا ہے آپ کا کوئی چھوٹا بھائی بھی ہے؟“

”سنا ہے کیا مطلب؟“

”آج میں نے اس کی تصویر دیکھی تو امی جان نے بتایا۔“

”صاحب زادے لندن گئے ہوئے ہیں پی ایچ ڈی کرنے۔ اردو کا بھوت سوار ہے ان پر۔ کم از کم مجھ سے تو یہی کہا ہے کہ لندن جا رہے ہیں۔“

”جب کہا ہے تو گئے بھی ہوں گے۔“

”ارے نہیں۔ تم نہیں جانتیں اسے۔ ایک مرتبہ اور غائب ہو گیا تھا محض یہ جاننے کے لیے کہ ہم اس سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ اسے تلاش کرتے ہیں یا نہیں۔ واپس آیا اور ہمیں خوش و خرم دیکھا تو بہت مایوس ہوا۔ اس کا خیال تھا ہم سب گریبان پھاڑ کر جنگل میں نکل گئے ہوں گے۔“

”ایسی محبت کرنے والے بھائی کے بغیر ہی آپ نے شادی کر لی۔“

”اس کے جانے کے بعد شادی کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ بلایا اس لیے نہیں کہ یہاں سے جانے کے بعد نواب صاحب نے خیر ہی نہیں لی ورنہ تمہاری تصویر تو ضرور بھیجتا کہ دیکھو پاکستان میں ایک ہی ہے جو اب ہمارے پاس ہے۔“

”جلدی کیا ہے، دو چار سال میں آئے تو خود ہی دیکھ لیں گے۔“

”مجھے وہ بہت عزیز ہے۔ زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا۔“

”آپ کو ایسی کیا جلدی ہو گئی۔ جب آنا ہوگا آ جائے گا۔“ یہ بیزار جملہ اچانک اس کی زبان سے ادا ہو گیا۔

”وہ آئے گا تو تمہیں خوشی نہیں ہوگی؟“

”میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں تو یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ ہم گھومنے نکلے ہیں تو کچھ اپنی باتیں کریں۔ کاشف کی باتیں لے کر بیٹھ گئے۔“

”یہ بھی اپنی ہی باتیں ہیں۔ پھر بھی تم کہتی ہو تو نہیں کرتے کاشف کی باتیں۔“

اتنی دیر میں وہ مارکیٹ آ گئی تھی جہاں عاطف کو آنا تھا۔ اس نے گاڑی پارک کی اور ملکہ کے ساتھ مارکیٹ میں داخل ہو گیا۔ وہ کہتی رہ گئی کہ ابھی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ کپڑوں سے الماری بھری ہوئی ہے لیکن عاطف نے پھر بھی دو شاندار جوڑے اسے دلوا دیے۔

”ایک شرٹ کاشف کے لیے بھی لے لیجیے۔“

”وہ ابھی آیا ہے نہیں اور اتنی ہمدردی ہو گئی۔“

”آپ کا اتنا عزیز بھائی ہے۔ ہمدردی تو مجھے ہوگی ہی۔“

”جب آ جائے تو ساری ہمدردیاں پوری کر لینا۔ فی الحال تو چشم کرم ہم پر رہے تو اچھا ہے۔“

”خیر سنا ہے کہیں وہ آ نہ جائے۔“

اس وقت تو وہ واقعی ہلکے پھلکے موڈ میں تھی کیونکہ عاطف اس کے ساتھ تھا۔ دو چار دن عاطف گھر پر ہی رہا اس لیے سوچنے کا وقت نہیں ملا لیکن جونہی عاطف نے آفس جانا شروع کیا اور کاٹنے کے لیے لمبے دن اسے مل گئے تو کاشف کی یادوں نے اس کا گھیراؤ کر لیا۔ کچھ دیر وہ اس کی باتیں، اس کی شرارتیں یاد کرتی رہتی اور پھر اس خوف میں مبتلا ہو جاتی کہ وہ آ گیا تو کیا ہوگا۔ میرا اس سے اب کوئی رشتہ ہی نہیں۔ میں اسے سمجھا دوں گی کہ اب میں تمہارے بھائی کی بیوی ہوں۔ کیا وہ میرے سمجھانے سے باز آ جائے گا؟ اگر وہ نہ مانا...... اگر وہ انتقام پر اتر آیا تو' اس نے کہا تھا میں اگر کسی اور کی ہو گئی تو وہ یا تو اسے قتل کر دے گا جس نے مجھے چرایا ہوگا یا خودکشی کر لے گا۔ کیا میں یہ دونوں حالتیں برداشت کر لوں گی؟ اس کو تو چھوڑو کیا اس کے آنے پر میں اپنے جذبات پر قابو رکھ سکوں گی؟

وہ ایسی تکلیف دہ الجھن میں گرفتار تھی کہ جس سے فرار کا راستہ اسے نظر نہ آتا تھا۔ ڈرائنگ روم میں جانے سے گریز کرتی تھی لیکن کوئی نہ کوئی مہمان آ ہی جاتا تھا اور اسے ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ سوچا تھا کہ وہ کاشف کی تصویر کو کہیں اٹھا کر رکھ دے لیکن وہ کسی کو شک میں مبتلا کرنا نہیں چاہتی تھی۔

اتنی احتیاط کے باوجود یہ شک ایک دن عاطف کی زبان پر آ ہی گیا۔

”میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کاشف کی تصویر دیکھ کر چونک پڑتی ہو۔ تم نے اسے کہیں دیکھا تو نہیں ہے؟“

”جی ہاں، تلاش گمشدہ کے اشتہار میں دیکھا تھا۔“ وہ ہنسنے لگی۔ ”آپ کمال کرتے ہیں، جب سے میں آئی ہوں تصویر ہی دیکھ رہی ہوں۔“

”وہ تمہارے شہر میں رہ چکا ہے، تمہاری طرح تقریری مقابلوں میں بھی حصہ لیا کرتا تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید تم نے کسی مقابلے میں اسے دیکھا ہو۔“

”اتنے لڑکے لڑکیاں ان مقابلوں میں آتے تھے۔ کون نظر میں رہتا ہے۔“

عاطف یہ سن کر خاموش ہو گیا تھا لیکن ملکہ کے دل کا چور شور مچا رہا تھا۔ بات ابھی یہاں تک آئی ہے کسی دن یہ راز کھل بھی جائے گا کہ میں اسے پہلے سے جانتی تھی۔

اسی سوگوار فضا میں اس کا رزلٹ آ گیا۔ وہ سب کچھ بھول کر اس خوشی میں مگن ہو گئی کہ اب وہ ڈاکٹر بن گئی ہے۔ اس کے پاس ہونے کی خوشی میں ایک پارٹی یہاں بھی ہوئی۔ اس پارٹی میں فاخرہ اور عباد اللہ خاں بھی آئے ہوئے تھے۔

ماں کو دیکھ کر ملکہ کا دل بھر آیا۔ ماں نے کہا تھا کہ اگر آنے والا آیا بھی تو پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ اس کا جی چاہا کہ اپنی ماں سے چیخ چیخ کر کہے کہ آنے والا آیا نہیں ہے مگر اس کا سراغ مل گیا ہے۔ اب وہ پچھتا رہی ہے کہ اس نے مزید انتظار کیوں نہیں کر لیا۔ شادی ہونی ہی تھی تو کسی اور جگہ ہو جاتی۔ وہ کس طرح زندگی بھر کاشف کا سامنا کر سکے گی۔ وہ ماں کے گلے لگی تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی لیکن سب یہی سمجھے کہ اتنے دن بعد ماں کو دیکھا ہے تو دل بھر آیا۔ اس کے رونے کا سبب کوئی نہ جان سکا۔

اب ہاؤس جاب کا مسئلہ تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی بڑے اسپتال میں ہاؤس جاب کرے۔ محراب پور میں سرکاری اسپتال تھا ضرور لیکن بس واجبی سا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے عاطف سے ذکر کیا کہ وہ ہاؤس جاب کرنے کے لیے اپنے گھر چلی جائے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ اجازت کبھی نہیں ملے گی لیکن عاطف نے اسے اجازت دے دی۔ وہ یوں اپنے والدین کے ساتھ اپنے میکے آ گئی جیسے قید سے پنچھی رہا ہوتا ہے۔

عاطف بارہ پندرہ دن میں آ کر اسے لے جاتا تھا یا وہ خود چلی جاتی تھی۔ شب و روز انہی مصروفیات میں گزر رہے تھے۔ ایک دن وہ پرانے دوستوں سے ملنے ریڈیو چلی گئی۔ وہاں اس کی ملاقات امجد سے ہوئی۔ امجد کو وہ بہت سے تقریری مقابلوں میں دیکھ چکی تھی۔ اب ا

پروڈیوسر بن گیا تھا۔ باتوں باتوں میں کاشف کا ذکر نکل آیا۔ کاشف کا نام آتے ہی امجد نے عجیب انکشاف کیا۔

"کیا ٹیلنٹ تھا جو اس شہر کی سڑکوں پر ضائع ہو گیا۔"

"کیا ہوا کاشف کو۔"

"پوری بات تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ سنا ہے کسی لڑکی نے اس سے بے وفائی کی تھی۔ وہ کچھ دن تو شہر کی سڑکوں پر دیوانوں کی طرح گھومتا رہا پھر اچانک غائب ہو گیا۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں کہاں گیا۔"

"کون تھی وہ لڑکی۔ کچھ پتا چلا۔"

"یہ تو معلوم نہیں۔ بس اتنا معلوم ہے کہ کاشف اس لڑکی کو ستانے کے لیے یا امتحان لینے کے لیے غائب ہو گیا تھا۔ واپس آیا تو اس لڑکی نے کہیں اور شادی کر لی تھی۔"

"بے چارہ کاشف۔ کتنا اچھا لڑکا تھا وہ۔" ملکہ نے افسردگی سے کہا اور اس کے کمرے سے اٹھ آئی۔

اب کسی اور سے کیا ملنا۔ وہ اپنے قدموں پر چل ضرور رہی تھی لیکن یہ اس کا حوصلہ تھا جو اسے اس کی گاڑی تک لے آیا تھا۔ اس نے گاڑی میں بیٹھ کر اے سی آن کر دیا اور سوچنے لگی۔ واقعات کی کڑیاں ملائیں تو تصویر بالکل صاف نظر آنے لگی۔ کاشف اس کا امتحان لینے کے لیے اس سے دور ہو گیا تھا۔ اپنے گھر گیا، ایک مذاق گھر والوں سے کیا۔ ان سے کہا وہ لندن جا رہا ہے اور دوستوں کے ساتھ کہیں نکل گیا۔ واپس آ کر اس نے مجھے فون کیا ہوگا لیکن شادی کے بعد میں نے "سم" بدل لی تھی۔ رابطہ نہیں ہوا تو اس نے گھر کے نمبر پر فون کیا ہوگا۔ اسے معلوم ہوا ہوگا کہ ملکہ کی شادی ہو گئی ہے۔ پھر وہ کچھ دن بقول امجد سڑکوں پر دیوانوں کی طرح گھومتا رہا اور پھر کسی طرف نکل گیا۔ خدا جانے کہاں ہوگا؟

اس کا مطلب ہے وہ لندن نہیں گیا۔ یہیں کہیں ہے اور کسی وقت بھی گھر لوٹ کر آ سکتا ہے۔ آنے دو، میں اسے پہچاننے ہی سے انکار کر دوں گی۔ میں کہہ دوں گی میں وہ ملکہ ہوں ہی نہیں۔ اور یہ میں اس کے بارے میں سوچ بھی کیوں رہی ہوں۔ میں شادی شدہ عورت ہوں، کسی اور کے بارے میں سوچنا بھی میرے لیے گناہ ہے۔ میں اب تک اس کے انتظار میں زندگی گزار دیتی لیکن وہ تو غائب ہو گیا تھا۔ جتنا میں ڈھونڈ سکتی تھی میں نے ڈھونڈا۔ وہ موجود ہی نہیں تھا تو میں کس کے لیے لڑتی۔

وہ کسی قدر پرسکون ہو گئی تھی۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گھر چلی آئی۔ وہ اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی لیکن گھر پہنچتے ہی ایک ادھورے خیال نے پھر آواز دے لی۔ اس نے تو اپنے شہر کا نام سلطان پور بتایا تھا اور میں رخصت ہو کر محراب پور گئی ہوں۔ یہ ماجرا کیا ہے؟ اس کا جواب بھی اسے جلد مل گیا۔ سرکاری ملازمتوں میں ٹرانسفر ہوتے رہتے ہیں۔ عاطف کا ٹرانسفر سلطان پور سے محراب پور ہو گیا ہوگا اور یہی وہ دن ہوں گے جب میں سلطان پور والے گھر کا نمبر ملاتی رہی تھی۔ وہ سرکاری مکان اس وقت خالی پڑا ہوگا۔

اس کی ہاؤس جاب مکمل ہونے والی تھی۔ اس کا دل پھر دھڑکنے لگا تھا کہ پھر اسی گھر میں جانا ہوگا اور یہی ہوا۔ ہاؤس جاب مکمل ہوتے ہی عاطف اسے لینے کے لیے آ گیا۔ اس کا جی چاہا انکار کر دے مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا، اسے جانا پڑا۔

اتنے بڑے گھر میں کاشف کی تصویر کے ساتھ وہ پھر اکیلی تھی۔ اس نے گھبرا کر نوکری کر لی۔ دن بھر اسپتال میں گزر جاتا۔ واپس آتی تو عاطف کے ساتھ کہیں باہر چلی جاتی۔ رات کی ڈیوٹی ہوتی تو دن کا بیشتر حصہ سوتے ہوئے گزر جاتا۔ سوچنے کے لیے نہ تو وقت تھا نہ ضرورت۔

اس دن وہ اسپتال سے آ کر بیٹھی تھی۔ عاطف بھی اسی وقت پہنچا تھا۔ اطلاعی گھنٹی بجی اور کچھ ہی دیر میں ملازم بھاگتا ہوا آیا۔ "مالک! کاشف بابو آئے ہیں۔"

"کیا کہا کاشف آیا ہے۔ بھیجو اسے یہاں۔ شرارتی کہیں کا۔" عاطف نے کہا اور پھر خود ہی اٹھ کر باہر کی طرف بھاگا۔ اس کے پیچھے ملکہ بھی دوڑ پڑی۔ اس نے دور سے دیکھا۔ وہ کاشف نہیں تھا، اس کی ہڈیاں تھیں جو چل رہی تھیں۔ وہ گھبرا کر کمرے کی طرف لوٹ گئی۔ یہ ہڈیاں اس کے کمرے میں داخل ہو گئیں۔ عاطف ان ہڈیوں کو سمیٹے ہوئے تھا۔

"ملکہ، دیکھو تو کون آیا ہے۔" عاطف نے کہا۔ پھر وہ کاشف سے مخاطب ہوا۔ "اپنی بھابی سے نہیں ملو گے۔"

"اچھا تو وہ یہ ہیں جن سے آپ نے شادی رچائی ہے؟"

"دیکھی ہے ایسی خوبصورت لڑکی تم نے؟"

"دیکھ تو رہا ہوں۔" اس کی آنکھوں میں ایسی حقارت تھی کہ ملکہ نے آنکھیں جھکا لیں۔

"فکر مت کر یار۔ اب تو آ گیا ہے، تیرے لیے اس سے بھی خوب صورت لڑکی لائیں گے۔"

"اب کہاں زمانے میں دوسرا جواب ان کا۔ یہ تو لگتا ہے بس ایک ہی بنی تھیں۔ انہیں آپ نے اڑے اب کیسی تلاش۔"

وہ کمرے سے یوں بھاگ کھڑا ہوا جیسے سانپ نکل آیا ہو۔ بس یہ کہتا گیا کہ وہ ماں کے پاس جا رہا ہے۔ بچی وفا وہیں ملے گی۔ عاطف بھی اس کے ساتھ ہی کمرے سے نکل گیا۔

وہ کمرے میں تنہا رہ گئی تھی۔ وہ کاشف کی حالت دیکھ کر خود کو ایسا مجرم سمجھ رہی تھی جسے پھانسی کی سزا ہونی چاہیے۔ اس نے سوچا، وہ اگر ذرا سی ہمت کر لیتی اور عاطف سے شادی نہ کرتی تو کاشف کی یہ حالت دیکھنے کو نہ ملتی۔ اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن آنسوؤں نے بغاوت کر دی۔ وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اسی وقت عاطف کمرے میں داخل ہوا۔

"ارے تم رو رہی ہو۔ آج تو خوشی کا دن ہے۔"

"میں کاشف کی حالت پر رو رہی ہوں۔ دیکھتے نہیں اس کی کیا حالت ہوگئی ہے۔ اپنی تصویر سے کتنا مختلف ہوگیا ہے۔ نہ جانے کس راہ سے گزرا ہے، کس حال میں رہا ہے۔"

"واقعی دکھ تو مجھے بھی ہوا ہے۔ گھر کا آرام ملے گا۔ تم اور ماں جی اس کا خیال رکھنے کے لیے ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کیا کر رہا ہے وہ؟"

"ماں سے باتیں کر رہا ہے۔ چلو تم بھی چلو۔"

"اتنے دن بعد آیا ہے۔ کرنے دو ماں سے باتیں۔ اب تو وہ آگیا ہے باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔" ملکہ کچھ دیر کے لیے چپ ہوئی پھر آئندہ کے اندیشے عاطف کے سپرد کر دیے۔ "میرا خیال ہے کاشف کو کسی لڑکی سے محبت ہے، اس کی بے وفائی نے اس کا یہ حال کیا ہے۔ آپ ذرا کاشف سے پوچھیے گا تو۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ میں اس کو اعتماد میں لوں گا۔ شاید کچھ بتا دے۔ یہ بھی معلوم کرنا پڑے گا کہ وہ لندن گیا بھی تھا یا نہیں۔"

"اس کی ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہے کہ وہ ہر لڑکی میں اس لڑکی کو تلاش کر رہا ہے جو اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں، مجھے دیکھتے ہی اس کے لہجے میں کیسی تلخی آگئی تھی جیسے وہ لڑکی میں ہی ہوں۔"

"ہاں انداز تو ایسا ہی تھا۔"

"آپ لوگ نہ سمجھیں مگر میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ اس کی ذہنی حالت کو سمجھ سکتی ہوں۔ اگر اس کے تصور نے مجھے وہ لڑکی سمجھ لیا تو طنز کے ایسے تیر برسائے گا کہ اس گھر میں میرا رہنا مشکل ہو جائے گا۔ کل کو وہ کھل کر بھی کہہ سکتا ہے کہ وہ لڑکی میں ہی ہوں۔ اگر اس نے کہہ دیا اور آپ نے یقین کر لیا تو میں تو کہیں کی نہ رہوں گی۔"

"اس ذہنی کیفیت کا کوئی علاج بھی تو ہوگا۔"

"علاج تو یہی ہے کہ وہ لڑکی اسے مل جائے۔ نہیں تو اسے ذہنی امراض کے اسپتال میں داخل کرانا پڑے گا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ خود ہی اس بے وفا کو بھول جائے۔ آپ اس سے بات کر کے تو دیکھیں۔ اس کے جواب سے یہ اندازہ تو ہو جائے گا کہ اس کا مرض کس منزل پر ہے۔"

"میں کوشش کرتا ہوں۔"

"یہ بات گھر میں نہ کیجیے گا۔ ایسے لوگ گھر کے بڑے شیر ہوتے ہیں۔ چیخنے چلانے لگے گا۔ گھر سے باہر اسے یہ احساس ہوگا کہ وہ گھر سے باہر ہے۔"

"آج رات تو میں یوں بھی چاہوں گا کہ وہ آرام سے سو جائے۔ کل ہی کوئی بات کروں گا۔"

"اتنے دنوں میں تو وہ رات کی نیند بھی بھول گیا ہوگا۔ میں آپ کو ایک ٹیبلٹ دیتی ہوں وہ اسے کھلا دیجیے گا۔ اس کے بغیر اسے نیند نہیں آئے گی۔"

"میں یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ اتنے دن کس دوست کے پاس رہا۔ اس دوست سے شاید یہ معلوم ہو سکے کہ وہ لڑکی کون تھی۔ اگر اس کی شادی نہیں ہوئی تو میں ان غلط فہمیوں کو دور کر دوں جو دونوں کے درمیان پیدا ہوگئی ہیں۔"

"ایسا ہرگز مت کیجیے گا عاطف۔ وہ دوست اول تو آپ کو کچھ بتائے گا نہیں۔ اگر بتا بھی دیا تو کاشف کو بھی ضرور بتائے گا۔ اس ذہنی کیفیت کے لوگ یہ ہرگز برداشت نہیں کرتے کہ ان کا راز کسی پر ظاہر ہو۔ اس کا راز کھل گیا تو وہ کوئی بھی قدم اٹھا سکتا ہے۔ وہ خود ہی بتا دے تو الگ بات ہے۔ پاگل آدمی کسی کا بھی نام لے سکتا ہے۔"

وہ رات آرام سے گزر گئی۔ صبح ہوئی تو ملکہ وقت سے پہلے ہی اسپتال چلی گئی۔ اسے یہ ڈر تھا کہ کاشف جاگ گیا تو سوال جواب ضرور کرے گا۔ عاطف بھی جا چکا تھا اور وہ اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ شام کو بھی جان بوجھ کر دیر سے گھر آئی لیکن یہ سوچ ضرور رہی تھی کہ بکرے کی ماں

کب تک خیر منائے گی۔

وہ گھر پہنچی تو یہ سن کر خوشی ہوئی کہ عاطف اسے لے کر باہر گئے ہیں۔ وہ اپنی ساس کے پاس جا کر بیٹھ گئی کہ شاید کاشف سے متعلق کوئی بات معلوم ہو۔ معلوم ہوا تو صرف اتنا کہ کاشف کہہ رہا تھا، وہ پھر یہاں سے چلا جائے گا۔ اس گھر میں اس کے دوست نہیں دشمن رہتے ہیں۔ اس کا یہاں دم گھٹ رہا ہے۔

اس کی ساس روتی جا رہی تھیں اور اسے بتاتی جا رہی تھیں۔ ملکہ نے انہیں تسلی دی کہ ایسے لوگ توجہ حاصل کرنے کے لیے ایسی دھمکیاں دیتے رہتے ہیں۔ قوت ارادی ایسی کمزور ہو جاتی ہے کہ جو کہتے ہیں وہ بھی نہیں کرتے۔ آپ فکر نہ کریں رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

وہ اپنے کمرے میں چلی آئی اور سوچنے لگی کہ کچھ دن کے لیے اپنے میکے چلی جائے لیکن پھر اس نے یہ فیصلہ بدل دیا۔ کاشف کو حقائق کا سامنا کرنا چاہیے۔ وہ کچھ دن تڑپے گا، طنز کے تیر برسائے گا۔ پھر سمجھ جائے گا کہ حقیقت وہی ہے جو وہ دیکھ رہا ہے۔ پھر اسی پر اکتفا کر لے گا کہ میں اس کی نہیں، اس کے سامنے تو ہوں۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ میں نے یہ تو نہیں چاہا تھا کہ ہم دونوں مل کر بھی دور رہیں۔ اس نے کمرا بند کیا اور اپنی بے بسی پر خوب روئی۔

وہ خوشی اور دکھ کے عجیب دوراہے پر آن کھڑی ہوئی تھی۔ خوشی یہ تھی کہ کاشف زندہ ہے۔ دکھ یہ تھا کہ وہ اس کا ہے یہ سوچنا بھی اب اس کے لیے گناہ تھا۔ عاطف نے بھی کہا تھا کہ دو کشتیوں پر سفر کرنا کتنا مشکل ہے۔ اس کا احساس اسے اب ہو رہا تھا۔

اس کے آنسو ابھی خشک نہیں ہوئے تھے کہ عاطف آگیا۔ اس نے پھر دیکھا کہ ملکہ کی آنکھیں آنسوؤں کے بوجھ سے جھک گئی ہیں۔

"ملکہ، کہیں تمہیں کاشف کا لوٹ آنا ناگوار تو نہیں لگا ہے؟"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ دیور تو بھابیوں کے گلے کا ہار ہوتے ہیں۔ میری آنکھیں تو اس کی حالت دیکھ کر بھیگ جاتی ہیں۔ یہ میری محبت نہیں تو اور کیا ہے۔"

"تم اس کے سامنے جانے سے بھی گریز کرتی رہی ہو۔"

"صرف اس لیے کہ اس کے زخم مجھے دیکھ کر مزید ہرے ہو جائیں گے۔ وہ سوچے گا، اس کا کھلونا ٹوٹ گیا ہے۔ تمہیں تمہاری مطلوبہ چیز مل گئی۔ میں اس کے سامنے کم ہی جاؤں تو اچھا ہے۔"

"ایک گھر میں رہ کر ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"آپ کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات کر دی تو آپ ہی کو برا لگے گا۔"

"میں سمجھ رہا ہوں اس کی کیفیت کو۔"

"پھر آپ چلیں، میں آتی ہوں۔"

"میں کھانے پر تمہارا انتظار کروں گا۔"

اس نے اپنا حلیہ درست کیا۔ کچھ سانس کو قابو میں کیا اور باہر نکل آئی۔ سب لوگ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ چکے تھے۔ وہ بھی اس طرف بڑھ گئی۔ کاشف نے اسے بیٹھتے ہوئے دیکھ کر فقرہ اچھالا۔

"دیکھو تو اماں، کون آیا ہے۔ بھائی جان کی دلہن کی بھی ہمت ہوگئی کہ سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائیں اور وہ بھی گھر میں۔ یہ تو بڑے بڑے ہوٹلوں میں کھانا کھاتی رہی ہوں گی۔"

"خبردار، یہ بھائی جان کی دلہن نہیں تیری بھابی ہے، بھابی کہا کر۔"

"اتنا کڑوا لفظ مجھ سے نہیں بولا جاتا۔"

"تمہاری بڑی بھابی ہے کچھ تو لحاظ کرو۔"

"میں تو انہیں ملکہ ہی کہوں گا۔ یہ نام کچھ زبان پر چڑھ گیا ہے۔"

"شریر کہیں کا۔ دو دن ہوئے نہیں اور نام زبان پر چڑھ گیا۔"

"یہ نام ہے ہی اتنا پیارا، میں کیا کروں۔"

"اچھا خاموشی سے کھانا کھاؤ۔"

"خاموش ہی تو ہوں۔ ان سے کہو یہ بھی تو کچھ بولیں۔ سنا ہے تقریریں تو یہ بہت اچھی کرتی تھیں۔"

"وہ کیا بولے۔ تم تو آتے ہی اس کے پیچھے پڑ گئے ہو۔"

"وقت وقت کی بات ہے اماں۔ کبھی کوئی پیچھے پڑتا ہے کبھی کسی کے پیچھے پڑنا پڑتا ہے۔"

عاطف خاموشی سے سن رہا تھا۔ ملکہ کے بدن میں کاٹو تو خون نہیں تھا۔ کھانے کے دوران بھی وہ ذومعنی فقرے بولتا رہا۔ ملکہ نے جیسے تیسے کھانا ختم کیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

کچھ دیر بعد عاطف کمرے میں آیا۔ اس کی کیفیت صاف بتا رہی تھی کہ وہ کسی الجھن کا شکار ہے۔ الجھن کیا وہ بھی کاشف کی باتوں سے پریشان ہوا ہوگا۔ وہ سمجھ رہی تھی

لیکن خود کیوں پوچھتی۔

وہ سونے کے لیے لیٹے تو عاطف نے اس سے عجیب سا سوال کر دیا۔

"کاشف اور تم ایک دوسرے کو پہلے سے تو نہیں جانتے؟"

"یہ بات آپ پہلے بھی کہہ چکے ہیں۔ دہرانے کا مطلب یہ ہے کہ آپ سنجیدہ ہیں۔ آپ کے بھائی کو آئے ہوئے دو دن ہوئے نہیں کہ مجھے اس الزام کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔"

"جان، میرا مطلب تمہارا دل دکھانا نہیں تھا۔ میں تو یہ پوچھ رہا تھا کہ پھر وہ ایسی باتیں کیوں کرتا ہے؟ تم نے دیکھا، کھانے کی میبل پر وہ کیا باتیں کر رہا تھا۔"

"میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ ایسی باتیں کرے گا۔ اسے کسی کے پیار میں بے وفائی ملی ہے۔ اب وہ ہر لڑکی کو اسی بے وفا لڑکی کے روپ میں دیکھ رہا ہے۔ جو باتیں وہ اس لڑکی سے کہنا چاہتا ہے، وہ مجھے دیکھ کر کر رہا ہے۔ ایک دن وہ یہ بھی کہہ دے گا کہ وہ لڑکی میں ہوں۔"

"اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ وہ پاگل ہو گیا ہے۔"

"یہ بھی پاگل پن کی ایک قسم ہے۔ اس میں کمی بھی آسکتی ہے، اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے آپ سے کہا تھا اس سے معلوم تو کریں۔ ذرا پتا تو چلے میرا اندازہ کتنا صحیح ہے۔"

"میں نے معلوم کیا تھا۔"

"کیا کہتا ہے؟"

"بس اتنا بتایا کہ اس کی ملاقات ایک لڑکی سے ہوئی تھی۔ وہ اسے آزمانے کے لیے کچھ دن کے لیے اس سے دور ہو گیا۔ واپس آیا تو اس لڑکی نے خودکشی کر لی تھی۔"

"وہ آدھا سچ بتا رہا تھا۔ مرنے والوں کا صبر آجاتا ہے۔ اگر اس لڑکی نے خودکشی کر لی ہوتی تو وہ اس لڑکی کو نہیں خود کو قصوروار کہتا۔ اس لڑکی نے کہیں اور شادی کر لی ہو گی۔ اس لیے وہ اتنا تلخ ہو گیا ہے۔"

"یہ آج کل کی لڑکیوں کو بھی نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ محبت کسی سے کرتی ہیں، شادی کہیں اور کر لیتی ہیں۔"

"لڑکیاں بھی کیا کریں۔ وہ تو بے چاری مجبور ہوتی ہیں۔ ماں باپ کے دباؤ میں آجاتی ہیں اور پھر کاشف کی بھی تو غلطی ہی تھی۔ وہ لڑکی اسے ڈھونڈتی رہی ہو گی اور شادی کا وقت آ گیا ہو گا۔"

"کاشف کی زندگی تو برباد کر دی اس نے۔"

"زندگی ایک جگہ رک نہیں جاتی۔ وقت ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے۔ ہم سب کو مل کر کاشف کے زخموں پر مرہم رکھنا ہے۔ وہ اگر مجھ پر اپنا غصہ اتار رہا ہے تو اتارنے دیجیے۔ آہستہ آہستہ نارمل ہو جائے گا لیکن اگر آپ نے مجھ پر شک کیا تو مجھ سے یہ برداشت نہیں ہو گا۔"

ملکہ نے اپنی دانست میں اپنی بے گناہی کا یقین دلا دیا تھا لیکن وہ یہ بھی سمجھ رہی تھی کہ کسی دن یہ سیلاب آئے گا اور سب کچھ بہا کر لے جائے گا۔ کاشف کی اذیت پسندی کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتی ہے۔ کہیں اس کا پاگل پن عاطف کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ وہ بہت دیر تک سوچتی رہی۔ عاطف کب کا سو چکا تھا۔

کاشف کی گستاخیاں روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھیں۔ وہ بات کرتے کرتے اچانک کوئی جملہ ایسا کہہ دیتا کہ اس کی ساس چونک کر اس کی طرف دیکھتی۔ عاطف گھر میں ہوتا تو اس کی آنکھوں میں شک کے سائے لہرانے لگتے۔ اب کاشف کی باتوں میں شرارت نہیں بغاوت نظر آنے لگی تھی۔ اب ضروری ہو گیا تھا کہ ملکہ اس سے بات کرے۔ اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر اس سے یہ کہے کہ یہ کیسی محبت ہے؟ وہ مجھے تکلیف پہنچا کر کیوں خوش ہو رہا ہے۔ اس سے کہے کہ اب وہ اپنی محبت میں آزاد نہیں۔ اب وہ شادی شدہ عورت ہے۔ اب وہ کسی کی عزت ہے۔

ملکہ نے موقع دیکھ کر کاشف کو اپنے کمرے میں بلایا۔

"کیا تم میرے ساتھ کچھ دیر کے لیے گھر سے باہر چل سکتے ہو۔"

"میرے ساتھ بھاگ رہی ہو؟ کیا عاطف سے بھی دل بھر گیا۔ واہ بھئی واہ! بھابی ہو تو ایسی۔"

"بکواس مت کرو۔ میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں جو یہاں بیٹھ کر نہیں ہو سکتی۔"

"چلیے باہر چلیے۔ ہم تو آج بھی آپ کے غلام ہیں۔"

وہ اسے کسی ہوٹل میں بھی لے جا سکتی تھی لیکن وہ سب کے سامنے تماشا نہیں بن سکتی تھی۔ کیا خبر اس کا رویہ کیسا ہو، وہ کتنی زور سے چیخے۔ اس نے ایک ویران جگہ پر لے جا کر گاڑی روک دی۔

"کاشف، یہاں میں تمہیں یہ کہنے کے لیے لائی ہوں کہ اگر تم حواس کھو چکے ہو تو یہاں سے چلے جاؤ۔ میں

اب تمہاری گستاخیاں مزید برداشت نہیں کر سکتی۔"

"صرف یہ کہو گی...... یہ نہیں پوچھو گی کہ میں اتنے دن کہاں رہا، کیا کرتا رہا؟"

"یہ پوچھنا میرا کام نہیں، ان لوگوں کا کام ہے جو تمہاری ماں ہے، تمہارا بھائی ہے۔"

"تم سے میرا کوئی رشتہ نہیں؟"

"کبھی ہو گا مگر اب میں تمہارے بھائی کی بیوی ہوں۔ تمہاری بھابی ہوں۔"

"کیا بھابی بھابی لگا رکھی ہے۔ اسے عاطف کہو صرف عاطف...... جس نے تمہیں مجھ سے چھین لیا لیکن میں زیادہ دیر تمہیں اس کے پاس نہیں رہنے دوں گا۔"

"کیا کرو گے؟"

"ایسی ایسی کہانیاں سناؤں گا کہ عاطف تمہیں کھڑے کھڑے طلاق دے دے گا۔"

"کتنی گھٹیا سوچ ہے تمہاری۔"

"پھر میں اور کیا کروں۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ "میں نے تمہیں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا۔ مارا مارا پھرا ہوں تمہارے لیے۔ یہ دیکھو کیا حالت ہو گئی ہے میری۔ اب تم ملی ہو تو کہتی ہو عاطف کی دلہن ہو۔ قتل کر دوں گا میں اسے۔ پھر تم اس کی دلہن نہیں رہو گی۔ میری دلہن بنو گی، میری۔ ایک گھر میں دو چاہنے والے نہیں رہ سکتے۔ تمہیں ہم دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہو گا۔"

"اب انتخاب کا وقت گزر گیا۔ یا تو مجھے بھول جاؤ یا یہاں سے چلے جاؤ۔"

"نہ میں جاؤں گا، نہ تمہیں بھولوں گا۔ تم میری ہو اور میری رہو گی۔"

"کاشف اسے قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لو۔"

کاشف کی عجیب حالت تھی۔ کبھی غصے میں آکر چیخنے لگتا تھا، کبھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا تھا۔ اس وقت بھی اس کا رو رو کر برا حال تھا۔

"کیا کروں ملکہ۔ بہت چاہتا ہوں تمہیں بھول جاؤں لیکن بھول نہیں پاتا۔ اب یہ میرے اختیار میں رہا ہی نہیں۔"

"تمہیں یہ اچھا لگتا ہے کہ مجھے تکلیف پہنچاؤ۔"

"تمہاری بے وفائی کی یہی سزا ہے۔ میں نے جو تکلیف اٹھائی ہے اس کا حساب کون دے گا۔"

"اب تم اپنے گھر میں رہو۔ سب تکلیفیں دور ہو جائیں گی۔"

"یہ میرا نہیں میرے رقیب کا گھر ہے۔ میں اسے قتل کر دوں گا۔" وہ پھر تلخ ہو گیا۔

"میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میرا سہاگ مجھ سے مت چھینو۔"

"پھر میں خودکشی کر لوں گا۔"

"میرے لیے یہ بھی ناقابل برداشت ہو گا۔"

"اس لیے کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔"

"میری محبت میرا شوہر ہے۔"

"ایک بار...... بس ایک بار کہہ دو کہ تم اب بھی مجھ سے محبت کرتی ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری دنیا سے نکل جاؤں گا۔ بس ایک بار کہہ دو کہ میرے جانے کے بعد تم مجھے یاد کیا کرو گی۔ ایک بار میری ملکہ بس...... ایک بار۔"

ملکہ سے اس کا یہ گڑگڑانا دیکھا نہیں گیا۔ اس نے سوچا کاشف کا علاج یہی ہے کہ اس وقت اس کا دل رکھا جائے۔ وہ میرے پیار میں موت کے قریب پہنچا ہے، میرا پیار ہی اسے زندگی کے قریب لائے گا۔ اس نے اس کا دل رکھ لیا۔

"میں تم سے کل بھی محبت کرتی تھی آج بھی کرتی ہوں، تمہاری یاد ہر وقت میرے دل میں آباد رہے گی۔"

"مجھے معلوم تھا تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ مسٹر عاطف نے اپنی دولت کا لالچ دے کر تمہارے ماں باپ کو مجبور کر دیا ہو گا۔ تم سے یہ شکایت ضرور ہے کہ تم مجبور کیوں ہو گئیں لیکن خیر، میرے لیے یہ اطمینان ہی بہت ہے کہ تم بیوی اس کی ہو لیکن محبت تو مجھ ہی سے کرتی ہو۔ چلو گھر چلو، تمہارا شوہر آ گیا ہو گا۔"

ملکہ نے گاڑی واپس موڑ لی۔ گھر کے قریب پہنچ کر ملکہ کو دھچکا سا لگا۔ عاطف کی جیپ گھر کے باہر کھڑی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کسی کام سے گھر آیا ہے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ عاطف کو یہ معلوم ہو کہ وہ کاشف کے ساتھ کہیں گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ گاڑی کو آگے لے جائے لیکن اسی وقت وہ اپنے گارڈ کے ساتھ گھر سے باہر نکلا، ملکہ کو گاڑی روکنی پڑی۔ عاطف نے کاشف کو اس کی گاڑی سے اترتے ہوئے دیکھا اور کچھ پوچھے بغیر ہی جیپ میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ ملکہ کا دل بند ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اس کا مطلب ہے شیطان کہیں آس پاس تھا۔ شک اپنا کام کر گیا۔ عاطف نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تم لوگ گئے کہاں تھے۔ اس نے سوچا ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا۔ عاطف

آئیں گے تو وہ انہیں مطمئن کر دے گی۔

عاطف قدرے دیر سے گھر آیا۔ انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خفا ہے۔ وہ اس کے لیے چائے لے کر آئی تو سامنے ہی بیٹھ گئی۔

''آپ نے یہ تو نہیں پوچھا کہ میں کاشف کو لے کر کہاں گئی تھی؟''

''ضرورت محسوس نہیں کی۔''

''اس لیے تو نہیں کہ آپ کو اس کے ساتھ میرا جانا اچھا نہیں لگا۔''

''مجھے صرف یہ اچھا لگا کہ چلو میں نہ سہی، کاشف تو خوش ہو گیا ہوگا۔''

''میں اسے ساتھ لے کر اس لیے گئی تھی کہ شاید مجھے کچھ بتا دے کہ وہ لڑکی کون تھی جس کے عشق میں وہ پاگل ہو رہا ہے۔''

''شاید بتا دیا اس نے کیونکہ میں اس کے پاس سے ہوتا ہوا آ رہا ہوں، خاصا مطمئن نظر آ رہا ہے جیسے کوئی بوجھ اتر گیا ہو۔''

''وہ مطمئن صرف اس لیے نظر آ رہا ہوگا کہ کسی نے اس سے محبت سے بات کی ورنہ اس نے بتایا تو مجھے بھی کچھ نہیں۔''

''چلو پوچھتی رہنا۔ کسی دن تو کچھ بتا ہی دے گا۔''

''آپ مجھ سے ایسی اکھڑی اکھڑی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟''

''اس لیے کہ میں کاشف کے مسئلے پر بہت پریشان ہوں۔''

''آپ پریشان نہ ہوں۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ کی پریشانی بہت جلد ختم ہو جائے گی۔''

''سچ! کیا بات ہو گئی ہے۔''

''کہہ رہا تھا کہ میں اب زندگی کی طرف لوٹ کر آنا چاہتا ہوں۔''

''کمال ہے! جو کام کوئی نہیں کر سکا، وہ تم نے کر دکھایا۔''

ملکہ نے اس کے بعد کوئی بات کرنی مناسب نہیں سمجھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ عاطف کے دل میں شک کا بیج پیدا ہو گیا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ احساس شاید زائل ہو جائے۔

اب تو ہر بات وقت پر چھوڑی جا سکتی تھی۔ اس نے بھی ایک ٹھنڈی سانس بھری اور چائے کا کپ اٹھا کر باہر نکل گئی۔

وہ رات اس طرح گزری کہ عاطف اپنے ذہن میں کچھ سوچ رہا تھا، ملکہ اپنے دل سے کچھ پوچھ رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔

دوسرے دن وہ اسپتال جانے کے لیے تیار ہوئی تو ساس کے پاس بھی چلی گئی۔ یہ دیکھنا بھی تھا کہ کاشف سو کر اٹھا یا نہیں۔ اس کی ساس نے اسے بتایا کہ وہ کچھ بتائے بغیر گھر سے نکل کر کہیں گیا ہے۔ ملکہ کو یہ سن کر خوشی ہوئی۔ اس کا مطلب ہے، وہ زندگی کی طرف لوٹنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ جب کوئی بیمار شخص باہر کی دنیا میں دلچسپی لینے لگے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ تیزی سے صحت یاب ہو رہا ہے۔

اب کاشف نے یہی معمول بنا لیا تھا۔ صبح ہوتے ہی کہیں نکل جاتا اور شام کو لوٹ آتا۔ ماں کے پاس بیٹھ کر کچھ دیر باتیں کرتا۔ ملکہ سے آمنا سامنا ہو جاتا تو ایک آدھ طنزیہ فقرہ اچھال دیتا مگر اب ان فقروں میں وہ تلخی نظر نہیں آ رہی تھی۔ عاطف بھی کچھ مطمئن سا نظر آ رہا تھا جیسے ملکہ کی طرف سے جو کدورت اس کے دل میں آ گئی تھی، وہ نکل گئی ہو۔

تقریباً پندرہ دن گزر گئے تھے۔ وہ حسب معمول اسپتال میں تھی۔ عاطف کا فون آیا کہ وہ فوراً گھر پہنچے۔ یا اللہ خیر! اس کی زبان سے نکلا اور وہ گھر پہنچ گئی۔ گھر کا تو منظر ہی دوسرا تھا۔ اس کی ساس بے ہوش تھیں۔ ڈاکٹر ان کے سرہانے بیٹھا تھا۔ عاطف کسی کو فون کر رہا تھا۔ وہ یہی سمجھی تھی کہ اس کی ساس کی طبیعت خراب ہوئی ہوگی اسی لیے اسے بلایا گیا ہے۔

''کاشف گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔'' عاطف نے فون کرنے کے بعد اسے بتایا اور ایک پرچہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''یہ وہ پرچہ ہے جو اس کے تکیے کے نیچے سے ملا تھا۔'' اسی پرچے سے یہ معلوم ہو سکا کہ وہ گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

اس نے لکھا تھا ''بھائی جان! میں بہت سوچ سمجھ کر آپ کے گھر سے جا رہا ہوں۔ گھبرایئے مت، میں مروں گا نہیں۔ ہو سکا تو کبھی واپس بھی آ جاؤں گا۔ دیکھتا ہوں کوئی میرا انتظار کتنا کرتا ہے؟ آپ سکون سے رہیں۔ میرا کیا ہے، کہیں بھی رہ لوں گا۔ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش مت کیجیے گا۔ میرے نہ ہونے ہی میں سب کا بھلا ہے۔ اپنی دلہن سے کہیے گا، وہ بہت خوبصورت ہیں۔''

ملکہ نے ڈاکٹر کو رخصت کیا کہ اب وہ آگئی ہے، انہیں سنبھال لے گی۔ عاطف پھر کسی کو فون کرنے لگا۔
”کس کو فون کر رہے ہیں؟“
”میں کنویں میں جال ڈال دوں گا اور اسے تلاش کروں گا۔ اس سے پوچھ کر رہوں گا، وہ کس راز کو چھپا رہا ہے۔ وہ کون ہے جس کی وجہ سے گھر چھوڑ کر گیا ہے۔“
یہ وقت ایسا نہیں تھا کہ وہ کسی بحث میں الجھتی۔ وہ ساس کی تیمارداری میں لگ گئی اور عاطف فون کرنے بیٹھ گیا۔ وہ ایسے عہدے پر تھا کہ پولیس سے دن رات کا واسطہ پڑتا تھا۔ اس کے لیے یہ کام کوئی مشکل نہیں تھا۔ ماں کے ہوش میں آنے کے ساتھ ہی وہ خود بھی نکل کھڑا ہوا تھا۔
دن بھر وقفے وقفے سے ماں کی خیریت دریافت کرتا رہا۔ وہ اپنی ساس کو ہوش میں لے آئی تھی اور انہیں مطمئن کرنے کے لیے ان سے کہہ دیا کہ عاطف اسے لینے کے لیے گئے ہیں۔ بس آتے ہی ہوں گے لیکن ان کے آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ اندھیرا ہونے کے بعد عاطف گھر میں داخل ہوا اور سیدھا ماں کے کمرے میں پہنچا۔ ملکہ بھی وہیں تھی۔ عاطف نے ماں کو تسلی دی کہ وہ کاشف سے مل کر آ رہا ہے۔ کسی کے کہنے میں آکر گھر چھوڑ دیا تھا، جلد آ جائے گا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے ملکہ کی طرف دیکھا تھا۔ وہ سخت غصے میں اور جھنجلایا ہوا نظر آ رہا تھا۔
”میں نوکر سے کہہ کر کھانا لگواتی ہوں۔ اتنی دیر میں آپ فریش ہو جائیں۔“ ملکہ نے کہا اور اٹھ کر جانے لگی۔
”مجھے بھوک نہیں ہے۔“
”تھوڑا سا تو کھا لیجیے۔“
”تم نے کھا لیا؟ نہیں کھایا تو کھا لو اور اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جاؤ۔ میں یہیں اماں کے کمرے میں سو جاؤں گا۔ رات میں انہیں کسی چیز کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“
”آپ کہیں تو میں بھی یہیں سو جاؤں؟“
”تم اپنی مرضی کی مالک ہو۔“
ملکہ نے اس کی زبان سے ایسی باتیں کبھی نہیں سنی تھیں۔ اس کا مطلب ہے شک کا پودا جوان ہو گیا ہے؟ وہ ماں کے کمرے میں تھی، لڑ بھی نہیں سکتی تھی لیکن طیش ایسا آیا کہ سیدھی اپنے کمرے میں آئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ میں سمجھ رہی تھی خطرہ ٹل گیا مگر سیلاب تو اب آنے والا ہے جو سب کچھ بہا کر لے جائے گا۔ پھر یہ سوچ کر مطمئن بھی ہو گئی کہ عاطف ابھی غصے میں ہیں۔ غصہ اترے گا تو اپنی غلطی کا خود احساس ہوگا۔ اس اطمینان کے باوجود سوچنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ وہ سوچتی رہی اور سوچتے سوچتے نیند آ گئی۔
صبح سو کر اٹھی تو عاطف جا چکا تھا۔ اسے بھی اسپتال جانا تھا۔ اس نے اپنی ساس کا بلڈ پریشر چیک کیا، نبض دیکھی اور اسپتال چلی گئی۔ اسپتال سے ایک نرس اس نے گھر بھیج دی کہ گھر جا کر اماں کی دیکھ بھال کرے۔
دوسری رات بھی عاطف ماں کے کمرے میں اور وہ اپنے کمرے میں سوئی۔ دونوں کے درمیان بات چیت بھی بند ہو گئی تھی۔
تین چار دن بعد عاطف اس کے کمرے میں آیا۔
”آپ کوشش ضرور کریں لیکن یوں پریشان نہ ہوں۔ اللہ اچھا کرے گا۔“
”اخبار میں اشتہار بھی دے چکا ہوں۔ دوسرے شہروں کی پولیس بھی اسے تلاش کر رہی ہے لیکن کچھ پتا نہیں چلتا۔“
”ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ مل جائے گا۔ وہ کوئی بچہ نہیں ہے۔ اپنا خیال رکھ سکتا ہے۔“
”سچ بتاؤ اس دن تمہاری اس سے کیا بات ہوئی تھی؟ کیا تم نے اس سے کہا تھا کہ گھر چھوڑ کر چلے جاؤ؟“
”میں کیوں کہوں گی۔ وہ مجھ پر بوجھ نہیں تھا۔ وہ میرا کیا بگاڑ رہا تھا، بے ضرر سا آدمی!“
”وہ جو پرچہ چھوڑ کر گیا ہے، اس نے اس میں لکھا ہے کہ میرے نہ ہونے ہی میں سب کا بھلا ہے۔ میں یہ معلوم کر کے رہوں گا کہ اس گھر میں وہ کون ہے جس کی وجہ سے اس کے چلے جانے میں سب کی بھلائی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ یہاں رہے اور میرا سکون غارت ہو۔ میرا سکون تو تم ہی ہو ملکہ بیگم!“
”اس گھر میں بس یہی ایک الزام تھا جو رہ گیا تھا۔ وہ بھی مجھے مل گیا۔“
”ابھی تو یہ محض الزام ہے مگر میں اس کی تحقیق کو ضرور پہنچوں گا۔“
ملکہ اور عاطف میں ایسی کشیدگی ہوئی کہ مہینوں کسی نے ایک دوسرے سے بات نہیں کی۔ ماں کو شک نہ ہو جائے اس لیے وہ اپنے کمرے میں سونے لگا تھا لیکن دونوں کے بستر الگ تھے۔ دونوں کی مصروفیات ایسی تھیں کہ کسی کو شک بھی نہیں ہوا۔ ملکہ اسپتال چلی جاتی، عاطف

اپنے آفس چلا جاتا۔ اسپتال سے آنے کے بعد وہ کچھ دیر ساس کے پاس بیٹھ جاتی۔ ان کی حالت بھی اب ایسی تھی کہ کاشف کے سوا انہیں کچھ یاد نہیں تھا۔ وہ اس پر غور ہی نہیں کر رہی تھیں کہ بہو بیٹے میں کیا تناؤ ہے۔
عاطف کی مصروفیات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کاشف کی تلاش میں دن رات ایک کیے دے رہا ہے۔ ملکہ کو ملال تھا تو یہ کہ جس شوہر کے لیے اس نے محبوب کھو دیا وہی اس سے بدگمان ہے۔ عاطف کے رویے نے اس کے دل میں کاشف کے لیے جگہ پیدا کر دی تھی۔ کبھی کبھی تنہائی میں بیٹھ کر اس کی یاد میں چند آنسو بہا لیتی تھی یا ڈرائنگ روم میں جا کر اس کی تصویر دیکھ لیتی تھی۔ ابھی تک کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی تھی کہ کچھ دل بہل جاتا۔
چار پانچ مہینے گزرے تھے کہ اسپتال میں اس نے اپنی ڈیوٹی رات کی کرا لی۔ وہ رات کو اسپتال میں رہتی، صبح جان بوجھ کر اس وقت گھر پہنچتی جب عاطف جا چکا ہوتا۔ دن میں اپنی نیند پوری کرتی۔
گھر میں قیامت کا سناٹا تھا۔
اس سناٹے میں ایک دن عاطف کی چیخیں گونجیں۔ پھر نوکروں کی آوازیں شامل ہوئیں۔ وہ اٹھ کر بھاگی۔ یہ آوازیں اس کی ساس کے کمرے کی طرف سے آ رہی تھیں۔ وہ اس کمرے کی طرف دوڑی اور سب کچھ سمجھ گئی۔ اس کی ساس بیٹے کے غم میں دنیا سے چلی گئی تھیں۔ اس نے نبض دیکھی، آنکھیں چیک کیں، دل کی دھڑکن ڈھونڈنے کی کوشش کی اور سر جھکا لیا۔
سناٹا اور گہرا ہو گیا تھا۔
ماں کی تدفین کے بعد تو عاطف گونگا ہو کر رہ گیا۔ ملکہ نے ایسی دل جوئی کی کہ غلط فہمیوں کی برف پگھلنے لگی۔ کاشف کے غم نے بھی اب صبر کا منہ دیکھ لیا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ سناٹا باتیں کرنے لگا۔
”تم رات کی ڈیوٹی کیوں کر رہی ہو؟“
”اسپتال میں رش کم ہوتا ہے۔ آرام مل جاتا ہے۔“
”رات کی ڈیوٹی تمہاری صحت پر برا اثر ڈالے گی۔“
”تھوڑی بہت نیند اسپتال میں پوری کر لیتی ہوں۔ کام تو نرسیں سنبھالتی ہیں۔“
”جب تک اماں تھیں، ان سے باتوں میں وقت کٹ جاتا تھا۔ اب تو راتیں مجھے کاٹنے کو دوڑتی ہیں۔“
”آپ کہیں تو میں دن کی ڈیوٹی کرا لوں؟“
”میں تو تمہاری صحت کے لیے کہہ رہا تھا۔“
ملکہ نے دن کی ڈیوٹی کرا لی۔ زندگی میں پھر ہلچل آ گئی۔ دونوں ایک ساتھ باہر نکلتے، ایک ساتھ واپس آتے۔ شام کو کہیں نہ کہیں گھومنے نکل جاتے یا کوئی مہمان آ جاتا تو وقت گزر جاتا۔ بچے ہوتے تو شور مچتا۔ یہاں کون شور مچانے والا تھا۔ دل شور مچاتا تو عاطف ماں جی کی باتیں لے کر بیٹھ جاتا یا کبھی کبھی کاشف کو یاد کر لیتا۔

☆☆☆

کاشف کو گئے ہوئے پانچ سال ہو گئے تھے۔ اس عرصے میں بہت سی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ عاطف کی ترقی ہو گئی تھی۔ وہ ڈپٹی کمشنر ہو گیا تھا۔ کاشف کی باتیں اب اس گھر میں نہ ہونے کے برابر ہوتی تھیں۔ ملکہ نے کاشف کی تصویر ڈرائنگ روم سے ہٹا دی تھی۔ تنہائی اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وہ ابھی تک اولاد سے محروم تھی۔ ملکہ اب تو یقین ہو گیا تھا کہ یہ محرومی عمر بھر کی ہے۔
یوں بھی گزر رہی تو بہت تھی لیکن تقدیر کے ترکش میں ابھی ایک تیر اور باقی تھا۔ شہر میں ہنگامے پھوٹ پڑے تھے۔ یہ ہنگامے روز بہ روز شدت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ عاطف کے عہدے کی نوعیت ایسی تھی کہ اسے ان علاقوں کا دورہ کرنا پڑتا تھا جہاں یہ ہنگامے ہو رہے تھے۔ وہ اس روز بھی دورے پر نکلا تھا کہ مشتعل ہجوم کے درمیان گھر گیا۔ اس کے ساتھ چلنے والی پولیس اسکواڈ اور مشتعل افراد کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہوا۔ ایک آوارہ گولی نے عاطف کو پہچان لیا۔ سینے پر عین دل کے پاس آ کر لگی۔ اسے اسپتال لے جایا جا رہا تھا کہ اس نے راستے ہی میں دم توڑ دیا۔
وہ اسپتال میں تھی جب یہ خبر پھیلی۔ اس نے اسے افواہ سمجھا لیکن ٹی وی کھولا تو یہ خبر چل رہی تھی۔ شہر میں ایک ہی سرکاری اسپتال تھا۔ تھوڑی دیر میں اس کی لاش بھی پوسٹ مارٹم کے لیے آ گئی۔ وہ تو بے ہوش تھی۔ اسے کچھ خبر ہی نہیں ہوئی، کب پوسٹ مارٹم ہوا، کب اس کی میت گھر پہنچ گئی۔
شام تک اس کی طبیعت بھی سنبھل گئی تھی۔ کچھ رشتے دار تھے، وہ بھی آ گئے تھے۔ ملکہ کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ عباد اللہ خاں تھے، شام تک وہ بھی آ گئے۔
عاطف کی میت پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ دفن کر دی گئی۔

سناٹا ہاتھ باندھے کھڑا تھا اور وہ عدت کے دن پورے کر رہی تھی۔

عدت کے دن گزرے تو اسے آئندہ کی زندگی کا خیال آیا۔ سرکاری مکان تھا، وہ خالی کرنا تھا۔ الگ مکان لے بھی لیتی تو بھی اکیلی یہاں رہ کر کیا کرتی۔ اس نے سوچا میکے جا کر رہے۔ اکیلا گھر پڑا ہے، باپ کی خدمت بھی کرے گی اور وہیں کسی اسپتال میں نوکری کر کے انسانیت کی خدمت بھی کرے گی۔

عاطف کی موت کے بعد اتنے پیسے مل گئے تھے کہ وہ اپنا اسپتال بھی کھول سکتی تھی۔ یہی سب سوچ کر اس نے محراب پور چھوڑ دیا اور اپنے باپ کے پاس چلی آئی۔

☆☆☆

"نانی اماں، آپ مجھے کھیلنے سے کیوں منع کرتی ہیں؟" پانچ سالہ آصفہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

"اس لیے کہ میری چاند سی بیٹی کے ہاتھ پاؤں مٹی میں ہو جاتے ہیں۔"

"ارے واہ، خود تو جب چھوٹی ہوں گی تو خوب کھیلتی ہوں گی، مجھے منع کرتی ہیں۔"

"میں کتابوں سے کھیلتی تھی۔ جب ذرا بڑی ہوئی تو یہی کتابیں پڑھنے لگی۔ بس یہ کھیل تھے ہمارے۔"

"اسی لیے آپ کی آنکھوں پر چشمہ لگ گیا۔ نا بھئی نا، میں تو کتابیں نہیں پڑھوں گی۔"

"پگلی، یہ چشمہ کتابیں پڑھنے سے تھوڑی لگا ہے۔"

"پھر کیسے لگا ہے؟"

"جب بوڑھے ہو جاتے ہیں تو چشمہ خود بخود لگ جاتا ہے۔"

"جب آپ کھیلتی نہیں تھیں تو آپ کے دوست بھی نہیں ہوں گے۔"

"دوست کس کے نہیں ہوتے؟"

"آپ کا تھا...... کیسا تھا؟"

"بہت پیارا، بالکل شہزادوں کی طرح۔ نیلی آنکھیں، بھورے بال۔ شرارتی ایسا تھا کہ چھپ جاتا تھا، میں بے چاری ڈھونڈتی رہتی تھی، بڑا شریر تھا وہ۔"

"اتنا اچھا تھا تو آپ اس سے شادی کر لیتیں۔"

"اب تو بدتمیزی پر اتر آئی ہے۔ چل بھاگ یہاں سے۔"

ڈانٹ سن کر آصفہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ ملکہ نے چشمہ اتارا اور آنکھوں کے بھیگے ہوئے گوشے صاف کر کے دوبارہ چشمہ پہن لیا۔ پھر اسے یاد آیا کہ آج اسپتال کے وزٹ کے لیے بھی جانا ہے۔ اس نے ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کو کہا اور خود تیار ہونے لگی۔

ملکہ محراب پور سے آ کر اپنے گھر میں آباد ہو گئی تھی۔ اپنے ساتھ لائی ہوئی دولت کا اس نے یہ مصرف نکالا تھا کہ ایک خالی پلاٹ خرید کر اسپتال تعمیر کرا لیا تھا جس میں غریبوں کا مفت علاج ہوتا تھا۔

یہاں آنے کے کچھ ہی دن بعد اس کے والد کا انتقال ہو گیا تو اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے اپنی ایک بیوہ رشتے دار سلمٰی کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ اپنے ساتھ دس سال کی بیٹی ثانیہ کو بھی لائی تھی۔

دس سال اور گزر گئے۔ ثانیہ بیس سال کی ہوئی تو ملکہ نے بڑی دھوم دھام سے اس کی شادی کی۔ آصفہ اسی ثانیہ کی بیٹی تھی جو چھٹیوں میں ملکہ کے پاس رہنے آئی ہوئی تھی۔

☆☆☆

اتنی بڑی حویلی اندھیرے میں ڈوبی کھڑی تھی۔ گاؤں میں لائٹ آ چکی تھی لیکن حفاظت کی غرض سے حویلی کے باہر اندھیرا رکھا جاتا تھا، صرف پہرے داروں کی آوازیں گونجتی تھیں۔ یہ ایک دور افتادہ پہاڑی مقام تھا جہاں دشمنیاں پالنے کے سوا کسی کو کوئی کام ہی نہیں تھا۔ اس لیے یہ سب کرنا پڑتا تھا۔ اس کے لیے یہ علاقہ نیا تھا نہ یہ حویلی۔ وہ کچھ نہیں تو تیس سال بعد یہاں آیا تھا۔ بہت کچھ بدل گیا تھا لیکن قدیم روایات ابھی زندہ تھیں۔ حویلی کے صدر دروازے سے ہٹ کر دیوار پر دو مشعلیں روشن تھیں جو اس وقت بھی جلا کرتی تھیں جب وہ یہاں سے گیا تھا۔ اسے معلوم تھا، اب کیا کرنا ہے۔ اس نے دروازے پر کھڑے ہو کر زور سے آواز لگائی۔

"شاہ رخ خاں کا دوست اس سے ملنے آیا ہے۔ کوئی باہر آئے۔"

دو بندوق بردار فوراً باہر نکلے۔ تلاشی لی کہ آنے والا شخص کوئی ہتھیار وغیرہ تو ساتھ نہیں لایا ہے۔ جب اچھی طرح اطمینان ہو گیا تو اسے لے کر مہمان خانے میں چلے گئے۔ یہاں مشعلیں بھی روشن تھیں اور جدید طرز کے بلب بھی جل رہے تھے۔ یہ نیا اضافہ تھا ورنہ وہ جب یہاں پہلے آیا تھا تو صرف مشعلوں پر گزارہ تھا۔

رات اتنی نہیں گزری تھی کہ شاہ رخ خاں سو جاتا۔ اسے جیسے ہی اطلاع ملی کہ کوئی مہمان آیا ہے، وہ فوراً

مہمان خانے میں پہنچ گیا۔ پہاڑی لوگوں کی یادداشت مہمانوں کے معاملے میں بڑی مضبوط ہوتی ہے۔ دیکھنے کی دیر تھی کہ فوراً پہچان گیا۔

"ارے...... کاشف رحمٰن...... میرا یار، میرا دوست!" شاہ رخ خاں زور سے چیخا اور دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ لگتا تھا گلے نہیں مل رہے، کشتی لڑ رہے ہیں۔

"ابے کتنے برسوں بعد آیا ہے۔" شاہ رخ خاں نے بیٹھتے ہوئے کہا "اور یہ کیا، تم تو کہتے تھے تم کبھی بوڑھے نہیں ہو گے۔ بال آدھے سفید ہو گئے۔ آنکھوں پر چشمہ آ گیا۔"

"اپنی طرف تو دیکھ۔ مجھ سے زیادہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ میں تو پھر بھی جوان ہوں۔"

"یہ تو اس وقت پتا چلے گا جب کل شکار پر چلیں گے۔"

شاہ رخ خاں اسے لے کر ایک کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کمرے کی آرائش جدید طرز پر کی گئی تھی۔ نہایت شاندار ڈبل بیڈ پڑا ہوا تھا۔ ایک طرف صوفے رکھے ہوئے تھے۔ فرش پر نہایت قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ یہ کمرا ان بیرونی مہمانوں کے لیے آراستہ کیا گیا تھا جو حویلی میں مہمان کے طور پر آتے تھے۔

کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد باتوں کا دفتر کھل گیا۔

"یہ بتاؤ، برسوں بعد وطن کی یاد کیسے آ گئی؟"

"ایک شادی میں شرکت کے لیے آنا پڑا۔ شادی تو اس بے وفا شہر میں ہے جہاں میں اجڑا تھا لیکن یہ سوچ کر پہلے محراب پور آ گیا کہ بھائی جان سے مل لوں گا لیکن وہاں تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ یہ تو مجھے اندازہ تھا کہ میری ماں اب اس دنیا میں نہیں رہی ہو گی لیکن یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ بھائی جان بھی مجھے چھوڑ جائیں گے۔ سرکاری بنگلا تھا اس میں اب کوئی اور کمشنر صاحب رہتے ہیں۔"

"تمہارے بھائی کے بیوی بچے......!"

"ان کا مجھے کچھ پتا نہیں۔ میں یہاں اس لیے آ گیا کہ تمہارا شکریہ ادا کرنا تھا۔ جس وقت میں گھر سے نکلا تھا، اسی کمرے میں آ کر ٹھہرا تھا۔ تم نے مجھے پناہ دی تھی۔ بھائی جان مجھے مجرموں کی طرح ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ یہاں نہ چھپتا تو فوراً پکڑا جاتا۔ پھر میں ایک صاحب کی وساطت سے لندن چلا گیا۔ اپنا بزنس سیٹ کر لیا ہے۔ مزے سے گزر بسر ہو رہی ہے۔"

"شادی کر لی یا اسی محبوبہ کے فراق میں ہو؟"

"نہ فراق ہے نہ وصال ہے۔ وہ چلی گئیں، شادی کی نہیں۔ تم سناؤ، تم نے تو شادی کر لی ہو گی۔"

"بیس سال کا میرا بیٹا ہے۔ دو لڑکیاں ہیں۔"

"تم تو بڑے بھاری بھرکم ہو گئے ہو۔"

"میں کہتا ہوں اب تم بھی شادی کر لو۔"

"اب تو میرے بچوں کی شادی کے دن ہیں۔"

"شادی کرو گے تو بچے ہوں گے۔"

"بھائی کے بچے بھی تو اپنے ہی بچے ہوتے ہیں۔ وہ جہاں کہیں بھی ہوں گے۔ اب تو ان کی شادی ہو رہی ہو گی۔ اب تو میں شادیوں میں شریک ہونے کا رہ گیا ہوں۔ کبھی اپنے بیٹے کی شادی کرنا تو مجھے ضرور بلانا۔ میں کہیں بھی ہوا آ جاؤں گا۔"

"میرا بیٹا بیس سال کا ہو گیا۔ اب تک شادی کے انتظار میں بیٹھا رہتا۔ اس کی شادی کو تو ایک سال ہو گیا ہے۔ بیٹیاں بھی اپنے اپنے گھر کی ہو گئیں۔ اب تیری خاطر میں دوسری شادی کروں گا، اس میں آ جانا۔"

کاشف کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ انتظار کرنے والے ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ اب تو میں ہی رہ گیا ہوں انتظار کرنے کو۔

دوسرے دن وہ شاہ رخ خان کے ساتھ شکار پر چلا گیا۔ ارادہ تو یہی تھا کہ اسی دن روانہ ہو جائے گا لیکن شاہ رخ نے اسے ضد کر کے روک لیا۔ شکار سے واپس آیا تو اتنی تھکن ہو چکی تھی کہ اسے ایک رات اور رکنا پڑ گیا۔ یہ رات بھی آدھی باتوں میں گزر گئی۔ صبح ہوتے ہی جیپ آ گئی۔ اس کے مسلح باڈی گارڈ دوسری جیپ میں سوار ہوئے۔ شاہ رخ خان اور کاشف جیپ میں سوار ہوئے اور اسے گاؤں سے باہر بہ حفاظت پہنچا کر واپس آ گئے۔

وہ محراب پور آیا اور یہاں سے ملکہ کے شہر کی طرف روانہ ہو گیا جسے وہ بے وفا شہر کے لقب سے یاد کرتا رہا تھا۔

شہاب اللہ خان نیازی شہر کے رئیس ترین آدمی تھے۔ اسی (80) سے تجاوز کر چکے تھے لیکن اب بھی نوجوانوں سے زیادہ پھرتیلے تھے۔ کاشف کے محسن تھے۔ جب وہ گھر سے نکلا تھا اور کچھ دن شاہ رخ خان کے پاس رہ کر وہاں سے رخصت ہوا تھا تو شہاب خان ہی تھے جنہوں نے اسے سہارا دیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ اس کے لندن جانے کا بندوبست کیا تھا بلکہ ایسے وسائل بھی مہیا کیے تھے

کہ لندن پہنچتے ہی اس نے اپنا کاروبار سیٹ کرلیا تھا۔ اب ان کے پوتے کی شادی تھی جس میں انہوں نے کاشف کو مدعو کیا تھا اور اسے آنا پڑا تھا۔

دیکھے بھالے راستے بھی اس کے لیے اجنبی ہوگئے تھے لیکن شہاب خان کے گھر پہنچنا کون سا مشکل تھا۔ اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا، کچھ اپنی یادداشت پر زور ڈالا اور پہنچ گیا۔

☆☆☆

شادی اور ولیمے کا دعوت نامہ آیا رکھا تھا۔ ملکہ شادی میں نہیں جاسکی تھی لیکن ولیمے میں جانا ضروری تھا۔ اس لیے بھی کہ شہاب خان خود دعوت نامہ دینے آئے تھے بلکہ اس لیے بھی کہ شہاب خان نے اس کے اسپتال کے لیے ایک بڑی رقم چندے میں دی تھی۔ اس احسان کا تقاضا تھا کہ وہ ضرور جائے۔ اس نے تقریبات میں جانا تقریباً ختم کردیا تھا لیکن یہاں جانا ضروری تھا۔

ولیمے کا اہتمام شہاب خان نے اپنی کوٹھی پر ہی کیا تھا۔ وہ گاڑی سے اتری تو شہاب خان اس کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ ان کی بیٹی نے ملکہ کا ہاتھ تھاما اور مہمانوں کے ہجوم سے ہوتے ہوئے اسے ایک نشست پر بٹھادیا۔ وہاں بیٹھی ہوئی خواتین سے اس کا تعارف کرایا اور معذرت کرکے خود بھیڑ میں گم ہوگئی۔ ملکہ نے کچھ دیر بیٹھنے کے بعد ادھر ادھر نظر دوڑائی اور مہمانوں کا جائزہ لینے لگی۔ اچانک اس کی نظر ایک آدمی پر پڑی جس کے بال بھورے تھے، کچھ سفید ہوگئے تھے۔ آنکھوں پر سنہرے فریم کا چشمہ لگا ہوا تھا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے یہ پہچاننے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کاشف ہے۔ پہلے تو اس نے سوچا انجان بن جائے لیکن وہ خود کو اتنا بڑا دھوکا نہ دے سکی۔ وہ اپنی نشست سے اٹھی اور اس کے پاس جاکر کھڑی ہوگئی۔ اس نے بھی نظر اٹھا کر دیکھا۔

"تم کاشف ہی ہونا؟"

"ملکہ تم......!"

دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے کو خراج ادا کررہی تھیں۔ دونوں چپ تھے جیسے کسی کے پاس کہنے کو کچھ نہ ہو۔ پھر ملکہ نے ہمت کی۔

"تمہیں خبر ہے، ہم کتنے لمبے عرصے بعد مل رہے ہیں۔"

"ہاں، جب محبت سے محبت ہوجائے تو شرط محبوب باقی نہیں رہتی۔ میں نے بھی یہ دن تمہارے تصور میں کاٹ دیے مگر اب تھک گیا ہوں۔ بڑھاپے میں چھڑی کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"تمہیں معلوم ہے، ان گزرے سالوں میں کیا، کیا ہوگیا ہے؟"

"میں یہاں آنے سے پہلے محراب پور گیا تھا۔ سب چلے گئے۔ یہ بتاؤ، تمہیں میرا انتظار تھا؟"

"یہ انتظار ضرور تھا کہ تمہیں ایک مرتبہ زندہ دیکھ لوں۔ یہ بتاؤ، شادی کی؟"

"کس سے کرتا۔ یہ تو مجھے اب معلوم ہوا کہ تم بھائی جان کی دلہن نہیں رہیں پھر سے ملکہ بن گئی ہو۔"

"میں اب بھی ملکہ نہیں عاطف کی بیوہ ہوں۔"

"مجھ سے شادی کروگی؟"

"فاصلے محبت کے قاتل نہیں ہوسکتے۔ میں تم سے ہمیشہ محبت کرتی رہوں گی لیکن ہم شادی کے لیے بنے ہی نہیں تھے۔"

"شاید!"

"رہ کہاں رہے ہو؟"

"میں تقریباً پچیس سال پہلے لندن چلا گیا تھا۔ اپنا بزنس ہے۔ یہ کارڈ رکھ لو۔ کبھی کبھی فون کرلیا کرنا۔ میں سمجھوں گا تم سے قریب ہوں۔"

ملکہ نے کارڈ لیتے ہوئے پوچھا "کب جارہے ہو؟"

"کل صبح کی فلائٹ ہے۔"

یہ باتیں ہورہی تھیں کہ کھانا شروع ہوگیا۔ وہ دونوں کھانے کی میز پر ساتھ ساتھ گئے۔ کھانے کے دوران بھی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ سوئٹ ڈش کی طرف گئی تھی۔ واپس آئی تو وہ غائب تھا۔ شریر کی یہ عادت اب تک نہیں گئی۔ یہیں کہیں چھپا ہوگا اور میری بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہورہا ہوگا۔ وہ اسے ڈھونڈتی رہی۔ جان بوجھ کر دیر تک رکی لیکن وہ اسے نہیں ملا۔

گھر پہنچ کر اس نے اس کا دیا ہوا کارڈ نکالا، کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس کے پرزے کرڈالے۔

"میں عاطف کی بیوی نہیں رہی، بیوہ تو اسی کی ہوں۔ کسی اور کو فون بھی کیوں کروں...... کہ شادی سے پہلے بھی تو کاشف کو فون کرتی رہی تھی...... وہ اس وقت نہیں ملا تو اب اسے فون کرکے کیا کرنا......"